خصوصی دلہن نمبر کی دلآویز سجاوٹ لیے ستمبر 2014ء کا پاکیزہ حاضر ہے
کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ
رفعت سراج کے ناول امانت کا حیران کن اختتام
نگہت سیما کے نئے قسط وار ناول اعتبار وفا کا عنقریب آغاز
نایاب جیلانی کی ترک وفا سبک خرامی سے انجام کی طرف گامزن
زاهده پروین نے اپنے قلم سے نکالا جنگل کا حسین پھول ناول کی صورت
شمیم فضل خالق
ہیں ہماری بزم کی
مہمان خصوصی
اس کے علاوہ
دلشاد نسیم، غزالہ رشید، نگہت اعظمی، شیریں حیدر اور
سیما بنت عاصم کی چشم کشا تحریروں کے ساتھ ساتھ پڑھیے ہالہ احمد،
ثریا انجم، فاطمہ خان و دیگر رائٹرز کے دلکش افسانے
عظمیٰ آفاق سعید
بے حد حسین، دلربا اور متنوع مستقل سلسلوں کا متاثر کن امتزاج صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

جلد ۳۴ ♦ شمارہ 10 ♦ ستمبر ۲۰۱۴ء

ماہنامہ

مدیر اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبہ اشتہارات

[illegible]	[illegible]	0333-2256789
[illegible]	[illegible]	0333-2168391
	[illegible]	0333-2895528
[illegible]	[illegible]	0300-4214400

♦♦♦

[illegible] 60 روپے ♦ [illegible] 700 روپے

63-C [illegible] کراچی 75500

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ملک اس وقت عجیب صورت حال کا شکار ہے۔ محاذ آرائی کے اس ماحول میں موجودہ حکومت پر مسلسل الزامات کی بوچھار ہے۔ ہم جیسے لوگ سمجھ ہی نہیں پا رہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کون صحیح اور کون غلط ہے یہ تو اہل سیاست بتا سکتے ہیں ہم جیسے لوگ تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک ترقی کرے۔ اس کی معیشت کو استحکام حاصل ہو۔ ہم سے بعد میں آزادی حاصل کرنے والا [illegible] سپر پاور ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں تباہ و برباد ہو جانے والا جاپان اور جرمنی کہاں پہنچ گئے۔ خود ہمارے سیاست دان جس بنگلہ دیش کو اپنی معیشت پر بوجھ کہتے تھے اس کی معیشت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ملائیشیا، تائیوان اور تھائی لینڈ جیسے پس ماندہ ممالک ترقی کی دوڑ میں ہم سے کتنا آگے نکل گئے اور ہم......؟ سوتی کپڑوں کی صنعت تباہ کر بیٹھے، گارمنٹس فیکٹریاں بند ہوتی جا رہی ہیں تقریباً ہر صنعت کا حال یہی ہے۔ آخر ان مصائب کا بھی کوئی ازالہ ہے یا پھر بقول شہزاد احمد

اپنے ہی شعلۂ رنگیں سے جلا دامن گل

اپنی ہی شاخِ تبسم پہ کلی مرجھائی

معراج رسول

خطا کار

سرگزشت

بخارا جہاں سے لاتعداد مشہور شخصیت ہند آئیں کیونکہ سمرقند و بخارا اہل علم کا گڑھ تھا۔ وہاں پر علم و ہنر کا دور دورہ تھا۔ بے شمار اہل علم و اہل ہنر جمع تھے۔ ہند مغلوں کا مفتوحہ علاقہ بن چکا تھا اس لیے سمرقند و بخارا کے اہل علم قسمت آزمائی کے لیے ہند کا رخ کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں اس نے بھی ہند کی جانب کوچ کیا مگر وہ قسمت آزمائی کے لیے گھر سے نہیں نکلا تھا بلکہ اسے صحرا نوردی کا شوق چرایا تھا۔ وہ خدا کی زمین کو آگے اور آگے جا کر دیکھنا چاہتا تھا۔ جب وہ بخارا میں تھا تو اس کی شہرت پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ مراتب یافتہ شخصیت میں شمار ہوتا تھا (تاریخ اس کے ابتدائی حالات پر خاموش ہے، کہیں بھی اس کے والدین یا جائے پیدائش کا ذکر نہیں ملتا ہے) عزت دار سمجھا جاتا تھا اسی لیے اسے 953ھ بمطابق 1546ء میں شہنشاہ ہمایوں نے قندھار آنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت اس عظیم الشان جشن میں شرکت کی تھی جو ہمایوں کی جانب سے منایا جا رہا تھا۔ یہ جشن اکبر کی رسم ختنہ پر منعقد کیا جا رہا تھا۔ ہمایوں نے اس جشن میں دور و نزدیک کی ہر اہم شخصیت کو دعوت نامہ بھیجا تھا۔ وہ بھی ان میں شامل تھا۔ اہل بخارا کے ذی حیثیت افراد کا ایک قافلہ قندھار جا رہا تھا۔ وہ بھی اس قافلے میں شامل ہوگیا۔ ہمایوں نے جشن کی بھرپور تیاری کرائی تھی۔ پورا شہر دلہن کی طرح سجا تھا۔ مہمانوں کے ٹھہرنے کا پُرتکلف انتظام تھا۔ وہ بھی ایک خیمے میں جا رکا۔ جس دن ہمایوں رسم کی ادائیگی کے بعد خلعت تقسیم کر رہا تھا دیگر اہل علم کے ساتھ اسے بھی دربار میں طلب کیا گیا۔ دعوت نامہ ملتے ہی وہ دربار کے لیے روانہ ہوگیا۔ ہمایوں جاہ و جلال کے ساتھ تخت پر جلوہ نما تھا۔ ایک کے بعد ایک اہل علم چوبدار کے نام پکارنے پر اپنی کرسی سے اٹھتے، کورنش بجالاتے، خلعت وصول کرتے اور اپنی جگہ واپس آ کر بیٹھ جاتے۔ اسی وقت، جب چوبدار نے اس کا نام پکارا اس پر جذب طاری ہوگیا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جھومنے لگا۔ زبان پر صرف ایک لفظ تھا "اللہ ہو"۔ چوبدار بار بار اس کا نام پکار رہا تھا مگر وہ جواب دینے کی کیفیت میں نہ تھا۔ اس پر "حال" طاری ہو چکا تھا۔ ہمایوں نے اسے اپنی جھلک بھی اور اس خطا پر وہ برہم ہوا چاہتا تھا کہ درباریوں نے ہمایوں کو روک دیا کہ یہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے محفل کبیدہ ہوگئی اور وقت سے پہلے ختم کر دی گئی۔ ہمایوں نے اس کی خلعت ایک وزیر کے حوالے کر دی تھی اور حکم دے دیا تھا کہ جب اس کی یہ کیفیت ختم ہو تو خلعت دے کر واپس بخارا بھیج دیا جائے۔

ہمایوں نے ہند کو فتح کیا حکومت قائم کی اور پھر کئی سال بعد تخت سے محروم بھی ہوگیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اسے تخت واپس مل گیا۔ دوسری بار تخت نشین ہوا تو اس نے سمرقند و بخارا کے اہل علم کو ہند آنے کی دعوت دی۔ اسی دور میں بخارا سے چلنے والے ایک قافلے کے ساتھ وہ بھی ہند آ گیا۔ اس نے سکونت کے لیے آگرہ کو منتخب کیا مگر یہاں آ کر جذب کی کیفیت سوا ہوگئی۔ وہ علم تقسیم کرنے کی بجائے آگرہ کی گلیوں میں چکر لگاتا رہتا۔ عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں۔ "اس نے مریدوں کی ایک جماعت تیار کر لی تھی۔ وہ مریدوں اور شاگردوں کے ساتھ مل کر مفت پانی پلاتے رہتے۔" یہ ایک عجیب بات تھی کہ ماشکی مفت میں مشک خالی کر دے۔ وہ پانی پلاتے جاتے اور شعر کہتے جاتے۔ ان کے اس عمل سے تو اس نے کبیدگی محسوس کی کیونکہ ایرانی اور تورانی سپاہ میں دوری بڑھ رہی تھی۔ رسہ کشی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ایسے وقت میں ان کی ایک اور حرکت نے تورانی امرا کو مشتعل کر دیا۔ وہ پانی پلاتے پلاتے نعرہ لگا دیتے تھے۔

تورانی امرا نے اسے تخت ناپسند کیا اور جھوٹی تہمت لگا دی کہ اس نے مذہب بدل لیا ہے اور اس خطا کی اسے سزا ملنی چاہیے۔ اس الزام پر وہ دل برداشتہ ہوگیا اور آگرہ سے بنگال کے لیے نکل پڑا۔ وہ شہر شہر گھومتا ہوا۔ 970ھ/1562ء میں بردوان جا پہنچا۔ مگر اس سے پہلے اس کی "خطا" بردوان تک پہنچ چکی تھی۔ حاکم بردوان نے تعزیر کی تیاری کا حکم دیا کہ اسے شہر پناہ سے باہر کر دیا جائے لیکن قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ بردوان کی آب و ہوا اسے راس نہ آئی۔ بنگال کے مریضانہ موسم نے اسے تپ لرزاں (ملیریا) میں مبتلا کر دیا۔ بردوان پہنچنے کے تیسرے دن وہ خالق حقیقی سے جاملا۔ بردوان میں ہی مقبرہ بنا۔ اسی درگاہ کے احاطے میں نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن کی قبر ہے۔ درگاہ پر جو کتبہ نصب ہے اس پر سن وفات 970ھ/1562 عیسوی درج ہے۔ اس خطا کار صوفی کو لوگ بیرام سقا عرف بہرام بردوانی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہر سال بیساکھ (بنگلہ سال) کے مہینے میں عرس مناتے ہیں۔

☆☆☆

طاہر الدین بیگ کی بھرپور خاص سے تشریف آوری۔ ”سرگزشت کا شمارہ اگست ایک بے مثال شاہکار کی صورت میں ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ایک ایسا شمارہ ہے جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے جسے ہر پڑھنے والے کو اپنی لائبریری کی زینت بنانا ہوگا کیونکہ یہ ایک دستاویزی ادنامے سے ہر تحریر نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہے۔ اس بار عقیل جعفری صاحب نے 15/14 اگست کے پس منظر میں پاکستان کے وجود کا بڑا تفصیلی ذکر کیا ہے اور ساتھ میں بڑی نادر تصاویر بھی ہیں جو ہمارا قومی سرمایہ ہے۔ پاکستان 15 اگست کو وجود میں آیا۔ 27 رمضان المبارک جیسا متبرک دن کرنے جانے کن وجوہات اور کن معنوں کے تحت پاکستان ڈے 14 اگست کو منانے کا فیصلہ ہوا۔ مصنف اس کی وجہ بتانے سے قاصر ہے کیونکہ اس کی وجہ کہیں ملی نہیں؟ عقیل جعفری صاحب اور سرگزشت کو میں دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ایسی تحقیق اور بے بہا تصاویر اور تحریر سرگزشت میں شائع ہوئی اور جعفری صاحب نے تو خوب ہی لکھا۔ کافی عرصے بعد محترم عنایت چشتی صاحب کی زبردست کاوش سرگزشت کی زینت بنی اور شکاریات کے موضوع پر بھی ایک کہانی آئی۔ دونوں ہمارے پسندیدہ موضوع ہیں۔ اب ذکر ہو جائے آپ بیتیوں کا اعتبار کریں بڑے عرصے بعد اتنی پُراثر اور لاجواب آپ بیتیاں شائع ہوئی ہیں کہ جب شروع کیا تو محترم چشتی صاحب کی کاوش تک پڑھ کر ہی دم لیا۔ آخری راستہ آپ بیتی کیا تھی ایک ایسی تحریر تھی جو قدم بہ قدم پر حیرت زدہ کر رہی تھی۔ منور کا کردار، خاندانی دشمنیاں، اولاد کی جذباتی فیصلے، ماں باپ اور بہن کی تکالیف یہ سب منور کے کردار کی عکاسی ہے بہن کو عزت بچانے کے لیے گاڑی کی ڈگی میں بند ہونا پڑا اور پھر انجام اپنے دیس کو چھوڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے تقریباً روپوش زندگی گزارنے والی آسٹریلیا چلی گئی۔ آسٹریلیا سے ہماری بھی کچھ ترم اور گرم یادیں وابستہ ہیں۔ ایک اور آپ بیتی کا ذکر کرتے ہیں جہاں پہلوان نما باپ بیٹی کے رشتے کے لیے ایک دیوار ہے اور جب ایک چاہنے والا اپنے دوست کو وہاں سفارش کے لیے بھیجتا ہے تو انجام یقیناً آپ کو پڑھ کر مزہ آیا ہوگا پھر ایک ڈاکٹر کی دلچسپ آپ بیتی جس نے اپنے مریض کو تندرست کرنے کے لیے کتنا پرپیچ علاج تلاش کیا۔ بہت ہی یادگار آپ بیتی علاج کے نام سے، پھر یہ جو آوارہ اور چھپا رستم کو عرض یہ کرنا ہے کہ آپ بیتیوں کے لحاظ سے بھی اگست کا شمارہ زبردست ہے۔ بڑے عرصے بعد اتنی دلچسپ، اثر انگیز اور سبق آموز آپ بیتیاں سرگزشت کے اگست کے شمارے کی زینت بنیں پھر زرینہ ودوم کے عنوان سے انجیلا کی زبردست کہانی مزہ دے گئی۔ شہرِ خیال میں سعدیہ یاسمین کوہاٹی، چاند صاحب اور ملک جاوید زبردست رہے۔“

سلطان مسعود کا تبصرہ بیادل پور سے۔ ”سرگزشت کی تعریف ڈکشنری میں موجود الفاظ سے تو نہیں کی جا سکتی۔ ایک بار پڑھنا شروع کرا تو پھر رکھنے کو دل نہیں کرتا۔ یہ خط لکھنے کا محرک جولائی کے شمارے کی کہانی ”تمہیں انگلینڈ نہیں“ ہے جس میں مصنف کی طرف سے خط میں شدید غصے نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ پاکستان کی پاک سرزمین پر یورپ کو ترجیح دینے والے اس بچے بیانی کو ضرور ملاحظہ کریں۔ میں گزشتہ 47 سال سے انگلینڈ میں مقیم ہوں۔ والدہ صاحبہ کی بیماری کی وجہ سے کچھ عرصے سے پاکستان آیا ہوا ہوں۔ مجھے بھی حیرت ہے کہ ہم آپ کے تبصرہ کا شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ یقیناً وہاں بھی بچوں سے زیادتی کے واقعات ہوتے ہیں مگر اتنا اندھیر نہیں ہے جو یہاں ہے۔ وہاں قانون اتنا سخت ہے کہ بعض حالات میں شاید قتل کے مجرم کو تو معاف کر دیا جائے مگر زیادتی اور خاص طور پر بچوں سے زیادتی کے مجرم کو عبرت ناک سزائیں دی جاتی ہیں۔ صرف دو واقعات لکھ رہا ہوں جس سے پڑھنے والے خود اندازہ لگا لیں کہ انصاف کہاں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے انگلینڈ کے ایک شہر میں بچے سے زیادتی کا ایک واقعہ ہوا۔ پولیس نے شہر کے تمام بالغ مردوں کا ڈی این اے ٹیسٹ کیا اور مجرم پکڑا گیا۔ دوسرا پہلے وہاں ایک دوسرا واقعہ ہوا ”جج نے سزا سناتے ہوئے ریمارکس دیے کہ یہ شخص معاشرے کے لیے خطرہ ہے۔ اس لیے اسے اکیس سال کی سزا دیتا ہوں اور دیکھوں گا کہ یہ شخص اکیس سال سے پہلے جیل سے کیسے نکلتا ہے۔ وہاں بچوں سے زیادتی کے مجرم ایک لمبی جیل کاٹنے کے بعد بھی ساری زندگی پولیس کی نگرانی میں رہتے ہیں کیونکہ ان کے لیے خاص رجسٹر ہوتا ہے، وہ جہاں جہاں بھی رہیں ان کا نامہ اعمال ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اب آئیے پاک سرزمین کی طرف یہاں ہر سال بچوں سے زیادتی کے صرف ریکارڈ شدہ کیس ہزاروں میں ہوتے ہیں اور جو کیس بااثر لیکن بدمعاشوں اور بے ضمیروں کی وجہ

سے پولیس ریکارڈ نہیں کرتی ان کی تعداد و شمار نہیں کی جا سکتی۔ بی بی سی کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق صرف گزشتہ پانچ سال میں ہونے والے زیادتیوں کے ہزاروں واقعات میں سے کسی ایک کو بھی سزا نہیں ہوئی۔ یہاں تو تین تین سال کی بچیاں...... اس ہفتے کا ایک اخبار پڑھ کر میرا قلم پورا فقرہ لکھنے سے کانپ رہا ہے کہ پنجاب میں ایک ڈیڑھ سالہ بچی...... یقیناً یورپ میں بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں مگر ایسا ظلم تو کبھی پڑھا سنا۔ وہاں تو ان کی نظر میں بااثر شخص کوئی نہیں ہوتا۔ تو پاکستانی اس لیے یورپ کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہاں قانون کی حکمرانی ہے۔"

شبانہ حنیف کی خیال آفرینی کراچی سے۔ "اگست کا شمارہ راشد منہاس شہید کے تذکرے سے مزین تھا۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا کہ ہمارے وطن کے جوانوں کا جذبہ کل بھی قابل فخر تھا اور آج بھی ہمارے فوجی جوان جو سرحدوں پر اور فضاؤں میں ہماری حفاظت کر رہے ہیں قابل فخر ہیں۔ امید پرست اور مدیر ثریا دوم میں دو خواتین کے بارے میں پڑھنا بھی ایک دلچسپ تجربہ ثابت ہوا لیکن یوم آزادی کی اصل تاریخ کیا ہونی چاہیے، اسے پڑھ کر ذہن تھوڑا الجھ گیا۔ قصہ الف لیلہ کی 230 ویں قسط بھی موسیقاروں پر تھی جو اچھی رہی۔ سب سے مزے کی چیز جی اے چشتی صاحب کے صاحبزادے کی بات تھی۔ سفرنامے تو ہمیشہ ہی معلومات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں جس کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں اور صد شکر کہ اب کی کہانی راہ و داریوں سے باہر نکلی۔ کافی اقساط راہ داریوں کی نظر ہو گئیں۔ سچ بیانیاں ہمیشہ کی طرح چشم کشا ہیں۔ سب سے قابل تعریف بات جس کا میں تذکرہ ضروری سمجھتی ہوں کہ آپ نے چشتی صاحب کو جس طرح دو ٹوک لکھا کہ ادارہ کسی خاتون کا نمبر کسی کو نہیں دیتا تو یقین کریں بہت اچھا لگا۔ میں اپنے میاں کا نمبر آپ کو دے رہی ہوں اگر چشتی صاحب چاہیں تو میرے میاں کے نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔ (نمبر چشتی صاحب کو ارسال کر دیا) خفا نمبر کے بارے میں بالآخر پتا چل گیا کہ اگلے ماہ ہاتھوں میں ہوگا۔ یقیناً شاندار ہوگا۔ میں معروفیت کے باعث یا جدہ خط نہیں لکھ سکی لیکن شہر خیال کے تمام ساتھی، بزرگ اور خواتین سب کے سب ایک خاندان کی طرح محسوس ہوتے ہیں سب کے لیے دعائیں اور سب کی خدمت میں سلام جناب شاہد حسین صاحب کے اہل خانہ کو اللہ تعالیٰ صبر عطا فرمائے اور شاہد صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔"

احمد خان توحیدی، کراچی سے لکھتے ہیں۔ "شمارہ اگست 25 جولائی کی شام کو مل گیا۔ برادر معراج رسول صاحب کا فلسطین میں روزانہ جو نمازوں کا قرمان تو یہ ایک دن کا مسئلہ نہیں ہے ستم یہ کہ ظالم کو لگام دینے والا بھی کوئی نہیں۔ افغانستان اور عراق میں نائن الیون کی آڑ میں ایلڈر اسلیس نے لو بھرہ خبر دی۔ ہم مسلمانوں کے نفاق کا یہ صلہ ہے۔ علامہ اقبال درست پیش گوئی کر گئے تھے ورنہ صلاح الدین ایوبی جیسے مجاہد کے پاس اتفاق کے سوا کیا تھا؟ ادب کا بابا آدم، حافظ ابراہیم کے بارے میں کل پڑھا ہو تو یاد نہیں۔ ایک صفحے میں عظیم لوگوں کے حالات سمو دینا سرگزشت کا ہی خاصا ہے۔ تفریحی مقام پر حفاظتی انتظامات ہونے کے باعث عیدالفطر پر ایک بے کا لاڈ وڈ پالیس افراد کی زندگی ہڑپ کر گیا۔ شہر خیال میں ایاز راہی مسند صدارت پر جلوہ افروز تھے تبصرہ کمال تھا۔ مسز سدرہ بٹ کوری دو ادبی نثر سے بچپن میں پورے گاؤں میں ہر گھر سے حلوہ آتا اور بانٹا جاتا تھا۔ خلیل حیدر جھنگ کی شہر خیال کی محفل میں آمد، خوش آمدید۔ سعید احمد جاند، حکیم سید رضا شاہ، شاہد جہانگیر، جاوید سرگانی، حیدر ریاست بھٹی، بشریٰ افضل، رانا شاہد کے جامع تبصرے تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کے شوہر کو اللہ تعالیٰ جلد صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین)۔ اکثر ساتھیوں نے ناپاک اسرائیل کے مظلوم فلسطینیوں پر ظلم اور لوڈ شیڈنگ پر افسوس کا اظہار کیا۔ فلسطین میں جو نمازوں اور ظلم پر معراج رسول فرما چکے۔ لوڈ شیڈنگ کے اصل مجرم سیاسی لیٹرے کالا باغ ڈیم کے دشمن ہیں۔ مظاہرے ادھر نے قومی املاک کی توڑ پھوڑ۔ عیدالفطر میں ایک ہفتے کا قیام ہم خود اپنی قبر کھود رہے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد صاحب، راشد منہاس (نشان حیدر) کی تفصیل سب بچوں نے بار بار پڑھا صاحب کی طرف سے جائزانہ التجا ہے کہ نشان حیدر پانے والے تمام قومی ہیروز کی باری باری ہر شمارے میں ایک کہانی شائع کریں۔ واجد علی خان، مختار آزاد دو بھی تحریریں لائے۔ آزادی، لطیف جعفری تفصیل کا شکریہ۔ 14 اگست ہو یا 15 اگست ہندو کے پنجے سے قائداعظم نے ہمیں آزادی دلائی لیکن لٹیرے کرتا دھرتا نے امریکی طوق گلے میں ڈال رکھا ہے جس کے بغیر با آسانی انہیں فراغت سے بھی نجات نہیں ملتی۔ انجم فاروق خونی تحریریں گلدستہ اسٹوری تھی۔ آفاقی صاحب کی قصہ الف لیلہ، ہیرا تھا صاحباں مرزا، سوہنی مہینوال آج بھی پنجاب میں اکٹھے میں چھلانگ کا گھڑا بجا کر طبلے اور بانسری کی سر پر یلی آواز سے شادی بیاہ و تقاریب میں شوق سے گاتے ہیں۔ آج کل ٹی وی پر سید نور کی خوب صورت فلم پاکیزہ آرہی ہے۔ مدیر ثریا دوم اچھی کہانی ہے۔ منظر امام نے آزادی والے مہینے کی خوب معلومات سے نوازا۔ کاش ہم آزادی کی قدر کر کے واقعی آزاد ہوتے۔ امید پرست اور الوداع لاائق گزارہ ہیں۔"

انجم فاروق ساحلی کی لاہور سے تشریف آوری۔ "اس بار سرگزشت کا ٹائٹل اچھا خوش نظر تھا۔ خونی تحریریں شائع کرنے کا شکریہ۔ یوم آزادی 14 یا 15 اگست اچھی تحقیقی کاوش ہے لیکن تنقید پرستوں کو یہ ہضم نہیں ہوگا۔ اس نئے انکشاف کے سلسلے میں عقیل عباس مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید پرست خوب تھی۔ مدیر ثریا بھی اچھی آپ بیتی ہے۔ قصہ الف لیلہ میں چندو لال کا تذکرہ اہم تھا۔ سراب حسب معمول آگے بڑھ رہی ہے۔ اگست معلومات سے بھرپور تھا۔ نشان حیدر بھی اچھی کاوش ہے۔ اشعار کا انتخاب معیاری تھا۔ امید ہے خفا نمبر کامیابی حاصل کرے گا۔ پہلی تینوں آپ بیتیاں خوب تھیں۔ باقی ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ شکار یات کی کہانی زیر مطالعہ ہے۔"

وحید ریاست بھٹی کا خط کرسیداں راولپنڈی سے۔ "سرگزشت 27 رمضان کے مبارک دن نظر نواز ہوا۔ حسب روایت اول کی مانند سب سے پہلے اجتماعی دردِ الم میں ڈوبا ہوا اداریہ پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ بالکل بجا فرمایا کہ یہود و ہنود نے مسلمانوں کی نسل کشی کی نیت کر لی ہے۔ صد

حیف مسلم حکمرانوں پر۔ مجال ہے کہ رمضان کریم میں اپنے ملک کے مسلمانوں کے خون ناحق بہائے جانے پر ان کے کانوں پر جوں تک رینگی ہو۔ عید نماز کے حوالے سے ہم نماز تہجد کو شمار کرتے تھے مگر آپ نے نماز جنازہ کو بھی نماز کے حوالے سے لکھ کر نہ صرف ضمیر پاکستان بلکہ ضمیر عالم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ہمارے پیارے وطن میں کوئی جماعت آزادی مارچ، کوئی انقلاب اور کوئی جماعت آپریشن ضرب عضب کے حوالے سے پوائنٹ اسکورنگ کرتی نظر آتی ہے یہ نہیں سوچتی کہ یہود و ہنود کا اگلا ہدف پاکستان ہی ہے (نعوذ باللہ) یک گی سرگزشت میں جدید شاعری (عربی) کے استاد کامل جناب حافظ ابراہیم کے حوالے سے لکھ کر آپ نے فہرست شعرا و ادبا میں مزید اضافہ فرمایا۔ شہر خیال میں اپنے تمام دوستوں کے خیالات سے مکمل ہم آہنگی نظر آئی۔ محمد ایاز راہی کو مسند صدارت مبارک۔ مختصر مگر جامع انداز میں تبصرہ فرما کر علم و ذوق قارئین کی خوب پیاس بجھائی، باقی لکھنے والوں میں مسعود باقر، کوثر محمد شکیل حیدر، بشریٰ افضل، قیصر عباس خان، سید احمد چاند، حکیم سید محمد رضا شاہ، ملک محمد جاوید خان سرکانی نے خوب خوب لکھا۔ رانا محمد شاہد صاحب کا جملہ تو شہر خیال کی رونق تھا۔ منشی محمد عزیز کی سرگزشت کو حاصل کرنے کی تگ و دو خاصی دلچسپ ہے۔ منشی محمد عزیز صاحب کی میں تائید کروں گا کہ شاہد حنیف سے عرض ہے کہ جنوری 2000 سے لے کر دسمبر 2010 تک کے تمام شمارے مناسب قیمت پر منشی محمد عزیز صاحب کو بھیجنے کی مہربانی فرمائیں تو ازحد نوازش ہوگی۔ سرگزشت میں رنگی کی مناسب صورت کیا ہوگی یہ آپ بہتر خود ہی جانتے ہیں۔ شاہد جہانگیر نے بھی خوب تبصرہ فرمایا۔ یہ جان کر انتہائی افسوس ہوا کہ ڈاکٹر وجیہ تبسم کے شوہر علیل ہیں۔ اللہ پاک انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ معروف مصور جناب شاہد حسین کے انتقال پر ملال پر ہم ان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔ نشان حیدر کے حوالے سے ڈاکٹر ساجد صاحب نے آزادی کے متوالوں کو خوب خراج عقیدت پیش کیا۔ پاکستان کے نامور محقق اور شاعر جناب عقیل عباس جعفری کی تحریر تو سب پر بھاری لگی نظر آئی۔ معراج صاحب اسی طرح کی ماہانہ تحریریں جعفری صاحب سے ضرور لکھوایا کریں۔ انجم فاروق ساحلی کی فوجی شہریاں بہت پسند آئی۔ علی الف لیلہ میں آفاقی صاحب نے پاپا جی اے جی جوشی کے حوالے سے نادر معلومات سے بہرہ مند فرمایا۔ گزارش ہے کہ مشہور ستار نواز پنڈت روی شنکر کے حالات اور ان کی لتا منگیشکر سے اختلافات کے حوالے سے ضرور تحریر فرمائیں۔ مسعود جیر صاحب کے حوالے سے شکیب صاحب نے خوب لکھا۔ شکیل ادریس صاحب نے انجلینا جولی کے حوالے سے ایک نادر مضمون تحریر فرما کر ہمیشہ کی طرح علم پسند قارئین سے خوب داد سمیٹی ہے ان سے گزارش ہے کہ مشہور انگریزی اداکار ریچرڈ ولس کے حوالے سے بھی تحریر فرمائیں۔ الوداع بھی سامان دلچسپی لیے ہوئے ہے۔ منظر امام کی نگارش ''الست'' بھی گزشتہ ماہ کی طرح کامیابی کے سفر پر گامزن ہے۔ باقی ابھی تک سچ بیانیاں نہیں پڑھیں اور اب تو صرف خط نمبر کا انتظار ہے اور وہ بھی بہت بے تابی کے ساتھ۔''

اظہر احمد کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''اگست کا شمارہ خلاف معمول 27 جولائی کو مل گیا۔ ٹائٹل تو بہت اچھا ہے۔ اتنی خوب صورت حسینہ کے ہاتھ میں بندوق اچھی نہیں لگی۔ سدرہ وکن پہلے بھی دونوں پر ہم نے تبسم ہی سجا رکھا ہے۔''

فقیر غلام حسین ضیا لکھتے ہیں۔ ''بیت بازی اگست کے شمارہ میں توشین عارف صاحب نے ایک شعر بھیجا ہے جس کا دوسرا مصرعہ ''انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے'' لکھا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آج سے پچاس سال پیشتر بحر طرح مشاعرے میں حافظ مظہر الدین میانوی شاعر نے اپنی غزل پڑھی تھی جس کا مقطع تھا میرے قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے، بلاؤں کی بجائے بلا ذکر اور حافظ صاحب کا ایک شعر میری طرف سے پیش ہے۔

مجھے خود اپنی نگاہوں پہ اعتبار نہیں
میرے قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے

(جسیم بھٹی، لاڑکانہ کا مرسلہ شعر ساغر صدیقی کا ہے اور یہ شعر بہت زیادہ مشہور ہے۔

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے

مریم قیصر لکھتی ہیں۔ ''سرگزشت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس بار اپنی ایک عزیزہ کی آپ بیتی لے کر حاضر ہوئی ہوں امید ہے کہ آپ اسے رسالے میں جگہ دے کر میری حوصلہ افزائی کریں گے۔''

سید محمد حکیم شاہ بخاری نے خان پور کٹورہ سے لکھا ہے۔ ''ایک عرصہ بعد سرگزشت کی محفل میں حاضر ہو رہا ہوں۔ مصروفیات کی وجہ سے دیگر شمارے پڑھنے کا وقت نہیں ملا اس لیے جب اسپتال سے گھر واپس آتا ہوں تو تین چار ماہ کے سرگزشت ایک ساتھ پڑھ لیتا ہوں۔ اس دفعہ میری خوش قسمتی کہ گھر میں میرے رہتے ہی اگست کا شمارہ پہنچا۔ آج بھی سرگزشت پڑھتے ہوئے وہی احساس ہوتا ہے جو آج سے کئی سال پہلے ہوتا تھا۔ یہ وہ واحد رسالہ ہے جو آج تک دنیا کا دیا ہے یعنی بالکل مکمل ہے۔ انکل معراج رسول کا اداریہ دل کو چھو گیا۔ اب تک غزہ کے معصوم شہیدوں کی تعداد 1500 سے تجاوز کر چکی ہے۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کشمیر، فلسطین، چیچنیا، عراق، شام و دیگر ممالک میں مسلمانوں کی نسل کشی کی جارہی ہے۔ دنیا کے نقشے سے ہمارا نشان مختلف ہتھکنڈوں سے مٹایا جارہا ہے لیکن عالم اسلام ابھی تک غفلت میں پڑا ہے...... افسوس صد افسوس۔ مدنی کتب نے یہ تو بتایا تھا کہ راشد منہاس شہادت کے رتبے پر کیسے فائز ہوئے لیکن اس کا اصل سیاق و سباق نشان حیدر میں پڑھا۔ چلو جنرل کبی نے راشد

منصب اس کے لیے نشان حیدر کا اعلان کر کے اپنے دور میں ایک کام تو اچھا کیا۔ واخان غان معلومات بھری تھی۔ دنیا کے کئی ایسے خطے ہیں جہاں کے لوگ باقی دنیا سے کٹ کر رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں جاننے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ آج کل یہ بھی سنا جا رہا ہے کہ شاید پاکستان کو تاجکستان سے بذریعہ سڑک واخان کے ذریعے ملا دیا جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو ہماری معیشت کے ساتھ ساتھ واخان کے قبائل اور تاجکستان کا بھی بھلا ہو جائے گا۔ یوم آزادی کے بارے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کافی عوام جانتی ہے کہ پاکستان 14 اور 15 اگست کی درمیانی شب معرض وجود میں آیا اور اگر قائداعظم نے پاکستان کا یوم آزادی 14 اگست کو منانا منظور کیا تو اس کے پیچھے بھی یقیناً کوئی وجہ ہوگی۔ یہ بھی سنا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح نہیں چاہتے تھے کہ دونوں ملک ایک دن اپنا یوم آزادی منائیں کیونکہ جب تاریخ، جغرافیہ، ثقافت اور مذہب مختلف ہے تو یوم آزادی بھی الگ ہی ہونا چاہیے اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ قائداعظم جیسا بائدبیر، ذہین اور باشعور شخص ضرور ایسا قدم کچھ سوچ کر ہی اٹھائے گا۔ انجلینا جولی واقعی اس ٹائٹل کی حق دار ہیں۔ اکثر اداکار اور اداکارائیں اپنے اپنے دور کے بعد ہی چیریٹی کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں جبکہ انجلینا نے شروع سے ہی اپنی صلاحیتیں اقوام متحدہ کے حوالے کر رکھی ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ پاکستان کے صاحب حیثیت لوگوں کو بھی یہ توفیق دے اور یہاں اس رپورٹ کے حوالے سے ذکر کروں گا جو انجلینا جولی نے پاکستان سے واپسی پر اقوام متحدہ کو پیش کی کہ ایک کروڑ لوگوں کا بھوک سے تڑپنا حکومت پاکستان کے لیے عام بات ہے۔ یہاں ہر سال سیلاب، زلزلے، قحط، خودکش حملوں سے لاکھوں جانیں ضائع ہوتی ہیں اور حکومت پاکستان تماشائی بنی دیکھتی رہتی ہے اور رہی بات ہمارے وزیراعظم کی تو کسی بھی وزیراعظم کو بیرونی دوروں سے فرصت نہیں ملی۔ ملک کے مسائل جائیں بھاڑ میں بس حکومت ڈالر کی قدر کم کر کے خوش ہے۔ اب ہمیں کچھ جاننا چاہیے کہ پاکستان کو پسماندگی کی جانب دھکیلا جا رہا ہے ہر سال ہم آئی ایم ایف سے سود پر قرضہ لیتے ہیں اور اب یہ قرضہ ہماری گردن تک آ چکا ہے لیکن حکمران خدا انہیں عقل، شعور اور غیرت عطا کرے (آمین) امید پرست میں خیالات کو مثبت اور نیک رکھنے کا جو پیغام دیا گیا ہے یہ اصل میں ہمارے مذہب اسلام کا پیغام ہے۔ آج کی نسل کا المیہ یہ ہے کہ جب کوئی بات قرآن و حدیث کی شکل میں بتائی جائے تو کوئی بھی شخص کان دھرنے کی زحمت نہیں کرتا اور اگر وہی بات کوئی انگریز اپنی تقریر، مضمون، کتاب میں لکھ دے یا فلم میں ڈائیلاگ کی شکل میں آ جائے تو لوگ اس کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے ان سب باتوں کا اصل منبع تو خود ہمارا مذہب اور قرآن ہے۔ سچ بیانیاں بھی کمال کی تھیں۔ ایک تصحیح کرنا چاہوں گا کہ صفحہ نمبر 118 پر چاڈ کو لیبیا کا علاقہ بتایا گیا ہے۔ چاڈ خود وسطی افریقا کا ایک مسلمان ملک ہے جو برسوں سے خانہ جنگی کا شکار ہے نہ کہ لیبیا کا علاقہ۔ یہ لیبیا کے جنوب میں ہے۔" (چاڈ اور لیبیا پہلے ایک تھے بعد میں انگریزوں نے ٹکڑے کر کے الگ کیے)

سدرہ بانو ناگوری، کراچی سے لکھتی ہیں۔ "سرگزشت کا شمارہ عید سے چند دن پہلے ملا۔ ساجد حسین کی انتقال کی خبر پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں کہ رنگوں سے خوب صورت شاہکار تخلیق کرنے والا فنکار اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے (آمین)۔ اداریے میں کنیتوں سے بھرپور جملے ہمیں شرمندگی سے دوچار کر گئے۔ اسرائیلیوں نے ایسا طمانچہ مارا ہے جس کی جلن ہم ہر لمحہ اپنے وجود پر محسوس کر سکتے ہیں۔ ٹی وی اسکرین پر غزہ کے مسلمانوں کے سسکتے، بلکتے وجود اور بے یارومددگار لاشے دیکھ کر ہم رو سکتے ہیں کہ ابھی آنسوؤں پر اختیار باقی ہے مگر ہم شاید اور کچھ کرنے کی سکت نہیں رکھتے کہ ہم تو خود بے بس ہیں لیکن ہمارے لبوں سے یہ کپکپاتی صدا ضرور نکلتی ہے کہ تم تنہا نہیں پیاروں ہم ساتھ تمہارے ہیں، چاہے وہ دعاؤں کی صورت ہو یا آنسوؤں کی صورت۔ خدا پاک غزہ کے مسلمانوں پر اپنا رحم فرمائے (آمین)۔ شہر خیال میں رسک وی تو ایاز راہی اپنے خط کے ساتھ پہلے نمبر پر نظر آئے سعید احمد چاند بھی حاضر ہوئے لیکن ان کا تبصرہ پرانے شمارے پر تھا۔ اویس شیخ کی خوب تیک سکے سے آمد اچھی رہی۔ رانا محمد شاہد کا تبصرہ بھی شامل تھا۔ مثنی عزیز بھی آخری وقت میں ہی پہنچ کر شکر ہے کہ خط شائع تو ہو ورنہ ہمیں آپ کی دلچسپ باتوں سے محروم ہونا پڑتا۔ دعاؤں کا شکریہ۔ ڈاکٹر رو بینہ اللہ پاک نفیس صاحب کو صحت دے تاکہ وہ جلد بھلے چنگے ہو جائیں اور آپ ہنستی مسکراتی شہر خیال میں حاضر ہوں۔ شہر خیال کے تمام باسیوں کو ہمارا سلام اس بار ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر نشان حیدر سب سے پہلے پڑھنے کا موقع ملا۔ وطن عزیز کے اس ہونہار سپوت نے جس بہادری سے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنایا وہ اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ہماری دھرتی ماں نے ایسے ایسے گوہر نایاب جنم دیے کہ ہم ان پر جتنا فخر کریں کم ہیں۔ تھی الف لیلہ وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھ نہیں سکے صرف تصاویر دیکھنے پر ہی اکتفا حاصل کیا ہے۔ کاشف زبیر کی سراب تو اب کسی سراب کی طرح ہی لگنے لگی ہے۔ شہر خیال میں بھی اس پر تبصرہ کم ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔ منظر امام کی الگ معلوماتی اور بے حد طویل مگر دلچسپیوں سے بھرپور رہی۔ سچی کہانی آخری راستہ پڑھی۔ یہ نایاب صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ سامنے ظالم اور انا پرست لوگوں میں گھرے رہنے کے باوجود آخری راستہ خوشگوار ثابت ہوا۔ مجیب ابرار احمد نے شاید صحافت سے توبہ کر لی ہوگی کہ بغیر سوچے سمجھے گزر نے والوں کا اپنا ہی افسانہ بنا کرتے ہیں۔ ہمیں خط نمبر کا شدت سے انتظار ہے کہ کب ہمیں بھی خطاکاروں کی خطاؤں کو پڑھنے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔"

محمد عمران جونانی کراچی سے رقمطراز ہیں۔ "محمد ایاز راہی خوب صورت اردو سے مرصع خط کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان تھے دیگر ساتھیوں میں سدرہ بانو، رحیم ریاست، سعید چاند، ملک جاوید سرگانی، رانا محمد شاہد، مثنی عزیز اور شاہد جہانگیر کے تجربہ کار قلم سے نکلے ہوئے شعر پسند آئے۔ ڈاکٹر روبینہ اللہ آپ کے لیے آسانی فرمائے، نفیس بھائی کو مکمل صحت دے۔ آفتاب نصیر احمد توحیدی، رانا سجاد، اعجاز سجاد اور ظاہر و گلزار جیسے اہم نام غیر حاضری کی لسٹ میں ہیں (شکر ! اک کو دنا نہیں یاد دیں) محمد شکیل حیدر دل سے خوش آمدید۔ خوشی ہوئی سرگزشت سے آپ کی پرانی رفاقت کا سن کر۔ بھائی ہندوستان کا سفرنامہ پڑھنے کا شوق ہے تو قرعتی مولائی مرحوم کا دلی دور ہے اور ہندوستان ہمارا پڑھ کر دیکھو دل میں تو

خوب صورت پیرائے میں لکھی۔

محمد جاوید پاشا کا مکتوب خاص لاہور سے گو کہ یہ خط علی سفیان آفاقی کے نام ہے مگر انہیں بھیجنے کا وقت نہیں اس لیے شامل اشاعت کر لیا۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”میرا تعلق ادبی، علمی اور فلمی دنیا سے ہے۔ میں مرحوم ناظم پانی پتی کا بیٹا ہوں اور ولی صاحب کا بھتیجا ہوں۔ فلمی الف لیلہ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں مگر میں نے آپ کی تحریروں میں ناظم پانی پتی، ان کے بڑے بھائی ولی صاحب اور بھائی ممتاز شانتی کا ذکر کبھی نہیں پڑھا یا شاید میری نظروں سے نہیں گزرا۔ آپ یقین جانیے جو خدمات میرے والد اور تایا مرحوم کی برصغیر کی فلمی دنیا میں ہے یہ آپ کے علم میں بھی ہوگا کہ لتا منگیشکر نے اپنا پہلا اردو فلمی نغمہ ناظم صاحب کا لکھا گایا تھا جو 1948ء میں ریلیز ہونے والی فلم مجبور کا تھا۔ گانے کے بول تھے ”دل میرا توڑا مجھے کہیں کا نہ چھوڑا..... تیرے پیار نے۔“ میرے پاس ان کی اس دور کی تصاویر اور اخبار کے تراشے محفوظ ہیں اس کے علاوہ ولی صاحب کے بیٹے ظفر اقبال باحیات ہیں۔ ان سے معلوم کر کے میں ولی صاحب پر بھی معلومات ارسال کر سکتا ہوں جو آپ ان کی فلموں گڈی گڈا، سوتی کماری اور لکشمی کے حوالے سے بھی لکھ سکتے ہیں ان کے یادگار گیت، نظمیں اور نعت۔ ”آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبی سے“ اچھن ٹل پیار کرن دا جیا ای خواب نتیجہ ہوندا مجھی رسیاں شہر لاہور دیا، بابل دا ویہڑا چھڈ کے ویران توں دور چلی، آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ میں خود بھی روزنامہ پاکستان میں کالم نگاری، فراغت کے وقت میں مضمون نگاری اور اکثر بڑی روزنامے دی نیوز میں مضامین لکھتا ہوں۔“

اعجاز حسین صفدر، نور پور تھل خوشاب سے رقم طراز ہیں۔ ”یکم رمضان، 30 جون کو میں اپنے میڈیکل چیک اپ کے لیے راولپنڈی روانہ ہوا لیکن ایک دن پہلے تبصرہ مکمل کر کے کوریئر سروس کے حوالے کر چکا تھا جن کا دعویٰ ہے کہ ملک کے کسی بھی کونے میں ڈاک دو دن کے اندر پہنچا دیتے ہیں اب میں کیسے مان لوں کہ تبصرہ لیٹ پہنچا ہوگا (اگر تبصرہ بروقت پہنچتا تو لگ ہی جاتا) ہم بڑھاپے کو نہ چاہتے ہوئے بھی گلے لگا چکے ہیں۔ گھٹنے گوڈے ہمارا وزن سہنے سے کب کے انکاری ہو چکے ہیں، کبھی کمر کی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کبھی بلڈ پریشر کا مسئلہ مستقل ہمارے ساتھ چل رہا ہے اور اب تو دو سال سے آنکھوں کی بیماری آنکھ مچولی کھیل رہی ہے اب خود ہی سوچیے انصاف کیجیے کہ کیسے مشکل حالات میں لکھتے ہیں لیکن دیر سے پہنچنے والے خطوط میں اپنا نام دیکھ کر دل بجھ جاتا ہے۔ ہم نے سرگزشت کا دامن پکڑا ہے ہم ساتھ چھوڑنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ (شائقین سرگزشت کی یہی تو پہچان ہے) نشان حیدر محرم و ہمت، شجاعت اور جاں نثاری کی بے مثال کہانی ہے۔ اللہ نے شروع سے ہی اس کام کے لیے انہیں چن لیا تھا انہوں نے عظیم معرکہ سر انجام دے کر خود کو تاریخ کا حصہ بنا دیا لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج ہمارے نوجوانوں کی کیا مصروفیات ہیں سوچیے۔ فلمی الف لیلہ میں موضوعات کی کمی نہیں ہے کافی دلچسپ معلومات ملیں لیکن لوگ داستانوں کو محض روایتی انداز میں بیان کیا گیا ہے صحت و تندرستی کے ساتھ آفاقی بھائی کی طویل عمری کی دعا کرتا رہتا ہوں وہ کیسی پرانی باتیں سنا کر بوریت سے بچائے رکھتے ہیں۔ اب وقت کی بچت کرتے ہوئے سچ بیانوں کی طرف آتے ہیں۔ آخری راستہ میں رباب جن مشکلات سے گزری ہے وہ عمر بھر یادوں میں یاد رکھے گی۔ قبائلی روایات، ہٹ دھرمی اور ضد میں کیے جانے والے فیصلوں کی بازگشت اکثر پڑھنے اور سننے میں آتی رہتی ہے۔ دعا ہے کہ کوئی بھی طاقت ان کے ذہن بدل کر رحم اور احترام انسانیت کا جذبہ ڈال دے۔ آمین۔ مرد نادان پڑھ کر شرم سے سر جھک گیا ہے والدین کی یہ کوشش ہوتی ہے جن محرومیوں سے ان کا واسطہ رہا ہے اب اپنے وسائل کے مطابق اولاد کو آسائشیں فراہم کی جائیں لیکن کیا خبر کہ وہ انہیں بگڑنے میں مدد فراہم کر رہے ہیں بگڑا ایسی بے حیائی کہ چودہ سال کا بچہ بھی وہ مناظر برداشت نہ کر سکا۔ اپنی تباہی کا سامان خود کیا جا رہا ہے تو کس سے گلہ کیا جائے اس تحریر کو آخری تنبیہ جانتے ہوئے سنبھلنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ مجبور اور راز داں اچھا دلچسپ اور منہ کا ذائقہ بدلنے والی کہانیاں ہیں۔ علاج واقعی لاجواب علاج ثابت ہوا لیکن ڈاکٹر کو چاہیے کہ ایسی صورت میں مریض کے کسی قریبی عزیز کو راز دار بنا لے۔ کوئی لڑکی زیادہ سر پھری نکلے اور اپنے بھائی یا دوسرے رشتے دار کی مدد مانگ لے ایسے میں ڈاکٹر کی ذات کو اچانک نقصان بھی پہنچ سکتا ہے کیونکہ وہ تو ایسے بہانوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ چھوٹا آدمی میں اگر رائٹر کی بات کو جذبات سے ہٹ کر حقیقت کی نظر سے دیکھیں تو صحیح لگیں گی چھوٹے آدمی کو کون یہ حیثیت دیتا ہے۔ چچا رستم حیرت انگیز اور چونکا دینے والے واقعات ہیں۔ چھوٹے شاہ صاحب کی ہمت، منصوبہ بندی اور بہادری کو جتنا سراہا جائے کم ہے کیونکہ معمول کی زندگی، آرام آسائش کو کوئی دیوانہ ہی ٹھوکر مار سکتا ہے انہیں اپنی دھرتی کی محبت اور وطن پرستی نے یہ مقام عطا کیا کہ اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کو ٹھکانے لگا کر جنت کا ٹکٹ جیت لیا ہے۔ بازیگر پڑھ کر ہمدردی کے جذبات ماند پڑ گئے ہیں بھلا کس کا اعتبار کیا جائے۔ بے شک اور بے اختیاری میں مستحق افراد کا حق بھی مارا جاتا ہے۔ جن دوستوں نے ہمارے تبصرے کو سراہا ہے۔ میں خلوص دل سے شکر گزار ہوں۔ شاہد حسین میرے ساتھی تھے ان کے لیے سورۃ فاتحہ اور تین بار قل شریف پڑھ کر بخشش کی دعا کی ہے۔“

لیاقت علی کولا، لاہور سے متصل ای میل۔ ”عید کی چھٹیوں کا سوچ کر دم نکل رہا تھا کہ کیسے گزریں گی لیکن جب بک اسٹال والے کا فون آیا کہ سرگزشت آ گیا ہے تو اطمینان ہوا۔ اداریے میں معراج رسول کا جھنجھوڑنے اور آنکھوں میں آنسو لا دینے والا تبصرہ انتہائی دکھ کے ساتھ پڑھا۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے امت مسلمہ کے لیے کہ بغیر کسی وجہ سے ہمارے مسلمان بھائیوں کو شہید کیا جا رہا ہے لیکن مسلمان ممالک کی بے حسی کہ کوئی بول نہیں رہا۔ بک شیلف میں مصر کے ادب کا نمایاں نام ابراہیم حفیظ کے بارے میں پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ شہر

خیال میں پہنچے تو مانسہرا کے محمد اعجاز رازی کو مسند پر براجمان پایا باقی سب دوستوں کے مشورے اچھے تھے خدا سے دعا ہے کہ نفیس صاحب کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ جناب شاہد صاحب کی وفات کا سنا تو بہت افسوس ہوا خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے (آمین)۔ اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف آخری راستہ پڑھ کر یقین نہیں ہوتا کہ لوگ اب تک ذات برادری میں پڑے ہوئے ہیں اس کا انجام اچھا ہوا مردہ دم میں تیسری کی حماقت پر افسوس ہوا یہ عادت یقیناً برا انجام لے کر آتی ہے۔ مجبور اور راز داں کچھ خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ چھپا رستم اور بازی گر بھی اچھی تھیں اس میں ہمارے معاشرے کی تصویر اجاگر ہوتی ہے لیکن نفس پرست کی سچ بیانی نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ کہانی ڈگنہ کی ہے۔ میں سرگزشت کا خاموش قاری ہوں بہت عرصے سے چونکہ بہت سال پہلے یہ واقعات شائع ہوتے تھے اور کافی حد تک لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو چکے ہیں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دوبارہ انہیں ایک ایک کر کے شائع کیے جائیں یقین کریں یہ جتنی بار بھی پڑھیں بور نہیں ہوں گے میری اس التماس پر غور کیجیے گا اجازت چاہوں گا، اللہ حافظ!"

منشی محمد عزیز میمن، لندن سے لکھتے ہیں۔ "عرض یہ ہے کہ میں نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے، وجہ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے یہودیوں کے مظالم کا پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے اور میں اپنے آپ سے الجھنے لگتا ہوں، بزدل آدمی ہوں ناں سو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لی ہیں اور ایسا شاید صرف مجھ اکیلے کے ساتھ نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کی یہی صورت حال ہے، نہ جانے کب بیدار ہوگی امت مسلمہ؟ اداریے میں انکل محترم معراج رسول صاحب نے بھی اسی موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ ایک تھی سرگزشت میں مصر کے ہر دل عزیز شاعر حافظ ابراہیم کی داستان پڑھ لی۔ شہر خیال کو دیکھ کر پتا چلا کہ عید کی وجہ سے سرگزشت کو مقررہ وقت سے پہلے مارکیٹ میں لانے کے لیے بہت سے باقاعدہ شرکت کرنے والے دوست تفصیل سے باہر ہی کھڑے رہ گئے جن میں خصوصاً آفتاب احمد نفیس اشرفی، راجا سجاد، اعجاز حسین سحار، طاہر گلزار اور راجا شاہد وغیرہ شامل ہیں۔ (اندازہ درست ہے) شاہد حسین کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر عطا فرمائے (آمین) سب سے پہلے تو محمد اعجاز رازی کو ایک دو کے لیے صدارت کی کرسی نصیب ہونے پر مبارک باد۔ تبصرہ مختصر لیکن زبردست تھا۔ مدد و باخود کوری او وعلیکم السلام۔ محمد شکیل جیدوا، بیگم۔ آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ آپ تقریباً میرے ہم عمر ہیں۔ بشیر فاضل، اگر آپ کہیں تو جوائنٹ کی فوٹو کاپی کروا کر ادارے کی معرفت آپ کو بھیج دوں؟ نفس شعور از بے مت اور روشن پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے کہانی بھیج دیں ہاں البتہ فوٹو کاپی ضرور اپنے پاس رکھ لیجیے گا۔ اب دیکھیں میری تحریر مسترد ہوئی ہے لیکن میں نے پھر بھی حوصلہ نہیں ہارا۔ ہاں البتہ یہ سرگزشت ہے اور اس میں عام چیز نہیں چلتی کوئی خاص منفرد اور اچھوتی تحریر ہونی چاہیے۔ یوم آزادی، نبیل عباس جعفری کی تحقیقی اور معلوماتی تحریر تھی جسے پڑھ کر دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم اپنا جشن آزادی چودہ کی بجائے پندرہ اگست کو کیوں مناتے ہیں۔ خونی تیرتھوں میں انجم فاروق ساحلی ہمیں خونی تیرتھوں سے ملوا رہے تھے۔ لیف لیٹ میں شوکت رحمان خٹک کا خط بہت ہی معلوماتی تھا خصوصاً رسول کریمؐ کے حالات زندگی کا جس طرح سے انہوں نے احاطہ کیا ہے وہ یقیناً صرف انہی کا کام ہے۔ مدر ٹریسا دوم میں یقیناً انجلینا اس لقب کی مستحق ہے کہ وہ کس طرح سے یتیم بچوں کی پرورش کر رہی ہے یہ یقیناً بہت بڑی نیکی ہے۔ امید پرست کو اس ماہ کی بہترین تحریر کہا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ذریعے کرشمے کا سہارا اور ونڈا کی کتاب سے ہزاروں بلکہ لاکھوں مایوس افراد زندگی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ کیا یہ کتاب اردو ترجمے کے ساتھ دستیاب ہے؟ اگر ہاں تو کہاں سے ملے گی؟ لونڈا کے ابتدائی حالات زندگی کا پڑھ کر دل بہت رنجیدہ ہو گیا تھا۔ الوداع میں ابھی تک تو سفر جاری ہے "جا نالاؤنی آ" کی اصطلاح کا پڑھ کر بہت ہنسا۔ اگست کے لیے حضرت امام شیخ مبارک باد کے مستحق ہیں اور اسی طرح رفعت کے حوالے سے دلچسپ معلومات میں بھی آپ کو بھیج چکا ہوں۔ ان کا کیا بنا؟ (کوئی بھی مضمون اس وقت تک سلیکٹ نہیں ہوتا جب تک مکمل اور بھرپور نہیں سمجھا جاتا) الوداع ابھی جاری ہے لیکن ذہن میں نمبر کی وجہ سے اسے روک لیا گیا ہے) مہرابہ کے لیے کاشف صاحب سے معذرت، مقابلہ بیت بازی میں افتخار حسین، پروین اختر، مرزا ابرار بیگ اور غالب حسین ظفر کا انتخاب پسند آیا۔ شمی آرٹ میں اس مرتبہ ذرا سختی لگ رہی ہے۔ خیر معافی کرتی لیں گے جواب اس کا آخر میں آپ سے گزارش کہ میرے بھیجے ہوئے اقتباسات کا کیا بنا؟ شکریہ!"

سید عدنان ذاکر علی، کراچی سے لکھتے ہیں۔ "اگست کا شمارہ عید سے پہلے ملنے کی وجہ سے عید کا مزہ دوبالا ہوا۔ آپ کے سارے اسٹاف کو بھی عید کی خوشیاں مبارک۔ پاکستان آفیسر راشد منہاس کی سرگزشت اچھی لگی۔ حسن رزاقی صاحب کا سفرنامہ الوداع بہت اچھا جا رہا ہے۔ سرابت میں ایک زندہ دل کردار گم ہو گیا یعنی عبید مظہر امام صاحب کی اگست میں لیڈی ڈیانا کی وفات کا کوئی ذکر نہیں ہے جو 31 اگست 1997ء کو ہلاک ہوئی تھیں۔ ستمبر 2012ء کے شمارے میں میرا مضمون شائع ہوا تھا 'سفیر موسیقی' جو موسیقار اے آر رحمان کے حالات پر مبنی تھا شکریہ۔"

نزاہت افشاں، تحصیل فتح جنگ، ضلع اٹک کا خط۔ "پورا شمارہ ویلڈن مثل آپ تھا کہانیاں بہت بہترین تھیں۔ باقی طاہر گلزار اور ... پشاور رسالہ میں آپ کا جاندار خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کو نہ صرف بہن تسلیم کرتا ہوں بلکہ آپ کا ادب و احترام بھی کرتا ہوں۔ باقی تمام قارئین کی بھی رائے پڑھنے کو ملی ہیں۔ آپ سے شکایت کنندہ ہیں کہ خطوط کے لیے صفحات کم ہیں۔ باقی انکل جی میں ایک

اسکول ٹیچر اور شاعر ہوں۔ اپنی اسٹوری بھیج رہا ہوں پلیز ضرور شائع کیجئے گا۔ دیگر نے اب تک میر، غالب، آتش، میر درد، بہادر شاہ ظفر، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، اقبال، فیض، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، ابن انشاء، منیر نیازی، محسن نقوی، فراز، ادا جعفری کو پڑھا ہے ابھی اور پڑھوں گا۔ آخر میں پھر آپ کی کاوشوں کو سلام کہ آپ اتنا معیاری شمارہ شائع کر رہے ہیں۔ میری اسٹوری کے بارے میں ضرور بتایئے گا کہ کب تک شائع ہوگی۔ دل کی گہرائیوں سے آپ کو عید مبارک (پڑھنے کے بعد بتا سکوں)۔

سید انور عباس شاہ کا دریا خان بھکر سے تبصرہ۔ ''اگست 2014 کا شمارہ 25 جولائی کو مل گیا تھا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے عید کی تعطیلات کو مدنظر رکھتے ہوئے شمارہ وقت سے پہلے نکال دیا۔ معروف مصور شاہد حسین کی وفات کا پڑھ کر دل بہت افسردہ ہوا۔ خداوند کریم ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین ثم آمین) شہر خیال میں نظر دوڑائی تو اس میں خط تو در کنار بلیک لسٹ میں بھی ہمارا نام شامل نہ تھا حالانکہ خط تو میں نے 2 جولائی کو پوسٹ کر دیا تھا۔ پھر بھی خط آپ تک نہ پہنچ سکا۔ حسب معمول تمام بہن بھائیوں کے خطوط شاندار تھے۔ محمد ایاز راہی کرسی صدارت پر بیٹھے بہت بھلے لگے خوب پیاری باتیں تھیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ امتیاز حسین اور اشفاق سید مختصر تبصرے کے ساتھ شہر خیال کی زینت بنے۔ محمد شکیل حیدر اور عظمیٰ شکور شہر خیال میں پہلی بار شرکت کرنے پر خوش آمدید امید ہے آئندہ بھی اسی طرح جلوہ افروز ہوتے رہیں گے۔ عظمیٰ صاحبہ ہمت کریں کہانی لکھ کر بھیجیں آگے اللہ مالک ہے لیکن کہانی سو فیصد حقیقت پر مبنی اور سرگزشت کے معیار کی ہونی چاہیے۔ قیصر عباس خان آپ نے جس مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے یہ مسئلہ دن بدن گمبھیر ہوتا جا رہا ہے بلکہ آئندہ تو اور زیادہ ہوتا جائے گا۔ اس کو روکنا اب بہت مشکل ہے کیونکہ ہم بہت دور نکل چکے ہیں ہاں البتہ اس کا تھوڑا سا حل یہ ہے جیسا کہ کچھ عرصہ قبل معراج رسول صاحب نے اپنے اداریے میں تحریر کیا تھا کہ اگر ہم کسی مسئلے کا حل اجتماعی طور پر نہیں کر سکتے تو کم از کم انفرادی طور پر تو کر سکتے ہیں۔ یہ بھی اسی طرح ہے سب سے پہلے ہم اپنے آپ کو ٹھیک کریں اس کے بعد اپنے اپنے گھروں پر کڑی نظر رکھیں۔ موبائل فون کا غلط استعمال ہو رہا ہو تو اسے اپنے اختیار کر لیں۔ غلط تصاویر ہو تو ڈیلیٹ کروا دیں۔ خدا بہ سفیان بہن بھائی کی عزت محفوظ رکھے۔ وحید ریاست بھٹی، ارمس شیخ، سعید احمد چاند، حکیم سید محمد رضا شاہ، ملک جاوید محمد خان سرکانی، منشی محمد عزیز کے شاندار خطوط بہت ہی پسند آئے۔ ڈاکٹر راحیلہ قیس کے لیے ہم صدق دل سے دعا گو ہیں کہ خداوند کریم قیس صاحب کو صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین)۔ ان کی غیر حاضری جو کہ ایک طویل عرصے پر محیط تھی اس کی وجہ اب سمجھ میں آگئی ہے۔ شاید جہانگیر صاحب کا خط حالانکہ آخر میں چھپا تھا لیکن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دکھا کر سب پر نمایاں تھا۔ فلمی دنیا میں انقلاب برپا کر دینے والی آواز احمد رشدی کے بارے میں مضمون بہت ہی پسند آیا۔ آفاقی صاحب کا بے حد شکریہ۔ مگر اس مضمون میں بھی آپ سے ایک خطا ہوگئی وہ یہ کہ ان کی تصاویر کے اوپر آپ نے گلوکار سہیل رعنا اور احمد رشدی لکھ دیا جبکہ سہیل رعنا تو موسیقار تھے۔ (گلوکاری بھی کی ہے) احمد رشدی حیدرآباد دکن کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے وہ آٹھ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے ان کا پورا نام سید احمد رشدی تھا اور ان کے والد پروفیسر حافظ منظور احمد مسلمانوں کی تنظیم ورکنگ کمیٹی سے منسلک تھے۔ احمد رشدی جب پیدا ہوئے تھے تو ان کے والد نے انہیں گود میں اٹھا کر کہا تھا کہ اس بچے کو میں حافظ بناؤں گا مگر بدقسمتی سے جب احمد رشدی تین سال کے ہوئے تو ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے احمد رشدی حافظ تو نہ بن سکے البتہ گلوکار ضرور بن گئے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ حمد و نعت کی محفلوں میں منعقدہ تقریب میں حصہ لینے لگے۔ اپنی سریلی اور میٹھی آواز کی بدولت جلد ہی انہوں نے اپنا مقام بنالیا۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی چلے آئے اور ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں حصہ لینے لگے۔ چونکہ اس وقت کم عمر تھے لہٰذا انہیں بچوں کے پروگراموں میں پیش کیا جاتا۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہونے والا نغمہ بندر روڈ سے کیماڑی ان کی مقبولیت کا سبب بنا۔ بعد میں وہ فلموں کے لیے بھی گلوکاری کرنے لگے۔ ان کی ابتدائی فلمیں چھمن اور مہتاب تھیں جن میں انہوں نے گول گپے والا آیا جیسے مقبول گیت گا کر شہرت کی بلندی پر سفر کرنا شروع کیا۔ احمد رشدی نے چند ایک فلموں میں اداکاری بھی کی تھی جیسے فلم ''لاکھوں میں ایک'' میں انہوں نے ایک مزاحیہ کردار ادا کیا تھا۔ 11 اپریل 1983 بروز پیر رات تقریباً دس بجے انہیں دل کا تیسرا اور آخری دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ دورے کے وقت موجود ڈاکٹر نے احمد رشدی کی حالت کو محسوس کر لیا اور اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ ان کو اسپتال لے جانے کے لیے کئی مقامات پر ایمبولینس کے لیے فون کیے گئے لیکن ایمبولینس دستیاب نہ ہو سکی۔ اس طرح وہ طبی امداد ملنے سے قبل ہی دس بج کر پانچ منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اپنی آواز کا جادو جگانے والے خالق حقیقی سے جا ملے اور شام چار بجے سخی حسن قبرستان میں سپرد خاک کر دیے گئے۔ انہوں نے اپنے پسماندگان میں ایک بیوہ اور تین بیٹیاں سوگوار چھوڑی تھیں آہ احمد رشدی۔

دیر سے موصول ہونے والے خطوط:

طاہرہ گلزار، پشاور۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ۔ عظمیٰ شکور، سرگودھا۔ اعجاز حسین لدھیانہ، خانیوال۔ اعجاز خلیل اعوان، لاہور۔ آصف علی نجم، لاہور۔ نیاز کھوکھر، شادی پور۔ ملک تہمینہ سلطان، شیخوپورہ۔ عباس علی بٹ، سیالکوٹ۔ قادر عباسی، سرگودھا۔ نیاز حسین جعفری، میرپور آزاد کشمیر۔ ایاز علی، فورٹ عباس۔ نیلم ملکانی، سانگھڑ۔ شیخ حمزہ وسیم، ملتان۔ ظہیر خیال، شارجہ یو اے ای۔

شخصیت

خطائے اوّل

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ اولین خطا جس کی گونج ہر آسمانی کتاب میں ملتی ہے

پھول سے دن، مہتابی راتیں، جنت کے ایام حسین، سب کچھ ایک پل میں خواب ہونے اور حضرت انسان کا مقدر گردش دہر ٹھہرا۔ صرف اس لیے کہ عقل نے دھوکا کھایا، شیطان کی چال نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس اولین خطا ہی کی وجہ سے خیال قوی ہے کہ حضرت آدمؑ اماں حواؑ کے بہکاوے میں آکر خطا کار ٹھہرے اور جنت بدر قرار پائے۔ لیکن تحقیق کچھ اور کہتی ہے۔ کیا واقعی حضرت آدمؑ کی خطا نے انہیں کرۂ ارض پر لا پھینکا ہے یا کچھ اور بات ہے۔ اسی نکتے کے گرد گردش کرتی تحقیقی تحریر۔

حدیث قدسی ہے ”میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق پیدا کی۔“

دنیا کے تمام مذاہب کا کہنا ہے کہ خالق کائنات نے انسان اول کو آدمی کی شکل میں پیدا کیا۔ لفظ آدم کے لفظی معنی مٹی سے بنا ہوا، بھورا، خیالہ، گندمی اور ابوالبشر کے ہیں۔ بعض اصحاب اللغت کے نزدیک یہ لفظ عربی ہے اور بعض کے نزدیک عجمی ہے۔ بعض کے نزدیک اس لفظ کا مادہ آدمت اور بعض کے نزدیک ”ادیم“ ہے۔ سنسکرت میں

"آدم" مٹی کا مخفف ہے اور ایک تفسیر کے مطابق لفظ آدم کی اصل بنی آدم ہے جسے بنظر تخفیف آدم کہا جانے لگا۔

آدم و حوا کے الفاظ دراصل تورات کی وساطت سے انگریزی اور دوسری زبانوں تک پہنچے۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق عبرانی زبان میں بھی لفظ آدم، انسانی کے ہم معنی ہے جبکہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق عبرانی کے علاوہ فلعی اور سبائی زبانوں میں بھی لفظ آدم بمعنی آدمی، جنس اور بشر آیا ہے۔ کسی فن کے موجد یا مورث اعلیٰ کو بھی آدم کہا جاتا ہے۔

قرآن عزیز میں حضرت آدم علیہ السلام کا نام 55 مرتبہ پچیس آیات میں آیا ہے۔

نظریہ ارتقا کے بانیوں کا یہ کہنا ہے کہ انسان اپنی ابتدائی تخلیق و تکوین ہی سے انسان پیدا نہیں ہوا بلکہ کائنات ہست و بود میں اس نے بہت سے مدارج طے کر کے موجودہ انسانی شکل حاصل کی ہے۔

مذہب یہ کہتا ہے کہ خالق کائنات نے انسان اول کو آدم کی شکل ہی میں پیدا کیا اور پھر اس کی طرح ایک ہم جنس مخلوق حوا علیہ السلام کو وجود دے کر کائنات ارضی پر نسل انسانی کا سلسلہ قائم کیا اور یہی وہ انسان ہے جس کو خالق کائنات نے عام مخلوق پر برتری اور بزرگی عطا فرمائی اور امانت الٰہی کا بارگراں اس کے سپرد فرمایا اور کل کائنات کو اس کے سپرد کر کے خلافت و نیابت الٰہی کا شرف اس کو بخشا۔

غرض کسی طویل بحث میں جائے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ انسان اول خواہ نظریہ ارتقا کے مطابق درجہ بہ درجہ انسانی شکل تک پہنچا ہو یا ابتدا ہی سے انسانی شکل میں وجود پذیر ہوا ہو علم اور مذہب دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ انسان ہی اس کائنات کی سب سے بہتر مخلوق ہے، بہ اعتبار حسن بھی اور بہ اعتبار عقل بھی۔

"بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین صورت میں بنایا۔"

"بلاشبہ ہم نے نسل آدم کو تمام کائنات پر بزرگی اور برتری بخشی۔"

اسلامی مورخین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ دور آدم سے پہلے زمین پر ایک قسم کی مادی اور خونریز مخلوق موجود تھی جو ہر وقت زمین پر فساد برپا کیے رہتی تھی۔ قرآن پاک اس مخلوق کو "جن" قرار دیتا ہے اور مفسرین کا ایک گروہ حضرت آدم کو اسی مخلوق کا خلیفہ قرار دیتا ہے یعنی ماقبل مخلوق کا جانشین یا ان کے بعد آنے والا۔

"جنوں" کی خوں ریزی کو روکنے کے لیے فرشتوں کو بھیجا گیا۔ فرشتوں کے اس لشکر نے اس مخلوق کو مار مار کر سمندروں، جزیروں اور ویرانوں کی طرف دھکیل دیا۔ ابلیس بھی ان جنوں میں سے تھا جسے گرفتار کرلیا گیا۔ پھر یہ آسمانوں میں فرشتوں کے ساتھ رہنے لگا۔ حضرت آدم کی تخلیق کے وقت یہ آسمان پر موجود تھا۔

زمین کا سینہ سپاٹ پڑا تھا۔ چہل قدمی کی کوئی آواز نہیں تھی۔ قدموں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ راتیں بے چراغ، دن ہر وجود سے خالی تھے۔ تب خالق کائنات نے چاہا وہ ایک اور مخلوق پیدا کرے جو اس کا نائب بھی ہو اور اس کے خالق ہونے کی گواہی بھی دے۔ اس سے پہلے وہ زمین و آسمان تخلیق کر چکا تھا مگر کوئی گواہی دینے والا بھی تو ہو۔ کوئی اس کا شکر گزار بھی تو ہو۔ کوئی اس کا احسان مند بھی تو ہو۔

آسمان کے سناٹوں میں جلال خداوندی کی آواز گونجی۔ فرشتے سجدے میں گر گئے اور حکم الٰہی کی طرف کان لگا دیے۔

"میں عنقریب، کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو بشر کہلائے گی اور زمین میں ہماری خلافت کا شرف حاصل کرے گی۔ یہ تمام مخلوقات میں برتر ہوگی۔"

اس اعلان کا فی الوقت وہی اثر ہوا جو ہونا تھا۔ فرشتوں کی جماعت ورطہ حیرت میں ڈوب گئی۔ یہ کیسا اعلان ہے۔ یہ کیسی مخلوق ہوگی جو وجود میں آنے والی ہے۔ ان کے دلوں میں خدشات تھے لیکن حکم الٰہی سے سرتابی کی مجال نہیں تھی بلکہ اس حکم کے خلاف سوچنا بھی راندۂ درگاہ ہو جانا تھا۔

چاند کا چراغ روشن ہو گیا تھا۔ ستاروں کی قندیلیں جل اٹھی تھیں۔ دن چھپ گیا تھا رات آ گئی تھی کہ ابلیس، فرشتوں کی ایک جماعت کے قریب آیا اور ان سے لگ کر بیٹھ گیا۔

"تم نے سنا اب کیا ہونے والا ہے۔"

"جو تم نے سنا وہی ہم نے بھی سنا" فرشتوں نے کہا۔

"اب مٹی جیسی ناکارہ چیز سے بھی مخلوق پیدا کی جائے گی اور اسے برتر بھی کہا جائے گا۔"

"رب کائنات جو چاہے کرے۔"

"اے فرشتو! کیا تمہیں یہ عجیب نہیں لگتا کہ تم "نور" سے بنائے گئے اور میں آگ سے اور وہ ہم سب سے برتر ہوگا۔ میری تو خیر کوئی حقیقت نہیں لیکن وہ تو تم سے بھی برتر ہوگا۔ تمہیں چاہیے کہ تم احتجاج کرو۔"

"اے ابلیس! تو یہ کیا سوچ بیٹھا ہے۔ مخلوق بھی خالق سے احتجاج کرسکتی ہے؟"

"چلو احتجاج نہ کرو، بارگاہ خداوندی میں پہنچ کر پوچھا تو جاسکتا ہے کہ وہ ہماری حق تلفی کیوں کر رہا ہے۔ ہم دن رات اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے؟"

"تو ضرور ہمیں اللہ رب العزت کی نظروں سے گرا کر چھوڑے گا۔ ایسی باتیں کیوں کرتا ہے۔"

"میرا علم مجھے بتا رہا ہے کہ یہ بھی پچھلی مخلوق کی طرح فساد برپا کرتا رہے گا۔"

"تجھ سے بہتر وہ جانتا ہے جو اسے بنا رہا ہے۔"

"میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔ اب تم نہیں سمجھتے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔" ابلیس نے کہا اور ان کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ فرشتوں کو اپنا ہم خیال بنالے لیکن اس کی ایک نہ چلی البتہ اس نے اپنے لیے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

آدم کا خمیر مٹی سے گوندھا گیا اور ایسی مٹی سے گوندھا گیا جو جنت کی تبدیلی قبول کرنے والی تھی۔ جب یہ مٹی پختہ ٹھیکرے کی طرح آواز دینے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس جسد خاکی میں روح پھونکی اور وہ گوشت پوست، ہڈی، پٹھے کا زندہ انسان بن گیا اور ارادہ، شعور، عقل اور وجدانی جذبات کا حامل نظر آنے لگا۔

اس موقع پر فرشتوں کو وہ باتیں یاد آگئیں جو ابلیس ان سے کر چکا تھا۔ ابلیس نے بھی آنکھوں آنکھوں میں اشارے کیے کہ یہی موقع ہے۔ جو اعتراضات میں نے اٹھائے تھے ان کا اظہار کردو۔ فرشتوں نے حقیقت حال کی دریافت کے لیے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔

"اگر اس ہستی کی پیدائش میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ یہ دن رات تیری تسبیح و تقدیس میں مصروف رہے تو اس کے لیے ہم حاضر ہیں بلکہ کرنے ہی رہتے ہیں۔ تیرا ہر حکم بجالاتے رہے ہیں جبکہ اس "خاکی" سے ہمیں نافرمانی اور فتنہ و فساد کی بو آتی ہے۔ یہ تو تیری زمین میں فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ تیرا یہ فیصلہ آخر کس حکمت پر مبنی ہے۔"

خالق کائنات جانتا تھا کہ یہ بغاوت نہیں بلکہ فرشتے ناواقف ہیں اور واقفیت چاہتے ہیں۔ نہایت نرمی سے فرمایا گیا۔

"مخلوق کو خالق کے معاملات میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ تم تو حقیقت حال کے اظہار سے پہلے ہی شک و شبہ میں مبتلا ہوگئے حالانکہ تمہیں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ میں نے جو کچھ کہا اس کے پیچھے کوئی حکمت ضرور ہوگی۔

"اور جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی و قدوسی کا اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میری نظر جس حقیقت پر ہے تمہیں اس کی خبر نہیں۔" (البقرہ)

اللہ کو سب معلوم تھا کہ ابلیس نے کچھ ایسی باتیں کردی ہیں کہ فرشتے تخلیق آدم کی طرف سے فکرمند ہوگئے ہیں لہٰذا اچھا ہے کہ اس حکمت کا راز ان پر کھل جائے جو کہ ان پر عظمت آدم کی برتری کا راز ظاہر ہوجائے اور یہ عملی مظاہرہ اس طرح ہو کہ ابلیس بھی اسے اچھی طرح دیکھ لے اور وہ جس غلطی کا مرتکب ہونے کا ارادہ کر رہا ہے اس سے باز آجائے۔

اللہ تعالیٰ نے اس عملی مظاہرے کے لیے اپنی سب سے عظیم صفت "علم" سے نواز دیا۔ اس کے لیے کیا مشکل تھا۔ اس نے کہا ہوجا اور وہ ہوگئی۔ حضرت آدمؑ علم اشیا اشیا سے باخبر ہوگئے۔ اس وقت جس قدر اشیا عالم کائنات میں موجود تھیں حضرت آدمؑ اوان سب کے نام بتا دیے گئے پھر ان اشیا کا مظاہرہ فرشتوں کے سامنے کیا اور ان سے پوچھا۔

"بھلا بتاؤ تو سہی ان اشیا کے بارے میں تم کیا علم رکھتے ہو۔"

"ہم ان چیزوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے کیونکہ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں بتا رکھا ہے۔"

"بس تو پھر اس لاعلمی پر آدم کی برتری پر شک کر رہے تھے۔"

"ہماری کیا مجال کہ ہم شک کریں۔ ہم تو اپنے یقین کو پختہ کر رہے تھے۔"

اللہ تعالیٰ نے ان اشیا کا مشاہدہ کرایا اور آدم نے ان سب کے نام بتا دیے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان اسما سے انہیں باخبر کردیا تھا۔

"جب فرشتوں نے اپنے عجز کا اعتراف کرلیا تو حکم الٰہی ہوا، اے آدمؑ! تم فرشتوں کو ان کے نام بتلا دو۔ جب آدم نے بتلا دیے تو اللہ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں اور جو کچھ

تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں۔" (البقرہ)

ملائکہ اللہ چونکہ اپنی خدمات کے سوا ہر قسم کی دنیوی خواہشوں اور ضرورتوں سے بے نیاز تھے اس لیے وہ ان کے علم سے بھی ناآشنا تھے اور آدم کو چونکہ ان سب سے واسطہ پڑنا تھا اس لیے ان کا علم ان کے لیے ایک فطری امر تھا جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کر دیا۔

ابلیس ان مظاہروں کو دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ فرشتے قائل ہو گئے ہیں۔ اس کا غرور یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ آدم اس سے برتر ہیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس کا اظہار کسی مناسب موقع پر ضرور کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ موقع اسی وقت فراہم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم اس (آدم) کے سامنے سربسجود ہو جاؤ۔ تمام فرشتے حکم کی تعمیل میں سجدے میں گر پڑے مگر ابلیس (شیطان) نے غرور میں آکر تعمیل حکم سے انکار کر دیا۔ اس سے ایک عظیم خطا سرزد ہو گئی۔

"ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم کے آگے سربسجود ہو جاؤ۔ وہ جھک گئے مگر ابلیس کی گردن نہیں جھکی۔ اس نے نہ مانا اور گھمنڈ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کافروں میں سے تھا۔" (البقرہ)

اللہ تعالیٰ اگرچہ عالم غیب ہے۔ دلوں کے بھید جانتا ہے۔ جانتا تھا کہ ابلیس نے سجدے سے انکار کیوں کیا ہے لیکن پھر بھی جتانے کے لیے پوچھا اور اس لیے بھی پوچھا کہ اس کے انکار کے سبب سے سب واقف ہو جائیں۔

"کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا۔"

"اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے، اسے مٹی سے۔ بھلا خاک کو آگ سے کیا نسبت۔ اے خدا! پھر یہ تیرا حکم کہ ناری، خاکی کو سجدہ کرے کیا انصاف پر مبنی ہے؟"

جلال خداوندی نے آواز دی "کبر و نخوت نے تجھے اس قدر اندھا کر دیا کہ تو اپنے خالق کے حقوق اور احترام خالقیت سے بھی منکر ہو گیا۔ پس تو اب اس سرکشی کی وجہ سے ابدی ہلاکت کا مستحق ہے۔ تو مردود ہوا۔"

ابلیس اپنے غرور و تکبر میں یہ بھول گیا کہ وہ آگ سے بنا ہے لیکن ہے تو مخلوق۔ مخلوق کی حقیقت خالق سے بہتر خود وہ مخلوق بھی نہیں جان سکتی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کون برتر ہے کون کم تر۔ کم تری اور برتری مخلوق کے جوہر سے نہیں اس کی صفات سے ہے۔

ابلیس کے جواب کے ساتھ ہی آسمان پر ایک مہیب سناٹا چھا گیا۔ فرشتوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ حکم الٰہی سے کسی نے انکار کیا ہو۔

"اے ابلیس! تجھے اس گستاخی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری آغوش رحمت سے دور کر دیا۔"

اس حکم کے بعد بھی توبہ اور ندامت کی بجائے وہ اصرار گناہ پر اڑا رہا۔

"اگر تو نے مجھے اپنے سے دور کر ہی دیا ہے تو مجھے قیام قیامت تک مہلت عطا کر۔ مجھے اس وقت تک موت نہ آئے جب تک قیامت بپا نہ ہو جائے۔"

تیری بدبختی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تیری زندگی کی رسی دراز ہو۔ میں نے تیری استدعا قبول کی۔ تو زندہ رہ تاکہ اپنی "خطا" کو یاد کرتا رہے۔"

یہ مہلت ملتے ہی اس کے گھمنڈ نے ایک اور انگڑائی لی۔

"جب تو نے مجھے راندۂ درگاہ کر ہی دیا ہے تو جس آدم کی بدولت مجھے یہ رسوائی نصیب ہوئی میں بھی اولادِ آدم کو اسی طرح رسوا کروں گا اور انہیں تیرا ناشکر گزار کر کے چھوڑوں گا۔ چہار جانب سے ان پر حملہ کر کے انہیں گمراہ کرتا رہوں گا۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ہم کو اس کی کیا پروا۔ ہماری فطرت کا قانون "مکافات عمل و پاداش عمل" ہے اور یہ اٹل قانون ہے۔ پس جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ جو بنی آدم مجھ سے روگردانی کرے گا اور تیری پیروی کرے گا وہ تیرے ساتھ ہی عذاب الٰہی کا سزاوار ہوگا۔ جا اپنی ذلت و رسوائی اور شومیٔ قسمت کے ساتھ یہاں سے دور ہو اور اپنی اور اپنے پیرو‌ؤں کی ابدی لعنت (جہنم) کا منتظر ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے سجدے کا جو حکم دیا تھا وہ فرشتوں کو دیا تھا اور ابلیس فرشتوں کی جنس میں داخل نہیں تو پھر اس پر عتاب الٰہی کیا معنی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ابلیس ملائکہ کی جنس نہ تھا۔

"وہ جن" سے تھا پس اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔

وہ "جن" میں سے تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے سجدے کا حکم دیا تو اس وقت وہ مجلس میں موجود تھا اور غیر معلوم مدت تک فرشتوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ بھی

اس حکم کا مخاطب تھا۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو اس حکم کا مخاطب سمجھتا تھا اسی لیے اس نے یہ جواب نہیں دیا کہ میں فرشتہ نہیں ہوں اس لیے یہ حکم مجھ پر لاگو نہیں تھا بلکہ غرور میں آکر یہ جواب دیا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اس لیے سجدہ نہیں کیا۔

قرآن میں اس مناظرے کی کیفیت کو اصلاً یوں بیان کیا گیا ہے۔

"اللہ نے فرمایا، تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ کہا، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیر اٹھے گارے سے بنایا ہے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔ حکم ہوا، اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا، تو راندہ ہوا اور جزا کے دن تک تجھ پر لعنت ہو گی۔ اس نے کہا، خدایا! مجھے اس دن تک مہلت دے جب انسان اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا اس مقرر دن تک تجھے مہلت دی گئی۔ اس نے کہا خدایا چونکہ تو نے مجھ پر (نجات وسعادت) کی راہ بند کر دی تو اب ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں ان کے لیے جھوٹی خوش نمائیاں بناؤں اور گمراہ کروں۔ ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے میرے بہکانے میں آنے والے نہیں۔ فرمایا بس یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا صرف انہی پر چلے گا جو بھٹک گئے ہیں اور ان سب کے لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے۔" (اسراء)

حضرت آدم ایک عرصے تک تنہا زندگی بسر کرتے رہے مگر یہ اس مٹی کی خاصیت تھی جس سے وہ بنائے گئے تھے کہ اس تنہائی سے وہ گھبرانے لگے۔ اپنی زندگی میں ایک وحشت اور خلا محسوس کرنے لگے۔ ان کی فطرت کسی مونس و ہمدم کی متلاشی نظر آتی تھی۔ خیال ہوتا تھا کہ ان جیسا کوئی اور بھی ہو۔ فرشتوں کی بھیڑ میں وہ اکیلے نظر آتے تھے۔ خدا نے ان کی اس بے چینی کو محسوس کیا اور ان کے لیے ان کی ہم جنس یعنی انسانوں میں سے "حوا" علیہ السلام کو پیدا کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک عورت کی تخلیق تھی جو ایک مرد کے لیے تھی۔ آدم علیہ السلام نے اپنے دل میں ان کے لیے بے پناہ کشش محسوس کی اور انہیں اپنے قریب دیکھ کر بے حد مسرور ہوئے۔

بائبل میں حضرت حوا کی پیدائش کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

"اور خداوند نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور خداوند نے کہا آدم کا اکیلا رہنا اچھا نہیں۔ اس کے لیے اس کا مددگار اس کی مانند بناؤں گا۔ خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکالا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر اس کے پاس لایا اور آدم نے کہا یہ تو اب میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اس لیے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی ہے۔ اس کے واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑ دے گا اور اپنی بیوی سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے اور آدم اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے۔"

آریوں کے ہندی اپنشدوں میں حضرت حوا کی تخلیق کے بارے میں یوں آتا ہے۔

"تنہائی میں وہ (آدم) خوش نہ رہ سکا۔ اسے دوسرے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے وجود کو دو حصوں میں تقسیم کیا جس میں سے ایک "پتی" کہلایا جبکہ دوسری "پتنی"۔ پتی پتنی سے ہمکنار ہوا جس سے بنی نوع انسان پیدا ہوا۔ پتنی نے سوچا وہ میرے قریب کیوں آتا ہے جبکہ اس نے خود اسے اپنی ذات میں سے پیدا کیا ہے۔"

قرآن نے صرف اتنا کہا۔

"لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔" (النساء)

قرآن میں کہیں بھی حوا علیہ السلام کی پیدائش کی تفصیل نہیں بتائی گئی۔ بخاری اور مسلم میں یہ حدیث ضرور بیان ہوئی ہے "عورت کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اس لیے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔"

اس کی روشنی میں ابن اسحاق نے تو اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حوا علیہ السلام آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں۔ ایک اور مفسر علامہ قرطبی نے اس کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ دراصل عورت کو پسلی کی ساخت سے تشبیہ دی ہے کہ اس کا حال پسلی کی طرح ہے۔ اگر اس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی تو جس طرح پسلی سے ٹیڑھے پن کے باوجود اس سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی سے کام لینا چاہیے۔"

مفسرین کی اکثریت نے اس رائے کا احترام کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اس طرح پیدا کیا کہ مرد کے

ساتھ اس کی جنس سے ایک دوسری مخلوق بھی بنائی جسے عورت کہا جاتا ہے۔

بہرحال تخلیق آدم وحوا کے بعد انہیں بہشت میں رکھا گیا۔

''پھر ہم نے آدم سے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو۔ جس طرح چاہو کھاؤ پیو اس چمن کی زندگی بسر کرو مگر دیکھو وہ جو ایک درخت ہے کبھی اس کے پاس نہ پھٹکنا۔ اگر تم اس (درخت) کے پاس گئے تو حد سے تجاوز کر بیٹھو گے اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں۔'' (البقرۃ)

حضرت آدم علیہ السلام کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ وہی جنت ہے جس کو جگہ جگہ قرآن میں قیام قیامت کے بعد مومنوں کا وطن بتایا گیا ہے یعنی ''جنت الماویٰ'' یا کوئی جنت ارضی تھی جو زمین پر آدم وحوا کے لیے بنائی گئی؟ اس کے بارے میں علمائے اسلام میں اختلاف ہے لیکن جمہور علمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ ''جنت الماویٰ'' ہے جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں سے کیا گیا ہے۔

صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ جملے ملتے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا۔ پس اہل ایمان کھڑے ہوں گے جب جنت ان کے قریب ہوگی۔ پھر وہ آدم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے اے ہمارے باپ ہمارے لیے اس جنت کو کھولیے اس پر حضرت آدم فرمائیں گے کیا تم کو اسی جنت سے تمہارے باپ کی خطا کاری نے نہیں نکالا تھا؟

جب آدم علیہ السلام اپنی زوجہ حوا علیہ السلام عالم راحت میں رہنے لگے۔ انہیں ہر طرح کا عیش وآرام میسر آگیا۔ عالم تکلیف پر ان کا ابھی گزر تک نہیں ہوا تھا تو یہ سب دیکھ کر ابلیس حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ وہ گنہگار اور نابکار مخلوق کی حیثیت سے ابھی آسمان پر ہی رہ رہا تھا۔ جنت کے عیش وآرام بھی دیکھ چکا تھا۔ وہاں کے پھلوں سے بھی واقف تھا اور اس درخت کو بھی جانتا تھا جس کے قریب جانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا تھا۔

وہ اپنی حالت پر پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ سوچتا رہتا تھا کہ میں فرشتوں کی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گیا ہوں اور جو مجھ سے کمتر مخلوق ہے اسے جنت میں ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ میں کوئی ایسی چال چلوں کہ آدم کا مقام ومرتبہ اس سے چھن جائے۔ مجھے نافرمانی کی سزا ملی ہے، میں اسے بھی نافرمان بنا دوں، وہ بھی جنت سے نکالا جائے، اسے کسی چیز کا نافرمان بنایا جائے، وہ غور کرتا رہا پھر اس کی آنکھیں کسی خیال سے چمکنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھیجتے ہوئے انہیں ہدایت کی تھی کہ دیکھو وہ جو ایک درخت ہے اس کے پاس نہ پھٹکنا۔ اگر وہ کسی طرح اس درخت کے پاس چلے جائیں اور اس کا پھل چکھ لیں تو یہ نافرمانی کے زمرے میں آئے گا۔ ان پر خدا کا غضب نازل ہوگا اور میرا کام بن جائے گا۔

اس نے یہ بھی سوچا کہ آدم تو شاید اس کے جھانسے میں نہ آئیں، حوا کمزور ہیں انہیں بہکانا چاہیے۔ وہ آدم کو خود بخود ورغلا لیں گی۔ شیطان (ابلیس) نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔

''تمہیں جنت میں ہر طرف جانے کی اجازت ہے۔''

''ہاں''

''صرف ایک درخت کی طرف جانے کے لیے کیوں منع کیا گیا ہے''

''کیا خبر۔''

''ذرا سوچو۔''

''اللہ کی مرضی۔''

''میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

''تم کیا جانتے ہو۔''

''میں یہاں رہا ہوں۔ ہر درخت کی کیفیت مجھے معلوم ہے۔ یہ درخت دائمی راحت اور قرب الٰہی کا ضامن ہے۔ تم اسے کھاتے ہی یہاں ہمیشہ رہنے کی حامل بن جاؤ گی۔ ایسی بادشاہی ملے گی جو کبھی زائل نہیں ہوگی۔ اسی لیے تو اس کا پھل کھانے سے تمہیں روکا گیا ہے۔''

''تم یہ باتیں کیوں بتا رہے ہو۔''

''اس لیے کہ میں تمہارا دوست ہوں دشمن نہیں۔''

یہ وسوسے کئی دن تک دل میں آتے رہے کہ وہ اس درخت کے پاس جائیں۔ اس کا پھل کھائیں معلوم تو ہو کہ منع کیوں کیا گیا ہے۔ پھر انہوں نے آدم سے ذکر کیا۔

''آپ کو معلوم ہے اس درخت کے پاس ہمیں جانے سے کیوں روکا گیا ہے۔''

''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''اس لیے کہ ہم یہاں ہمیشہ رہنے والے نہ بن پائیں۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو تمہیں اس حقیقت کا کیا علم۔''

''بس میرے دل میں آیا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ اسی لیے ہمیں روکا گیا ہے۔''

کیا عجب کہ شیطان نے یہی وسوسہ حضرت آدم کے دل میں بھی ڈالا ہو کیونکہ قرآن میں ہے کہ شیطان نے کہا اے آدم، اور جب حضرت حوا نے بھی یہی بات کی تو ان کے وسوسے میں تبدیلی آ گئی اور یہ بھول گئے کہ اللہ نے ان سے اس درخت کے پاس نہ جانے کا عہد لیا تھا۔

ان سے خطا ہوئی۔ پائے ثبات میں لغزش آ گئی اور ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا۔ پھل کھاتے ہی بشری لوازم ابھرنے لگے۔ اس سے پہلے بھی ان کے ستر کپڑوں سے بے نیاز تھے لیکن اس درخت کا پھل کھاتے ہی شرم وحیا کا احساس پیدا ہوگیا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر شرمانے لگے۔ برہنگی ایک دوسرے پر ظاہر ہوگئی۔ وہ دونوں درختوں کے پتوں سے ستر ڈھانپنے لگے اور سوچنے لگے کہ یہ کیسی مصیبت ہے جو نازل ہوگئی ہے۔

اب تک نہ بھوک کا احساس تھا نہ برہنگی کا، نہ پیاس کی جلن تھی نہ سورج کی تپش اور پل بھر میں یہ سب کچھ ہوگیا۔ عالم راحت سے عالم مشقت میں آ گئے۔

ایک طرف وہ ایک دوسرے سے چھپتے پھرتے تھے دوسری جانب خدائے تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا اور آدم سے بازپرس ہوئی۔

''غرض (شیطان نے) دھوکا دے کر ان کو کھینچ ہی لیا۔ جب انہوں نے اس درخت (کے پھل) کو کھالیا تو ان کے ستر کی چیزیں ایک دوسرے کے روبرو بے پردہ ہوگئیں۔ وہ بہشت کے (درختوں کے) پتے اپنے اوپر چپکانے لگے تب ان کے پروردگار نے ان کو پکارا کہ کیا میں نے تم کو اس درخت (کے پاس جانے سے) منع نہیں کیا تھا اور بتا نہیں دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' (الاعراف)

''اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آدم کو پہلے سے جتا کر عہد لے لیا تھا پر وہ بھول گیا اور ہم نے (نافرمانی کا) قصد اس میں نہیں پایا تھا اور پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا، آدم کے آگے جھک جاؤ۔ سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر ہم نے کہا اے آدم یہ (ابلیس) تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو یہ تمہیں جنت سے نکال کے رہے اور تم محنت میں پڑ جاؤ۔ تمہارے لیے اب ایسی زندگی ہے کہ نہ تو اس میں بھوکے رہتے ہو نہ برہنہ، نہ تمہارے لیے پیاس کی جلن ہے نہ سورج کی تپش لیکن پھر شیطان نے آدم کو وسوسے میں ڈالا۔ اس نے کہا اے آدم میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا نشان دے دوں؟ اور ایسی بادشاہی جو کبھی زائل نہ ہو چنانچہ آدم اور حوا نے اس درخت کا پھل کھا لیا اور دونوں کے ستر ان پر کھل گئے تب ان کی حالت ایسی ہوگئی کہ باغ کے پتے توڑنے لگے اور ان سے اپنا جسم ڈھانپنے لگے غرضیکہ آدم اپنے پروردگار کے کہنے پر نہ چلا پس وہ بے راہ ہوگیا۔'' (سورہ طہٰ)۔

توریت نے کچھ تبدیلی کے ساتھ اس قصے کو یوں بیان کیا۔

''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور بی بی حوا کو جنت عدن میں رکھا۔ اس جنت کو چار نہریں سیراب کرتی تھیں اور اس جنت کے مشرقی جانب درخت حیات تھا جس کا پھل کھانے کی ممانعت تھی۔ سانپ کل دشتی جانوروں میں سے جن کو خداوند نے بنایا تھا چالاک تھا اور اس نے عورت سے کہا، کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ کسی درخت کا پھل نہ کھانا۔ عورت نے کہا باغ کے پھل تو ہم کھاتے ہیں پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ اس کا پھل نہ کھانا ورنہ مر جاؤ گی۔ سانپ نے عورت سے کہا کہ اسے کھانے سے تم نہیں مرو گی بلکہ اس کے کھانے سے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور خدا کے مانند نیک و بد جاننے والی بن جاؤ گی۔ عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوب ہے تو اس نے پھل کو توڑا اور کھا لیا اور اپنے شوہر کو بھی دیا تب ان کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں۔ خداوند خدا نے پوچھا کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا ہے جس کے کھانے کو تم منع کیے گئے تھے کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ پیدا کیا تھا اس نے پھل کھایا اور مجھے بھی دیا پھر اس (خدا) نے عورت سے کہا میں تمہارے درد حمل کو بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا اور آدم سے کہا نافرمانی کے باعث یہ زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ مشقت کے ساتھ عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا تاوقتیکہ خاک میں واپس نہ لوٹ جائے اور آدم کو اس خدشے کے تحت عدن سے نکال دیا کہ کہیں وہ درخت حیات کا پھل نہ کھا لے۔''

غرض جب یہ بھید کھل گیا کہ وہ دونوں اس درخت کے پاس گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے بازپرس کی تو آدم کو احساس ہوا کہ غلطی سرزد ہوگئی لیکن انہوں نے ابلیس کی طرح

اپنے گناہ پر اصرار نہیں کیا۔ کوئی مناظرہ نہیں کیا اور اپنی ''خطا'' کو تاویلات کے پردے میں نہیں چھپایا بلکہ ندامت و شرمساری کے ساتھ اقرار کیا کہ غلطی ضرور ہوئی لیکن اس کا سبب سرکشی نہیں بلکہ بربنائے بشریت بھول چوک اس کا باعث ہے، تاہم غلطی ہے اس لیے توبہ و استغفار کرتے ہوئے عفو و درگزر کا درخواست گزار ہوں۔

حضرت حق نے ان کے اس عذر کو قبول فرما لیا اور معاف کر دیا مگر وقت آگیا تھا کہ حضرت آدم خدا کی زمین پر حق خلافت ادا کریں۔

خداوند تعالیٰ نے فیصلہ سنا دیا۔

''تم کو اور تمہاری اولاد کو ایک معین وقت تک زمین پر قیام کرنا ہوگا اور تمہارا دشمن ابلیس بھی اپنے تمام سامان عداوت کے ساتھ وہاں موجود ہوگا۔ تم اور حوا دونوں یہاں سے جاؤ اور میری زمین پر جا کر بسو اور اپنی مقررہ زندگی تک حق عبودیت ادا کرتے رہو۔

قصور معاف ہو گیا تھا۔ حضرت آدم نے یہ الفاظ ادا کردیے تھے: ''اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں بخش نہیں دے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔''

لیکن خدا کی حکمت اس میں تھی کہ اب وہ جنت چھوڑ دیں۔

''ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ پھر میری طرف سے جو ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف یا رنج کا موقع نہیں ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

آدم علیہ السلام کی اس لغزش سے یہ تو ہوا کہ انہیں جنت سے نکلنا پڑا لیکن یہ انقلاب عظیم بھی رونما ہوا کہ بزم دنیا آراستہ ہوگئی۔ ان کی خطا آرائش دنیا کا سبب بن گئی۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ آدم علیہ السلام کا جنت سے نکل کر زمین پر اتارا جانا سزا کے طور پر نہیں تھا کیونکہ انہیں ان کی سابقہ خطا کی معافی مل چکی تھی اور معاف کر دینے کے بعد سزا نہیں بنتی بلکہ انہیں زمین پر اس لیے اتارا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نائب کے طور پر کام کریں۔ انہیں جنت میں صرف امتحان کی غرض سے رکھا گیا تھا اور آخر کار انہیں زمین پر ہی اترنا تھا۔

☆☆☆

خالق کائنات نے انسانی خمیر میں دو متضاد قوتوں کو شامل کر دیا ہے۔ گویا اس خمیر کو خیر و شر کے پانی سے گوندھا گیا ہے یعنی وہ شر کو اپنا کر گناہ کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے اور خیر کی قوت کو کام میں لا کر نیک کام بھی کر سکتا ہے۔ یہ فیصلہ اس کے ارادہ و اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ گناہ کرتا ہے یا نیکی کے راستے پر گامزن ہوتا ہے۔ یہی اس کا امتحان ہے۔ یہی قوتیں اسے فرشتوں سے ممتاز کرتی ہیں کہ وہ گناہ پر دسترس رکھتے ہوئے بھی گناہ نہ کرے۔

انہی متضاد قوتوں کے حامل انسانوں میں سے خداوند تعالیٰ رشد و ہدایت کے لیے بعض کو چن لیتا ہے اور اسے رسول اور نبی کا نام دیتا ہے اور ان ہستیوں سے وہ توقع کرتا ہے کہ وہ ہر قسم کے گناہ سے پاک اور منزہ ہوں۔ نبی یا پیغمبر یا رسول کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے اور اہل و عیال کی زندگی سے بھی وابستہ ہے اور ہر قسم کے عملی و ارادی گناہوں سے پاک بھی ہے تاکہ اس کا ہر عمل کائنات کے لیے نمونہ بن جائے البتہ بشریت کے تقاضے سے سہو اور نسیان اور لغزش کا امکان باقی رہتا ہے اور کبھی کبھی عملی شکل اختیار کر لیتا ہے مگر فوراً اس پر متنبہ کر دیا جاتا ہے۔

لغزش کیا ہے؟ ایک ایسا عمل جو قصداً نہ ہو اور سرکشی نہ رکھتا ہو۔ اپنی ماہیت کے اعتبار سے قبیح اور بد نہ ہو۔ معمولی سی خطا کا درجہ رکھتا ہو مگر کرنے والے کی ہستی کے شایان شان نہ ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ بھی بالکل یہی تھا لہٰذا سورہ بقرہ میں یہ وضاحت کر دی گئی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی یہ غلطی تھی نہ گناہ اور نہ نافرمانی بلکہ معمولی قسم کی لغزش تھی۔

''شیطان نے ان دونوں سے لغزش کرا دی''

اور سورہ ''طٰحٰہ'' میں فرمایا: ''اور بلاشبہ ہم نے آدم سے ایک اقرار لیا تھا پس وہ اس کو بھول گیا اور ہم نے اسے پختہ ارادے کا نہ پایا۔''

سورہ طٰحٰہ ہی میں یہ بیان ہوا ''اور آدم نے اپنے پروردگار کا حکم پورا نہ کیا اور وہ بھٹک گیا۔''

ان کی اس لغزش کو اتنے سخت الفاظ کے ساتھ اس لیے یاد کیا گیا کہ آدم جیسے مقرب بارگاہ الٰہی کے لیے یہ لغزش اور نسیان بھی ان کے مرتبے کی وجہ سے غیر موزوں ہے لہٰذا قابل گرفت ہے۔''

☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور بی بی حوا کو جنت سے

نکالتے ہوئے فرمایا! ''تم اور حوا دونوں یہاں سے جاؤ اور میری زمین پر جا کر بسو اور اپنی مقررہ زندگی تک حق عبودیت ادا کرتے رہو۔''

شیطان مردود کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی لعنت بھیجتے ہوئے نکال دیا۔

''تو اتر جا۔ تجھے شایان شان نہیں کہ یہاں کبر و غرور کرے۔ پس نکل جا تو ذلیل ہے۔''

''فرمایا! (اللہ نے) یہاں سے نکل جا۔ تو مردود ہے اور تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت۔'' (الحجر)

یہاں تک آنے کے بعد قرآن خاموش ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں بتاتا کہ وہ کرۂ ارض کے کس مقام پر اتارے گئے۔ مگر مفسرین نے کئی مقامات کی نشاندہی کی ہے۔ ان اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ ہندوستان کی سرزمین پر اور حضرت حوا علیہ السلام ''جدہ'' کی سرزمین پر اتارے گئے اور پھر ایک مدت بعد ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہوئے عرفات (حجاز) کے میدان میں ایک دوسرے سے جا ملے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ساتھ اتارے گئے ہوں۔

وہ دونوں زمین پر یکجا تو ہو گئے لیکن حیران تھے کہ اب کیا کریں۔ جنت یاد آتی تھی جہاں ہر طرح کا عیش و آرام تھا۔ یہاں جس طرف نظر جاتی تھی پتھر یلے ٹیلوں اور چٹیل میدانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ گرمی کی شدت سے بدن جلتا تھا۔ بدن پر کپڑے بھی نہیں تھے جو دھوپ کی تمازت سے بدن کو بچا لیتے تھے۔ ایک پتھر پر بیٹھ کر گریہ وزاری کرنے لگے۔ اپنی بخشش کی طلب کرتے جاتے تھے اور خدا کی مدد کے طالب تھے۔ خدا بھی انہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ ان کے دل میں ڈالا کہ وہ اس مقام سے ہٹ کر کچھ آگے کی طرف جائیں۔ وہ چلتے رہے اور قدرت نے انہیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جہاں کچھ درخت تھے جن میں پھل لگے ہوئے تھے۔ یہ گویا ان کا دسترخوان تھا۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک چشمہ نظر آیا جس سے پانی ابل رہا تھا۔ اس سامان حیات کو دیکھا تو مسرور ہوئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اس مشکل وقت میں اللہ کا شکر ادا کرنے کی ادا خدا کو پسند آئی کہ وہ شکر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اسی وقت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے۔ ان کے پاس روئی تھی۔ حضرت حوا کو حکم ہوا کہ وہ اسے کات کر سوت بنا لیں۔ پھر دھاگا بنانا اور اس دھاگے سے کپڑا بننا سکھایا۔ انہیں بیج فراہم کیے اور کھیتی باڑی سکھائی۔

ایک مفسر فرماتے ہیں کہ حضرت آدمؑ جنت سے اترے تو ان کے پاس حجر اسود بھی تھا اور جنت کے درختوں کے پتے بھی۔ پھر حضرت آدمؑ نے ان پتوں کو پھیلا دیا۔''

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت آدم کو جنت سے زمین پر اتارا گیا تو ان کو ہر چیز کی صنعت گری سکھا دی گئی اور جنت کے پھلوں کو بطور توشے کے ان کے ساتھ کر دیا۔''

غرض بیج، پھل، پودے اور پتے۔ انہوں نے زمین میں لگائے اور کھیتی باڑی کا آغاز کر دیا جو ان کے لیے بہت تھا۔ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ غار اور درختوں کی جھاڑیں ان کا ٹھکانا رہے ہوں گے اور پھر وہ قدم بہ قدم زندگی کی منزلیں طے کرتے رہے ہوں گے۔

قرآن اور توریت بھی اس سفر کی کوئی روئیداد بیان نہیں کرتے۔

یہ تمام ترقیاں حیات انسانی کو برقرار رکھنے کے لیے تھیں ورنہ اصل مقصد تو نسل انسانی کا فروغ اور اولاد آدم کا دنیا میں پھیلنا تھا تاکہ خالی دنیا کا دامن انسانوں سے بھر جائے اور وہ اللہ کو پہچانیں اور اس کی عبادت کریں۔ اس کا اہتمام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ ان کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہوتے تھے یعنی ایک دفعہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ پھر دوسری دفعہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کو بتا دیا تھا کہ پہلی مرتبہ کی لڑکی کا عقد دوسری مرتبہ کے لڑکے سے کیا جائے اور دوسری مرتبہ کی لڑکی کا عقد پہلی مرتبہ کے لڑکے سے کیا جائے۔ یہی تمہاری شریعت ہوگی۔ اس کے مطابق عمل کرنا۔ پھر ان جوڑوں سے جو اولاد پیدا ہوگی ان کی آپس میں شادیاں ہوں گی یعنی ایک بھائی کی اولاد سے دوسرے بھائی کی اولاد سے۔

اس سے پہلے کہ یہ نوبت آتی حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل کے درمیان اس طرز شادی پر سخت جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور وہ بزرخدا نے کیا تھا زمین پر تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اس کی تعبیر نظر آنے لگی۔

قرآن نے ان دونوں بیٹوں کے نام کا ذکر نہیں کیا ہے صرف ''ابن آدم'' آدم کے دو بیٹے کہہ کر کلام شروع کر دیا ہے البتہ توریت میں ان کے نام قائن اور ہابل بتائے گئے ہیں جو غالباً عربی میں آ کر قابیل ہابیل ہو گئے۔ قابیل بڑا تھا اور ہابیل چھوٹا۔ شریعت کے مطابق قابیل کی شادی ہابیل کی بہن سے ہونی تھی اور ہابیل کی شادی قابیل کی بہن سے اور جب شادی کا وقت آیا تو قابیل اپنے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی (اقلیمہ) سے شادی پر بضد ہو گیا کیونکہ وہ

خوبصورت تھی اور ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی معمولی شکل کی تھی۔ پہلے تو اس مسئلے پر دونوں بھائیوں میں تکرار ہوتی رہی۔ ہابیل اسے سمجھاتا رہا لیکن قابیل کسی صورت نہ مانا۔

''دیکھو قابیل، اقلیمہ تمہاری بہن ہے اور ہماری شریعت میں بہن سے شادی نہیں ہوتی۔''

''تم کچھ بھی کہو گے تو میں نہیں مانوں گا۔ اقلیمہ بہت خوبصورت ہے اور میں بڑا بھی ہوں۔ مرضی میری چلے گی۔''

''اس میں بڑے چھوٹے کی بات نہیں ہے اور نہ ہی انکار کر رہا ہوں۔ میں تو تمہیں شریعت بتا رہا ہوں۔''

''میں اقلیمہ سے شادی کر کے رہوں گا۔ شریعت میں ہو یا نہ ہو۔''

جب ہابیل نے دیکھا کہ وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تو حضرت آدمؑ کی خدمت میں پہنچا اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ انہوں نے بھی قابیل کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا خودسر تھا کہ اس نے ان کی نصیحت بھی ٹھکرا دی اور کہنے لگا کہ اگر آپ نے میری شادی اقلیمہ سے نہیں کی تو میں اسے اغوا کر لے جاؤں گا مگر اس کی شادی ہابیل سے ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔

جب حضرت آدمؑ نے دیکھا کہ قابیل کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تو انہوں نے ایک تجویز دونوں کے سامنے رکھی۔

''تم دونوں اپنی اپنی قربانی حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کرو۔ جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنا ارادہ پورا کرنے کا مستحق ہے۔''

دونوں نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔

توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں قربانی کی قبولیت کا یہ الہامی دستور تھا کہ نذر وقربانی کی چیز کسی بلند جگہ پر رکھ دی جاتی تھی اور آسمان سے آگ نکل کر اسے جلا دیتی تھی۔

ہابیل قربانی والے دن ایک بہترین اچھا خدا کی نذر کرنے کے لیے لے آیا۔ قابیل کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اس نے اپنی کھیتی میں سے غلہ لیا اور لے کر چلا۔ پھر اسے خیال آیا کہ جب آسمانی آگ نے اس غلے کو جلا ہی دینا ہے تو میں وہ غلہ کیوں نہ لے جاؤں جو اب بے کار ہو چکا ہے۔ وہ واپس آیا اور اچھا غلہ رکھ کر ردی قسم کا غلہ جو اب کسی کام کا نہیں رہا تھا اپنے ساتھ لے کر گیا۔ اس کی نیت شروع ہی سے خراب تھی

لہٰذا خدا نے بھی اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جو بدنیتوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ آسمان سے آگ نمودار ہوئی اور اس آگ نے ہابیل کی نذر کو جلا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہابیل کی نذر کو شرف قبولیت حاصل ہو گیا۔ اب ہابیل، اقلیمہ کا حق دار تھا۔

قابیل نے خدا کا فیصلہ ماننے کی بجائے ہابیل کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔

''اے ہابیل، تو یہ مت سمجھنا کہ تیری قربانی منظور ہوئی تو میں تجھے یونہی چھوڑ دوں گا۔ میں تجھے قتل کر دوں گا مگر اقلیمہ سے شادی نہیں کرنے دوں گا۔''

''بھائی تو غصہ کیوں کرتا ہے۔ اب تو تو نے خدا کا فیصلہ بھی دیکھ لیا۔ اب تو اپنی ضد سے باز آجا۔''

''یہ خدا کا فیصلہ نہیں ہے۔ تو نے ضرور کوئی چالاکی کی ہے۔''

''خدا کے آگے کسی کی چالاکی نہیں چلتی۔ بس اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگار وں کی قربانی قبول کرتا ہے۔''

''تو یہ سن لے میں تجھے قتل کر کے چھوڑوں گا۔''

''قابیل، میں تجھ سے زیادہ طاقتور ہوں لیکن پھر بھی تو میری طرف قتل کی نیت سے ہاتھ بڑھائے گا تو میں اپنا ہاتھ تیرے قتل کے لیے نہ بڑھاؤں گا کیونکہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔''

ہابیل کا یہ قول نہایت حسن اخلاق اور وسعت ظرفی پر دلالت کرتا ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اپنے بھائی سے برائی کا ارادہ نہ کرے خواہ بھائی کرے۔

اسی وجہ سے بخاری و مسلم میں حضورؐ کا فرمان ثابت ہے۔ فرمایا ''جب دو مسلمان تلوار سونتے ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو قاتل و مقتول دونوں جہنم میں جاتے ہیں۔ صحابہ نے دریافت کیا یارسول اللہ یہ قاتل تو ٹھیک ہے لیکن مقتول کیوں؟ فرمایا یہ بھی اپنے ساتھی کے قتل پر خواہش مند تھا۔''

شیطان تو یہ عہد کر کے جنت سے نکلا تھا کہ وہ اولاد آدم کو راہ راست سے گمراہ کرتا رہے گا۔ جب موقع ملے گا وہ ان پر حملہ ضرور کرے گا چنانچہ اس وقت بھی وہ قریب ہی کھڑا تھا اور قابیل کے غصے کو ابھار رہا تھا۔ اس نے قابیل کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ وہ شریعت کے حکم سے انکار کر دے۔ مقصد یہی تھا کہ اولاد آدم بھی اس کی طرح ذلیل و رسوا ہو۔ سب سے بڑا گناہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو قتل کرنا ہے اور وہ قابیل کو اس پر اکسا رہا

تھا۔

قابیل غصے میں بھرا ہوا حضرت آدم کے پاس پہنچا۔ آدم دونوں کی قربانی کی طرف سے فکر مند تھے کہ دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ کیا نتیجہ نکلے گا لیکن پھر بھی بشری تقاضے نے انہیں فکر مند کر دیا تھا۔ قابیل کو غصے میں دیکھا تو سمجھ گئے کہ کیا ہوا ہے۔ پھر بھی پوچھنا ضروری سمجھا۔

''کس کی قربانی قبول ہوئی؟''

''ہابیل کی قربانی کو آگ نے جلا دیا۔''

''یہ تو ہونا ہی تھا۔ شریعت کیسے بدل جاتی۔''

''بات یہ نہیں ہے بلکہ آپ تو شروع ہی سے میرے خلاف تھے۔ آپ نے ہابیل کے لیے دعا کی تھی اسی لیے اس کی قربانی قبول ہوئی۔''

''بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کی قربانی قبول کرتا ہے۔''

انہوں نے بھی وہی بات کہہ دی جو قابیل پہلے کہہ چکا تھا۔ وہ وہاں سے پاؤں پٹختا ہوا ہٹ گیا اور ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے گزرے ہوئے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اب تو آخری حجت بھی پوری ہو گئی۔ ہابیل کی قربانی قبول ہو گئی۔ اب اقلیمہ کی شادی اس سے کر دی جائے گی۔ اب میں کیا عذر پیش کروں گا۔ اگر ہابیل راستے سے ہٹ جائے۔ کہیں غائب ہو جائے تو اقلیمہ کا دعوے دار ختم ہو جائے گا مگر یہ غائب کیسے ہو۔ اس نے ہابیل کو دھمکی دی تھی کہ وہ اسے قتل کر دے گا لیکن اس وقت تک وہ قتل سے مراد تکلیف پہنچانا سمجھتا تھا۔ کائنات کے آئینے نے ابھی موت کا چہرہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ قابیل کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ انسان مرتا بھی ہے البتہ تکلیف سے واقف تھا۔ ایک مرتبہ وہ کہیں جا رہا تھا کہ اس کا پاؤں کسی چٹان سے ٹکرا گیا تھا۔ اسے سخت تکلیف ہوئی تھی۔ کئی روز وہ اس تکلیف سے بے چین رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہابیل کو بھی اسی طرح تکلیف پہنچائی جائے تاکہ وہ اقلیمہ کی طرف سے دست بردار ہو جائے اور تنگ آ کر میرے حق میں فیصلہ کر دے۔ حسد اور ملال سے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے فیصلے پر عمل کرنے سے قبل ایک مرتبہ پھر چاہا کہ آدم علیہ السلام کے پاس جائے۔ شاید وہ اب مان جائیں۔ حضرت آدم اپنے کھیتوں پر جانے کے لیے نکل ہی رہے تھے کہ وہ ان کے سامنے پہنچ گیا۔ آدم علیہ السلام خوش ہو گئے کہ شاید قابیل کو ندامت ہوئی ہے اور وہ اقلیمہ سے

کچھ ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں جن پر برسوں تک یقین رکھا جاتا ہے۔ یعنی وہ غلطیاں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اور کبھی سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ ایسی غلطیوں کی تعداد اگرچہ بہت کم ہوتی ہے لیکن یہ غلطیاں بہت عظیم الشان قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ اور ایسی غلطیوں میں پوری قوم مبتلا ہو جاتی ہے۔ آئیں ہم آپ کو ایک ایسی ہی غلطی کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ زمانہ ہے 1553 کا۔ اس وقت اسپین میں فورٹن نام کا ایک آدمی ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ملاح تھا۔ اس نے کوئی جرم کیا تھا جس پر اسے قید کی سزا ہوئی تھی لیکن وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ایک بحری جہاز چرا کر فرار ہو گیا۔

بہت دنوں کے بعد یہ جہاز کیلی فورنیا کے ساحل سے آ لگا۔ فورٹن نے سمجھا کہ اس نے کوئی بہت بڑا جزیرہ دریافت کر لیا ہے۔ اپنی اس ''دریافت'' پر فورٹن کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر جزیرہ کیلی فورنیا کا ایک نقشہ بھی تیار کر لیا۔ کچھ دنوں کیلی فورنیا میں گزار کر وہ اسپین واپس آ گیا۔

ایک بہت بڑے جزیرے کی دریافت پر نہ صرف اس کی سزا معاف کر دی گئی۔ بلکہ اس کی نگرانی میں کیلی فورنیا کے ہزاروں نقشے بھی تیار کروائے گئے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ غلطی پورے دو سو برسوں تک برقرار رہی تھی۔ اس دوران میں اسپین سے ہزاروں افراد کیلی فورنیا آئے لیکن کسی نے آگے جا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ علاقہ مکمل طور پر جنوبی اور شمالی امریکا سے ملا ہوا ہے۔ بہرحال اس غلطی کی اصلاح 1776 میں اس وقت ہوئی جب جوان ڈی انزا نے جا کر اصل صورت حال بتائی اور یہ کہا کہ کیلی فورنیا جزیرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ نقشے واپس لیے گئے جو دو سو برسوں تک رائج رہے تھے۔ دیکھیں تاریخ کی کیسی عظیم الشان غلطی ہے جو دو سو برسوں تک دہرائی جاتی رہی۔

مرسلہ: نگار وسیم، کراچی

دست بردار ہونے کے لیے آیا ہے۔

''قابیل آخر تجھے اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا۔''

''میں تو اس وقت آپ کو اپنی غلطی یاد دلانے آیا ہوں نہ آپ غلطی کرتے اور نہ جنت سے نکالے جاتے۔ آپ خود نکلے اور ہمیں بھی مصیبت میں پھنسا دیا۔''

''یہ کون سا موقع ہے یہ باتیں کرنے کا اور تجھے کس نے بتایا کہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔''

''اماں حوا بھی ایک روز جنت کو یاد کرکے بہت رو رہی تھیں۔''

''میرے بیٹے مجھ سے خطا ہوئی تھی لیکن اللہ نے مجھے معاف کر دیا۔''

''اللہ مجھے بھی معاف کر دے گا۔ آپ مجھے اقلیمہ سے شادی کرنے دیں۔''

''مجھ سے اللہ کا حکم ماننے میں بھول چوک ہو گئی تھی اور اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ پھر یہ کہ میں نے حکم توڑا تھا شریعت نہیں ٹھکرائی تھی۔ مجھے جو کچھ جبرئیل نے سکھایا ہے وہی میری شریعت ہے۔ میں اس میں رد و بدل نہیں کر سکتا اگر میں تمہاری محبت میں تبدیلی کر بھی دوں تو یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ میری اولاد اپنی بہنوں سے شادیاں کرے گی اور اللہ یہ نہیں چاہتا۔''

''آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے یہ اجازت دے دے۔''

''اب میں چاہوں بھی تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ تمہاری قربانی نامقبول ہو چکی ہے۔''

''پھر میں یہ سمجھوں کہ آپ ہابیل کو مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں۔''

''میری محبت تم دونوں کے لیے یکساں ہے لیکن میں تو وہ چاہوں گا جو اللہ چاہتا ہے۔''

قابیل کے پاس اب تمام دلیلیں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ خاموشی سے پلٹ آیا۔ اب تو مجھے آخری بار ہابیل ہی سے بات کرنی پڑے گی۔ اگر وہ مانتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میں اپنے منصوبے پر عمل کروں گا۔ اسے اتنی تکلیف دوں گا کہ وہ ہار مان جائے۔ وہ اسے ادھر ادھر ڈھونڈتا پھرا اور بالآخر وہ اسے مل گیا۔

''میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اقلیمہ کو میرے لیے چھوڑ دو۔'' قابیل نے کہا۔

''میرے بھائی، میں ایسا کبھی نہ کرتا لیکن میں اللہ کے فیصلے کو نہیں بدل سکتا۔''

''تو پھر تم سمجھ لو آج سے میری اور تمہاری جنگ ہے۔ میں تمہیں ہر طرح کی تکلیف پہنچاؤں گا یہاں تک کہ تم میرے حق میں دست بردار ہو جاؤ گے۔''

''میں تمہیں پھر بھی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا لیکن یہ نصیحت ضرور کرتا ہوں کہ اللہ کو ناراض مت کرو۔ اس کا فیصلہ مان لو۔''

''اپنی نصیحت اپنے پاس رکھو اور وقت کا انتظار کرو۔'' قابیل نے کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

شیطان اس کے ساتھ ساتھ تھا اور ساتھ ساتھ وہ بھی آ گیا۔ اب اسے عمل کرکے دکھانا تھا کہ قابیل کو کیا کرنا ہے۔ قابیل ایک درخت کے نیچے آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک بڑا سانپ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ کسی نے پکار کر کہا قابیل! تمہارے قریب جو پتھر پڑا ہے اسے اٹھا کر سانپ کو مار دو۔ قابیل نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ آواز دینے والا کہیں بھی نظر نہ آیا۔ سانپ بہت نزدیک آ چکا تھا۔ قابیل نے پتھر اٹھایا اور سانپ کے پھن پر دے مارا۔ پتھر اتنا بڑا تھا کہ سانپ کچل گیا۔ قابیل نے نزدیک جا کر دیکھا۔ سانپ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ آواز پھر آئی، کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ تو مر گیا۔

''مر؟ کیا ہوتا ہے۔''

''یہ ایک گہری نیند ہوتی ہے۔ اس کے بعد کوئی بھی جاندار کبھی بیدار نہیں ہوتا۔ وہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے پھر کبھی واپس نہیں آتا۔''

''مگر یہ تو یہیں پڑا ہے۔ دنیا سے کہاں گیا ہے۔''

''یہ اس کا جسم ہے اس کی روح چلی گئی ہے۔ یہ جسم بھی کچھ دنوں میں گل سڑ جائے گا۔ اب یہ حرکت نہیں کر سکتا نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کو موت کہتے ہیں۔''

''میں جب بھی پتھر ماروں گا یہی ہوگا۔''

''تم جس کو بھی مارنا ہے وہ مر جائے گا۔''

''وہ پھر کبھی زندہ نہیں ہوگا۔''

''نہیں وہ پھر کبھی اس دنیا میں نہیں آئے گا۔''

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ شیطان تھا جو اسے سب کچھ بتا رہا تھا۔ بات اس کے مطلب کی تھی اس لیے سن بھی رہا تھا اور ذہن نشین بھی کرتا جا رہا تھا۔

وہ اٹھا اور اس جگہ چلا گیا جہاں اس نے چند روز پہلے بہت سے بچھو رینگتے دیکھے تھے۔ اس وقت بھی ایک بچھو وہاں رینگ رہا تھا۔ بچھو نے اسے دیکھا تو تیزی سے اپنے بل کی طرف بھاگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ بل میں داخل ہوتا

قابیل کے پتھر نے اس کا کام تمام کر دیا۔ قابیل نے اسے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا لیکن وہ ساکت تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ مر چکا ہے، قابیل نے سوچا۔ اسے عجیب سی لذت حاصل ہوئی۔ اس کا مطلب ہے میں ہابیل کو بھی اسی طرح مار سکتا ہوں۔

وہ کئی دن تک پرندوں اور طرح طرح کے کیڑوں کو پتھر سے مار کر ان کی موت کا تماشا دیکھتا رہا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کا نشانہ بھی پکا ہو گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ پتھر سے کسی بھی جاندار کو مارا جا سکتا ہے۔ گویا پتھر کی صورت میں اس کے ہاتھوں میں ہتھیار آ گیا تھا۔

حضرت آدمؑ دونوں کی طرف سے بے فکر ہو گئے تھے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ ہابیل کو کھیت سے واپس آنے میں دیر ہو گئی۔ آدمؑ نے دیر ہونے پر قابیل کو ہابیل کی طرف بھیجا۔"

قابیل تو اسی دن کی تلاش میں تھا کیونکہ بار بار خفگی کی وجہ سے ہابیل اس سے منہ موڑنے لگا تھا اور اب آدمؑ اسے خود قابیل کی طرف بھیج رہے تھے۔ اس نے اپنے ارادے کی رسی کو مضبوطی سے تھاما اور اسے ڈھونڈنے نکل گیا۔ وہ اسے ایک غار میں سوتا ہوا مل گیا۔ اسرائیلیوں کے مطابق یہ دمشق کے نزدیک جبل قاسیون کا غار تھا۔

قابیل، ہابیل کے سرہانے کھڑا تھا۔ ہابیل ایک پتھر کو تکیہ بنائے گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے سرہانے کون کھڑا ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں۔ صرف قابیل جانتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر بعد کیا کرنے والا ہے۔

"ایک بڑی چٹان اٹھا اور اس کے سر پر دے مار" کسی نے قابیل کو آواز دی۔ یہ شیطان تھا جو اسے پکار رہا تھا۔ قابیل نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ آواز پھر آئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس نے سانپ کو اور بچھو کو پتھر مارے تھے تو وہ مر گئے تھے۔ اب قابیل موت کے مفہوم کو اچھی طرح جاننے لگا تھا۔ قابیل خاموشی سے غار سے باہر آیا اور ایک بڑی چٹان ہاتھوں میں بلند کر کے غار میں لوٹ گیا۔ ہابیل اب بھی اسی طرح سو رہا تھا۔ قابیل نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چٹان کو مزید بلند کیا اور ہابیل کے سر پر دے ماری۔ ہابیل کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ اس کے سر سے نکلنے والا خون ...ادھر ادھر پھیل گیا۔ قابیل نے یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ مرا یا نہیں اسے آوازیں دیں، اسے ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ ساکت تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ مر چکا ہے، وہ بھی واپس نہیں آئے گا، میرے اور اقلیمہ کی راہ میں حائل نہیں ہو گا، وہ سوچ رہا تھا پھر وہ غار کے دروازے پر آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ ہابیل کی لاش کو کہاں چھپائے، کہاں لے جائے۔ اگر اسے یونہی پڑا رہنے دیتا تو باپ کو کیا جواب دیتا۔

یہ دنیا کا پہلا قتل اور پہلی موت تھی۔ ابھی یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ مرنے کے بعد لاش کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اب پشیمان بھی ہو رہا تھا اور یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کہیں ہابیل کی لاش اس کے جرم کو ظاہر نہ کر دے۔ اسی پریشانی میں رات اور دوسرے دن کا کچھ حصہ گزر گیا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر میں غار کے اندر جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ ایک لمحے کو تو یہ بھی خیال آیا تھا کہ لاش کو اٹھا کر کہیں دور پھینک آئے لیکن پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ اتنی بھاری لاش کو کہاں کہاں اٹھائے پھرے گا۔

وہ اسی پریشانی میں تھا کہ دو کوے ہوا میں اڑتے ہوئے آئے اور اس کے سامنے زمین پر گر گئے۔ زمین پر بھی وہ دونوں لڑ رہے تھے۔ قابیل اس منظر میں ایسا کھویا کہ اپنی پریشانی بھول گیا پھر اس نے دیکھا طاقتور کوے نے کمزور کوے کو مار دیا ہے۔ زندہ کوا مردہ کوے کو اپنی چونچ اور پنجوں سے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ جیسے دیکھ رہا ہو وہ مرا یا نہیں اور جب اسے یقین ہو گیا تو زندہ کوا اپنے پنجوں سے زمین کھودنے لگا۔ جب تھوڑا سا گڑھا بن گیا تو اس نے مردہ کوے کو لے کر اس گڑھے میں دھکیلا اور اوپر سے مٹی ڈال کر گڑھا بند کر دیا اور اڑ گیا۔

قابیل کو راہ سوجھی۔ اس نے سوچا وہ بھی اس طرح گڑھا کھود کر ہابیل کو اس میں چھپا دے اور اوپر سے مٹی ڈال دے۔ اس نے بھی ایک نوکیلے پتھر سے زمین کھودنی شروع کر دی اور دل میں کہتا جاتا تھا "ہائے افسوس! کیا میں اس حیوان سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے جرم کو چھپانے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا۔ اس کا سر شرم و ندامت سے جھک گیا۔

جب گڑھا کھود چکا تو بھائی کی لاش کو گڑھے میں دفن کر دیا اور اوپر سے مٹی ڈال کر زمین ہموار کر دی۔ ایک نشانی اب بھی چھوڑ گیا۔ جس چٹان پر سوتے ہوئے ہابیل کو اس نے قتل کیا تھا اس پر خون اسی طرح جما ہوا تھا۔

قرآن نے اس پورے واقعے کو ان لفظوں میں بیان کیا۔

"اور سنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا جب نذر کی دونوں نے کچھ، اور مقبول ہوئی ایک کی، اور نہ مقبول

ہوئی دوسرے کی۔ کہا، میں تجھ کو مار ڈالوں گا۔ وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے پرہیزگاروں سے۔ اگر تو ہاتھ چلادے گا مجھ پر مارنے کو۔ میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھے مارنے کو۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ بھی حاصل کرلے اور اپنا گناہ بھی۔ پھر ہوجائے تو دوزخ والوں میں سے اور یہی سزا ہے ظالموں کی۔ پس اس کو راضی کیا اس کے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے، پھر اس کو مار ڈالا۔ سو ہوگیا نقصان اٹھانے والوں میں۔ پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کریدتا تھا زمین کو تاکہ اس کو دکھلادے کس طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی۔ بولا ہائے افسوس! مجھ کو اتنا بھی نہ ہوسکا کہ اس کوے جیسا ہی ہوتا کہ چھپا لیتا لاش اپنے بھائی کی پھر لگا پچھتانے۔''

رسول اللہ نے فرمایا کہ''دنیا میں جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اس کا گناہ حضرت آدمؑ کے بیٹے کی گردن پر ضرور ہوتا ہے اس لیے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتدا کی اور یہ ناپاک طریقہ جاری کیا۔''

اس اثنا میں حضرت آدمؑ کہیں تشریف لے گئے تھے۔ واپس آئے اور ہابیل کے متعلق پوچھا تو قابیل نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''مجھے کیا خبر۔ کہیں چلا گیا ہوگا۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ اس کی طرف سے اتنی محبت ہے تو خود جا کر ڈھونڈ لو۔''

اس کی باتوں سے صاف لگتا تھا کہ وہ جو کچھ جانتا ہے اسے بتانے سے گریزاں ہے۔ پھر خود اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔

حضرت آدمؑ و حوا پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ اسی دوران میں حضرت آدمؑ نے خواب میں دیکھا کہ ہابیل انہیں مدد کے لیے پکار رہا ہے اور الغیاث الغیاث کی آوازیں آرہی ہیں۔''

حضرت آدمؑ نے ایک مرتبہ پھر قابیل سے پوچھا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی مسلسل خاموشی نے ان کی فکر کو تشویش میں بدل دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پریشانی دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام ان کے پاس آئے اور ان سے پوچھا۔ اے آدمؑ! کیا آپ نہیں جانتے قابیل آپ کے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ حضرت آدمؑ نے نفی میں جواب دیا۔

''میں اگر جان لیتا تو اس قدر پریشان کیوں ہوتا۔''

''اب ہابیل سے آپ کی ملاقات کبھی نہ ہوسکے گی کیونکہ وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے جاچکا ہے۔ قابیل نے اسے حسد کی وجہ سے قتل کردیا ہے۔''

''مجھے میرے مردہ ہابیل ہی سے ملادو۔ اس کی لاش کہاں ہے۔'' حضرت آدمؑ نے التجا کی۔

''آپ کو ہابیل کی لاش بھی نہیں دکھائی جاسکتی کیونکہ قابیل نے اسے قتل کرکے زمین میں دفن کردیا ہے۔ میں صرف وہ جگہ دکھا سکتا ہوں جہاں اسے قتل کیا گیا۔''

جبرئیل علیہ السلام انہیں اس جگہ لے گئے جہاں ہابیل اپنی بھیڑ بکریاں لے کر جایا کرتا تھا اور ایک پتھر پر سر رکھ کر سوجایا کرتا تھا۔ حضرت جبرئیلؑ نے اس چٹان کی طرف اشارہ کیا جہاں ہابیل سورہا تھا اور قابیل نے اس کو قتل کیا تھا۔ خون کے دھبے ابھی تک چٹان پر نظر آرہے تھے۔

''میری نسل کو ابھی تک موت کا علم نہ تھا کہ موت بھی کوئی شے ہے۔ موت کس طرح آتی ہے اور موت کے بعد لاش کو کیا کرنا ہوتا ہے۔ قابیل نے ان باتوں کو کیسے جان لیا۔''

''یہ سب باتیں اسے ابلیس نے سکھائی ہیں جو آپ کا اور آپ کی اولاد کا ازلی دشمن ہے۔''

''ہائے افسوس! مجھے قابیل سے تو کوئی امید نہیں تھی۔ میری نیک اولاد جو میری آیندہ نسلوں کی رہنمائی کرسکتی تھی اسے قابیل نے قتل کردیا اور قابیل شرارت اور فتنہ و فساد پھیلانے کے لیے رہ گیا۔ اب میری نسل میں نیکی کس طرح پھیلے گی۔''

''اللہ اس کا بندوبست بھی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہابیل کی جگہ ایک بیٹا عطا کرے گا جو نیک اور صالح ہوگا۔ اس کا نام شیث رکھا جائے گا۔ آپ کی نسلوں میں گمراہی قابیل اور اس کے ہم خیال پھیلائیں گے اور نیکی و پرہیزگاری کا راستہ (حضرت) شیث (علیہ السلام) لوگوں کو دکھائیں گے جس سے آپ کا نام دنیا میں روشن ہوگا۔

حضرت آدمؑ نے جبرئیلؑ سے التجا کی ''مجھے وہ جگہ بھی دکھاؤ جہاں ہابیل کو دفن کیا گیا ہے۔''

جبرئیلؑ انہیں اس مقام پر لے گئے جہاں قابیل نے ہابیل کو دفن کیا تھا۔ قبر کھود کر دیکھا تو لاش خون اور مٹی میں لت پت تھی۔ وہ اس لاش کو گھر لے آئے اور اپنے رہنے کی جگہ پر دفن کردیا۔

چرند پرند جمع ہوگئے تھے جو بین کررہے تھے اور شور مچارہے تھے۔

آدم نے جبریلؑ سے پوچھا" آپ ان کی زبان سمجھتے ہیں مجھے بتایئے یہ کیا کہہ رہے ہیں۔"

جبریلؑ نے جواب دیا" یہ سب آہ و زاری کر رہے ہیں کہ انسان سے دور رہنا چاہیے کیونکہ یہ بے وفا ہے اور اپنے بھائی تک کو قتل کر دیتا ہے۔"

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ قابیل کو داب لے۔ زمین نے قابیل کو زانوں تک داب لیا۔

"اے اللہ مجھے یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے۔" قابیل نے پوچھا۔

"تو نافرمان بندہ ہے اس لیے تجھے مردود قرار دیا گیا ہے۔"

"اے اللہ! ابلیس نے بھی تو نافرمانی کی تھی مگر اسے تو آزاد چھوڑ دیا گیا۔"

"اے ملعون! اس نے نافرمانی کی تھی کسی کا خون نہیں کیا تھا۔"

"میرے باپ نے بھی تو تیرے حکم کے خلاف کیا تھا۔"

"اس نے قطع رحمی کا گناہ نہیں کیا تھا اور وہ نادم بھی ہوا تھا۔"

"نادم تو میں بھی ہوں۔"

زمین کو حکم ہوا کہ اسے چھوڑ دو۔ ہم نے اسے معاف نہیں کیا لیکن مہلت دیتے ہیں تاکہ یہ اور اس کے ماننے والے دنیا کے لیے نشان بنے رہیں اور اس کا حال دیکھ کر میرے مخلص بندے گناہوں سے بچے رہیں۔

یہ تو مفسرین کا بیان تھا توریت اس قتل کے بعد کے واقعات کو اس طرح بیان کرتی ہے۔

"تب خداوند نے قابیل سے کہا تیرا بھائی ہابیل کہاں ہے۔ اس نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ میں کیا اپنے بھائی کا محافظ ہوں۔"

پھر اس نے کہا" تو نے یہ کیا کیا۔ تیرے بھائی کا خون زمین سے مجھے پکارتا ہے اور اب تو زمین کی طرف سے لعنتی ہوا۔ جب تو زمین کو جوتے گا تو وہ اب تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہوگا۔"

"میری یہ سزا تو میری برداشت سے باہر ہے۔" قابیل نے کہا۔ "تو نے مجھے روئے زمین سے نکال دیا ہے اور میں تیرے حضور سے روپوش ہو جاؤں گا اور زمین پر خانہ خراب اور آوارہ پھروں گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی مجھے پائے گا قتل کر ڈالے گا۔"

"نہیں بلکہ جو تجھے قتل کرے اس سے سات گنا بدلہ لیا جائے گا اور خداوند نے اس کے لیے ایک نشان ٹھہرایا کہ کوئی اسے پا کر مار نہ ڈالے۔"

اپنی خطاؤں کے سبب قابیل خداوند کے حضور سے نکل گیا اور عدن کے مشرق کی طرف "نود" کے علاقے میں جا بسا۔

(توریت)

وہ جاتے وقت اس بہن کو ساتھ لے گیا جس سے وہ شادی کا خواہش مند تھا۔ سرزمین نود میں قیام کیا اور یہاں اس کے بچے اور بچوں کے بچے ہوئے۔

☆☆☆

جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر مبارک ایک سو تیس سال ہوئی تو حضرت حوا کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ یہ ہابیل و قابیل کے پچاس برس بعد کا واقعہ ہے۔ اس وقت عمریں بہت دراز ہوا کرتی تھیں لہٰذا قابیل ابھی زندہ تھا اور اپنے مسکن "نود" میں تھا جہاں اس کی نسل فروغ پا رہی تھی۔

جبریلؑ کے توسط سے آدم کو پہلے ہی یہ خوشخبری مل

چکی تھی کہ ہابیل کے بدلے میں اللہ انہیں ایک بیٹا دے گا تم اس کا نام شیث رکھنا۔

شیث کے معنی عطیہ کے تھے یعنی اللہ کی طرف سے یہ عطیہ تھا جو آدمؑ کو ملا تھا۔ حضرت جبرئیلؑ نے یہ خبر بھی پہنچائی تھی کہ یہ لڑکا نیکی اور پرہیزگاری کی راہ دکھائے گا۔

حضرت شیث علیہ السلام بڑے ہوتے گئے۔ اس دوران آدمؑ کی دیگر اولادیں اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھیں اور آدم علیہ السلام ان کے درمیان رہ کر رشد و ہدایت کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ آپ کی تعلیمات وہی تھیں جو قرآن پاک میں ارشاد ہیں۔ انہوں نے ان تعلیمات کے ذریعے اپنی اولاد کو نیکی کی طرف بلایا۔

حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں پہلے نبی کی حیثیت سے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ طبری کی روایت کے مطابق آپ پر 21 صحیفے نازل ہوئے، البتہ کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی۔

ایک روایت کے مطابق حضرت آدمؑ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور آپ پر اکیس اوراق پر مشتمل حروف تہجی نازل ہوئی۔ یہ دنیا کی پہلی کتاب تھی جس میں تمام زبانوں کی صدائیں کر دی گئی تھیں۔ علامہ زرکشی ابوالحسین بن فارس کے مطابق حضرت آدمؑ نے اپنی وفات سے 300 سال قبل عربی اور سریانی زبانوں میں کتابیں مٹی کی تختیوں پر لکھ لی تھیں اور انہیں پکا کر محفوظ کر لیا تھا۔

حضرت شیث علیہ السلام کی نیکی بچپن ہی سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ ہر وقت باپ کی خدمت میں مشغول رہتے اور رشد و ہدایت کے کاموں میں حضرت آدمؑ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ اس دنیا پر اللہ تعالیٰ کا ایک گھر بنائیں چنانچہ آدمؑ نے شیث علیہ السلام کو ساتھ لیا اور موجودہ خانہ کعبہ کی جگہ پہنچ گئے۔ اس جگہ کی نشاندہی جبرئیلؑ نے کی تھی۔ حضرت شیث علیہ السلام پتھر اور مٹی لالا کر دیتے رہے۔ آدم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی اور دیواریں کھڑی کیں۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہو چکی تو آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حج کے لیے عرفات میں گئے۔ اللہ نے حج کا طریقہ آپ کو سکھا دیا تھا۔ رات مزدلفہ میں گزاری اور پھر منیٰ میں آئے۔ وہاں سے واپس آ کر طواف کعبہ کیا۔

یہ پہلا حج تھا جو آدم علیہ السلام اور حوا علیہ السلام نے خدا کے حکم سے ادا کیا۔

آپ کی اولاد بھی آپ کے کہنے کے مطابق حج ادا کرتی رہی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک وہی بنیاد قائم رہی۔ طوفان نوح نے اس عمارت کو منہدم کر دیا لیکن بنیاد باقی رہی۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم کا زمانہ آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی بنیاد پر جبرئیل علیہ السلام کی نشاندہی پر خانہ کعبہ دوبارہ تعمیر کیا۔

نبی اکرمﷺ تک وہی عمارت قائم رہی۔

آنحضرتﷺ کے زمانے ہی میں (آپ کی بعثت سے قبل) قریش نے چھت بلند کر کے پھر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔

اس نئی تعمیر میں قریش نے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادیں چھوڑ کر جگہ کم کر دی تھی جس کی نسبت آپﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر اہل مکہ اسلام میں نئے نہ ہوتے تو میں کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ کی حدود پر قائم کر دیتا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب مکہ کے والی بنے تو چونکہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے یہ روایت سنی تھی اس لیے انہوں نے اپنے عہد حکومت میں قریش والی بنیاد گرا کر حدود ابراہیمی پر خانہ کعبہ کو تعمیر کیا۔

عبدالملک بن مروان کی خلافت کے زمانے میں جب حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو شہید کر دیا تو مروان کے کہنے پر عبداللہ بن زبیر کی بنیاد گرا کر پھر ان حدود پر خانہ کعبہ کی تعمیر کی جن پر قریش نے آنحضرتﷺ کے زمانے میں تعمیر کی تھی۔

جب تعمیر مکمل ہو گئی تو مروان تک حضرت عائشہؓ کی بیان کردہ حدیث مبارک پہنچی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"اگر یہ حدیث میں پہلے سن لیتا تو اس کے مطابق حدود ابراہیمی پر عمارت کی تعمیر کرواتا۔"

ہارون رشید کے عہد میں یہ قضیہ پھر اٹھا۔ اس نے عقل مندی یہ کی کہ عمارت گرانے اور عبداللہ بن زبیرؓ کی حدود کے مطابق تعمیر کرنے سے پہلے امام مالکؒ سے مشورہ کر لیا۔ امام صاحب نے انکار کر دیا۔

"خانہ کعبہ کو بادشاہوں کی تماشا گاہ نہیں بننا چاہیے کہ ہر بادشاہ اپنے عہد حکومت میں اسے گراتا رہے اور نئی تعمیر کرتا رہے۔"

خانہ کعبہ کی بنیادیں آج بھی وہیں قائم ہیں صرف تزئین و آرائش ہوتی رہتی ہے۔

اسے ابوالبشر آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا اور آنے

والے ہر پیغمبر نے اس کی تائید کی اور اس کو عبادت گاہ بنایا۔

☆☆☆

اولاد آدم میں سے ایک طرف شیث علیہ السلام تھے جن کی اتباع آدم علیہ السلام دیگر اولادیں کر رہی تھیں دوسری جانب قابیل تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خطا کے باوجود مہلت دی تھی۔ اس کی رسی کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ قابیل اور اس کی آل اولاد میدانی علاقوں میں آباد تھی اور شیث علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی دیگر اولادیں ان کے بیٹے اور ان کے بچوں کے بچے پہاڑوں میں آباد تھے۔

عرصہ گزر گیا یہاں تک آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آ گیا۔ آپ اس دنیا سے سرخرو جا رہے تھے کہ آپ کی تمام اولادیں سوائے قابیل کے توحید پر مکمل پیرا تھیں۔

جب آپ کو بذریعہ وحی منشائے الٰہی کا علم ہو گیا تو آپ نے اپنے فرزند حضرت شیث علیہ السلام کو بلایا اور انہیں وصیت و نصیحت کے بعد انہیں اپنا جانشین مقرر کیا۔

دن رات کی گھڑیوں کی پہچان کروائی اور ان اوقات کی عبادتوں کی تعلیم دی اور اس کے بعد ایک بڑے طوفان کے وقوع کی پیش گوئی فرمائی۔

جب حضرت آدم وفات پا گئے اور وہ جمعہ کا دن تھا تو فرشتے حنوط خوشبو لے کر حضرت آدم کے پاس آئے اور جنت کا کفن لائے۔ حضرت شیث علیہ السلام نے اس کفن میں انہیں کفنایا۔

ابن اسحٰق فرماتے ہیں کہ آفتاب و ماہتاب سات دن رات تک گہن میں رہے۔

ابن ضمرہ سعدی کہتے ہیں کہ میں نے مدینے میں ایک بزرگ کو دیکھا جو وعظ فرما رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں۔ معلوم ہوا یہ ابی بن کعب ہیں۔ وہ وعظ فرما رہے تھے۔

''جب حضرت آدم کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو کہا۔ ''اے بیٹو! جنت کے پھلوں کو کھانے کا دل چاہ رہا ہے تو بیٹے چلے گئے تاکہ جنت کے پھل تلاش کریں۔ سامنے سے ان کو فرشتے مل گئے جن کے ساتھ کفن اور خوشبو تھی۔ فرشتوں نے پوچھا، اے بنی آدم! کہاں اور کس چیز کی تلاش میں جا رہے ہو۔ کہا'' ہمارے والد مریض ہیں اور جنت کے پھل کھانے کو ان کا جی کر رہا ہے۔'' فرشتوں نے کہا واپس چلو۔ تمہارے والد کا وقت پورا ہو گیا ہے۔ وہ سب واپس آ گئے۔ فرشتے بھی ان کے ساتھ تھے۔ حضرت حوا نے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ کون ہیں اور کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ وہ حضرت آدم کے لیے پناہ مانگنے لگیں یعنی انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کی روح قبض کی جائے۔

حضرت آدم نے فرمایا، حوا مجھے چھوڑو اپنے پاس سے۔ میں تجھ سے پہلے پیدا ہوا تھا لہٰذا میرے اور میرے رب کے فرشتوں کے درمیان راستہ خالی کر دو۔ پھر فرشتوں نے ان کی روح قبض کر لی اور پھر غسل دیا کفن دیا خوشبو لگائی پھر گڑھا کھود کر قبر بنائی پھر نماز جنازہ پڑھائی پھر ان کو قبر میں رکھ کر پتھر رکھے اور مٹی ڈال دی۔ اور پھر کہا اے بنی آدم! یہ تمہاری سنت اور طریقہ ہے۔

آپ کے مدفن کے بارے میں ظاہر ہے صرف قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے چنانچہ مشہور یہ ہے کہ وہ اس پہاڑ کے پاس مدفون ہیں جہاں وہ ہند میں اس کے پاس اترے تھے لیکن وہ کہاں اترے تھے اس کے بارے میں بھی کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ میں جبل ابی قبیس کے پاس ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اس مقام پر دفن ہیں جہاں اب بیت المقدس واقع ہے۔

ان کی عمر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ہزار سال زندہ رہے۔ توریت ان کی عمر 930 سال بتاتی ہے۔

ان کی وفات کے ایک سال بعد اماں حوا بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

حضرت آدم وفات پا چکے تو ان کے معاملات کے نگہبان حضرت شیث علیہ السلام ہوئے۔ وہ بھی نبی تھے اور حضرت ابوذر غفاری کی روایت کے مطابق، اللہ نے شیث علیہ السلام پر پچاس صحیفے نازل کیے۔

☆☆☆

حضرت آدم نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد شیث کے بیٹوں اور ان کے بیٹوں کے بیٹوں میں سے کوئی ہرگز ہرگز قابیل کی اولادوں سے نکاح نہ کرے اور ان پر ایک دیوار قائم کر دی تھی کہ کوئی قابیل کے علاقوں کی طرف نہ جائے۔ اس وقت آبادی مختصر تھی اس لیے یہ دیوار کافی تھی۔

حضرت شیث آٹھ سو سال تک زندہ رہے۔ تب تک یہ دیوار موثر رہی لیکن اب آبادی ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔

دنیا واضح طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک حصے میں بنو شیث آباد تھے دوسرے حصے میں بنو قابیل کے لوگ تھے جن کے درمیان کوئی اختلاط نہیں تھا لیکن شیث علیہ السلام

کے انتقال کے بعد ایک وقت وہ آیا جب بنو شیث نے آدم کی وصیت کو ٹھکرا دیا۔

بنو قابیل کی عورتیں نہایت حسین و جمیل تھیں۔ ان کی رگوں میں چونکہ قابیل کا خون گردش کر رہا تھا اس لیے آوارہ مزاج بھی تھیں اور شیطان ان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ انہیں قدم قدم پر بہکاتا رہتا تھا۔

ایک دن شیطان ایک غلام کی شکل میں یہاں رہنے والوں میں سے ایک شخص "توبالی" کے پاس آیا اور اس کی خدمت کے لیے اس کے پاس نوکر ہوگیا۔ توبالی اس کی خدمت گزاری سے بہت خوش تھا۔

ایک روز توبالی بہت اداس بیٹھا تھا کہ اس کا غلام آگیا اور اداسی کا سبب پوچھنے لگا۔

"آپ کہیں تو میں ایک ایسی چیز آپ کے لیے بنا دوں کہ آپ کا دل لگا رہے۔"

"دل بہلانے کے لیے تو یہاں کی عورتیں ہی بہت ہیں لیکن پھر بھی نہ جانے میں کیوں اداس ہوں۔ تم بھلا ایسی کیا چیز بنا سکتے ہو جس سے میری اداسی دور ہو جائے۔"

"یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتا سکتا۔ بس آپ مجھے جنگل تک جانے کی اجازت دے دیں۔"

توبالی حیران تھا کہ جنگل میں ایسی کیا چیز ہے جو وہ میرا دل بہلانے کے لیے لائے گا۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بانسری تھی۔ اس نے اسے ہونٹوں سے لگایا تو عجب عجب نغمے برآمد ہوئے۔ توبالی ان نغموں سے لطف اندوز ہوگیا۔

"تو نے تو یہ بڑی عجیب چیز بنائی۔"

"یہ کیا ہے میں تو اس سے بھی عجیب چیزیں بنا سکتا ہوں۔"

"پھر دیر کس بات کی ہے۔ جلدی بنا، بنو قابیل کو معلوم تو ہو کہ میرا غلام کتنا بڑا کاریگر ہے۔"

اس نے یکے بعد دیگرے موسیقی کے کئی آلات بنا کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ اس وقت تک دنیا ان آلات سے واقف نہیں تھی۔ یہ تو شیطان کے اپنے ذہن کی ایجاد تھی۔

ان آلات کو دیکھ کر دوسرے لوگوں نے بھی ایسے آلات بنا لیے۔ گھر گھر سے موسیقی کی آوازیں آنے لگیں۔

اب شیطان نے ان کی عورتوں کے دلوں میں ڈالا کہ وہ موسیقی کی دھنوں پر رقص کرنے کے لیے گھروں سے نکل آئیں۔

اب آئے دن کا معمول ہوگیا تھا کہ مرد ڈھول تاشے بجاتے اور عورتیں ان کے ساتھ رقص میں شامل ہو جاتیں۔

یہ آوازیں پہاڑوں تک پہنچتی تھیں جہاں بنو شیث آباد تھے۔ ان نغموں میں ایسی دلکشی تھی کہ ان کے دل بھی للچانے لگے تھے۔ خطا پر اکسانے لگا۔

ایک روز بنی شیث کا ایک شخص ہمت کر کے پہاڑ سے نیچے اتر آیا اور بنو قابیل کے علاقے میں پہنچ گیا۔ گویا خطا کے راستے پر اس نے قدم رکھ دیا۔ یہاں کا تو عالم ہی دوسرا تھا، نیم ستوری عورتیں رقص کر رہی تھیں۔ عیش و نشاط تھا۔ بے حیائی تھی، سرشاری تھی۔

وہ پوری رات گزار کر اپنے علاقے میں پہنچا تو اس کے ہونٹوں پر ان حسین و جمیل عورتوں کی مدح سرائی کے نغمے گونج رہے تھے۔ وہ اس سرشاری سے وہاں کی تصویر کشی کر رہا تھا کہ دوسرے مردوں کے بھی دل للچانے لگے۔ وہ تصور ہی تصور میں اپنے علاقے کی روکھی پھیکی زندگی اور قابیل کے علاقے کی رنگین زندگی کا موازنہ کرنے لگے۔ ان میں سے بعض نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بھی میدان میں اتریں گے اور وہاں کی محفلوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

اور وہ چلے گئے۔

بنو قابیل کی عورتیں جتنی خوبصورت تھیں ان کے مرد اتنے ہی بدصورت تھے۔ ان عورتوں نے جب بنو شیث کے خوبرو نوجوانوں کو دیکھا تو ان پر فریفتہ ہوگئیں۔

سب کے سب کسی نہ کسی عورت کے دام میں پھنس گئے اور واپسی کا راستہ بھول گئے۔

یہ افراد جب عرصہ دراز تک واپس نہ پہنچے تو ان کے ساتھیوں کو تشویش ہوئی۔ دیکھنا تو چاہیے کہ ہمارے لوگوں پر کیا گزری۔ انہوں نے سوچا اور وہ بھی نیچے اتر آئے۔ انہیں بھی بنو قابیل کی عورتوں نے پھانس لیا۔ یہ لوگ ابھی تک کسی نبی کی ہدایت کے بغیر زندگی گزار رہے تھے لہٰذا اخلاقی قدریں ان میں تھیں ہی نہیں البتہ توحید پر عمل پیرا تھے۔ خدا کو ایک مانتے تھے۔ شیطان کو ان کی یہی ایک بات کھٹکتی تھی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح ان میں بت پرستی رائج کر دی جائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی بے حیائی کو تو معاف کر دے گا لیکن شرک کی لعنت کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ بنی آدم کو گمراہ کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔

یہ موقع اسے بہت جلد مل بھی گیا۔ اس قوم میں "ود" نام کا ایک صالح مرد تھا۔ قوم کے لوگ اسے بہت محبوب رکھتے تھے جب اس کا انتقال ہوگیا تو تمام لوگ گریہ وزاری

میں ڈوب گئے۔ اس کا غم تھا کہ بھولا ہی نہیں تھا۔ ابلیس لعین نے یہ حال دیکھا تو بنی آدم پر حملہ کرنے کی ایک صورت سامنے آ گئی جس کا وعدہ کر کے وہ جنت سے اترا تھا۔ وہ انسانی صورت میں ان کے پاس آیا۔

"تم لوگ کیوں اتنی گریہ وزاری کر رہے ہو؟"

"دیکھتے نہیں ہمارا محبوب یہاں دفن ہے۔ یہ ہمارے لیے دعائیں کیا کرتا تھا۔ اس کی دعا سے بارش ہوا کرتی تھی۔ ایسی خوش حالی حاصل تھی۔ اب یہ نہیں رہا تو ہمارے لیے کون دعا کرے گا۔ بس یہی غم ہے جو ہمیں کھائے جاتا ہے۔"

"تم کہو تو میں اس کا ایک بت بنا کر تمہیں دے دوں؟ جو مٹی کا ہو گا لیکن بالکل اس صورت کا ہو گا جیسا وہ شخص تھا۔ تم اس بت کو اپنے گھروں میں رکھ لینا اور اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لینا۔ جو کچھ اس سے مانگو گے وہ تمہیں دے گا۔"

"یہ بت تو ایک ہو گا۔ کس کس گھر میں رکھا جائے گا۔"

"ایک ایسی جگہ بنا لینا جہاں اسے رکھ دینا۔ سب لوگ وہاں جائیں اور اپنی مرادیں اس کے سامنے بیان کر دیں۔"

سب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ شیطان نے ایک "بت" بنا کر انہیں دے دیا۔

ابتدا میں تو یہ "بت" محض یادآوری کے لیے تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کی عبادت کی جانے لگی۔ جب ایک نسل گزر گئی تو جتنے نامور لوگ تھے ان کے بھی مجسمے بنا لیے گئے اور ہر ایک کے سپرد ایک کام کر دیا گیا۔ ان کے پجاری وجود میں آ گئے۔ نذریں چڑھائی جانے لگیں۔ پوری قوم گمراہی میں مبتلا ہو گئی۔ پھر یہ مجسمے گھروں میں رکھے جانے لگے۔

آدم علیہ السلام اور شیث علیہ السلام تک تو ایک اللہ کی عبادت ہوتی تھی لیکن اب اللہ کی عبادت ترک ہو گئی یہ بت ہی خدا بن گئے۔ ایک چھوٹی سی خطا نے بت پرستی کی بھی ابتدا کرا دی۔

رسول اکرمؐ نے اس قوم کے متعلق فرمایا "وہ لوگ ایسے تھے جب ان میں سے کوئی صالح شخص وفات کر جاتا تو یہ لوگ اس کی صورت بنا کر رکھ لیتے۔ یہ لوگ اللہ عزوجل کے نزدیک بدترین مخلوق تھے۔"

اس کفر و الحاد میں جو قابیل ہی کے نہیں بلکہ شیث کے لوگ بھی رنگے جا چکے تھے۔

جب گمراہی نے عظمت آدم کو ملیا میٹ کر دیا جب انسان اپنے ہی ایسے انسانوں کو اللہ کا شریک مان کر پوجنے لگا تو حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ جب لوگوں نے ان کی بات بھی نہیں مانی تو عظیم طوفان نے ان سب کو غرق کر دیا اور دنیا پھر سے آباد ہوئی۔

☆☆☆

حضرت عمر ابن خطابؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا، موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی اے میرے پروردگار ہمیں آدم دکھلا یئے جنہوں نے ہم کو اور اپنے آپ کو جنت سے نکلوایا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ ان کو دکھلا دیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھا "آپ آدم ہیں؟"

فرمایا "جی ہاں۔"

حضرت موسیٰ نے پوچھا "آپ ہی ہیں وہ جن میں اللہ نے اپنی روح پھونکی، آپ کو فرشتوں سے سجدہ کروایا اور آپ کو تمام نام سکھائے۔"

فرمایا "جی ہاں۔"

"پھر آپ کو کس چیز نے اکسایا کہ آپ نے ہمیں بھی اور خود کو بھی جنت سے نکلوا دیا۔"

حضرت آدم نے پوچھا "آپ کون ہیں۔"

"میں موسیٰ ہوں۔"

"آپ بنی اسرائیل کے پیغمبر موسیٰ ہیں۔ آپ سے اللہ نے پردے کے پیچھے سے راز و نیاز کیے۔"

"ایسا ہی ہے۔"

"پھر بھی آپ مجھے اس بات پر موردِ الزام ٹھہرانے ہیں جو مجھ سے پہلے سے لکھی جا چکی تھی۔"

پھر رسول اکرمؐ نے فرمایا "آدم موسیٰ پر غالب آ گئے۔"

دوسرے لفظوں میں آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ جنت سے اخراج میرے پھل کھانے سے نہیں ہوا تھا کیونکہ وہاں سے اخراج میری پیدائش سے بھی پہلے اللہ نے لکھ دیا تھا اسی لیے تو فرشتوں سے کہہ دیا تھا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ پھل کھانے سے مجھے روکا گیا تھا اور میں نے کھا لیا۔ یہ واقعی میری لغزش تھی۔ میری اس "خطا" کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے معاف فرما دیا تھا۔

ماخذات

قصص القرآن، قصص الانبیاء، توریت تذکرۃ الانبیاء، تاریخ طبری، امیر علی خان۔

خطائے مسلماں

خطا در خطا

کاشف خان

عرب کے صحراؤں سے مسلمان اٹھے اور آدھی دنیا پر چھا گئے۔ اخلاق اور پراثر مذہبی احکامات کی وجہ سے ان کے آگے دنیا جھک گئی مگر جب انہی مسلمانوں سے غلطیوں پر غلطیاں سرزد ہونے لگیں تو مسلم دنیا کا نقشہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔

تاریخ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں غیر مسلم حکمرانوں نے اسلام کے بارے میں غلط فیصلہ کیا اور اس کا خمیازہ بھگتا۔ حضرت محمد ﷺ نے ایران اور بازنطینی سلطنتوں کے حکمرانوں کو خط لکھا اور دعوت اسلام دی۔ ایرانی قیصر خسرو پرویز نے بدبختی پائی اور نامہ مبارک چاک کر دیا۔ اس کی سلطنت بھی نامہ مبارک کی طرح چند عشروں میں پرزے پرزے ہو گئی۔ دوسری طرف قیصر روم ہرقل نے نامہ مبارک اور قاصد کو عزت و احترام دیا اور اپنی سلطنت آنے والے آٹھ سو سال کے لیے بچالی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے کامیاب سیاست کی اور قیصر غلط فیصلہ کر کے نشان عبرت بن گیا۔ مگر قیصر روم دوسری طرف اپنے عیسائی حلیفوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ ایک عیسائی حاکم نے فاش غلطی کی اور آپ ﷺ کے سفیر کو شہید کر دیا۔ یہ شام میں ہونے والی جنگوں کا نقطہ آغاز تھا۔

ایک بار یہ جنگیں شروع ہوئیں تو ہرقل اور اس کے بعد آنے والے قیصروں کو بھی ان میں شامل ہونا پڑا تھا اور شام ایک عشرے سے بھی پہلے رومی سلطنت کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ایران اور وسط ایشیا تک مسلمانوں کے قدم پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ خلافت راشدہ اور اس کے بعد ہونے والے جھگڑوں نے مسلمانوں کی پیش قدمی کو شدید متاثر کیا۔ خلافت بنو امیہ کے ابتدائی دور تک مسلمان ایک طرف افریقہ کے آخری حصے میں اسپین کے پاس تک پہنچ گئے تھے۔ دوسری طرف وسط ایشیا میں مسلمان ترکستان پر قبضہ کر چکے تھے اور تیسری طرف مسلمان سندھ پر قابض ہو گئے تھے جو بر صغیر کا دروازہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان ان تینوں علاقوں میں مزید آگے جا سکتے تھے مگر سیاست کے ایک بدترین فیصلے نے مسلمانوں کو وہیں روک دیا اور یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ بعد میں مسلمان آگے بھی بڑھے لیکن اسلام وہیں رک گیا تھا۔

ولید بن عبدالملک نے اپنے بھائی سلمان بن عبدالملک کو ولی عہد مقرر کیا۔ سلمان کے حجاج بن یوسف سے شدید اختلافات تھے۔ اس نے سلمان کی ولی عہدی کی مخالفت کی تھی۔ لیکن اس کے خلیفہ بننے سے پہلے حجاج بن یوسف دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ البتہ اس کے مقرر کیے ہوئے جنرل تھے۔ ان میں محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر اور قتیبہ بن مسلم جیسے جری اور اعلیٰ پائے کے جرنیل شامل تھے۔ سلمان نے اپنے مشیروں کے کہنے میں آ کر ان تینوں کو معزول کر کے واپسی کا حکم دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب یہ تینوں جنرل اپنی فوج کے ساتھ آگے بڑھنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ موسیٰ بن نصیر اسپین فتح کر چکے تھے اور اب ان کی نظریں فرانس پر مرکوز تھیں۔ جنگ یرموک میں شکست سے مسلمان مایوس نہیں ہوئے تھے مگر موسیٰ بن نصیر کی معزولی ان پر بجلی بن کر گری اور اس کے بعد مسلمان بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

دوسری طرف قتیبہ بن مسلم نے بغاوت کی اور سلمان کی بھیجی فوج کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر شکست

کھائی۔ صرف محمد بن قاسم نے اطاعت کی، اپنا مفتوحہ لشکر اور سندھ کی حکومت چھوڑ کر واپس آ گئے اور صلے میں انہیں زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ یہ ایک مسلمان حاکم کی طرف سے ایسی فاش سیاسی غلطی تھی جس نے آنے والے دور میں دور رس نتائج مرتب کیے۔ برصغیر اور چین تسخیر سے رہ گئے۔ چین کی حدود میں مسلمان ترکستان سے آگے گئے ہی نہیں۔ برصغیر اگرچہ ہزار سال تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہا لیکن اس کی رعایا نے مجموعی طور پر اسلام قبول نہیں کیا۔ آج بھی یہاں پائے جانے والے مسلمانوں کی اکثریت، اصل میں عرب، ایران اور وسط ایشیائی ممالک سے آئی۔ پہلے انہیں ہاتھ سے نکالا کر وہاں بھی اکثریتی آبادی غیر مسلم رہ گئی۔ اسی طرح جہاں تک محمد بن قاسم نے فتح حاصل کی تھی وہی علاقے بہ حیثیت مجموعی مسلمان ہوئے اس سے آگے مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے۔ مفتوحات ہاتھ سے نکلے تو مسلم خطوں کی باری آئی۔ یورپ نے ایک وقت میں سوائے ترکی کو چھوڑ کر تمام اسلامی دنیا پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب روس وسط ایشیا کے مسلم ممالک پر قابض ہوا تو چین نے ترکستان پر قبضہ کر لیا۔ اگر اسے اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی خطا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

بنو امیہ کے بعد بنو عباس کا دور شروع ہوا۔ شروع کے عباسی خلفا نے مضبوطی سے حکومت کی اور وہ نہ صرف روحانی بلکہ سیاسی قائدین بھی ہوتے تھے لیکن جب خلافت کو زوال پیش آیا اور آس پاس کے سلطان اور صوبے کے گورنر زیادہ طاقتور ہو گئے تو خلفا کی حیثیت صرف روحانی قائدین کی رہ گئی۔ سلطان برائے نام ہی خلیفہ کی اطاعت کرتے تھے۔ وہ اس سے صرف سند حکمرانی وصول کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ بعض اس سے بڑھ کر بغداد پر حملہ آور ہوتے اور یہاں زبردستی اپنی حکمرانی چلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ خلیفہ کی حکومت سکڑ کر بغداد تک محدود ہو گئی۔ اس کے چاروں طرف یعنی شام، عراق، ترکی، ایران اور وسط ایشیا میں سلطانوں کی حکومت تھی۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ خلیفہ ایک محاصرے میں آ گیا ہے لیکن درحقیقت یہ حصار اس کی حفاظت کا ضامن تھا۔ جب تک یہ حصار قائم رہتا وہ محفوظ رہتا مگر آخری خلیفہ نے عاقبت نااندیشی اور بدترین سیاست کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ حصار خود ختم کر دیا۔

صحرائے گوبی سے اٹھنے والے طوفان کے قائد چنگیز خان نے اپنی اعلیٰ سیاسی بصیرت سے عشروں پہلے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کا اصل مقابلہ مسلمانوں سے ہوگا۔ یہی نہیں اس نے بجا طور پر یہ اندازہ بھی لگایا کہ جب تک مسلمانوں میں خلافت موجود ہے انہیں کلی طور پر شکست نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے اس نے خلافت کو اپنا اصل ہدف قرار دیا۔ مگر بغداد تک پہنچنے کے لیے اسے نہایت طاقتور خوارزمی سلطنت سے ٹکرانا پڑتا۔ معاملہ صرف خوارزم شاہ کو نہیں تھا بلکہ اگر اس کی پشت پر خلیفہ بغداد ہوتا اور وہ جہاد کی اپیل کر دیتا تو خوارزم شاہ کو نہ صرف لاکھوں رضاکار بلکہ آس پاس کی مسلم ریاستوں کے لشکر بھی مل جاتے۔ مگر بدقسمتی سے خلافت اور خوارزم شاہ کے معاملات درست نہیں تھے اور سند حکمرانی حاصل کرنے کے باوجود دونوں میں اندرون خانہ

اختلافات تھے۔ پھر مسلمانوں کے آپس کے اختلافات بھی بہت زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ مسلکی اور فقہی اختلافات نے مسلمانوں کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔

ناعاقبت اندیش خلیفہ نے چنگیز خان سے دوستی کا فیصلہ کیا جس نے اسے جھانسا دیا کہ وہ خوارزم شاہ کا خاتمہ کرکے خلافت کو اس کے جبر سے بچالے گا۔ منگول جاسوس نہایت ہوشیاری سے خلیفہ کا پیغام چنگیز خان تک لے گئے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ کے دردناک ترین دور کا آغاز ہوا۔ جس میں تقریباً پچاس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مسلم حکومتیں تباہ ہو گئیں۔ کم سے کم دو درجن ایسے شہر برباد اور کھنڈر ہوئے جن میں سے ہر ایک علم اور ثقافت میں گوہر نایاب سے کم نہیں تھا۔ سب سے بڑھ کر بغداد جیسا علمی مرکز تباہ ہوا صرف ایک اسی شہر میں بیس لاکھ مسلمان تہ تیغ کر دیے گئے۔ مجموعی طور پر مارے جانے والے مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ تھی۔

اس سے کہیں زیادہ بڑا نقصان مسلمانوں کو علمی دنیا میں اٹھانا پڑا۔ اس وقت مسلمان یگانہ روزگار تھے۔ سائنس دان تھے یا دین کے عالم تھے۔ منگولوں نے چن چن کر عالموں کو قتل کیا اور کتابیں نذر آتش کیں۔ صرف بغداد میں ایک ہزار سے زیادہ پبلک لائبریریاں تھیں۔ امراء اور علماء کے کتب خانے اس کے علاوہ تھے۔ کہتے ہیں کہ منگولوں نے پہلے کتابوں کو جمع کرکے آگ لگائی اور اس سے اتنا دھواں اٹھا کہ دن میں بھی رات جیسا منظر ہو گیا پھر ان کتابوں کو دجلہ میں پھینک دیا گیا جس سے دجلہ کا شفاف پانی مہینوں سیاہ رہا۔ اس کے چند سو سال بعد مسلم اسپین کی تباہی نے مسلمانوں کی قسمت پر مہر لگا دی۔ اتنی بڑی تباہی اور بربادی نے مسلمانوں میں مایوسی اور قنوطیت کو جنم دیا۔ وہ بحیثیت مجموعی علم سے دور ہو گئے۔ اب نہ ان میں دین کے عالم تھے اور نہ دنیا کے۔ بلکہ ان میں سستی و کاہلی اور دنیا سے بے رغبتی جیسی بدعتیں در آئیں۔ اسلام عمل کا درس دیتا ہے مگر مسلمان اس درس کو فراموش کر بیٹھے۔

مذہبی اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر عبادات پر زور دیا جانے لگا۔ ترک دنیا عام ہوئی اور خانقاہیں آباد ہونے لگیں۔ خلافت اور حکمرانی کے احساس سے محروم ہو کر مسلمان پست خیالی میں الجھ گئے۔ تجارت، صنعت اور حرفت ختم ہو گئی۔ کتب خانے برباد ہونے سے علوم کی جڑ کٹ گئی۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آنے لگیں جو آپس میں لڑتی تھیں۔ وسط ایشیا پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور مغرب سے روس کی سلطنت سر اٹھانے لگی تھی۔ صرف ایک مصر اور ایک ہندوستان ایسے خطے تھے جو منگولوں سے محفوظ رہے تھے ان کے علاوہ باقی مسلم دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں تھی جو منگولوں کو روک سکتی۔ پھر چند عشروں میں وحشی منگول دنیا فتح کرنے کے بعد ان قوموں اور ملکوں کے اسیر ہو گئے جو انہوں نے فتح کیے تھے۔ وسط ایشیا آنے والے منگول مسلمان ہو گئے مگر اس سے پہلے وہ جو نقصان پہنچا چکے تھے اس کی تلافی آج تک نہیں ہو سکی۔ اس کی بنیاد خلیفہ کا ایک غلط سیاسی فیصلہ بنا تھا۔

بعض اوقات تاریخ کے فیصلے ایسی شخصیات کے ہاتھ میں آجاتے ہیں جو بہت معمولی اور کم اہم نظر آتے ہیں مگر ان کی کوشش تاریخ کا دھارا بدل دیتی ہے۔ یہاں آپ کے سامنے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ پہلی مثال سلجوق ترکوں کے سلطان طغرل بے کی ہے۔ ایشیائے کوچک میں کوہ یورال سے لے کر ترکستان اور موجودہ عراق سے لے کر شمال میں سائبیریا کے خطے تک ان ترکوں کی حکمرانی تھی۔ طغرل بے اولین شخص تھا جس نے ان ترکوں کو ایک قوت کے طور پر جمع کیا ورنہ یہ قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ترک ہمیشہ سے ایشیا میں فیصلہ کن قوت رہے اور جیسے ہی ترکوں کا اتحاد عمل میں آیا۔ عیسائی مشنری اور مسلمان مبلغ ان کے لیے میدان میں آگئے۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ طغرل بے ان کی طرف راغب ہو جائے۔

اس کوشش میں مسلمان مبلغ کامیاب رہے انہوں نے نہایت ہوشیاری سے اسلام کے وہ نکات نمایاں کرکے طغرل بے اور اس کے ساتھیوں کے سامنے پیش کیے جو ترکوں کی طرز زندگی اور ثقافت سے مماثلت رکھتے تھے۔ اس کے مقابلے میں عیسائی مبلغ عیسائیت کے بنیادی نکات پر زور دیتے رہے جو ترکوں کے طرز زندگی سے میل نہیں کھاتے تھے۔ جیسے ایک تھپڑ کھا کر دوسرا گال پیش کر دینا یا گوشت سے پرہیز کرنا۔ طغرل بے اور اس کے اہل خانہ کے مسلمان ہوتے ہی تمام ترک جو اس کے ماتحت تھے مسلمان ہو گئے اور کمزور پڑتے مسلمانوں کو یک دم بہت بڑی قوت مل گئی۔ قدرت نے اس نامعلوم مسلمان مبلغ کے ہاتھوں ایک بڑا کام کرایا اور تاریخ کا رخ بدل دیا۔

دوسرا واقعہ اس کے برعکس ہے یہاں بھی قدرت نے ایک مسلمان مبلغ کو موقع دیا کہ وہ ایک ابھرتے حکمران کے سامنے اسلام پیش کرے۔ یہ روس کا حکمران ولادی میر تھا۔ وہ روسی سلطنت کے بانی رورک کا پڑپوتا اور اولگا (ہیلگا) کا

پڑا تھا۔ اولگا روس کی بیوہ اور وہ پہلی روسی حکمران تھی جس نے عیسائیت قبول کی۔ وہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے کمسن بیٹے کی ریجنٹ کے طور پر حکمرانی کرتی رہی اور پھر اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو عیسائی بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ولادی میر کے آس پاس مشنری منڈلا رہے تھے اور ان کی پوری کوشش تھی کہ وہ عیسائی ہو جائے مگر کہتے ہیں کہ اس کا رجحان اسلام کی طرف تھا۔

اسی بنا پر اس نے حجت اتمام کے طور پر اپنے دربار میں بیک وقت عیسائی اور مسلمان مبلغ کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ اپنا اپنا مذہب اس کے سامنے پیش کریں۔ عیسائی مبلغ نے اس موقع کو استعمال کیا اور اس نے عیسائیت کو یوں پیش کیا کہ اس میں ولادی میر کی پسند کی چیزیں شامل کر دیں اس کے برعکس مسلمان مبلغ نے سچ بولنے کے شوق میں جھوٹے ہی سور کو حرام قرار دیا۔ جب کہ وہ جانتا تھا کہ شاہ کو سور کا گوشت پسند ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے ولادی میر نے عیسائیت قبول کر لی اور مسلمان مبلغ کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا۔ بعد میں ولادی میر نے بازنطینی شاہ کی بیٹی سے شادی کی اور یونانی چرچ سے منسلک ہو گیا۔ اس کے عیسائی ہوتے ہی پانچ کروڑ روسی باشندے بھی عیسائی ہو گئے۔

ان دو مثالوں سے واضح ہے کہ بعض اوقات سیاسی قسم کے فیصلے جو قوموں، ملکوں اور مذاہب کے ماننے والوں پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں وہ معمولی آدمیوں کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ اگر مسلمان مبلغ حلال حرام کے چکر میں پڑے بغیر اسلام کی تعلیمات اس کے سامنے پیش کرتا تو یقین ممکن ہے کہ ولادی میر عیسائی کی بجائے مسلمان ہو جاتا۔ سلطنت روس آج عیسائی کی... بجائے مسلم خطہ ہوتی۔ اسی وقت سے روس نے ایک سپر پاور کے طور پر ابھرنا شروع کر دیا۔ آنے والی آٹھ صدیوں تک یہ ایک تسلسل کے ساتھ پھیلتی رہی وسط ایشیا پر روس کا قبضہ مصنوعی تھا جو ختم ہو گیا لیکن اس سے روسی سلطنت کی وسعت اور طاقت پر خاص فرق نہیں پڑا اور وہ آج بھی سپر پاور ہی ہے۔

حکمرانوں کے لکھے اور کہے ہوئے الفاظ بعض اوقات کیا نتائج لاتے ہیں اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ترکوں نے جب سلطنت عثمانیہ کی بنیاد رکھی تو اس وقت مسلمان زبوں حالی سے دوچار تھے۔ اسپین میں مسلم سلطنت اپنی مرکزیت کھو چکی تھی۔ افریقا جو ایک زمانے میں یوسف بن تاشقین جیسے حکمران دیکھ چکی اب قبائلیوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مصر عضو معطل تھا۔ ہندوستان میں مسلم حکمرانی تھی لیکن اس میں حکمرانوں کو مسلمانوں اور اسلام سے زیادہ اپنی حکومت کی پروا تھی۔ ایسے میں یورپ کے تیز عزائم کے سامنے بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی لیکن جب سلطنت عثمانیہ کا ظہور عمل میں آیا تو اہل یورپ کے دانشوروں نے بھانپ لیا کہ ایک اور مسلم سلطنت نمودار ہونے والی ہے جسے اس وقت نہ روکا گیا تو وہ یورپ کے لیے خطرہ بن جائے گی۔

بازنطینی سلطنت اپنے آخری دموں پر تھی مگر دارالحکومت قسطنطنیہ دفاعی لحاظ سے بے مثال شہر تھا۔ پھر یہ ایک طرح سے مشرق میں یورپ کا آخری مورچہ بھی تھا اس لیے اس کے پیچھے تمام یورپ جمع ہو گیا۔ اس کے باوجود عثمانی حکمران وار بڑھاتے ہوئے بالآخر قسطنطنیہ تک آن پہنچے اور سلطان محمد فاتح نے اس شہر بے مثال کو فتح کر لیا۔ یہاں سے مسلم سلطنت یورپ میں داخل ہوئی۔ اس کے دس سال بعد اسپین کی مسلم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا مگر اہل یورپ کی اسلام کو یورپ سے بے دخل کرنے کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔ اب ترکوں کی صورت میں اسلام نے یورپ میں قدم رکھ دیا۔ اس بار مسلمان مشرق کی طرف سے آئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ترک بحیرہ اسود کے دوسری طرف جا پہنچے تھے۔ مشرقی یورپ کی ریاستیں ایک ایک کر کے عثمانیوں کے سامنے سر جھکانے لگیں۔ اس وقت آسٹریا کی ریاست یورپ میں سب سے طاقتور مانی جاتی تھی مگر عثمانی حکمران بایزید یلدرم نے اپنی فوج کے ہمراہ آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کا محاصرہ کر لیا اور ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ ہی دنوں میں ویانا ترکوں کے قبضے میں آ جائے گا اور اس کے بعد ان کا راستہ روکنے والا کم سے کم مشرقی یورپ میں کوئی باقی نہیں رہے گا۔

مگر عین اس وقت وسط ایشیا کا قہر تیمور لنگ بایزید یلدرم کے اس خط کا جواب دینے اپنے لشکر سمیت اناطولیہ آن پہنچا جو بایزید نے تیمور لنگ کے دوستانہ خط کے جواب میں لکھا تھا اور اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ یورپ سے فارغ ہو لے اس کے بعد وہ سمرقند کا رخ کرے گا اور فتح کے بعد تیمور لنگ کی سب سے چہیتی بیوی کو سر دربار بے ہندہ رقص کروائے گا۔ تیمور لنگ نے اس سے کہا تھا کہ ہم دونوں مسلمان ہیں اور بڑے حکمران ہیں ہمیں اپنی سرحدوں کا مل بیٹھ کر تعین کر لینا چاہیے تاکہ مستقبل میں کوئی تنازعہ پیدا نہ ہو۔ یہ خیر سگالی کا بہت ہی غلط اور سخت ترین جواب ہو سکتا تھا جو ایک حکمران دوسرے حکمران کو دے سکتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بہت بڑی سیاسی خطا تھی۔ بایزید اچھی طرح

جانتا تھا کہ تیمور لنگ کمزور نہیں ہے۔ اس کے پاس سفاک سپاہیوں پر مشتمل بہت بڑا لشکر تھا۔ وہ خود اعلیٰ درجے کا فوجی کمانڈر تھا جو تمام جنگی چالوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ فتح کے لیے کوئی بھی حربہ استعمال کرنے سے قطعی نہیں ہچکچاتا تھا۔

بایزید کے اس جواب پر وہ خاموش ہو گیا جیسے وہ بایزید سے مرعوب ہو گیا ہو۔ مگر یہ خاموشی اس سمندر کی طرح تھی جس کی تہہ میں طوفان کروٹیں لے رہا ہو۔ مکار تیمور صرف موقع کے انتظار میں تھا۔ عثمانی اس سے پہلے بھی کئی بار ویانا فتح کرنے کی کوشش کر چکے تھے اور ہر بار وہ کسی نہ کسی وجہ سے ناکام رہے۔ اس لیے اس بار بایزید یلدرم تہیہ کر کے روانہ ہوا تھا کہ وہ ویانا فتح کر کے ہی واپس آئے گا۔ اس کی تیاریاں بھی اسی لحاظ سے تھیں۔ یہ بات یورپی طاقتوں کے علم میں تھی اور وہ تیمور اور بایزید کی چپقلش سے بھی واقف تھے۔ ان کے سفیر حرکت میں آئے اور وہ سمرقند جا پہنچے۔ تیمور پہلے ہی تیار تھا اور اس کی سپاہ جنگ کے لیے سامان کر رہی تھی۔ جیسے ہی بایزید نے ویانا کا محاصرہ کیا۔ تیمور لنگ نے اناطولیہ کا رخ کیا۔ اس نے اپنی نقل و حرکت اتنی خفیہ رکھی کہ جب وہ اناطولیہ میں داخل ہوا تو بایزید تک اطلاع پہنچی اور بیزید کن کے گھر تک پہنچ جانے والی بات تھی۔

بایزید نہایت عجلت میں محاصرہ چھوڑ کر پلٹا۔ جب وہ ترکی میں داخل ہوا تو تیمور لنگ انقرہ کے پاس میدان جنگ کا نقشہ تیار کر کے اس کا منتظر تھا۔ اس نے بایزید کی سپاہ کو منظم ہونے کا موقع دیے بغیر حملہ کر دیا اور مختصر جنگ کے بعد عثمانیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بایزید سمیت تمام اعلیٰ عہدیدار گرفتار ہوئے۔ گرفتار شدگان میں بایزید کا حرم بھی تھا۔ تیمور نے میدان جنگ میں دربار سجایا۔ حسب معمول مارے جانے والے دشمنوں کے سر کاٹ کر ان کا مینار بنایا گیا اور بایزید سمیت سب کو یہ منظر دکھایا۔ بایزید کو لوہے کے ایک پنجرے میں قید کیا ہوا تھا۔ پھر تیمور نے اس کے حرم سے اس کی سب سے چہیتی چھوٹی بیوی کو بلوایا اور اسے سر دربار برہنہ رقص پر مجبور کیا۔ بایزید یہ سب دیکھنے پر مجبور تھا۔ یہ سب کرنے کے بعد تیمور نے ترک سلطان کو آزاد کر دیا اور اس کی سلطنت سے تعرض کیے بغیر واپس چلا گیا مگر بایزید اس ذلت کے احساس سے ہی ایک مہینے بعد مر گیا۔ یوں انا کے مارے دو حکمرانوں کی خطا نے ایک سنہری موقع کو گنوا دیا جب مسلمان یورپ کے وسط تک پہنچ سکتے تھے۔

انگلینڈ اور فرانس کی روایتی دشمنی میں اس وقت تیزی آئی جب نپولین فرانس کا حکمران بنا اور اس نے انگریزوں کو پے در پے شکستوں سے دوچار کیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ انگریزوں سے ان کی طاقت کا اصل ذریعہ یعنی ان کی کالونیاں چھیننے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس نے آغاز برطانیہ کے افریقی مقبوضات سے کیا اور لیبیا پر قبضہ کرتا ہوا وہ مصر تک آ پہنچا جس پر اس وقت ترکی گورنر حکمران تھا۔ دوسری طرف انگریز بھی مصر پر نظر جمائے بیٹھے تھے کیونکہ بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کے سنگم پر واقع مصر افریقا اور ایشیا کی کنجی تھا۔ انگریزوں نے مصر کے لیے عجلت سے کام نہیں لیا وہ جانتے تھے کہ ابھی عثمانی حکمران کمزور نہیں ہوئے ہیں۔ براہ راست کارروائی کی بجائے انگریز حسب معمول سازشوں سے کام چلا رہے تھے اور قومی و قبائلی عصبیتوں کو ابھارتے ہوئے مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ کر رہے تھے۔

ویسے میں جس واحد یورپی طاقت نے مسلمانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا وہ نپولین بونا پارٹ تھا۔ اس نے برصغیر میں ٹیپو سلطان سے خط و کتابت کی اور طے پایا کہ نپولین ایک بیڑہ ہندوستان بھیجے گا جو ٹیپو سلطان سے مل کر وہاں سے انگریز اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دے گا۔ مگر نپولین نے بدقسمتی سے اس بیڑے کو بحیرہ قلزم کے راستے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ فرانسیسی ماہرین پہلے ہی نہر کو قلزم سے ملا رہے تھے نہر کے راستے بیڑہ قلزم سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچ جاتا۔ بحیرہ میں انگریزوں کا بیڑہ بھی موجود تھا اور جاسوس بھی۔ وہ نپولین کے عزائم سے واقف ہو گئے اور انگریز ایڈمرل نیلسن نے اسکندریہ کے پاس فرانسیسی بیڑے پر اچانک حملہ کر کے اسے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اس جنگ میں نہ صرف نپولین کے تیس ہزار قیمتی سپاہی مارے گئے بلکہ وہ اپنی بحری قوت کے بڑے حصے سے محروم ہو گیا۔ اس کے بعد اسے مصر سے بھی پسپا ہونا پڑا۔ سیاست کے ماہرین نپولین کی اس خطا کو اس کے روس پر حملہ کرنے سے بھی بڑی خطا قرار دیتے ہیں کیونکہ روس میں صرف اسے جنگی شکست ہوئی تھی۔ مگر اس بحری شکست نے انگریزوں کے دل سے اس کا خوف نکال دیا اور سب سے بڑھ کر انہوں نے نپولین اور ٹیپو سلطان کا مشترکہ منصوبہ ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا اور نپولین کو میدان جنگ میں شکست دے کر گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا۔ اس ایک غلطی نے برصغیر کو ڈیڑھ سو سال کے لیے انگریزوں کی غلامی میں دے دیا تھا۔ اگرچہ لڑنے والی دونوں طاقتوں کا تعلق مغرب سے تھا لیکن یہ اہم ترین جنگ مشرق میں ہوئی تھی۔

1857ء میں جب انگریز دہلی پر قبضے کی تیاری مکمل کر

چکے تھے اور ان کی فوج دہلی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ حریت پسند جنرل بخت خان کی قیادت میں شدید مزاحمت کر رہے تھے اور شاہی خاندان کے غدار حریت پسندوں کے خلاف انگریزوں سے ساز باز کر رہے تھے۔ ایسے میں گولہ بارود کی تباہی نے جنرل بخت خان کے عزائم کو ناکام بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس تباہی میں اندر کے غدار ملوث تھے۔ اب دہلی کا دفاع ناممکن تھا اس لیے اس نے بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے... درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ دہلی سے نکل چلیں کیونکہ جہاں بادشاہ ہوگا وہی جگہ دارالحکومت بن جائے گی اور لوگ اس کے گرد جمع ہوں گے۔ مگر بہادر شاہ ظفر نے اپنے مشیروں کے بہکاوے میں آ کر اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اس نے دہلی میں رہنے کا فیصلہ کیا اور بالآخر انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے انگریزوں نے خاندان مغلیہ کی پانچ سو سالہ حکومت کا ہی خاتمہ نہیں کیا بلکہ برصغیر سے ہزار سالہ مسلم اقتدار کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر بہادر شاہ ظفر جنرل بخت خان کے ہمراہ دہلی سے نکل جاتا تو حریت پسند انگریزوں کو برصغیر سے بے دخل کر دیتے۔ یہ زمینی حقیقت ہے کہ انگریز طاقت اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے بہت آگے تھے اور ان کو عقب سے مسلسل اسلحہ مل رہا تھا۔ جدید رائفلوں اور توپوں سے انہوں نے حریت پسندوں کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ پھر انہوں نے ہندو راجاؤں اور مسلمان حاکموں کی مدد بھی حاصل کر لی تھی۔ ان کے پاس لڑنے اور مرنے کے لیے ہندوستانی سپاہ کی کمی نہیں تھی۔ ریلوے نظام کی مدد سے وہ برق رفتاری سے سپاہ اور سامان جنگ منتقل کر سکتے تھے۔ جنوبی ہندوستان پر وہ نصف صدی قبل ہی مکمل طور پر قابض ہو چکے تھے اور اب مزاحمت صرف شمالی ہندوستان میں تھی۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان بھی ان کے ہاتھ آ گئے تھے۔ اس لیے اگر بہادر شاہ ظفر دہلی سے نکل بھی جاتا تو انگریزوں کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ حریت پسند کمزور نہیں تھے مگر انہیں انگریزوں کے ساتھ مقامی غداروں کا مقابلہ بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لیے امکان یہی تھا کہ وہ پھر بھی ناکام رہتے۔ مگر سیاست مفروضوں پر چلتی ہے۔ اس لیے سیاسی ماہرین بہادر شاہ ظفر کے اس انکار کو سیاسی خطا قرار دیتے ہیں۔ جس نے برصغیر کو بہت جلد انگریزوں کی غلامی میں دے دیا۔

پہلی جنگ عظیم اور پھر جنوبی افریقا میں سیاہ فاموں سے جنگ کے لیے انگریزوں کو ہندوستانی سپاہ کی ضرورت تھی لیکن اس کے لیے انہیں ہندوستانی قیادت کی مدد درکار تھی۔ ایسے میں کانگریس اور گاندھی جی نے غیر متوقع طور پر انگریزوں کی مدد کا فیصلہ کیا اور ان کے تعاون سے کم و بیش تین ملین ہندوستانی سپاہی بھرتی ہو کر پہلی جنگ عظیم اور جنگ بوئیر میں شریک ہوئے ان میں سے چار لاکھ مارے گئے۔ گاندھی جی کو توقع تھی کہ بدلے میں انگریز کانگریس کو زیادہ اقتدار میں شریک کریں گے۔ مگر خلاف توقع جنگ کے بعد انگریزوں کا رویہ بالکل بدل گیا۔ باغیوں کی پکڑ دھکڑ کے نام پر قوم پرستوں کو گرفتار کیا جانے لگا اور سیاست پر پابندیاں لگائی جانے لگیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ انگریزوں نے ہندوستانی عوام پر جبر و تشدد کا استعمال شروع کر دیا۔ جلیانوالہ کا واقعہ پیش آیا۔ تب گاندھی جی کو اپنی بڑی سیاسی خطا کا احساس ہوا۔

مگر تین عشرے بعد کانگریس اور گاندھی جی کی سیاسی بصیرت ایک بار پھر جواب دے گئی۔ صوبوں سے کانگریس کی حکومت کے استعفے کے بعد گاندھی جی نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کی اور اس کے بعد سول نافرمانی کا ڈول ڈالا۔ کانگریسی کارکنوں نے قوم پرستوں کے ساتھ مل کر ہنگامہ آرائی اور تشدد سے کام لیا۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز ڈر جائیں گے کیونکہ ان کے سامنے دوسری جنگ عظیم کا چیلنج بھی درپیش تھا مگر انگریز انتظامیہ نے سختی سے کام لیا اور چند ہفتوں میں گاندھی جی کی یہ تحریک کچل دی گئی اور گاندھی جی سمیت تمام ہی کانگریسی اور قوم پرست لیڈر شپ جیل میں ڈال دی گئی۔ بالآخر گاندھی جی کو اپنی اس غلطی سے بھی رجوع کرنا پڑا۔

سیاسی ماہرین کے نزدیک انگریزوں کی طرف سے پیش کردہ کیبنٹ مشن پلان ہندوستان کو متحد رکھنے کی آخری سعی تھی جسے کانگریس کی ہٹ دھرمی نے ناکام بنا دیا۔ خود ہندو لیڈر شپ قیام پاکستان کے بعد پچھتاتی رہی کہ جو چیز انہیں برتری کے ساتھ مل رہی تھی اسے انہوں نے خود مسلم لیگ کی تحفے میں پیش کر دیا۔ 1946ء کے عام انتخابات سے واضح تھا کہ مسلم ووٹ تقریباً سو فیصد مسلم لیگ کے لیے تھا اور مسلم لیگ کا ایجنڈہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک حاصل کرنا تھا۔ اس صورت حال میں انگریز کسی صورت ایسا ہندوستان چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے جس میں صرف ہندو راج قائم ہو جائے اور مسلمانوں کے لیے سوائے لڑنے اور مرنے کے کوئی راستہ باقی نہ رہے۔ کسی قسم کی خانہ جنگی کا مطلب سوویت یونین کو دعوت دینا تھا جو افغانستان کی سرحد تک آ چکا تھا۔ خان غفار خان اور ان کی پارٹی کی صورت میں پہلے ہی کمیونسٹ پارٹی ہندوستان کی سرحد میں موجود تھی۔ خود

کانگریس اور سوشلسٹوں کا رجحان سوویت یونین کی طرف تھا۔ گویا زمین ہموار تھی صرف آگے بڑھنا تھا۔

بہت مجبوری کے عالم میں انگریز برصغیر کی تقسیم پر آمادہ ہوئے۔ درحقیقت انگریزوں نے برصغیر کی جتھے بندی اس طرح کی تھی کہ اسے ایک مکمل یونٹ کی صورت دے دی تھی۔ ریلوے لائن، سڑکیں، نہریں اور وسائل سے ہندوستان کو ایک ملک کی صورت دی گئی۔ مگر ساتھ ہی بڑی ہوشیاری سے وسائل کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ تقریباً سب کچھ ان علاقوں میں تھا جہاں ہندو اکثریت میں تھے۔ صنعتیں، اہم تنصیبات اور تعلیمی ادارے حتیٰ کہ بڑے شہر بھی اسی خطے میں تھے جیسے بمبئی، مدراس، کلکتہ اور احمد آباد۔ دہلی بڑا شہر تھا مگر وہ پہلے سے بڑا شہر تھا۔ انگریزوں کی ناانصافی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امرتسر میونسپلٹی کا بجٹ لاہور کے بجٹ سے زیادہ تھا جب کہ دونوں شہروں کی آبادی میں بہت فرق تھا۔ انگریز سو سال سے ہندوستان کو ایک یونٹ کے طور پر منظم کر رہے تھے اس لیے وہ کس طرح اس کی تقسیم پر دل سے آمادہ ہو سکتے تھے۔

اس لیے انگریزوں نے ایک ذو منزلہ ری پبلک کا پلان پیش کیا۔ اس میں برصغیر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا۔ مغربی حصے میں موجودہ پاکستان مع کشمیر کے شامل ہوتا۔ مشرقی حصے میں بنگال اور آسام شامل ہوتے اور یہاں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہوتی جب کہ وسطی حصے میں شمالی اور جنوبی ہندوستان کے ہندو اکثریت والے علاقے شامل ہوتے۔ یہ سب سے بڑا صوبہ ہوتا جو ملک کے ستر فیصد حصے پر محیط ہوتا۔ ملک کا دارالحکومت دہلی ہوتا۔ تقریباً تمام اہم تنصیبات اور شہر اسی خطے میں تھے۔ وسائل کا نوے فیصد سے زیادہ وسطی یعنی ہندو صوبے کو ملتا۔ پلان کے مطابق کرنسی، دفاع اور امور خارجہ کو چھوڑ کر صوبے باقی تمام امور میں خود مختار ہوتے۔ ایک بار ذو منزلہ ری پبلک بننے کے بعد دس سال میں عوام ریفرنڈم میں اس کی تصدیق یا مکمل آزادی کی توثیق کر سکتے تھے۔

کانگریس نے ابتدائی طور پر بڑی خوشی سے اس پلان کو مان لیا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ مکمل آزادی تھی۔ لیکن تصادم سے بچنے کی خاطر مسلم لیگ نے بھی پلان کی منظوری دے دی اور اس کے بعد مشترکہ حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ مگر یہاں دونوں جماعتوں کے اختلافات کھل کر سامنے آئے۔ جلد یہ واضح ہو گیا کہ دونوں قومیں نہ تو مل کر رہ سکتی ہیں اور نہ ہی کوئی حکومت چلا سکتی ہیں۔ کانگریس اور گاندھی جی کو یہ احساس ستانے لگا کہ دس سال بعد اگر مسلم اکثریت رکھنے والے دونوں صوبے آزادی کے حق میں فیصلہ کر لیتے ہیں تب بھی پاکستان زیادہ بہتر صورت میں وجود میں آ جائے گا۔ اس لیے کانگریس نے پلان کی منظوری واپس لے لی۔ نتیجے میں مسلم لیگ نے بھی مشن پلان سے دست برداری اختیار کی اور مکمل آزادی سے کم کسی چیز کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اب انگریز کے پاس سوائے تقسیم کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک سال بعد پاکستان اور ہندوستان نامی دو ملکوں کا قیام عمل میں آ گیا۔

بعد میں کانگریس اور گاندھی جی کو احساس ہوا کہ انہوں نے عجلت میں اور صرف چند خدشات کے پیش نظر برصغیر کو اکائی کی صورت میں رکھنے کا آخری موقع گنوا دیا تھا۔ اس میں بے شک مسلمانوں کو دو حصے ملتے لیکن وہ الگ الگ ہی ہوتے۔ نیز دو حصوں میں غیر مسلم آبادی بھی اچھی خاصی ہوتی۔ تقسیم کے نتیجے میں آبادی کا جو انخلا ہوا وہ نہ ہوتا۔ ملک کا بڑا حصہ ان کے پاس آتا اور سب سے بڑھ کر انہیں وزارت خارجہ، کرنسی اور دفاع مل جاتا۔ اس سے بھی بڑھ کر انگریزوں کے جانے کے بعد وہ اس قابل ہوتے کہ بزور بازو مسلم اکثریت کے دونوں صوبوں پر قبضہ کر لیتے۔ آخر انہوں نے کشمیر، حیدرآباد دکن اور جونا گڑھ میں یہی تو کیا تھا۔ بھارت نے نہایت چالاکی سے ان سب خطوں کو اپنا داخلی معاملہ قرار دیا اور دنیا والوں نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ لیکن یہ پلان مسترد کر کے انہوں نے پاکستان کی صورت میں ایک آزاد اور خود مختار ملک کی راہ ہموار کر دی۔

دیکھا جائے تو مشن پلان سراسر کانگریس اور ہندوؤں کے حق میں تھا۔ اس میں مسلمانوں کو صرف صوبائی خود مختاری حاصل ہو رہی تھی اور وہ آغاز میں ہی دو حصوں میں بٹ جاتے۔ جب کہ ہندو متحد رہتے۔ دس سال بعد ریفرنڈم کے ذریعے آزادی کا وعدہ بہت دور تھا اور اس سے پہلے ہی صوبوں کی رہی سہی آزادی کا بھی آسانی سے خاتمہ کیا جا سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر کوئی بین الاقوامی ادارہ اس میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ دو ملکوں کی حیثیت سے کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں گیا تو اس سے کیا فرق پڑا؟ سات عشروں سے یہ سرد خانے میں پڑا ہوا ہے۔ حیدرآباد دکن اور جونا گڑھ تو مسلمہ طور پر انڈیا کا حصہ قرار دیے جا چکے ہیں۔ اسی بنا پر آج بھارت کے سیاسی ماہرین مشن پلان رد کرنے کو اس وقت کانگریس کی سب سے بڑی خطا قرار دے رہے ہیں۔

خطائے مشرق

حکمرانوں کی خطائیں

کے زیڈ خان

کم عقل حکمرانوں کے غلط فیصلے عوام کی زندگی میں زہر بھر دیتے ہیں۔ مشرقی حکمرانوں کے ایسے ہی چند فیصلوں کا تذکرہ جس کی سزا عوام کو بھگتنا پڑی اور عوام کی خوش حالی بدحالی میں بدل گئی۔

ماضی قریب کے حکمرانوں کے غلط فیصلوں کا بیان

مشرق باقی دنیا کے لیے ہمیشہ سے ایک پُراسرار اور پُرتجسس لفظ رہا ہے۔ اس نام کے ساتھ ہی انوکھی اور غیر مصدقہ شدہ داستانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ذہن میں آ جاتا ہے۔ مشرق سے مراد عام طور سے براعظم ایشیا سے لی جاتی ہے کیونکہ زمانہ قدیم سے ہی ایشیا کو دنیا کی اولین سرزمین قرار دیا جاتا تھا۔ اس کی وسعت اس کے دور دراز خطے، اس کے نامعلوم ممالک، اس کے انوکھے رسم و رواج، اساطیری داستانیں، اس کے رنگ برنگے لوگ اور سب

سے بوجھ کر اس کی بے پناہ دولت جو معدنی اور قدرتی وسائل اور ہنرمند لوگوں کی صورت میں موجود تھی اور باقی دنیا کی رال ٹپکانے کے لیے کافی تھی۔ آج بھی ترقی یافتہ دنیا مغرب میں ہے اور مشرق اتنا طاقتور نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ساری دنیا کی نظر مشرق پر لگی رہتی ہے۔ اس کے وسائل اور دولت آج بھی مغرب کو للچاتی ہے۔

مشرق صرف مختلف تہذیبوں کا نہیں بلکہ تقریباً تمام ہی الہامی اور غیر الہامی مذاہب کا مرکز بھی رہا ہے۔ یہاں یہودیت، عیسائیت، اسلام، ہندومت، بدھ مت اور جین مت جیسے مذاہب نے جنم لیا۔ حضرت آدمؑ اور حوا اسی سرزمین پر آئے اور یہیں آباد ہوئے۔ ان کی نسلیں یہیں پھلی پھولیں، پھر طوفان نوح جیسا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ اس نے نسل انسانی کو از سر نو تشکیل دیا۔ حضرت نوحؑ کی اولادوں نے آج کی نسلوں کو جنم دیا۔ انسان مشرق سے باقی دنیا میں پھیلا۔ ممکن ہے زمانہ قدیم میں اور بھی بڑی تہذیبیں قائم ہوئی ہوں لیکن جس تہذیب کا سب سے پہلا تحریری سراغ ملتا ہے وہ موجودہ عراق کے علاقے میں حکومت کرنے والا شاہ حمورابی تھا۔ وہ اولین حکمران تھا جس نے ملک کے قوانین، اصول اور قواعد کو تحریری شکل دی۔ اس وقت کاغذ نہیں تھا اس لیے انسانوں کا پہلا تحریری آئین مٹی کی تختیوں پر لکھا گیا اور یہ تختیاں آج بھی عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔

حمورابی اور اس کے تحریری آئین کی وجہ سے ماہرین عمرانیات وادی دجلہ و فرات کو انسانیت کا اولین گہوارہ قرار دیتے ہیں۔ حمورابی ممکنہ طور پر عرب نسل سے تھا تبھی وہ سامی تھا لیکن اس کی حکومت کا بیشتر حصہ وسط ایشیا میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ موجودہ آذربائیجان سے لے کر شام کی ساحلی پٹیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک منظم ساخت، فوجی قوت اور کاشت کاری سے حاصل ہونے والے محاصل نے اسے دنیا کی دولت مند اور بہترین مملکت بنا دیا تھا۔ حمورابی کے جانشینوں نے اس کی سلطنت کا تسلسل برقرار رکھا۔ اسی دوران میں ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایرانی بھی سر اٹھانے لگے۔ مصر عراق کی طرح منظم اور کاشت کار ملک تھا۔ جب کہ ایرانی چرواہے تھے اور رفتہ رفتہ بابل و نینوا کی سلطنت کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔

بعد میں آنے والے بابلی حکمران نااہل ثابت ہوئے اور شام و فلسطین کے علاقے ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ یہاں پہلے مصری قابض ہوئے اور پھر مصر سے آنے والے بنو اسرائیل نے اپنی سلطنت قائم کر لی۔ بابل کی صدیوں تک ان دونوں سے لڑائی جاری رہی۔ اس لڑائی میں ایرانی قبائل ان کے دست و بازو تھے لیکن اس کی قیمت وہ بابلی حکومت سے بہت بھاری وصول کرتے تھے۔ انہوں نے بے شمار زرخیز علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور اب پورے بابل اور نینوا پر قابض ہونے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں بخت نصر بابل کا حکمران ہوا۔ وہ ذہین اور سخت گیر حکمران تھا جو میدان جنگ میں اپنی فوج کی خود قیادت کرتا تھا۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے سب سے پہلے شام و فلسطین پر قبضے کا سوچا۔ اس وقت بنو اسرائیل آپس میں قتل و غارت گری اور اللہ کے نبیوں کو قتل کرنے میں مصروف تھے۔ اس بات سے قطعی غافل کہ اللہ کا عذاب بخت نصر کی صورت میں نازل ہونے والا ہے۔

چالاک بخت نصر علاقے کی صورت حال اور بنو اسرائیل کی حالت سے واقف تھا۔ جب اس نے ارض مقدس پر چڑھائی کی تو اس کے جاسوسوں نے نہایت ہوشیاری سے بنو اسرائیل میں یہ تاثر پھیلایا کہ بخت نصر اللہ کا عذاب ہے اور اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ وہی حربہ ہے جو بعد میں چنگیز خان نے آزمایا اور خود کو خدا کا قہر قرار دیا جس کا مقابلہ کوئی انسان نہیں کر سکتا اور یہی سوچ کر بیشتر مسلمانوں نے ہتھیار ڈال کر خود کو منگولوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور آسانی سے تہہ تیغ ہو گئے۔ یہی حالت بنو اسرائیل کی ہوئی۔ گناہوں اور عیاشیوں نے انہیں پہلے ہی کمزور اور کاہل کر دیا تھا۔ وہ بخت نصر کا مقابلہ نہ کر سکے اور وہ با آسانی بیت المقدس پہنچ گیا۔ وہاں اس نے یہودیوں کا بے پناہ قتل عام کیا، بیت المقدس کو اس طرح برباد کیا کہ اس کی بنیادیں تک اکھاڑ دیں، ہیکل سلیمانی کو ڈھا دیا اور اس کے نوادرات اور قیمتی برتن مع لاکھوں بنو اسرائیل کے بابل لے آیا۔

یہ وقت تھا کہ بخت نصر اپنی سلطنت کی توسیع کی طرف توجہ دیتا لیکن اس کی بجائے اس نے دارالحکومت میں تعمیرات کے عظیم الشان منصوبے شروع کر دیے۔ اس نے نئے محلات اور حکومتی دفاتر بنوائے، معبدوں کو نئے سرے سے تعمیر کرایا، شہر میں پلوں اور سڑکوں کا جال بچھا دیا، نئے محلے آباد کیے اور مملکت کی بیشتر دولت ان تعمیراتی کاموں میں صرف ہونے لگی۔ بخت نصر نے ایک ایرانی لڑکی ایمی ٹس سے شادی کی تھی اور وہ پہاڑوں کی رہنے والی تھی۔ بابل میں پہاڑ نہیں تھے۔ ایمی ٹس بیمار پڑ گئی اور بخت

نصر نے اس کی خاطر بابل میں پہاڑوں کی طرز کے باغات بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بہت بڑا منصوبہ تھا اور اس پر اس وقت کے بہترین ماہرین کام کر رہے تھے۔ سات منزلہ تعمیر میں جو بعد میں بابل کے معلق باغات کہلائی ایک منفرد اور عجیب و غریب چیز تھی۔ اس کی تعمیر پر بے انتہا خرچ ہوا اور ماہرین سیاسیات نے اسے بخت نصر کی فاش غلطی قرار دیا جس نے بالآخر اس کی حکومت کو زوال پذیر کر دیا۔

وسط ایشیا سے وارد ہونے والے آریائی حملہ آوروں نے برصغیر میں ایسی تباہی مچائی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ وہ گھوڑوں اور لوہے کے ہتھیاروں سے مسلح تھے جب کہ مقامی قبائل دھات کے استعمال سے نا آشنا تھے۔ ان کو صرف سونے، چاندی اور کانسی کا علم تھا اور ان سے ہتھیار نہیں بنتے تھے۔ وہ جنگجو ذہنیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ہڑپہ اور موہنجو داڑو کی عظیم تہذیبیں اسی حملے کا نشانہ بن کر مٹ گئیں۔ آریاؤں نے مقامی لوگوں کو جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا اور خود ان کی ہموار اور زرخیز زمین پر قابض ہو گئے۔ ابتدا میں آریا خانہ بدوش اور چرواہے تھے لیکن جب وہ دریاؤں کی وادیوں میں آباد ہوئے اور کاشت کاری شروع کی تو ان میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ وہ مقامی قبائل کی دیکھا دیکھی بت پرستی میں مبتلا ہوئے اور جنگجوئیت ترک کرتے ہوئے کاشت کار اور ہنر مند بن گئے۔ گوشت کھاتے کھاتے اچانک انہوں نے گائے کو تقدس کا درجہ دے دیا اور سبزی خور ہو گئے۔ مذہب ایک ہوا تو فاتح اور مفتوح کی تفریق برقرار رکھنے کے لیے ذات پات کا نظام ایجاد کیا گیا۔

ہندوستان آغاز سے ایک منقسم ملک تھا یہاں مرکزی حکومت ہمیشہ باہر سے آنے والوں نے قائم کی اور جب وہ مقامی رنگ میں رنگ جاتے تو پھر سے کثیر ریاستی نظام لوٹ آتا تھا۔ آریاؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ کچھ عرصے متحد رہنے کے بعد برصغیر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا اور ایک ایسی ہی ریاست کے شہزادے سدھارتھ نے انسانوں کو دکھی دیکھ کر ایک نئے مذہب بدھ مت کی بنیاد رکھی۔ اپنی سادہ تعلیمات اور عدم تشدد کی پالیسی کی وجہ سے اس نئے مذہب نے برصغیر میں حیرت انگیز مقبولیت حاصل کی اور نچلی ذات کے کچلے ہوئے لوگ بہت تیزی سے اس میں شامل ہونے لگے۔ حد یہ کہ اس کے عروج کے دور میں اشوک اعظم جسے برصغیر کا پہلا بڑا حکمران کہا جاتا ہے اس نے بھی بدھ مت قبول کر لیا۔

اس موقع پر ہندو مت کے پجاریوں نے بجا طور پر خطرہ محسوس کیا کہ یہی صورت حال رہی تو ہندو مت مٹ جائے گا یا پھر صرف اعلیٰ طبقوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے ایک سازش کے تحت بظاہر مہاتما بدھ اور بدھ مت کی تعلیمات کو ہندو مت کا حصہ مان لیا گیا۔ مندروں میں مہاتما بدھ کی مورتیاں سجا دی گئیں اور ان مندروں کو تمام ذاتوں کے لیے کھول دیا گیا۔ عوام اس دھوکے میں آ گئے۔ لیکن بدھ مت کے رہنما اس کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے۔ ان کا مذہب نیا اور منظم نہیں تھا۔ وہ عیار اور سازشی بھی نہیں تھے اس لیے پجاریوں کی اس چال کا مقابلہ نہ کر سکے اور اشوک اعظم نے اس کی توثیق کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے بدھ مت کو فائدہ ہوگا اور اعلیٰ ذات کے ہندو بھی بالآخر بدھ مت قبول کر لیں گے۔

لیکن ہوا اس کے برعکس اشوک اعظم کے بعد جب ہندوؤں نے دوبارہ سیاسی غلبہ حاصل کیا تو انہوں نے اپنا دھوکے کے لیے چڑھایا ہوا نقاب اتار دیا اور بدھ مت کے خلاف کھل کر میدان میں آ گئے۔ جن نچلی ذات کے ہندوؤں نے بدھ مت قبول کیا تھا انہیں جبراً مجبور کیا گیا کہ وہ ہندو مت میں واپس آ جائیں۔ بدھ راہبوں کو برصغیر سے بے دخل اور جلا وطن کر دیا۔ ان کا قتل عام کیا گیا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ آبادیاں چھوڑ کر ویرانوں میں جا بسیں۔ ٹیکسلا جیسا اہم مرکز تباہ و برباد کر دیا۔ ہندوؤں کا جبر و تشدد اتنا بڑا کہ بدھ مت برصغیر چھوڑ کر ہمالیہ کے پار تبت اور اس سے آگے چین چلے گئے جہاں یہ مذہب بہت پھلا پھولا اور آج اس کے ماننے والے نوے فیصد افراد مشرق بعید میں پائے جاتے ہیں۔ تھائی لینڈ، برما، لاؤس، ویت نام اور کمبوڈیا کا اکثریتی مذہب بدھ مت ہی ہے۔ چین، جاپان، کوریا، ملائشیا، تائیوان اور ملائیشیا میں بھی اس کے ماننے والے بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ مشرق بعید سے باہر صرف سری لنکا میں بدھ مت اکثریت میں ہیں اور یہ یہاں کا سرکاری مذہب ہے۔

مہاتما بدھ ایک ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بدھ مت نے برصغیر میں جنم لیا اور یہیں پھلا پھولا۔ مگر یہاں اس کے ماننے والے تعداد کے اعتبار سے کسی قطار شمار میں نہیں آتے ہیں۔ حد یہ کہ عیسائیوں کی تعداد بدھوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اشوک اعظم کے ایک غلط فیصلے ایک معمولی خطا نے بدھ مت کو اپنے ہی وطن سے دیس نکالا دے دیا تھا۔ اگر وہ یہ سیاسی غلطی نہ کرتا اور بدھ مت کی الگ حیثیت برقرار

کہتے ہیں کہ انسان کا اولین نزول افریقا میں ہوا لیکن انسان نے سب سے پہلے آبادیاں مشرق میں بسائیں۔ تمدن کا آغاز چار خطوں میں ہوا۔ انسان وادی دجلہ وفرات میں آباد ہوا، مصر میں نیل کی وادی، برصغیر میں سندھ کی وادی اور چین میں یانگ سی کیانگ کی وادی میں انسان آباد ہوئے اور کاشت کاری شروع کی۔ یہیں سے عظیم الشان سلطنتوں کا آغاز ہوا۔ ان میں صرف نیل کی وادی افریقا میں تھی لیکن قربت اور تمدن کے لحاظ سے یہ افریقا سے زیادہ ایشیا کے قریب رہی ہے۔ ان میں نیل اور دجلہ وفرات کی وادیاں یوں اہم ہیں کہ یہ دنیا کے تین بڑے بڑے خطوں کے سنگم پر واقع تھیں۔ اس لیے مشرق کی بین الاقوامی سیاست کا آغاز بھی اسی خطے سے ہوا۔

اس سے پہلے دو قوموں اور ملکوں کا آپس میں تعلق صرف جنگ کی صورت میں ہوتا تھا لیکن کاشت کاری نے تجارت کو جنم دیا اور نفع کمانے کی خاطر تاجر دنیا بھر میں اپنا مال لے جانے لگے یوں قوموں اور ملکوں میں ایک اور تعلق کا آغاز ہوا۔ مصر اور ایشیا کے درمیان تجارت ہونے لگی۔ قدیم ہندوستان اور وسط ایشیا کے تعلقات شاہراہ ریشم کی مدد سے آج سے دو ہزار سال پہلے بھی تھے۔ اسی شاہراہ سے چین بھی برصغیر، عرب خطوں اور مغرب سے جڑا ہوا تھا۔ بحیرہ عرب اور بحیرہ روم بین الاقوامی تجارت کا مرکز بن گئے۔ اس تجارت نے ایشیا میں مختلف اقوام کو قریب کیا اور انہیں ترقی کرنے میں مدد دی۔ زرخیز زمین، متنوع موسم اور پھر کاشت کے لیے اجناس، سبزیوں اور پھلوں کی لاتعداد اقسام نے مشرق میں زراعت کو ترقی دی۔ کپاس، گندم، چاول اور جو جیسی بنیادی خوراک اصل میں مشرق کی پیداوار تھی اور باقی دنیا تک اسے تاجر حضرات پہنچاتے تھے۔

مشرق بہت بڑا خطہ ہے یہ بجائے خود ایک بڑا عظیم ہے۔ چین جو رقبے میں اکیلا ہی یورپ اور شمالی امریکا جتنا بڑا رکھتا تو شاید اشوک اعظم کے زمانے میں بدھ مت ہندوستان کا اکثریتی اور سیاسی مذہب بھی ہو جاتا جس کے بعد ہندو مت کے لیے اس پر غلبہ پانا ناممکن ہو جاتا۔

☆☆☆

انسانی تاریخ کے اولین قحط کی وجہ تو خوراک کی کمی تھی اور نہ ہی خشک سالی اور نہ ہی کوئی جنگ، بلکہ اس کی وجہ ایک چینی بادشاہ کا عجیب و غریب فیصلہ تھا جس نے چند سالوں میں کم و بیش ایک کروڑ افراد کو بھوک سے ہلاکت کی نظر کر دیا۔ سولہویں صدی عیسوی میں منگ خاندان نے مغربی اور شمالی چین پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ یہاں کے وسیع صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں آباد افراد کی خوراک گندم تھی۔ جیسا کہ جنوبی اور مشرقی چین کے اکثر باشندے چاول کھاتے تھے۔ منگ خاندان کو مسلسل شمال کے خانہ بدوشوں کی طرف سے حملوں کا سامنا رہتا تھا اور اس وجہ سے ایک ہمہ وقت مستعد فوج شمالی سرحدوں پر موجود رہتی تھی۔ واضح رہے کہ دیوار چین کا آغاز بھی اسی خطے سے ہوا تھا اور یہ منگ خاندان سے بھی پہلے تعمیر ہونا شروع ہو چکی تھی۔

اچانک اطلاع ملی کہ خانہ بدوش قبائل حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس پر منگ شہنشاہ نے فوج کو فوری سرحد پر جانے کا حکم دیا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ بے پناہ بارشوں کی وجہ سے راستے کیچڑ زدہ اور فوجی نقل و حرکت کے لیے دشوار ہو رہے تھے۔ منگ شہنشاہ نے حکم دیا کہ پتھریلی سڑک تعمیر کی جائے مگر اس مقصد کے لیے پتھر دستیاب نہیں تھے اور دور پہاڑوں سے پتھر کاٹ کر لانے کا وقت نہیں تھا۔ ایسے میں کسی کمانڈر کے دماغ میں ایک عجیب و غریب خیال آیا اور اس نے تجویز پیش کی کہ آٹا پیسنے والی چکیوں سے سڑک تعمیر کی جائے۔ یہ چکیاں دو اور سخت پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ ان کا اوپری پتھر گھومتا ہے اور نیچے والا ساکت رہتا ہے ان دونوں پتھروں کے درمیان گندم پستی ہے۔ کمانڈر کی یہ تجویز درجہ بدرجہ ہوتی ہوئی منگ شہنشاہ تک پہنچی اور اس نے اس کی منظوری دے دی۔ فوج تک حکم پہنچا کہ علاقے کے ہر گھر سے آٹا پیسنے والی چکیاں حاصل کر لی جائیں اور اگر کوئی انکار کرے تو اسے اس کے اہل خانہ سمیت قتل کر دیا جائے۔

منگ سپاہ نے اس حکم پر بہت سختی سے عمل کیا اور جن لوگوں نے چکیاں دینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا انہیں ان کے خاندانوں سمیت بے رحمی سے قتل کر دیا اور ان کے گھروں کو آگ لگا دی۔ اس کے بعد خوفزدہ عوام نے مزاحمت ترک کر دی اور سپاہی ہر گھر کی تلاشی لے کر وہاں پائی جانے والی ہر چکی اٹھا کر لے گئے۔ جن گھروں میں ایک سے زائد چکیاں تھیں ان کی تمام چکیاں اٹھالی گئیں۔ اطلاع پھیلنے پر لوگوں نے اپنی چکیاں چھپانی شروع کر دیں اس پر حکام نے یہ کیا کہ جس گھر سے چکی نہیں ملتی تھی اس کے تمام افراد کو برہنہ کر کے کمر تک زمین میں دفن کر دیا جاتا اور ان کی ننگی پشتوں پر اس وقت تک کوڑے برسائے جاتے جب

ہے۔ ایشیائی روس جو افریقا سے زیادہ رقبہ رکھتا ہے۔ منگولیا جس کی آبادی بمشکل ایک کروڑ ہے رقبے میں پورے مغربی یورپ سے بڑا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ملک بھی لاکھوں مربع میل پر مشتمل ہیں۔ ہزاروں سال پہلے جب ملک اور سرحدیں نہیں تھیں تو انسانوں کے پاس اتنی زمین تھی کہ وہ اور ان کے جانور آرام سے گزر بسر کرتے تھے۔ یہاں صحرا تھے، بڑے بڑے چٹیل بیابان تھے۔ ناقابل تسخیر پہاڑ تھے، دور تک پھیلے ہموار ترین میدان تھے اور تبت جیسی سطح مرتفع تھی۔ سمندر اور دریا تھے۔ بعض مقامات پر سارے سال بارش ہوتی تھی اور ایسی جگہیں بھی تھیں جہاں پانی سب سے نایاب اور قیمتی چیز سمجھا جاتا تھا۔ کہیں ایسا سبزہ کہ زمین نظر نہیں آتی اور کہیں ایسا بنجر کہ سبزے کا ایک پتا بھی نہیں ملتا تھا۔

ماحول اور زمین کے اس تنوع نے اس خطے میں ایسی رنگا رنگ تہذیبوں کو جنم دیا جو آپس میں میل نہیں کھاتی تھیں۔ جزیرہ نما عرب اور برصغیر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا اسی طرح چینی اور وسط ایشیائی تہذیبیں بالکل الگ تھیں۔ اصل میں ان کے درمیان میں اتنے فاصلے تھے کہ ان کا آپس میں نہ ہونے کے برابر تعلق تھا۔ تعلق نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہ گئیں۔ چین اور برصغیر کے بیچ ناقابل عبور ہمالیہ تھا اس لیے بالکل پاس ہونے کے باوجود ان کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں تھا اسی طرح جزیرہ نما عرب ایشیا کی اصل سرزمین سے متصل ہوا سو میل کی دوری پر ہے لیکن درمیان میں سمندر ہونے کی وجہ سے اس کا باقی ایشیا سے تعلق کٹ گیا تھا۔ مشرق بعید کا ایک بڑا حصہ جزائر پر مشتمل ہے اس خطے میں انڈونیشیا، ملائیشیا، فلپائن اور تائیوان کے جزائر آتے ہیں جو ایشیا کی زمین سے الگ ہیں مگر ان کا چین سے رابطہ تھا اس لیے یہاں کی تہذیب میں چینی نقش ملتے ہیں۔

تک وہ چھپائی ہوئی چکی کے بارے میں بتانے پر آمادہ نہ ہو جاتے۔ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا جاتا تھا۔

اس ظلم و ستم کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مہینے سے بھی کم عرصے میں دس لاکھ سے زیادہ چکیاں جمع ہو گئیں اور ان کی مدد سے پختہ سڑک بنا کر فوج کو سرحدی علاقوں کی طرف بھیج دیا گیا جہاں اس نے کامیابی سے حملہ آور خانہ بدوش قبائل کو مار بھگایا مگر اس کامیابی کی قیمت اس خطے میں بسنے والے لوگوں کو ادا کرنی پڑی جن کے پاس کھانے کے لیے گندم تھی لیکن اسے پیسنے کے لیے چکیاں نہیں تھیں۔ جو اکا دکا چکیاں بچ گئی تھیں وہ اتنی بڑی آبادی کی ضرورت کے لیے ناکافی تھی۔ چین ہمیشہ سے کثیر الآبادی ملک رہا ہے اور اس وقت بھی منگ سلطنت میں رعایا کی تعداد سات سے آٹھ کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔ جس علاقے سے لوگوں سے جبراً چکیاں لی گئیں وہاں آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ تھی اور صرف دو سال کے مختصر عرصے میں قحط بلکہ آٹے کی کمیابی نے لاکھوں افراد کی جان لے لی تھی۔ بڑے پکی گندم کھا کر بھی گزارا کر سکتے تھے لیکن بہت سے عمر رسیدہ اور چھوٹے بچے روٹی کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور وہی سب سے زیادہ اس قحط کا شکار ہوئے۔ پانچ سال کے عرصے میں مرنے والوں کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ انسانی تاریخ میں اسے پانچواں بڑا قحط شمار کیا جاتا ہے جس میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ ہلاک ہوئے اور اس کی وجہ خشک سالی نہیں تھی۔

☆☆☆

مصر میں سلطنت کا آغاز نیل کے ڈیلٹا سے ہوا تھا۔ اولین دارالخلافے ڈیلٹا کے ساتھ ساتھ آباد ہوئے۔ ان میں موجودہ قاہرہ ہی سب سے پہلا دارالخلافہ تھا جہاں شروع کے چار فرعون خاندانوں نے حکومت کی۔ آج سے تین ہزار سال پہلے تک قاہرہ ایک باقاعدہ شہر کا روپ اختیار کر چکا تھا لیکن اس وقت اس کا نام کچھ اور تھا۔ کیونکہ مصری تحریر سے ناآشنا تھے اس لیے ہمیں اس وقت قاہرہ کا نام نہیں معلوم ہے مگر قدیم فرعون خاندانوں نے یہاں بے شمار تعمیرات کیں۔ ان کے عالی شان محلات، امرا کے محلات، دفاتر اور عام افراد کے لیے مخصوص محلے تھے۔ مگر دریا کے شاخوں سے گھری دلدلی زمین ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی بڑی اور بھاری تعمیر نہیں ہوئی مگر ان تعمیرات کے لیے نزدیکی صحرا میں غزہ اور ممفس کے شہر موجود تھے جہاں آج دنیا کے سب سے بڑے اہرام اور قدیم عمارتیں موجود ہیں۔

قاہرہ میں بندرگاہیں تھیں اور یہاں اتنا اناج پیدا ہوتا تھا جو نہ صرف مصر بلکہ کئی ملکوں کی خوراک کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ دولت کا ایک انبار تھا جو محاصل کی صورت میں سرکاری خزانے میں چلا آرہا تھا۔ دولت بھی عظیم الشان شہر تھا اور لاکھوں کی رعایا تھی جو فرعونوں کی پرستش کرتی تھی کیونکہ فرعون ہمیشہ سے خود کو خدا کہتے تھے۔ عوام کو دبا کر رکھنے کا یہ سب سے بہترین طریقہ حکمرانی تھا اس کی کامیابی کا

اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً تین ہزار سال جاری رہنے والی سلطنت میں شاذ ہی ایسا موقع آیا جب عوام نے حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی۔ ورنہ اندرونی سازشیں اور بیرونی حملہ آور ہی حکمران تبدیل کرنے کا کام کرتے تھے۔ نیل کا ڈیلٹا بیرونی حملہ آوروں کے خلاف قدرتی حصار کا کام کرتا تھا۔ صرف چھوٹے تجارتی بحری جہاز اور کشتیاں ہی اس میں داخل ہو سکتی تھیں اور بڑے جنگی جہازوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ شاہی محلات اور اہم سرکاری دفاتر تک جانے والی نہریں بند کی جا سکتی تھیں سب سے بڑھ کر یہ جنوب سے آنے والے حملہ آوروں سے دور تھی۔ گویا یہ بہت محفوظ جگہ تھی۔

ہر ملک میں دارالحکومت اس ملک کا سب سے بڑا اور محفوظ شہر ہوتا تھا۔ یہ فطری سوچ تھی لیکن مصری حکمرانوں نے اس کے برعکس اپنا دارالحکومت نیل کے ڈیلٹا سے اوپر کی جانب منتقل کرنا شروع کر دیا۔ مقصد عوام سے دوری اور اپنا عیاشانہ طرز زندگی چھپانا تھا۔ حالانکہ حکمران تو ہر جگہ عیاش ہوتے ہیں۔ عوام ان کی عیاشیاں برداشت کرتی ہے۔ اس لیے دارالحکومت کی منتقلی سمجھ سے بالاتر تھی۔ یہی نہیں بلکہ آنے والے فرعون خاندان اپنا الگ دارالحکومت بناتے رہے اور وہ ہمیشہ جنوب کی طرف بڑھتے رہے گویا عوام اور ملک کے مرکز سے دور جاتے رہے۔ قاہرہ سے باہر بننے والے دارالحکومت عمارتوں کے لحاظ سے بہت بڑے اور شان و شوکت والے ہوتے تھے لیکن عوام سے خالی ہوتے تھے۔ ان شہروں میں صرف سرکاری اعمال، فوج اور خدمت گار رہتے تھے۔ عام افراد کو وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ خاندان بہ خاندان اور بعض اوقات فرعون بہ فرعون دارالحکومت منتقل ہوتے ہوتے نیل کے اوپری حصے میں جا پہنچے جہاں آج کل اسوان زیم ہے۔

دارالحکومتوں کی منتقلی سے یہ نتیجہ نکلا کہ بیرونی حملہ آور بغیر کسی مداخلت کے وہاں تک پہنچ جاتے تھے اور انہیں صرف فوج سے لڑنا پڑتا تھا۔ عوام کے نہ ہونے سے مدافعت کمزور پڑ جاتی تھی اور رسد بند ہو جاتی۔ اس لیے حملہ آور عام طور سے با آسانی قابض ہو جاتے تھے۔ جنوب سے آنے والے جنگجو قبائل اسی لیے کامیاب ہوئے اور کئی صدیوں تک مصر پر حکومت کرتے رہے۔ دوسری طرف رومی با آسانی مصر کے ساحلوں پر قابض ہو جاتے تھے۔ کیونکہ دارالحکومت یہاں سے دور تھے اور وہاں سے فوج اور حکم آنے میں تاخیر ہوتی تھی۔ کئی بار شام اور عراق کے حملہ آور صحرائے سینا پار کر کے مصر تک آ گئے۔ اگرچہ ہر بار مصریوں نے بیرونی حملہ آوروں کو بالآخر پسپا کر دیا لیکن اس سے مصر کو نقصان بھی ہوا۔ اس کی وحدت کمزور ہوئی اور عوام میں بیرونی آقاؤں کو قبول کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ سکندر اعظم کے جنرل بطلیموس کے تحت کے بعد مصر مکمل طور پر غیر ملکیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے بعد سے عام طور سے غیر ملکی ہی یہاں کے حکمران رہے اور خاص مصریوں کو اپنے ملک پر حکومت کرنے کا موقع کم ملا۔ مسلم دور میں ملک کا کلچر مکمل طور پر بدل گیا اور مصر افریقی سے عرب ایشیائی تہذیب کا حامل ملک بن گیا۔ اسلام قدیم فرعونی مذہب سے بالکل مختلف تھا۔ اسلام سے قبل یہاں عیسائی حکمران تھے مگر عیسائیت ملک کا اکثریتی مذہب نہیں تھا۔ اکثر مصری اپنے قدیم مذہب پر قائم تھے۔ انہوں نے بعد میں اسلام قبول کیا اور عیسائیوں کی اکثریت عیسائی رہی جو آج بھی مصر میں اقلیت کے طور پر آباد ہے۔

سیاست میں دارالحکومت کی بنا سوچے سمجھے منتقلی کو فاش غلطی سمجھا جاتا ہے اور اکثر اس کے نتائج ملکوں کے حق میں اچھے نہیں نکلتے ہیں۔ عوام کا حکمرانوں کے پاس رہنا شاید حکمرانوں کے لیے اچھا نہ ہو لیکن ملک کے لیے ضرور اچھا ہوتا ہے۔ دور جدید میں پاکستان اور ترکی میں دارالحکومتوں کی منتقلی کا اثر اچھا نہیں ہوا۔ دونوں ملکوں میں علیحدگی پسند رجحانات کو تقویت ملی تھی۔ پاکستان کا مشرقی بازو الگ ہوا اور ترکی میں کرد علیحدگی پسندوں نے سر اٹھایا۔ یہ تحریک بدستور جاری ہے۔ اس کے برعکس روس، برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک میں دارالحکومتوں کے تسلسل سے ان ملکوں کو سپر پاور بننے میں مدد ملی۔ افغانستان جیسا چھوٹا اور کمزور ملک بھی اس لیے مستحکم ہے کہ وہاں کا دارالحکومت صدیوں سے کابل چلا آ رہا ہے۔ صدیوں بعد مصری حکمران بھی قاہرہ کو دارالحکومت بنانے پر مجبور ہوئے جو اس ملک کا فطری دارالحکومت ہے۔

ماہرین فرعونوں کے اس اقدام کی حکمت وجہ کار حکومت میں پجاریوں کی مداخلت قرار دیتے ہیں جو نیل کے ڈیلٹا کے زرخیز حصوں پر قابض تھے۔ شاید پجاری خود بھی چاہتے تھے کہ حکمران یہاں سے دور چلے جائیں تاکہ وہ عوام سے رابطے میں نہ رہیں اور سکون سے دولت سمیٹتے رہیں۔ پھر حکمران اور عوام کے درمیان رابطہ بھی وہی بن جاتے اور عوام کی آڑ میں فرعونوں سے اپنے مطالبات منوا سکتے تھے۔ فرعون عوام سے دوری کی وجہ سے بے خبر رہتے کہ یہ مطالبات اصل میں عوام کے نہیں بلکہ ان پجاریوں کے

ہیں۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو ان حکومتوں کی مسلسل نااہلی نے مصر کو ہمیشہ ایک بین الاقوامی طاقت بننے سے روکا حالانکہ فوج اور دولت کے لحاظ سے مصر اس قابل تھا کہ روم اور ایران کے ساتھ اس وقت کی سپر پاور ہوتا۔ رومنوں نے تقریباً سارے یورپ کے ساتھ ایشیا اور افریقا میں بھی مقبوضات بنا رکھے تھے۔ ایران وسط ایشیا، افغانستان اور بلوچستان پر قابض تھا۔ عرب کے اکثر حصوں پر اس کا براہ راست اثر تھا اور یمن میں ایرانی گورنر حکومت کرتا تھا۔ مگر مصریوں کو شاذ ہی اپنی سرحدوں سے باہر نکلنے کا موقع ملا وہ بھی کبھار شام یا سوڈان پر قابض ہو جاتے تھے مگر ان کا قبضہ محدود ہوتا تھا۔ اس سے آگے وہ کبھی نہیں جا سکے البتہ روی جنوب کے حبشہ سے اور کبھی شمال کبھی مصر تک چلے آتے تھے یا اس پر قابض ہو جاتے تھے۔

☆☆☆

یمن جزیرہ نما عرب کا ہمیشہ سے شورش زدہ حصہ رہا ہے۔ مختلف ادوار میں یہ مختلف بیرونی طاقتوں کے قبضے میں رہا۔ حضرت سلیمان کے دور میں ایک طرح سے بنی اسرائیل اس پر قابض ہو گئے تھے اور ان کا قبضہ بہت عرصے رہا۔ حتیٰ کہ جب رومنوں نے بیت المقدس تباہ کر کے یہودیوں کو منتشر کر دیا اور کچھ عرصے بعد عیسائیت نے ایشیا اور یورپ پر غلبہ حاصل کر لیا تب بھی یہودی یہاں قابض رہے تھے اور انہوں نے یہاں خاص طور پر عیسائیوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا تھا پھر یہاں ایرانی قابض ہو گئے اور اس کے بعد یہاں حبشہ سے تعلق رکھنے والے عیسائی آ گئے۔ جب تک مسلمانوں کے قدم یہاں تک نہیں پہنچے تب تک عیسائی ہی یہاں کے حکمران تھے۔ لیکن اس سارے دور میں مقامی باشندے بت پرستی پر قائم رہے یا پھر وہ دین ابراہیمی کی پیروی کرتے تھے۔ یہودیت یا عیسائیت سے انہیں رغبت نہیں تھی۔ سیاسی طور پر ان کے غلبے کے باوجود انہوں نے اپنا مذہب ترک نہیں کیا تھا۔

مکہ اور خانہ کعبہ اس وقت بھی پورے عرب کا روحانی مرکز تھا اور کٹر بت پرست بھی اس کی تعظیم کرتے تھے۔ جب حبشہ والے یہاں قابض ہوئے تو انہیں مکہ اور کعبہ کی یہ برتری ناگوار گزری۔ فطری طور پر ان کی خواہش تھی کہ عرب بھی عیسائیت قبول کر لیں مگر عربوں اور خاص طور سے یمنیوں کا رجحان اس طرف نہیں تھا۔ حبشہ کی طرف سے ابرہہ نامی گورنر یہاں آیا تو اس نے عیسائیت کی ترویج کے لیے انتہائی کوشش کی مگر اس کی کوششوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ حد یہ کہ اس نے ایک شاندار عمارت تعمیر کرائی اور اعلان کیا کہ اب کعبہ کی جگہ یہاں حج کیا جائے گا۔ مقامی عربوں نے اس کا جواب یوں دیا کہ کسی نے چپکے سے اندر گھس کر رفع حاجت کر لی۔ ابرہہ نے مشتعل ہو کر مکہ پر حملہ کر کے خانہ کعبہ کو ڈھا دینے کا فیصلہ کیا۔ ابرہہ اور اس کے حملہ آور لشکر کے ساتھ جو گزری اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اور ہمیں تاریخ سے بے شمار روایات ملتی ہیں۔

ابرہہ کے اس عمل نے عربوں اور خاص طور سے یمنیوں میں عیسائیوں سے نفرت انتہا کو پہنچا دی۔ ابرہہ اور اس کا لشکر برباد ہوا تھا پھر نصف صدی بعد اسلام کا غلغلہ بلند ہوا اور یمن تک اس کی صدا پہنچی تو اسلام کی سرکاری آمد سے پہلے ہی یمن کا بڑا حصہ اسلام بگوش ہو چکا تھا اور اس کی بنیادی وجہ خانہ کعبہ کا اسلام کا مرکز ہونا تھا۔ جب دنیا کا روحانی مرکز اسلام کا روحانی مرکز بنا تو اس نے خود بہ خود سارے عرب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کافر اور دین ابراہیمی سے تعلق رکھنے والے اسلام کا حصہ بن گئے کیونکہ خانہ کعبہ دونوں کی عبادتوں کا مرکز تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ابرہہ نے غلط حکمت عملی اختیار کی اور عیسائی اقتدار کا خاتمہ کر لیا ورنہ ممکن ہے کہ شام کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں کو کسی بڑی جنگ کے بعد یمن پر غلبہ حاصل ہوتا۔ شام کی جنگوں میں مسلمانوں کا جو عظیم جانی نقصان ہوا وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ یمن میں مسلمان اس نقصان سے بچ گئے اور بنا کسی خاص لشکر کشی کے یہ اہم ترین خطہ اسلام کا حصہ بن گیا۔

یمن کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ افریقہ کی مشرقی ساحلی پٹی کے دہانے پر ہے اور یہاں سے اس سارے علاقے میں اسلام پھیلا۔ دوسری صدی ہجری تک یہ پورا علاقہ تنزانیہ تک مسلمان ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس شام اور عراق و ایران فتح کرنے کے باوجود وسط ایشیا اور موجودہ ترکی میں اسلام چھٹی صدی ہجری میں داخل ہوا اور یہاں بھی مسلمانوں کو بے انتہا جنگیں لڑنا پڑیں۔ وہ امن و امان جو تبلیغ کے لیے لازمی ہے یہاں عنقا تھا۔ یمن میں امن تھا اور یہاں سے اسلام آگے بہت تیزی سے پھیلا۔ یمنی سے مسلمان تاجر انڈونیشیا، ملائیشیا، فلپائن اور مالدیپ تک پہنچے اور یہاں بنا کسی جنگ اور خون خرابے کے اسلام پھیلا۔ اسی طرح برما اور تھائی لینڈ کی ساحلی آبادیاں بھی مسلمان ہوئیں اور یہاں دنیا کے مسلمانوں کی بیس فیصد تعداد آباد ہے۔

سائنسی خطائیں

غلط نظریہ

مریم کے خان

دنیائے سائنس میں کسی نظریہ کو قائم کرنے سے پہلے حقیقت کی چھلنی سے چھانا جاتا ہے۔ تحقیق کی کٹھالی میں اسے کندن بنایا جاتا ہے تب کہیں اُسے پیش کیا جاتا ہے مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ عرصہ دراز تک جس سائنسی نظریہ کو برس حقیقت سمجھا جاتا رہا وہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔ ایسے ہی چند اغلاط بھرے نظریوں کا تذکرہ۔

سائنس کے وہ غلط اصول جو عرصے تک سچ کہلاتے رہے

"ارے میاں تم کیا جانو۔ سائنس بے کوئی مذہب تھوڑی ہے جو اپنی مرضی سے کچھ بھی شامل کر لو یا نکال دو۔ تحقیق ہوتی ہے سائنسداں اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ وہ ایک ایک چیز چھان پھٹک کر ہی کوئی نتیجہ نکالتے ہیں۔"

مندرجہ بالا بات میرے خالو کی تھی۔ بحث اس بات پر تھی کہ سائنس اور سائنس داں بھی غلط ہو سکتے ہیں۔ خالو خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں اور جدید سائنس پر ان کا پختہ ایمان ہے جیسا کہ مذکورہ جملے سے ظاہر ہے۔ میرا خیال تھا کہ سائنس

خطا کرتی ہے کیونکہ سائنس الگ سے کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ہم انسانوں سے متعلق ہے۔ اور جب انسان ہر شعبے میں خطا کر سکتا ہے تو سائنس کے میدان میں کیوں نہیں کر سکتا۔ خالو سے بحث کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس بارے میں میرا علم کم ہے اور مجھے اس بارے میں باقاعدہ جاننا چاہیے۔ آج کل ریسرچ اور چھان بین کے لیے سب سے بہترین طریقہ انٹرنیٹ ہے۔ اگرچہ انٹرنیٹ پر بھی غلط معلومات کی بھرمار ہے لیکن آدمی کوشش کرے تو اپنے مطلب کی چیز حاصل کر ہی لیتا ہے۔

جب میں نے انٹرنیٹ پر سائنس کی تاریخ اور اس کی غلطیاں کھنگالنا شروع کیں تو کئی دلچسپ اور حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ ان ہی دنوں اتفاق سے سرگزشت کے خطا نمبر کی آمد کا انکشاف ہوا اور میں نے مناسب سمجھا کہ اپنی تحقیق کو سرگزشت کے صفحات کی نظر کروں تاکہ میرے خالو جیسے اور بھی بہت سے لوگ جو سائنس کو بے خطا سمجھتے ہیں وہ جان لیں کہ ابتدائی زمانے سے آج تک کتنے سائنسی نظریات جن کو مغرب میں بعض اوقات مذہبی اعتقاد کا درجہ دے دیا گیا تھا قطعی غلط ہیں اور ان کی غلطی پکڑی جا چکی ہے۔ صرف قدیم زمانے میں ہی نہیں بلکہ جدید سائنس میں بھی ایسی غلطیوں کی بھرمار ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب سائنسی تحقیق اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے کہ کوئی بھی غلط دریافت یا نظریہ زیادہ دن اپنی جگہ برقرار نہیں رکھ سکتا اور جلد یا بدیر اسے غلط ثابت کر دیا جاتا ہے جب کہ پہلے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔

آج سے ہزاروں سال پہلے مصر، عراق اور چین کی سلطنتوں میں سائنسی تحقیق کا کام جاری تھا اور اس کا ثبوت ان کی ترقی اور قوت تھی کیونکہ کوئی بھی ملک اور قوم سائنس اور مخصوص علوم میں ترقی کیے بغیر طاقتور نہیں بن سکتی ہے۔ مگر آج ہمیں بتایا جاتا ہے کہ سائنس کا آغاز اصل میں یونان سے ہوا تھا اور ان تہذیبوں کی کاوشوں کا بالکل ذکر نہیں ہوتا۔ آج کی مغربی سائنس نہ صرف ان قدیم تہذیبوں بلکہ تقریباً آٹھ سو سالہ مسلم دور کو جب تجرباتی سائنس نے عروج حاصل کیا تو قطعی نظر انداز کر کے اپنا رشتہ براہ راست یونانی سائنس سے جوڑتے ہوئے بالکل نہیں شرماتی ہے۔ حالانکہ زمانہ قدیم میں معمولی استعمال کی چیز بھی یورپ میں ایجاد نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ یونان میں اس دور میں فلسفی اور سائنسداں تھے لیکن ان کے بیشتر نظریات غلط تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود انہیں سائنسی

تحقیق کا بانی کہا جاتا ہے حالانکہ انہوں نے جو سائنسی طریقہ کار اپنایا ہوا تھا وہی غلط تھا اور اسے سائنس کی سب سے بڑی خطا کہا جائے تو بے جا نہ ہو۔ سقراط، ارسطو اور افلاطون کے یونان میں سائنسی تحقیق زبانی ہوتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ بحث مباحثے کی مدد سے کوئی بھی بات ثابت کی جا سکتی ہے اور کسی بھی حقیقت تک پہنچا جا سکتا ہے۔ تجرباتی سائنس کا کوئی تصور نہیں تھا اور اسے حماقت سمجھا جاتا ہے۔

زبانی تحقیق کا کس قدر شہرہ تھا اور یہ یونان میں کس حد تک رائج تھی اس کا اندازہ اس مشہور واقعے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ایک محفل میں بحث ہو رہی تھی کہ گھوڑے کے منہ میں کتنے دانت ہوتے ہیں۔ بحث کرنے والے اپنے اپنے تخمینے لگا رہے تھے کہ گھوڑے کا دانت اتنا بڑا ہوتا ہے اور منہ کا سائز یہ ہے اس لیے اتنے دانت ہوں گے۔ دوسرے اس سے اختلاف کر رہے تھے۔ وہ اپنے اندازے پیش کر رہے تھے اور بحث سے اسے ثابت بھی کرنا چاہتے تھے۔ اس پر ایک نسبتاً کم پڑھا لکھا شخص جو خاموشی سے بحث سن رہا تھا اس نے کہا کہ اتنی بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے، سامنے گھوڑا کھڑا ہے اس کا منہ کھولو اور دانت گن لو۔ اس پر اہل محفل نے اس بے چارے کو جاہل قرار دیا اور محفل سے نکال باہر کیا۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یونانی سائنس کس نہج پر استوار تھی اور کتنے درست سائنسی نظریات پیش کرنے کی اہل تھی۔ اس کے باوجود اہل مغرب جدید سائنس کو براہ راست یونانی سائنس سے جوڑنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے خطے سے تعلق رکھتی تھی۔

آئیے اب ذرا یونانی سائنس کے ان غلط نظریات کی بات کرتے ہیں جو صدیوں تک درست سمجھے جاتے رہے۔ دوسری صدی عیسوی میں گیلان نامی سائنس داں نے حیرت انگیز انکشاف کیا کہ جسم میں خون کی گردش کا ذمے دار جگر ہے (جی ہاں دل نہیں ہے) جگر نہ صرف صفرا اور خون بناتا ہے بلکہ یہ اسے سارے جسم میں دوڑاتا بھی ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ جو ملک جنگجوئی کے لیے مشہور ہو اور جہاں جنگیں تہواروں کی طرح ہوتی تھیں۔ جہاں ہر سال ہزاروں افراد جنگوں میں مارے جاتے تھے۔ ان کے جسم کٹ پھٹ جاتے تھے۔ وہاں ایک نہایت اعلیٰ درجے کا سائنس داں اس قدر احمقانہ نظریہ پیش کرے گا۔ جو بات بالکل جاہل قبائلی بھی جانتے تھے۔ گیلان اس سے بے خبر تھا اور اس نے نہایت غلط طور پر جگر کو خون کی گردش کا ذمے دار

قرار دے دیا۔ مزے کی بات ہے اہل یونان نے اس پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا اور آنے والی کئی صدیوں تک اسی بات پر یقین کیا جاتا رہا ہے کہ جگر خون کی تقسیم کرتا ہے۔

جس شخص نے سب سے پہلے خون کی درست ترین سرکولیشن کو بیان کیا وہ مشہور مسلم سرجن الرازی تھا۔ الرازی نے صرف سرجری کے میدان میں کمال حاصل نہیں کیا بلکہ اس نے انسانی جسم کی تشریح کے علم کی بنیاد رکھی جسے آج کل اینا ٹومی کہا جاتا ہے۔ الرازی نے تقریباً ٹھیک ٹھیک وضاحت کی کہ جسم کا کون سا عضو کیا کام کرتا ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ دل خون کی گردش کا کام کرتا ہے۔ اس کے پمپ کرنے سے خون پورے جسم میں ہر جگہ پہنچتا ہے۔ مگر مغربی سائنسی ماہرین اس کا سہرا انگلینڈ کے ڈاکٹر ولیم ہاروے کے سر باندھتے ہیں جس نے 1628ء میں انکشاف کیا کہ دل خون پمپ کرتا ہے۔ الرازی کے تقریباً سات سو سال بعد۔ لیکن الرازی سے قطع نظر مسلسل سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں بہت سے لوگ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ گیلان کا نظریہ غلط ہے مگر چرچ کی طرف سے قدیم یونانی سائنس کو الہامی درجہ دیئے جانے کے بعد اس کا انکار جرم سمجھا جاتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نظریے کو غلط ثابت کرنے میں اتنا عرصہ لگ گیا۔

دوسرا انتہائی غلط سائنسی نظریہ جو یونانی سائنس سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دوسری صدی عیسوی میں ماہر فلکیات بطلیموس کا پیش کردہ تصور تھا کہ زمین نظام شمسی کا مرکز ہے اور سورج سمیت دیگر تمام اجرام فلکی اصل میں اس کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ نظریہ واضح طور پر یونانی دیومالا سے لیا گیا تھا جس میں زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ صرف سورج اور چاند کی مختلف گردشوں سے با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ زمین نظام شمسی کا بھی مرکز نہیں ہے بلکہ سورج مرکز ہے اور زمین سمیت باقی تمام سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں۔ اس خیال کی تردید بھی سب سے پہلے مسلمان ماہرین فلکیات اور جغرافیہ کے ماہرین نے کی۔ ان میں سب سے نمایاں نام الکندی کا تھا۔ یہ نہ صرف فلکیات بلکہ جغرافیہ کا بہت بڑا ماہر تھا۔

اس کے بنائے گئے نقشے اس وقت ساری دنیا کے جہاز ران استعمال کرتے تھے۔ اسی نے سب سے پہلے اصطرلاب کی مدد سے یہ واضح کیا کہ نظام شمسی کا مرکز زمین نہیں ہے۔ اس نے ایک مصنوعی کرہ بنایا اور اس کی مدد سے نظام شمسی کی اصل تصویر دکھائی۔ مگر افسوس کہ آج بہت کم لوگ اسے اور اس کی دریافتوں کو جانتے ہیں۔ وہ اولین شخص تھا جس نے زمین کے گول ہونے کا تصور بھی پیش کیا کیونکہ یونانی سائنس زمین کو چپٹا تصور کرتی تھی۔ الکندی جغرافیہ کا اتنا بڑا ماہر تھا کہ آٹھ سو سال پہلے بنایا ہوا اس کا دنیا کا نقشہ آج کے نقشے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ حالانکہ اس وقت امریکا دریافت نہیں ہوا تھا مگر الکندی نے نقشے پر شمالی امریکا لکوریڈا تک، کیوبا اور وسطی امریکا کی پٹی کو واضح کیا۔ اس نے افریقا، ایشیا اور یورپ کے بحیرہ روم کے ساحلوں کا درست ترین نقشہ بنایا۔ کہتے ہیں کہ کولمبس اسی کے بنائے نقشوں کی مدد سے امریکا تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔

مغربی دنیا اس کا سہرا سولہویں صدی کے ماہر فلکیات کوپرنیکس (جو خود مسلم اساتذہ کا تربیت یافتہ تھا۔ اس نے جو کتابیں پڑھی تھیں وہ ساری کی ساری مسلمانوں نے لکھی تھیں) 1543ء میں کوپرنیکس نے اپنے ایک مقالے میں خیال پیش کیا کہ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے اور تمام سیارے اور ان کے ذیلی سیارے اس کے گرد ایک مخصوص مدار میں گردش کرتے ہیں۔ اس نے نظام شمسی کا ایک ماڈل پیش کیا تھا۔ جو غلطیوں سے پر تھا اور ان غلطیوں کو بعد میں سر آئزک نیوٹن نے درست کیا تھا۔ کوپرنیکس نے سیاروں کے مدار کو گول قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے گول مدار کو درست ترین صورت قرار دیا مگر بعد میں ثابت ہوا کہ سیاروں اور ان کے ذیلی سیاروں کے مدار گول نہیں بلکہ بیضوی ہوتے ہیں۔

کوپرنیکس دمدار ستاروں کی وضاحت کرنے سے بھی قاصر رہا تھا کیونکہ وہ اس کے گول مدار کے تصور پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ہیلی کا دمدار ستارہ قبل مسیح سے دیکھا جا رہا ہے اور اس کا اولین ریکارڈ تقریباً چار ہزار سال پہلے کا ہے جب مصری ماہرین فلکیات نے اس کا ذکر تصویری تحریر کی مدد سے کیا۔ دمدار ستارے انتہائی بیضوی مدار میں سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ چند سال سے لے کر کئی ہزار سال تک کے وقفے سے نظام شمسی میں داخل ہوتے ہیں اور سورج کے بالکل قریب سے چکر لگا کر واپس چلے جاتے تھے۔ دمدار ستاروں کے علاوہ آسمان پر نظر آنے والے نظام شمسی کے بعید اور قریب سیاروں کی پوزیشن بھی جو بدلتی رہتی تھی اگر یہ ستارے زمین کے گرد گھوم رہے ہوتے تو ان کی پوزیشن یوں نہ بدلتی۔ بلکہ یہ ہمیشہ ایک ہی جگہ رہتے۔ یہ بھی کوپرنیکس ماڈل کے خلاف تھی۔

حسب معمول یونانی سائنس کے اسیر کرسچن چرچ نے کوپرنیکس کی دریافت کو ماننے سے انکار کر دیا اور بدستور

زمین کے مرکز ہونے پر اصرار کیا۔ کوپرنیکس کے نظریے کو یورپ کے سائنسی حلقوں میں پذیرائی ملی مگر چرچ اور اس کے زیرِ اثر عوام اس سے دور رہے۔ حد یہ کہ سو سال بعد تاپید ہو جانے والے سائنس داں گلیلیو کو کوپرنیکس کی حمایت اور زمین کو نظامِ شمسی کا مرکز نہ ماننے پر سزا دی گئی اور اسے بہت صبرناک حالات سے گزرنا پڑا تھا۔ اس نے ان جہلا سے معافی مانگ کر جان چھڑائی تھی ورنہ وہ اسے سزائے موت دینے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ گلیلیو ہی تھا جس نے سب سے پہلے دوربین کی مدد سے سیارہ مشتری کے چاند دریافت کیے اور اس نے لوگوں کو دکھایا بھی کہ یہ چاند مشتری کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ واضح تردید تھی کہ ہر چیز زمین کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے باوجود اسے اور کوپرنیکس کو جھٹلا دیا گیا۔

چرچ کے اسی رویے کی وجہ سے جب سائنس نے مغرب کے معاشرے پر غلبہ پایا تو سائنس کے شیدائیوں نے اسے مذہب کا درجہ دے دیا اور سائنسی دریافتوں اور نظریات کو ایمان کا حصہ بنا لیا تھا۔ یہ دوسری قسم کی انتہا پسندی تھی جو چرچ کے ردِعمل میں پیدا ہوئی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ آج بھی جاری ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سائنسی نظریے یا دریافت سے اختلاف کرے تو اسے بہت عجیب انداز میں لیا جاتا ہے جیسے اختلاف کرنے والے نے کوئی ناممکن بات کہہ دی ہو۔ سائنس غلطی کرے ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ سائنس بھی غلطی کرتی ہے اور اس کے نصف سے زائد نظریات اور دریافتوں میں یا تو بنیادی تبدیلی ہوتی ہے یا وہ سرے سے رد کر دی جاتی ہیں۔ قدیم سائنس یعنی یونانی سائنس کے تقریباً تمام نظریات اور خیالات ایک ایک کر کے رد کیے جا چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے نظریات بھی بدل چکے ہیں جو آج سے بیس یا تیس سال پہلے تک سائنس کی بنیادوں میں شامل کیے جاتے تھے۔

اس کی ایک مثال فزکس کا ایک نظریہ ہے کہ الیکٹرون کو حرکت سے نہیں روکا جا سکتا ہے صرف اس کی سمت تبدیل کی جا سکتی ہے اور اسی خیال نے گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں الیکٹرانکس کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا لیکن آج سے بیس سال پہلے امریکا کی برکلے لیب میں ایک انوکھا تجربہ کیا گیا جب ماہرین نے الیکٹرون کی حرکت کو بہت مختصر وقت کے لیے روک دیا۔ یہ وقت اتنا کم تھا کہ سیکنڈ کے کروڑویں حصے کے برابر تھا لیکن اس دریافت نے الیکٹرانکس کی صورت بدلنا شروع کر دی ہے۔ آج آپ کے کمپیوٹرز اور موبائل میں جو میموری چپس کام کر رہی ہیں وہ اسی خیال کی وجہ سے وجود میں آئیں۔ اب تک معلومات کو صرف مقناطیسی طریقے سے محفوظ کیا جاتا تھا مگر اب بہت چھوٹی میموری چپس میں بہت زیادہ معلومات اسٹور کر کے رکھی جا سکتی ہیں۔ اس دریافت سے اُمید ہے کہ مستقبل میں الیکٹرانکس آلات کے توانائی کے استعمال میں ڈرامائی کمی آئے گی۔ آنے والے دور میں اسی دریافت کی مدد سے الیکٹرانکس کے آلات مسلسل برقی توانائی کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

جدید سائنس کس قدر غلطی کر سکتی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک یعنی اب سے کوئی سوا سو سال پہلے تک ڈاکٹر اور سرجن آپریشن کے اوزار پکڑنے سے پہلے ہاتھ دھونا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں جراثیم کوئی نقصان دہ چیز نہیں تھے۔ اس لیے وہ کسی جراثیم کش محلول سے (جو کئی ہزار سال سے الکوحل کی صورت میں عام دستیاب ہے) ہاتھ صاف نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اپنے اوزاروں کو صاف کرتے تھے۔ اس وقت تک نہ صرف عام بیکٹیریا بلکہ وائرس بھی دریافت ہو چکے تھے اور یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ بہت سی مہلک اور جان لیوا بیماریاں اصل میں جراثیموں کی وجہ سے لاحق ہوتی ہیں۔

طاعون، چیچک، خسرہ اور ہیضہ جیسی بیماریاں جنہوں نے ایک زمانے میں دنیا کی بہت بڑی آبادی کو چند سالوں میں ختم کر دیا تھا۔ یہ سب جرثوموں سے پھیلتی ہیں۔ اس کے باوجود ڈاکٹر اور سرجن حضرات آپریشن یا زخموں کی رفوگری سے پہلے اپنے ہاتھ یا اوزار صاف کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عمل کی وجہ سے بیسویں صدی کے آغاز تک کتنی جانیں اس لیے ضائع ہو گئیں کہ ان کے زخموں کا احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے انفیکشن ہو گیا تھا۔ حیرت کی بات ہے انسان کم سے کم دو ہزار سال سے زخموں کی صفائی اور انہیں خراب ہونے سے بچانے کے مناسب طریقے بروئے کار لاتا رہا ہے۔ جیسے الکوحل سے صاف کرنا، پانی کھولا کر اس سے کپڑے، برتن اور آلات صاف کرنا اور زخموں کو داغنا۔ ان سب کا مقصد جراثیم کو ختم کرنا ہوتا تھا۔

اگرچہ اس وقت انسان جراثیم کے بارے میں قطعی لاعلم تھا مگر قدیم انسان کو بھی معلوم تھا کہ زخموں کو اگر گندے ہاتھوں، کپڑے یا اوزار سے چھوا جائے تو وہ خراب ہو جاتے

ہیں۔ ان میں بھی پڑتا ہے اور بعض اوقات یہ خرابی جان لیوا بھی ثابت ہوتی ہے۔ برصغیر میں عام دیہاتی بھی مختلف جڑی بوٹیوں سے زخموں کی صفائی کرنا جانتے تھے اور وہ بھی احتیاطی تدابیر استعمال کرتے تھے مگر انگلینڈ اور دیگر یورپی ممالک میں سرجن کا صفائی سے گریز حیرتناک ہی کہا جا سکتا ہے۔ انگلینڈ اور فرانس کی صد سالہ جنگ کے دوران میں ہزاروں لاکھوں سپاہی جو معمولی زخمی ہوئے تھے اسی وجہ سے دوران علاج انتقال کر گئے۔ سول وار اور جنگ عظیم اول کے دوران میں سب سے پہلے جرمن اور امریکن سرجنوں نے اس طرف توجہ دی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ اور آلات صاف کرنا شروع کیے۔

اس مقصد کے لیے پہلے الکوحل استعمال کی جاتی تھی اس کے بعد مصنوعی جراثیم کش تیار ہونے لگے۔ فینائل اور پنسلین کی ایجاد کے بعد زخم میں انفیکشن سے مرنے والوں کی تعداد میں ڈرامائی کمی آئی تھی مگر اس سے پہلے جدید سائنس کی اس غلطی نے یقیناً بہت سے ایسے لوگوں کی جان لی جن کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ڈاکٹر جراثیم کش احتیاطی تدابیر پر عمل کرنے لگے تھے اور اسی وجہ سے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں زخمی ہونے والے تقریباً دس کروڑ افراد کی جان بچائی جا سکی جن کے زخم کم گہرے تھے۔ دوسری صورت میں یہ سب مر چکے ہوتے۔

جدید سائنس کی ایک اور حیرت انگیز غلطی ڈی این اے کی افادیت کو نظر انداز کرنا ہے۔ ڈی این اے انسانی خلیے میں موجود جینیاتی مواد کو کہتے ہیں یہ Deoxyribo Nucleic Acid کا مخفف ہے۔ اس کی خلیے میں وہی اہمیت ہے جو ایک کمپیوٹر میں ہارڈ ڈسک کی ہوتی ہے جس میں تمام تر معلومات محفوظ ہوتی ہیں، اسی طرح ایک ڈی این اے میں انسان کی تمام خصوصیات محفوظ ہوتی ہیں۔ یہ پروگرام ہے جس کے تحت خلیے بڑھ کر ماں کے پیٹ میں ایک انسان کی تشکیل کرتے ہیں۔ ڈی این اے کی معلومات طے کرتی ہیں کہ آپ کی جلد کا رنگ کیا ہوگا، آنکھوں کا رنگ اور بال کیسے ہوں گے، نیز آپ کے نقوش کیا ہوں گے۔ جسمانی بڑھوتری یعنی قد و قامت اور تن و توش پیدائش کے بعد کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر امریکا میں بسنے والے سیاہ فام اکثر بھاری بھرکم جسامت رکھتے ہیں لیکن بالکل ان کی نسل کے لوگ شمالی اور جنوبی افریقہ میں دبلے ہوتے ہیں۔ یہ فرق خوراک اور ماحول کے فرق سے پڑتا ہے۔

ڈی این اے ایک ایسی ہارڈ ڈسک ہے جس میں صدیوں سے معلومات جمع ہو رہی ہیں اور یہ نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں۔ کاربن، نائٹروجن اور چند دوسرے عناصر سے بنا ڈی این اے گھومتی ہوئی سیڑھی نما ساخت رکھتا ہے۔ جیسی کہ اکثر گھروں میں گھومتی سیڑھیاں اوپر جا رہی ہوتی ہیں۔ اسی سیڑھی نما ساخت میں معلومات یوں پوشیدہ ہوتی ہیں کہ خلیے کے لیے انہیں پڑھنا آسان ہوتا ہے لیکن جب انسان نے اسے پڑھنے کی کوشش کی تو اس کوشش میں کوئی دس سال اور کوئی ایک سو پچاس ارب ڈالرز کی خطیر رقم خرچ ہوئی تھی۔ جس زمانے میں یہ رقم خرچ ہوئی تھی اس وقت پاکستان کی کل آمدنی ایک سو ارب ڈالرز بھی نہیں تھی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ڈی این اے کو پڑھنا کس قدر مشکل اور مہنگا عمل ہے لیکن ڈی این اے کے اس جینیاتی نقشے سے مستقبل میں بہت سی بیماریوں کے علاج کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ کینسر کی قبل از وقت روک تھام ہو سکے گی اور نقائص والے بچوں کی پیدائش سے پہلے ان کے جسمانی نقائص درست کر دیے جا سکیں گے۔

لیکن کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ اس قدر اہم دریافت کی بیسویں کے نصف تک سائنس کی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی اور وہ اسے انسانی جسم میں ایک اضافی چیز سمجھا جاتا تھا جیسے ہاتھ اور پیروں کی چھوٹی انگلیاں جن کا بظاہر کوئی مصرف نہیں ہے کیونکہ سائنس داں اس پروٹین سے بنی سیڑھی نما ساخت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امن ہوا اور سائنسی تحقیق کا دور شروع ہوا تب سائنس دانوں نے پہلی بار ڈی این اے کی طرف توجہ دی اور جلد ہی اس کے شواہد سامنے آنے لگے کہ اس بہت چھوٹی سی شے میں بہت اہم معلومات پوشیدہ ہیں۔ انسانی خلیے کی جسامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف دماغی خلیوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق دس کھرب سے زیادہ ہے۔ ہر خلیے میں جینز ہوتی ہیں اور ان کی تعداد بھی ایک اندازے کے مطابق ڈیڑھ لاکھ ہوتی ہے۔ ڈی این اے جین سے بھی چھوٹا ہوتا ہے مگر اس کی ساخت حیرت انگیز ہوتی ہے اگر فرض کر لیا جائے کہ ڈی این اے کی چوڑائی ایک انچ ہے تو اس کی سیڑھی کھلنے پر سات میل لمبی ہوگی۔

جلد یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ کسی بھی جاندار جسم کی بنیاد بھی ڈی این اے ہے۔ چاہے وہ دنیا کا مختصر ترین وائرس ہو یا بلو وہیل جیسا جسیم جانور، سب کی تشکیل اسی ڈی

این اے کی ہدایت کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسے جیسے اس کے بارے میں انکشافات ہوتے جارہے ہیں۔ ڈی این اے پر تحقیق کی رفتار میں بھی تیزی آرہی ہے۔ کہاں صرف پون صدی پہلے بیکار سمجھا جانے والا ڈی این اے اب حیاتیاتی ماہرین کی نگاہ میں انتہائی اہم بن گیا ہے۔ اس کے بارے میں خیال کیا جارہا ہے کہ یہ صرف جسم کی تشکیل میں کردار ادا نہیں کرتا بلکہ ڈی این اے کی خفیہ تہوں میں ایسے راز بھی چھپے ہوئے ہیں جو ہمیں ہمارے آباؤاجداد کے بارے میں بتائیں گے کہ وہ کیسی زندگی بسر کرتے تھے اور انہیں کون کون سی بیماریاں لاحق تھیں۔ کچھ ماہرین تو اس سے بھی آگے جاکر اس کے لیے بھی پُراُمید ہیں کہ ڈی این اے میں ماضی کے راز ویڈیو اور آڈیو کی صورت میں محفوظ ہیں اور وہ اس کے لیے کوشاں ہیں کہ ان معلومات تک رسائی حاصل کرکے اسے دیکھ اور سن سکیں۔ گویا ہم ماضی کے بارے میں درست ترین بات جان سکیں گے۔ اس سے بہت ساری تاریخی حقائق کی تصدیق یا تردید ہوسکے گی۔

اب ہم دوبارہ قدیم یونانی سائنس کی ایک اور غلط تصوراتی کی طرف آتے ہیں۔ لفظ ایٹم یونانی کے لفظ ایٹوس سے نکلا ہے اس کے لغوی معنی ناقابل تقسیم کے ہیں۔ اس وقت کے یونانی فلسفی اس لفظ کو مادے کے مختصر ترین ذرے کی وضاحت کے لیے استعمال کرتے تھے جو اتنا مختصر ہوتا ہے کہ اسے مزید تقسیم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر ہم موجودہ معنوں میں ایٹم کا لفظ لیں تو یونانی فلسفی اسے ہرگز ان معنوں میں استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی فزکس کی معلومات نہایت مختصر اور غلطیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود آنے والی کم سے کم پندرہ صدیوں تک یہ غلط تصور قائم رہا۔ مسلمانوں نے فزکس کے میدان میں بہت کم کام کیا حالانکہ اس کی بنیاد یعنی ریاضی پر مسلمان اعلیٰ درجے کا عبور رکھتے تھے۔ اس کے باوجود وہ مادے کے قوانین دریافت نہیں کرسکے یا ان کی دریافت وقت کی گرد تلے دب کر رہ گئی۔ صرف ایک نام ایسا نظر آتا ہے۔ جس نے فزکس میں بہت کام کیا مگر اس کا کام خود مسلمانوں نے محفوظ نہ رکھا۔ اس کا نام جابر بن حیان ہے۔ چودھویں صدی میں آئزک نیوٹن نے سب سے پہلے مادے کے قوانین کی وضاحت کی اور یہیں سے ایٹم کی دریافت کا سفر شروع ہوا۔ جبکہ ابھی ایک بالکل نئی کتاب "سپر برینز ان اسلام" آئی ہے جسے یورپ کے کئی مصنفین نے مل کر مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں جابر بن حیان کے کلیے کا ذکر ہے جو اس نے ایٹم

پڑ رہے تھے۔

اس کے باوجود یہ سائنس اتنی پیچیدہ ثابت ہوئی کہ انیسویں صدی کے آخر میں جا کر سائنس دان یونانی نظریے کی تردید کر سکے کہ ایٹم ناقابل تقسیم ہے اور انگریز سائنس دان جے جے تھامسن نے سب سے پہلے کیتھوڈ رے ٹیوب کی مدد سے الیکٹرون دریافت کیا اور یہ بھی کہا کہ یہ ہر ایٹم کا لازمی حصہ ہے۔ یہیں سے ایٹم کے ناقابل تقسیم ہونے کا نظریہ شکست ہونے لگا۔ 1909ء میں ارنسٹ رتھرفورڈ کے ساتھ ارنسٹ مارسڈن اور ہانس گیگر نے سونے کی پرت پر ''الفا ذرات'' کی بارش کی اور اس کا حیرت انگیز نتیجہ نکلا۔ اس بارش نے ایٹم کے مرکزے کو بے نقاب کر دیا اور الیکٹرون کے منفی چارج کے مقابلے میں مرکزے کا مثبت چارج سامنے آیا۔ گویا ثابت ہو گیا کہ ایٹم میں بیک وقت مختلف طرح کا چارج رکھنے والے عناصر ہوتے ہیں اور اس کا مطلب ہے کہ ایٹم خود مختلف ذرات کا مجموعہ ہے نہ کہ ایک ہی ذرہ ہے۔

جلد ہی واضح ہو گیا کہ ایٹم تین بنیادی ذرات یعنی الیکٹرون، نیوٹرون اور پروٹون پر مشتمل ہے۔ اس میں نیوٹرون اور پروٹون مرکزے میں ایک ساتھ رہتے ہیں اور الیکٹرون ان کے گرد گردش کرتے ہیں سب سے سادہ یعنی ہائیڈروجن کے ایٹم میں نیوٹرون نہیں ہوتا ہے۔ یوں تقریباً دو ہزار سال تک مادے کی اکائی کے بارے میں غلط نظریہ رکھنے کے بعد بالآخر سائنس نے اسے درست کیا۔ مزے کی بات ہے سائنس اس درستی کے باوجود غلطی سے نہ بچ سکی اور ایٹم کے قابل تقسیم ہونے کے باوجود اکثر سائنس دانوں کا یہی خیال تھا کہ الیکٹرون ہی مادے کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے۔ مگر یہ غلطی زیادہ عرصے برقرار نہیں رہی اور فزکس کے ماہرین نے پہلے مزید چھوٹے ذیلی ذرات کا خیال پیش کیا اور جیسے جیسے ٹیکنالوجی ترقی کرتی گئی ویسے ویسے مزید ذیلی در ذیلی ذرات کی موجودگی کا ثبوت بھی ملتا جا رہا ہے۔

اب یہ حال ہے کہ درجنوں کی تعداد میں ذیلی ذرات دریافت ہو چکے ہیں اور سائنس دان ان کی بھی ٹوٹ پھوٹ پر بات کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ مادے کی یہ تقسیم کہاں جا کر رکے گی۔ یہاں ایک وضاحت اور کر دی جائے کہ بیسویں صدی کے سب انقلاب آفریں نظریہ یعنی نظریہ اضافیت جو آئن اسٹائن نے پیش کیا۔ اس میں بھی غلطی تھی۔ آئن اسٹائن کا نظریہ شعاعی تھا یعنی شعاعیں بے وزن اور بے بار ہوتی ہیں۔ یعنی یہ مادہ نہیں بلکہ توانائی کی قسم ہوتی ہیں۔ مگر کوانٹم تھیوری کے مطابق ہر قسم کا مادہ اور شعاعیں اصل میں ذرات پر مبنی ہوتی ہیں۔ آئن اسٹائن کے دور میں جرمن سائنسدان میکس پلانک نے اس کی تھیوری پیش کی مگر اسے پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ مگر اب ثابت ہو گیا ہے کہ ہر قسم کی شعاعیں چاہے وہ نظر آتی ہوں یا نہ نظر آتی ہوں، اور کشش ثقل بھی اصل میں ذرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ یوں آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت میں بھی خطا نکل آئی۔

یونانی سائنس کے زمانے سے ماحول اور آب و ہوا کے ماہرین کا خیال تھا کہ بارش ان علاقوں میں زیادہ برستی ہے جو زرخیز ہوتے ہیں اور جو علاقے بنجر ہوتے ہیں وہاں بارش کم ہوتی ہے۔ یہ ایک حد تک حقیقت بھی ہے۔ درخت اور پودے کسی علاقے میں بڑی تعداد میں ہوں تو وہ بارش کا سسٹم بہتر بناتے ہیں لیکن یہ سچ نہیں ہے کہ بارش زرخیز علاقوں میں زیادہ ہوتی ہے اور کم زرخیز علاقوں میں کم ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال امریکا میں ایریزونا اور آسٹریلیا کا عظیم صحرا ہے جس کی زمین اپنے اندر بہت زیادہ زرخیزی رکھتی ہے اور یہاں بہت بڑے پیمانے پر گندم اور مکئی کاشت کی جاتی ہے مگر یہاں سالانہ بارش کا تناسب کم اور غیر یقینی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پانچ سے چھ سال کم بارش ہوتی ہے اور پھر دو تین سال بہت زیادہ بارشیں ہوتی ہیں۔ یہاں زمین پانی جذب کر لیتی ہے اور یہی پانی خشک سالی کے دنوں میں فصلوں کی سینچائی میں استعمال ہوتا ہے۔ مزے کی بات ہے کہ یہ نظریہ امریکا اور آسٹریلیا کی دریافت کے بعد زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔ جب یورپ کے باسی پہلی بار ایسی زمینوں پر آباد ہوئے جو خشک تھیں اور جہاں بارش کا تناسب یورپ کے مقابلے میں بہت کم تھا۔

اس نظریے کی بنیاد یہ ہے کہ نمی زمین کی زرخیزی برقرار رکھتی ہے مگر اب سائنس کہتی ہے کہ خشکی زمین کی زرخیزی برقرار رکھتی ہے اور نمی اسے ختم کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امریکا اور آسٹریلیا میں زمین کے بہت بڑے رقبے مسلسل زیر کاشت لا کر ان کی زرخیزی کو تقریباً ختم کر دیا اور اب وہاں زرخیز زمین کی بجائے ریتیلے صحرا جنم لے رہے ہیں جن میں سوائے خاردار جھاڑیوں کے اور کچھ نہیں اگ سکتا ہے۔ اس وجہ سے اب سائنس دان زور دے رہے ہیں کہ زمین کو مسلسل کاشت کے بعد کچھ عرصے کے لیے چھوڑا جائے اور اس پر درخت لگا دیئے جائیں۔ درخت اور اس کے ساتھ بارش کے ذریعے آبپاشی زمین کو پھر سے زرخیز بنا دیتی ہے۔ نمی والے نظریے کی بنیاد پر ساری دنیا میں خشک

زمینوں کو کاشت کرنے کے لیے مصنوعی طریقہ آبپاشی اپنایا گیا اور دور دراز سے پانی لا کر زمینیں آباد کی گئیں۔ اس کا نتیجہ سیم و تھور کی وبا کی صورت میں نکلا اور اس نے کروڑوں ایکڑ زرخیز زمین کو بنجر کر دیا۔

بعض اوقات سائنس کسی عمل کی وضاحت نہیں کر پاتی تو اس کے لیے ایک خیالی نظریہ اپنا لیا جاتا ہے جس کا کوئی عملی ثبوت بھی نہیں ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک نظریہ آگ کی وضاحت کے لیے اپنایا گیا۔ انسان ابتدائی دور سے دیکھتا آ رہا ہے کہ آگ بعض چیزوں کو جلا دیتی ہے اور بعض چیزوں کو نہیں جلا پاتی۔ جو چیزیں جلتی ہیں وہ خود آگ کا ذریعہ بن جاتی ہیں جیسے لکڑی، کوئلہ، نباتی اور معدنی تیل، حیوانی چربی اور بعض قدرتی عناصر جو آگ پکڑ لیتے ہیں۔ پتھر، دھاتوں اور بہت ساری دوسری چیزوں کو آگ بالکل نہیں لگتی ہے۔ سائنس صدیوں سے اس پر غور کرتی رہی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بالآخر سترھویں صدی کے جرمن ڈاکٹر اور کیمیا کے ماہر جے جے بیکر نے خیال پیش کیا کہ جو چیز جل سکتی ہے اس میں لازمی فلوجسٹن نامی عنصر پایا جاتا ہے۔ یہ عنصر ہی اصل میں آگ کی بنیاد ہے اگر یہ کسی مادے میں موجود نہ ہو تو وہ جل نہیں سکتا ہے۔

1667ء میں پیش کیے جانے کے بعد حیرت انگیز طور پر پروفیسر بیکر کی یہ تھیوری فوری طور پر مقبول ہو گئی اور تمام سائنس داں اس پر دل و جان سے ایمان لے آئے۔ حالانکہ بیکر نے یہ دعویٰ کسی تجربے کی بنیاد پر نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی نے مفروضہ فلوجسٹن دیکھا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ جلنے کے بعد چیز کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ جیسے اگر اچھی طرح خشک کی ہوئی ایک کلوگرام لکڑی جلائی جائے تو اس کی راکھ سو گرام بھی نہیں بچے گی گویا اس کی نوے فیصد کمیت غائب ہو جائے گی۔ اسی طرح اور اجسام جو جل سکتے ہیں ان میں بھی وزن کی کمی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ تیل اور چربی جیسی چیزیں جل کر مکمل طور پر غائب ہو جاتی ہیں۔ اس مشاہدے سے بیکر نے فلوجسٹن کا نظریہ ایجاد کیا۔ فلوجسٹن یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "جلنے کے قابل"۔ بیکر کے مطابق جس مادے میں فلوجسٹن کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی وہ اتنا ہی آتش پذیر ہوگا۔ ساتھ ساتھ جلنے کے بعد اس کے وزن میں بھی اسی تناسب سے کمی آئے گی۔ یعنی اگر کسی مادے میں فلوجسٹن ستر فیصد ہے تو جلنے کے بعد اس کا وزن ستر فیصد کم ہو جائے گا۔ جس میں سو فیصد ہوگی وہ جل کر مکمل غائب ہو جائے گا۔

فلوجسٹن کا نظریہ اتنا مقبول ہوا کہ فوری طور پر یورپ کی تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کر لیا گیا۔ اس کی مقبولیت کی ایک وجہ شاید اس کا نیا پن بھی تھا کیونکہ اس سے پہلے تمام ہی سائنسی نظریات یا تو قدیم یونانی سائنس سے لیے گئے تھے یا پھر مسلمان سائنس دانوں کی تحقیقات سے اخذ کیے گئے تھے۔ خود یورپی سائنس داں ابھی اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ نئے نظریات پیش کر سکیں۔ اسی وجہ سے فلوجسٹن کا نظریہ بلا جھجک اپنا لیا گیا حالانکہ اس نظریے کی نفی کے لیے اس وقت بھی قابل توجہ مشاہدات موجود تھے۔ اول یہ کہ اگر جلنے والی چیز کو ہوا کی فراہمی روک دی جائے تو وہ جلنا کیوں چھوڑ دیتی ہے؟ آگ کیسے بجھ جاتی ہے؟ اگر جلنے والے مادے میں فلوجسٹن موجود ہوتا ہے تو اسے ہر صورت جلنا چاہیے مگر اس پر خاصے عرصے بعد غور کیا گیا۔

سب سے پہلے فرانسیسی سائنس داں انٹونے لوریئنٹ ڈی لوائزے نے نوٹ کیا کہ کسی بھی مادے کو جلنے کے عمل میں لازمی ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے اس کا مشاہدہ بند بھٹی میں کیا۔ جب بھٹی میں ہوا کی فراہمی روک دی گئی تو اس میں جلنے والی آگ بجھ گئی۔ خالص حالت میں آکسیجن کو سب سے پہلے سوئیڈش سائنس داں کارل ولہیلم شیلے نے الگ کیا اور اس نے اسے آتش گیر گیس کا نام دیا کیونکہ ہوا میں آزاد ہوتے ہی یہ آس پاس جلنے کے قابل چیزوں کو آگ لگا دیتی تھی مگر یہ لوائزے ہی تھا جس نے صحیح معنوں میں اسے دریافت کیا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ دیگر عناصر کو جلانے سے ان کے وزن میں کمی ہوتی ہے لیکن جب پارے کو جلایا جائے تو اس کے وزن میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ آکسیجن پارے کے ساتھ مل کر آکسائیڈ بناتی ہے جس سے پارے کا وزن جلنے کے بعد کم ہونے کی بجائے بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر خالص ہائیڈروجن کو جلایا جائے تو اس سے پانی حاصل ہوتا ہے جو وزن میں جلائی جانے والی ہائیڈروجن سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہے۔ یہاں سے لوائزے نے جان لیا کہ فلوجسٹن کا نظریہ غلط ہے۔ افسوس کہ یہ قابل ترین سائنس داں انقلاب فرانس کی بھینٹ چڑھ گیا اور اسے ایلیٹ کلاس کا نمائندہ قرار دے کر اس کا سر کاٹ دیا گیا۔

قدیم سائنس (یونانی سائنس) ایک اور بے وزن نظریہ رکھتی تھی۔ ارسطو کا کہنا تھا کہ اگر دو مختلف وزن کی اشیا بلندی سے گرائی جائیں تو وہ اپنے وزن کی مناسبت سے مختلف رفتار سے زمین پر گریں گی۔ جیسے ایک پتھر اور ایک روئی کے

گالے کو زمین پر گرایا جائے تو یہ عام مشاہدہ ہے کہ دونوں کی رفتار الگ ہوگی۔ پتھر بہت تیزی سے اور روئی کا گولا سست روی سے نیچے گرے گا۔ یہ نظریہ سترہ صدیوں تک پوری استقامت سے سائنس کے حلقے میں برا جمان رہا اور کسی نے اسے غلط قرار دینے کی جرأت نہیں کی۔ یہ شرف بھی سائنس کی دنیا کے منصور، گیلی لیو کے حصے میں آیا جس نے پیسا کے مینار پر چڑھ کر دو مختلف وزن کے دھاتی بات نیچے گرائے اور وہ ایک ساتھ زمین پر گرے۔ اس نے یہ تجربہ بار بار کیا اور مختلف چیزوں کے ساتھ کیا۔ ہر بار نتیجہ ایک ہی رہا۔

جہاں تک تعلق روئی کے گالے اور پتھر کے گرنے کی مختلف رفتاروں کا تھا تو اس کی وجہ ان کا وزن نہیں بلکہ ہوا کی مزاحمت تھی۔ روئی کا گالا پھولا ہوتا ہے اور اپنی ساخت کی وجہ سے ہوا سے رگڑ کھاتا ہے اس لیے اس کے گرنے کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے گیلی لیو نے روئی کے گالے کو بھگو کر اس کا وزن بڑھا لیا اور حجم چھوٹا کر لیا اور پھر اسے پتھر کے ساتھ نیچے پھینکا تو وہ بالکل پتھر کی رفتار سے نیچے گرا تھا۔ اس سرعام تجربے کے بعد چرچ اسے مسترد کرنے کی جرأت تو نہیں کر سکا مگر چرچ نے ایک بت پرست (ارسطو بت پرست تھا) کا نظریہ اپنے ایمان کا حصہ بنا رکھا تھا حالانکہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ مگر ایک راسخ عیسائی یعنی گیلی لیو کی دریافت اس کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ بعد میں جب گیلی لیو نے کوپرنیکس کی حمایت کی اور زمین کو نظام شمسی کا مرکز ماننے سے انکار کر دیا تو چرچ کو موقع ملا اور اس نے اپنے معتوب کو مذہبی عدالت میں کھینچ لیا۔ بہرحال اس سے کشش ثقل کی اس عظیم دریافت پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

قرون وسطیٰ سے چرچ کی جانب سے سائنسی تعلیمات کا حاصل کرنا ممنوع تھا۔ بلکہ سوائے بائبل کے ہر کتاب پڑھنا منع تھی۔ ریاضی، طب اور مادی علوم حاصل کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ ایسا کرنے والے کو سزا دی جاتی تھی۔ پورے یورپ میں تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر تھے اور علم کے متلاشی مشرقی بازنطینی سلطنت یا مصر کا سفر کرتے تھے۔ پھر اسپین کی مسلم سلطنت نے جب فطری علوم کو پھیلانے کا بیڑہ اٹھایا تو یورپ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور علم کے دیوانے اس طرف کھنچے چلے آئے۔ جنونی صلیبیوں نے اس چراغ کو بجھا کر سمجھا کہ وہ یورپ کا تاریک ترین دور پھر واپس لے آئیں گے مگر علم کے پرستار جگہ جگہ پھیل گئے تھے اور وہ نئی شمعیں روشن کر رہے

تھے۔ ایسے میں سترھویں صدی کے ایک عیسائی اسکالر کی طرف سے دعویٰ کیا گیا کہ یہ زمین اور ساری کائنات صرف چھ دن میں وجود میں آئی اور اسے بنے ہوئے صرف چھ ہزار سال گزرے ہیں۔

یہ تحقیق اسکالر نے بائبل کی روشنی میں کی اور زمین کی تاریخ پیدائش چار ہزار چار قبل مسیح نکالی گئی تھی پھر اس میں آنے والے دو صدیوں کا اضافہ ہوا یوں زمین کی کل عمر چھ ہزار سال متعین کی گئی۔ بائبل کے مطابق خدا نے پیر سے لے کر ہفتے تک دنیا اور کائنات تشکیل کی اور اتوار کے دن آرام کیا۔ اس لیے مغربی دنیا میں ہمیشہ سے اتوار کو چھٹی کے دن کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ کٹر مذہبی اس دن کام کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا اب طنزاً جوان دنیا کا نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقت دنیا اور کائنات کی عمر جاننے کی جستجو شروع ہوئی تھی۔ ماہرین ارضیات ساری دنیا میں پھیل کر آثار قدیمہ اور قدیم افسانوں سے ملتے جلتے جانداروں کے فوسل تلاش کر رہے تھے اور ان کی قدامت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایسے میں صرف مصر میں انہوں نے ایسی عمارتوں کا مشاہدہ کیا جو کم سے کم چھ ہزار سال پرانی تھیں اور مصری کتبوں پر لکھی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ نیل کی وادی میں انسان سات ہزار سال قبل مسیح سے آباد تھے۔ اولین فرعون خاندان پانچ ہزار سال قبل مسیح میں برسر اقتدار آیا۔ خود حضرت موسیٰ جو سترھویں فرعون خاندان کے دور میں بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے آج سے چار ہزار سال پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ طوفان نوحؑ اور ان سے پہلے حضرت آدمؑ کم و بیش دس ہزار سال پہلے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ مذہبی حوالوں سے ثابت ہے کہ طوفان نوح آج سے کوئی آٹھ ہزار پہلے موجودہ عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں آیا تھا۔ سائنس بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ صرف جدید انسان کی تاریخ چھ ہزار سال سے زیادہ پرانی ہے۔

پاکستان میں موہن جو ڈرو اور ہڑپہ جیسی قدیم تہذیبوں کے آثار پائے جاتے ہیں جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے تباہ ہو چکی تھیں تو ان کی آبادی یقیناً اس سے کہیں پہلے ہوئی ہوگی۔ بلوچستان میں آٹھ ہزار سال سے زیادہ پرانی تہذیب کے آثار ملے ہیں۔ خود یونانی فلسفی افلاطون بحر اوقیانوس کے پاس ایسے خطے کا ذکر کرتا ہے جو اس کے

وقت سے آٹھ ہزار سال پہلے تباہ ہو گیا تھا یعنی اس کی تباہی کو اب دس ہزار سال گزر چکے ہیں۔ انسان دس ہزار سال پہلے شمالی اور جنوبی امریکا پہنچا اور اس نے وہاں انکا اور مایا جیسی عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ یہ سب آج سے چھ ہزار سال پہلے یا اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔ ایسے میں صرف معلوم انسانی تاریخ نے اس نظریے کو باطل قرار دے دیا۔ واضح رہے کہ یہ صرف ایک مذہبی نظریہ نہیں ہے بلکہ سوسائٹی نے اسے بہ حیثیت مجموعی قبول کیا اور انیسویں صدی کے وسط تک کسی قابل ذکر سائنس داں نے اس کی تردید نہیں کی تھی۔ 1875ء تک امریکا میں چون فیصد لوگوں کا خیال تھا کہ دنیا کچھ چھ ہزار سال پرانی ہے۔ یورپ میں اس پر یقین کرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی کیونکہ یہاں معاشرے پر چرچ کی گرفت مضبوط تھی اور بعض صورتوں میں اب بھی ہے۔

اب آتے ہیں سائنس کی طرف، زمین اور کائنات کی عمر پر تحقیق تو انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہو گئی تھی مگر اسے آسانی فزکس میں نئی دریافتوں کے بعد ملی۔ جدید دوربینوں سے ایسی کہکشائیں دیکھی گئیں جو زمین سے اتنے فاصلے پر ہیں کہ روشنی کو یہاں تک آنے میں اربوں سال کا وقت درکار ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ زمین اور کائنات کی عمر چھ ہزار سال ہرگز نہیں ہے پھر جدید تابکاری کے اخراج کی مدد سے اندازہ لگایا کہ زمین کی عمر کم سے کم ساڑھے چار ارب سال ہے اور بعض دعووں کے مطابق یہ پانچ سے سات ارب سال پرانی ہے۔ سورج اور اس کے ذیلی سیاروں میں بھاری عنصر کی جزئیات ثابت کرتی ہے کہ ان کا مادہ تیسری بار کسی ستارے اور اس کے ذیلی سیاروں کی تشکیل میں استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ مدت لاانتہائی حد تک چلی جاتی ہے۔ اب ایسی کہکشائیں اور کائناتی اجسام دریافت ہو چکے ہیں جو زمین سے پندرہ کھرب نوری سال کی مسافت پر ہیں۔ یہ اتنا فاصلہ ہے کہ انسانی ذہن اس کا تصور کرنے سے بھی قاصر ہے اور اس فاصلے کے بعد اور کیا کچھ ہے ہم اب تک نہیں جان سکے ہیں۔ ماہرین زمین کے نیچے ایسی چٹانیں دریافت کر چکے ہیں جو دو ارب سال پرانی ہیں۔ زندگی کے ایسے فوسل مل چکے ہیں جو پچاس کروڑ سال سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔

ایک اور سائنسی نظریہ جو آج بھی کسی نہ کسی صورت میں رائج ہے۔ کئی ہزار سال سے نہ صرف عام لوگ بلکہ بڑے سائنس داں بھی اس پر یقین رکھتے چلے آئیں۔ جب مسلمان عروج پر آئے اور سائنس ان کے ہاتھ میں آئی تب مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ وجود میں آیا جو اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ مخصوص کیمیائی عمل سے عام دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مخصوص عناصر کو نباتاتی اشیا کے ساتھ پھانٹے، ابالے اور اس میں سے مختلف چیزیں کشید کرنے کا عمل کیمیا کہلاتا تھا اور اسی وجہ سے اس عمل کو الکیمیا کہا جانے لگا۔ ان دیوانوں نے اپنی عمریں اسی چکر میں گنوا دیں اور بہت سے جانوں سے گئے کیونکہ مستقل زہریلے کیمیائی ماحول میں رہنے سے وہ بیمار ہوئے اور جان گنوا بیٹھے، مگر ان لوگوں کے تجربات نے ایک تو تجرباتی سائنس کی بنیاد رکھی دوسرے انہوں نے سونا تو نہیں بنایا لیکن بہت سے کیمیائی عناصر اور مرکبات دریافت کر لیے۔ بعد میں سائنس کی دیوی کو تسخیر کر کے مغرب نے کیمیا کے لفظ کو کیمسٹری کر لیا۔

یہ لوگ نفوذ پذیر کیمیائی مادے، تیزاب اور الکلی جیسی چیزیں استعمال کرتے تھے اس وجہ سے یہ اشیا کیمیا کی بنیاد بن گئیں۔ جابر ابن حیان جسے دنیا کا پہلا تجرباتی سائنس داں کہا جاتا ہے وہ بھی اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ عام دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن اس نے اپنی کوششیں اصل کیمیا کی طرف مرکوز رکھیں اور تین معدنی تیزاب ایجاد کر کے اپنا نام رہتی دنیا تک کے لیے محفوظ کر لیا۔ ایک اور مسلم سائنس داں جن کا نام کیمیا کے حلقے میں لیا جاتا ہے وہ ابو علی سینا تھے۔ ابتدائی زمانے میں وہ بھی کیمیا کے خبط میں مبتلا تھے اور انہیں تجربات کے دوران میں دھواں لگنے سے آنکھیں دکھنے لگیں اور وہ علاج کے لیے طبیب کے پاس گئے جس نے ان سے علاج کی اچھی خاصی فیس وصول کر لی تو انہوں نے سوچا کہ اصل کیمیا تو یہ ہے نا کہ وہ جس میں سارا دن سر کھپاتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے طب پڑھنا شروع کی اور جلد نامور طبیب بن گئے تھے۔

سترھویں صدی تک تقریباً تمام یورپی عالم اور سائنس داں اس پر یقین رکھتے تھے کہ کیمیائی عمل سے عام دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سر آئزک نیوٹن اور جان ڈالٹن جیسے ٹھوس سائنسی پس منظر رکھنے والے افراد بھی شامل تھے۔ حد یہ کہ فزکس کی صورت بدل دینے والا آئن اسٹائن بھی سمجھتا تھا کہ ایسا ممکن ہے، اگرچہ اس نے کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا لیکن جن دنوں وہ سوئٹزرلینڈ میں پیٹنٹ آفس کی جاب کر رہا تھا تب وہ ان پیٹنٹس کو خاص طور سے پڑھتا تھا جو کیمیا کے حلقے میں آتے

ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مادے کے قوانین کے لحاظ سے یہ ناممکن ہے کہ بغیر ایک ایٹم کو توڑے یا دو ایٹموں کو آپس میں جوڑے بغیر عنصر کو تبدیل کیا جا سکے۔ یہ دونوں کام کس قدر مشکل ہیں کہ سینکڑوں ہزاروں سائنس دانوں نے دو صدیوں تک لگاتار کام کیا تب کہیں جا کر ایٹم توڑنے پر آمادہ ہوا۔ تب اس سے وہ ری ایکٹر بھی بنے جو بجلی مہیا کرتے ہیں اور ایٹم و ہائیڈروجن بم بھی جو ایک ہی پل میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بعد میں فزکس نے تجرباتی طور پر ایٹم کی تبدیلی سے سونا بنایا لیکن یہ سونا کس قدر مہنگا پڑا ذرا دل تھام کر سنیں۔ اس وقت سونے کی قیمت سے بائیس ہزار گنا زیادہ مہنگا پڑا تھا۔

یہ ثابت ہونے کے باوجود کہ عام دھات کو کسی بھی کیمیائی طریقے سے سونے میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے آج بھی دیوانوں کی کمی نہیں ہے جو اس کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جیو بالائی داستانوں میں ایک ایسے پتھر کا ذکر موجود ہے جسے اگر لوہے سے مس کیا جائے تو لوہا سونے میں بدل جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے پارس پتھر اور مغرب میں فلاسفرا سٹون کہا جاتا ہے۔ ان داستانوں کے مطابق یہ پتھر پہاڑوں میں پایا جاتا ہے۔ اس پتھر کی تلاش میں بھی لوگوں نے عمریں گزار دیں اور بہت سوں نے گنوا دیں مگر کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آیا بالکل آبِ حیات کی طرح جس کا تذکرہ بس سنا ہی سنا ہے حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

جدید سائنس کی ایک تاریخی غلطی جس کا تذکرہ کیے بغیر یہ مضمون شاید مکمل نہ ہو کیونکہ اس غلطی نے بہت زیادہ تنازعات کو جنم دیا اور اس نے درحقیقت سائنس کو مذہب کے سامنے لا کھڑا کیا۔ یہ غلطی ڈارون کے نظریہ ارتقا میں بندر کو انسان کا جدِ امجد قرار دینے کی تھی۔ چارلس ڈارون کے نظریے کے مطابق فطرت بہترین کا انتخاب کرتی ہے۔ اس میں کمزور فنا ہو جاتے ہیں اور طاقتور کو بقا ملتی ہے۔ جاندار ماحول کے ساتھ ساتھ خود کو بدلتے ہیں۔ جیسے موجودہ وہیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کروڑوں سال پہلے یہ خشکی کا جانور تھا مگر اپنے بھاری بھرکم وجود کو اٹھانے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے یہ پانی میں جانے پر مجبور ہوا اور بالآخر یہ مکمل طور پر آبی جانور بن گیا لیکن اس کی بعض خصوصیات اب بھی خشکی والی ہیں جیسے یہ ہوا میں سانس لیتی ہے۔ اس طرح جب خوراک کی کمی سے ڈائنو سار کی نسلوں کو خطرہ ہوا تو انہوں نے اپنا جسم چھوٹا کر لیا اور کم خوراک پر زندہ رہنے کے قابل ہو گئے۔ آج کے رینگنے والے جانوروں کو ڈائنو سور کی باقیات کہا جاتا ہے۔ ڈارون نے اسے نظریہ ارتقا کا نام دیا۔

بندر کو انسان کا جدِ امجد قرار دینے پر الہامی مذاہب سے تعلق رکھنے والوں نے اس کی شدید مخالفت کی کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں جنہیں اللہ نے خاص طور سے تخلیق کیا اور جنت سے براہِ راست زمین پر اتارا کیونکہ یہ نظریہ مغرب میں پیش کیا گیا تھا اس لیے سب سے پہلے چرچ اس کی مخالفت میں آگے آیا۔ اس کے ردِعمل میں ساری سائنسی برادری ڈارون کی پشت پر کھڑی ہو گئی اور اسے منطق اور تجربے کی بجائے مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر لیا جانے لگا جو بجائے خود سائنسی استدلال کی خلاف ورزی ہے۔ مخالفت نے اس نظریے کو کہیں زیادہ شہرت دی جتنی کہ اسے دوسری صورت میں مل سکتی تھی اور سائنس اس کے اٹھتے ہوئے پہلوؤں کا جائزہ لینے کی بجائے اس کی پشت پناہ بن گئی۔ حد یہ کہ بیسویں صدی کے آغاز میں کسی سائنس داں کی طرف سے ڈارون کے نظریے کی مخالفت سائنس سے کفر کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ ہر سائنس داں اور پڑھے لکھے شخص کا اس پر ایمان لانا لازمی سمجھا جاتا تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ سائنس دانوں کو اس نظریے کی غلطیوں کا احساس ہونے لگا۔ اس میں سب سے بڑی خامی کمزور اور طاقتور کی تشریح تھی۔ ڈارون نے اسے ایسے لیا جیسے ایک پہلوان اور ایک کمزور کا مقابلہ کرایا ہو وہ ان کے درمیان کشتی میں کمزور آدمی کو لازمی شکست نصیب ہوگی اور فتح طاقتور کے حصے میں آئے گی۔ حالانکہ ارتقا میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون زندہ رہنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے اور خود کو بدلتے حالات میں تیزی سے ڈھال سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال لال بیگ ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ کمزور سا کیڑا گزشتہ دو ارب سال سے زمین پر موجود ہے اور یہ آج بھی سخت جان ترین جانداروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ایسے حالات میں بھی زندہ رہتا ہے جہاں دوسرے کیڑے مر جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ڈائنا سور جیسے دیو ہیکل جاندار زمین پر صرف تیس کروڑ سال رہ سکے اور آج سے چھ کروڑ سال پہلے یہ فنا ہو گئے تھے۔ ڈارون کے نظریے کے مطابق لال بیگ کو فنا ہو جانا چاہیے تھا اور ڈائنا سور کو زندہ رہنا چاہیے تھا لیکن ہم جانتے ہیں ایسا نہیں ہے۔

یہاں سے ڈارون کے نظریے میں دراڑ پڑنا شروع

ہوگئی۔ آج سے نصف صدی پہلے تک ماہرین اس نظریے کو مسترد کرچکے تھے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے نظریے میں جو سب سے مضحکہ خیز بات تھی یعنی انسان اور بندر کا تعلق وہ بدستور سائنس کا حصہ رہی۔ حتیٰ کہ جینیاتی سائنس نے اتنی ترقی کرلی کہ ڈی این اے میپنگ کی مدد سے ماہرین پتا چلانے لگے کہ کون سا جاندار ماضی میں کیا ہوتا تھا۔ اس پروگرام نے ڈارون کے نظریے میں آخری کیل ٹھونک دی۔ ڈی این اے کی زنجیر نے ثابت کیا کہ انسان اور بندر میں آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ ان میں کچھ جسمانی مماثلت موجود ہے بلکہ ڈی این اے کے لحاظ سے بندر کے مقابلے میں سفید چوہا انسان کے زیادہ نزدیک ہے۔ یہی وجہ ہے دنیا بھر میں تجربہ گاہوں میں سفید چوہے کو ان دواؤں اور طریقہ علاج کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو انسانوں کی صحت اور بیماریوں کے خلاف لڑنے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ سفید چوہے پر تجربے سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ دوا انسانوں پر کیا اثر مرتب کرے گی اور بیماریوں کے علاج میں کس قدر بارآور ثابت ہوگی۔

آج کی سائنس نے اسے ثابت کیا ہے کہ انسانی ڈی این اے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے کیونکہ یہ سب سے پیچیدہ ڈی این اے ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس قدر ترقی یافتہ ڈی این اے کو قدرتی انداز میں بننے میں اتنا وقت درکار ہے جو زمین کی عمر سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ نیز تمام انسان ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ اس حیرت انگیز انکشاف نے اس مضحکہ خیزی کو ہمیشہ کے لیے دفن کردیا ہے کہ انسان کا جدِ امجد کوئی اور جاندار ہوسکتا ہے کیونکہ یہ **خصوصیت صرف** انسانی ڈی این اے میں پائی جاتی ہے۔ دیگر جاندار نسلوں میں سے کوئی بھی ایک ماں کی اولاد نہیں ہیں۔ واضح رہے کہ نسلی وراثت باپ کی طرف سے ہونے کے باوجود انسانی ڈی این اے اپنا زیادہ تر مواد ماں سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کو بنیاد بناتے ہوئے جس جینیاتی ماہرین نے تقریباً پانچ ہزار مختلف نسلوں کے انسانوں کے ڈی این اے آپس میں میچ کیے تو یہ نتیجہ سامنے آیا کہ تمام انسان چاہے وہ افریقا کا حبشی ہو یا ناروے کا وائکنگ نسل کا آدمی یا پھر منگولیا کا زرد فرد ہو وہ سب ایک ماں کی اولاد ہیں اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ ماں آج سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ سال پہلے افریقا میں کہیں موجود تھی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ بابا آدمؑ اور اماں حواؑ آج سے ڈیڑھ لاکھ سال پہلے زمین پر اتارے گئے تھے تب بھی

ایک بہت ہی بھیانک اور عبرت ناک غلطی علاؤالدین محمد خوارزم سے ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی سلطنت بہت طاقتور تھی، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی سلطنت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتا ہے۔

اس زمانے میں منگولوں کا طوفان چنگیز خان کی صورت میں آگے بڑھتا آرہا تھا۔ چنگیز خان نے اپنے سفیر خوارزم شاہ کے دربار میں بھیجے تھے۔

خوارزم شاہ نے ایک ایسی غلطی کی جس کی سزا پوری قوم کو نسل در نسل برداشت کرنی پڑی۔

اس نے منگولوں کو کسی قابل ہی نہیں سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اجڈ وحشی لوگ اس کی تربیت یافتہ فوج کا کیا مقابلہ کرسکتے تھے۔

اس نے نہ صرف چنگیز خان کی توہین کی بلکہ ان سفیروں کے سر کاٹ کر چنگیز خان کے پاس بھیج دیے۔

بس پھر کیا تھا۔ منگولوں کے طوفان، چنگیز خان نے اس کی پوری حکومت تاراج کرکے رکھ دی اور اتنے انسانوں کا خون بہایا کہ تاریخ میں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

مرسلہ: ناصر چغتائی، کراچی

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ الہامی مذاہب میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان پہلے بہت طویل عمر پاتے تھے اور وہ ہزاروں سال بھی زندہ رہتے تھے۔ وہ قد و قامت میں بھی بہت بڑے ہوتے تھے تو اس کا بھی امکان ہے کہ ان کی بلوغت بھی سینکڑوں سال میں جا کر مکمل ہوتی ہوگی اور چند ہی نسلیں دسیوں ہزار سال کا وقت گزار دیتی ہوں پھر وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی عمر اور قد و قامت کم ہوتا چلا گیا۔ خاص طور سے طوفانِ نوحؑ کے بعد انسان عمر اور قد و قامت کے لحاظ سے موجودہ دور تک آگیا تھا۔ یہ ایسا انکشاف ہے کہ اس نے جدید سائنس کو بھی چکرا دیا ہے۔

گزشتہ تین دہائیوں سے جینیاتی ماہرین دیوانوں کی طرح انسانی ڈی این اے کو دوسرے جانوروں سے منسلک کرنے کی سرتوڑ کوشش کررہے ہیں صرف اس لیے کہ قدیم بوزنوں (انسان نما حیوان جن کی نسلیں اب فنا ہوچکی ہیں) یا کسی اور جاندار سے انسان کا تعلق ثابت کیا جاسکے۔ مگر وہ ایسا کرنے میں قطعی ناکام رہے ہیں۔ کسی بھی دوسرے جاندار کا ڈی این اے انسان سے میچ نہیں کرتا ہے اور نہ ہی

انسان کے ڈی این اے کا ڈیڑھ لاکھ سال پہلے سے زمانے تک سراغ ملتا ہے۔ جب کہ بندر اور دوسرے جانداروں کے کروڑوں سال پرانے ڈی این اے تلاش کر لیے گئے ہیں۔ ان ماہرین کی کوشش ایسا ہی ہے جیسے برج الخلیفہ کے بارے میں کہا جائے کہ یہ عمارت کسی زمانے میں جھگی نما جھونپڑا ہوتی تھی اور پھر اس نے ارتقائی مراحل طے کر کے برج الخلیفہ کی صورت اختیار کر لی۔

جہاں ایک طرف جدید ارتقائی نظریہ ہمیں بتاتا ہے کہ فطری طور پر جانداروں کی نسلیں (اگر وہ کسی بڑے حادثے سے دوچار نہ ہوں جس میں پوری نسل کی بقا خطرے میں پڑ جائے) کروڑوں سال میں جا کر صرف تین سے پانچ فیصد تک بدلتی ہیں۔ یہ دورانیہ پندرہ کروڑ سال ہے۔ فرض کیا جائے کہ انسان کا آغاز ایک معمولی جرثومے سے ہوا تھا تو اس کے ڈی این اے کو ترقی کر کے موجودہ صورت میں آنے میں پانچ ارب سال سے زیادہ کا وقت درکار ہوگا جو زمین کی متوقع عمر سے بھی زیادہ ہے۔ اسے بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ہم زمین کی عمر کا اندازہ غلط لگا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ چھ سات یا دس ارب سال ہو۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان صرف ڈیڑھ لاکھ سال میں موجودہ حالت تک پہنچ جائے جب کہ اس کے ڈی این اے میں شدھ ہونے کے برابر تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ اس کو یوں سمجھیں کہ ایک کار جو دس کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چل سکتی ہے وہ سو کلو میٹر کا فاصلہ دس گھنٹے یا اس سے زیادہ وقت میں تو طے کر سکتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اتنی کار یہ فاصلہ دس منٹ میں طے کر لے۔ بالکل اسی طرح یہ ناممکن ہے کہ زمین کا کوئی بھی جاندار بدل کر اتنی تیزی سے انسان بن جائے۔ جب کہ یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی ہے کہ ڈیڑھ لاکھ سال پہلے انسان اتنا ہی عقل مند تھا جتنا کہ آج کا انسان ہے۔ یوں سائنس نے اپنی سب سے بڑی غلطی بالآخر دور کر لی۔

ایک غلطی جو جرثوموں کی دریافت کے بعد ہوئی وہ یہ تھی کہ جرثومے بارش کے ذریعے آسمان سے اترتے ہیں۔ یعنی یہ زمین پر جنم نہیں لیتے ہیں۔ خردبین سازی میں سب سے نمایاں نام زچ ہولیس جانسن کا ہے۔ یہ ڈچ عینک ساز سولہویں صدی کے آخر میں پیدا ہوا اور تقریباً اٹھاون برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس سے پہلے ایک اور ڈچ عینک ساز ہانس لپرشے نے دنیا کی پہلی عملی خردبین تیار کی تھی مگر اس کی بنائی ہوئی خردبین بہت طاقتور نہیں تھی اور وہ ایک حد سے زیادہ چیزوں کو بڑا کر کے نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہ زچ ہولیس تھا جس نے سب سے پہلے اتنی طاقتور دوربین بنائی جس نے جراثیم بھی دکھا دیے۔ اس لحاظ سے زچ ہولیس کو جراثیم کا دریافت کنندہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ جراثیم کی دریافت کے فوراً بعد ان کے بارے میں نت نئے خیالات پیش کیے جانے لگے جیسے یہ از خود گندگی سے پیدا ہوتے ہیں لیکن پھر یہ خیال عام ہو گیا کہ جراثیم بارش کے ساتھ زمین پر آتے ہیں۔ زچ ہولیس نے اس بارے میں تجربات کا فیصلہ کیا۔ پہلے اس نے زمین پر موجود برتنوں میں بارش کا پانی جمع کیا لیکن یہ برتن پہلے سے صاف شدہ نہیں تھے اور ان کے پانی میں بھی جراثیم پائے گئے۔ تب زچ ہولیس نے بلند ستونوں پر بالکل صاف کیے ہوئے برتن رکھ کر ان میں بارش کا پانی جمع کیا اور جب اسے خردبین کی مدد سے دیکھا تو اس پانی میں جراثیم نہیں تھے اس طرح زچ ہولیس نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ جراثیم بارش کے ساتھ آسمان سے اترتے ہیں۔

سائنس کی بہت سی ایجادات کے بارے میں بھی غلطیاں ہوئی ہیں اور ان کے بارے میں پہلے جو خیال کیا جاتا تھا وہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔ آج سے کوئی سوا سو سال پہلے جب ایک جرمن ڈاکٹر نے مارفین سے ہیروئن تیار کی تو اس نے دعویٰ کیا کہ یہ سر درد اور ڈپریشن کا بہت اچھا علاج ہے۔ اس وقت ڈاکٹر نسخے میں ہیروئن تجویز کرتے تھے مگر ایک دہائی بعد ہی اسے بہت خطرناک نشہ قرار دے دیا گیا جو آدمی کو اپنا اسیر بنا لیتا ہے اور اس سے چھٹکارا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اسپرین کی دریافت کے بعد اسے دل کے لیے خطرناک سمجھا جاتا تھا اور مریضوں کو بہت احتیاط سے اور تجویز کی ہوئی مقدار میں اسپرین استعمال کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی لیکن نصف صدی بعد تجربات سے پتا چلا کہ اسپرین نہ صرف دل کے امراض اور ہائی بلڈ پریشر سے بچاتی ہے بلکہ اگر دل کا دورہ پڑ رہا ہو تو ڈاکٹر ایسے میں اولین حفاظتی تدبیر کے طور پر اسپرین کھلانے کو کہتے ہیں جو ڈسپرین کی صورت میں تقریباً ہر گھر میں عام موجود ہے۔ میرے خالو کو دل کا دورہ پڑا اور ان کو اسپتال لے جانے سے پہلے ڈسپرین دی گئی تھی جس نے دورے کی شدت کم کر دی اور ان کی جان بچ گئی۔ آج بھی آئے دن پرانے سائنسی نظریات رد ہوتے ہیں یا ان میں بنیادی تبدیلیاں آتی ہیں۔ اس لیے ہم سائنس کو حرف آخر نہیں کہہ سکتے۔

خطائے مغرب

غلط فیصلے

ردا بتول

مغرب جو اب دانشوروں کا خطہ کہلاتا ہے وہاں کس کس قسم کی خطائیں سرزد ہوئیں۔ کیسی کیسی نادانیاں اور اندھے فیصلے ہوئے، انہیں دلچسپ خطاؤں کا ذکر خاص۔ اگر زعم اقتدار میں ایسے فیصلے نہ کیے جاتے تو تاریخ کچھ اور کہہ رہی ہوتی۔

صاحب اقتدار کی خطائیں تاریخ بدل دیتی ہیں

سیاست ایک ایسا لفظ ہے جسے سنتے ہی ذہن میں چالاکی، مکاری اور سفاکی جیسے الفاظ ذہن میں آتے ہیں۔ زمانہ قدیم سے کامیاب سیاست دان اسے سمجھا جاتا ہے جو ان تینوں صفات کو پوری طرح استعمال کرتا ہو۔

سیاست میں رحم، مروت اور نرم دلی خامیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ مغرب میں میکاولی اور مشرق میں چانکیہ موجودہ سیاست کے بانی ہیں۔ زمانہ قدیم میں سیاست کا آغاز قبیلے کی سطح سے ہوا جب انسانوں نے مل کر رہنا شروع کیا اس

وقت طاقتور ہی قبیلے کا سردار بنتا تھا مگر اسے اپنی سرداری برقرار رکھنے کے لیے سیاست کی بھی ضرورت پڑتی تھی۔ طاقت کے ساتھ حکمت عملی سے بھی کام لینا پڑتا تھا اور یہی حکمت عملی بعد میں سیاست کہلائی۔ مگر جب انسان متمدن ہوا اور اس نے بستیاں بسانے کا آغاز کیا تو زندگی کے ذرائع بڑھ گئے۔ وہ درختوں سے مکانوں میں منتقل ہوا، خوراک بہتر ہوئی اور ساتھ ہی بنا ہوا لباس میسر آیا۔ اب حکمرانوں کو ذرائع کے ساتھ آسائشیں بھی میسر آنے لگیں۔ یوں ان میں اور عام آدمیوں میں فرق بڑھنے لگا پھر جیسے جیسے انسان متمدن ہوتا گیا یہ فرق بھی بڑھتا رہا اور حکمرانوں کی ایلیٹ کلاس وجود میں آگئی۔ چھوٹی بستیوں سے بڑے شہر اور بڑے شہروں سے بڑے ملک وجود میں آئے۔ پھر ملکوں کی باہمی آویزش ہونے لگی اور یہاں سے بین الاقوامی سیاست کا آغاز ہوا۔

زمانہ قدیم سے مغرب کی اصطلاح کرۂ ارض کے مغرب میں پائی جانے والی سرزمین ہے۔ اس سے مراد عام طور سے یورپ اور افریقا کا مغربی اور شمالی حصہ لیا جاتا تھا۔ پھر امریکا دریافت ہوا تو وہ بھی خود بہ خود مغرب کا حصہ بن گیا۔ یورپ دنیا کا سرد ترین براعظم ہے اور یہ واحد براعظم ہے جس میں کوئی صحرا نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے انسانوں نے سب سے آخر میں اسے رہائش کے لیے منتخب کیا۔ اولین جدید انسانی آثار آج سے پانچ ہزار سال پہلے کے ملے ہیں جب انسان شام اور ترکی کے ساحلوں کے ساتھ سفر کرتا یورپ تک پہنچا۔ یونان کے جزیرے سب سے پہلے ان کے مسکن بنے اور پھر ان کے قدم آگے یورپ کی اصل سرزمین پر بڑھتے چلے گئے۔ یہ خانہ بدوش چرواہے تھے اور یورپ کی ہری بھری چراگاہیں انہیں خوب راس آئیں۔ کم زرخیز زمینیں اور دریائی وادیاں نہ ہونے کی وجہ سے اہل یورپ کاشت کار نہ بن سکے اور آنے والے دو ہزار سالوں تک وہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔

پھر جنوبی اور جنوب مشرقی یورپ میں پہلی بستیاں آباد ہوئیں۔ یہ بستیاں یونان اور اٹلی میں آباد ہوئی تھیں۔ اس کے بعد فرانس اور اسپین میں باقاعدہ بستیاں بنیں۔ یہیں یورپ کی پہلی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ انگلینڈ، جرمنی، وسط یورپ اور روس کا علاقہ بہت بعد میں جا کر متمدن ہوا تھا۔ یورپ کی ترقی کا آغاز یونان تھا اور اسے عروج بخشا رومن سلطنت نے۔ یونانی فکر و فن اور جنگ کے ماہر تھے۔ انہوں نے فنون جنگ اور ہتھیار سازی کو بہت ترقی دی اور تعداد میں کم ہونے کے باوجود پارس کی بہت بڑی قوت سے ٹکر لی۔ پھر یونانی زوال کا شکار ہوئے۔ آپس کی جنگوں نے انہیں کمزور کر دیا تو رومنوں نے ان کی جگہ لی۔ ڈھائی ہزار سال پہلے تشکیل پانے والی رومن سلطنت نے دیکھتے ہی دیکھتے یورپ میں مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

دوسری طرف شام کی ساحلی پٹی سے اٹھنے والی فونیقی قوم نے بحیرہ روم میں تجارت پر اجارہ داری حاصل کر لی۔ ان کے تجارتی بحری جہاز پورے بحیرہ روم میں گشت کرنے لگے۔ یورپی ساحل بندرگاہوں کے لحاظ سے تو بڑا موزوں تھا مگر یہاں رومن اور یونانی قابض تھے۔ مصر پر پہلے ہی ایک مضبوط حکومت موجود تھی اس لیے فونیقی اس سے آگے بڑھ کر لیبیا کی ساحلی پٹی پر اپنی تجارتی کوٹھیاں بناتے ہوئے موجودہ الجزائر تک چلے آئے۔ یہاں انہوں نے وحشی قبائل کو مار بھگایا اور قرطاجنہ کا تاریخی شہر آباد کیا۔ اہل یورپ اسے کارتھیج کہتے تھے۔ یہ جگہ فونیقی قوم کو اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے اپنا آبائی علاقہ شام چھوڑ کر اسے مستقل سکونت کے لیے پسند کر لیا۔ بحیرہ روم پر وہ پہلے ہی اجارہ داری حاصل کر چکے تھے۔ فونیقی تجارت کے ساتھ صنعت و حرفت کے بھی ماہر تھے۔ اس معاملے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ ساری دنیا سے اہل ہنر کو اچھے معاوضے پر اپنے ہاں لے آئے جو معاوضے پر نہیں آئے تھے انہیں غلام بنا کر لے آئے۔ یوں انہوں نے قرطاجنہ کو دنیا کا سب سے بڑا صنعتی شہر بنا دیا۔

تجارت سے بیش بہا دولت حاصل ہوئی تو اس پر رال ٹپکاتے بحری قزاق بھی نمودار ہوئے اور ان سے اپنے تجارتی جہازوں کو بچانے کے لیے فونیقی فوجی قوت بننے پر مجبور ہوئے۔ وہ جنگجو ذہنیت نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ رومن شروع سے جنگجو ذہنیت رکھتے تھے مگر ایک بار جب فونیقیوں نے فوجی قوت رکھی تو اس میں اضافہ ہی کرتے رہے پھر اس تاجر قوم کو ملک گیری کا شوق چرایا۔ آس پاس کے تمام ملکوں کو اپنے زیر نگیں کرنے کے بعد وہ رومنوں کی طرف متوجہ ہوئے اور روم سے جنگوں کا آغاز ہوا۔ جہاں تک تجارت کا تعلق تھا تو فونیقیوں کا پلہ بھاری تھا۔ رومی جو دولت لاکھوں غیر رومیوں کو قتل کر کے اور اپنے ہزاروں سپاہی مروا کر حاصل کرتے تھے وہ فونیقی ایک بھی جان ضائع کیے بغیر تجارت کے ذریعے سمیٹ لے جاتے تھے۔ مگر وہ میدان جنگ میں رومنوں کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ پے در پے شکستوں نے فونیقیوں کو مشتعل کر دیا اور جب ان میں ہنی بال

جیسا عظیم جرنل پیدا ہوا۔

سیاسیات کے ماہرین ہنی بال کے روم پر حملے کو سیاسی تاریخ کی اولین فاش غلطی قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کے نتیجے میں بالآخر قرطاجنہ تباہ ہوا اور قرطاجنہ بہ حیثیت قوم صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے۔ ہنی بال کا باپ رومنوں سے شکست کے بعد صدمے سے مر گیا یا اس نے خودکشی کر لی۔ یہ داغ تھے جو ہنی بال کے دل پر لگا اور اسی داغ نے اسے مجبور کیا کہ وہ رومنوں کے خلاف لڑے۔ اس وقت قرطاجنہ کا نظام سو بڑے چلاتے تھے جو اصل میں سو بڑے تاجر تھے۔ وہ اس جنگ کے خلاف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رومن سلطنت کا مقابلہ ممکن نہیں ہے، مگر عوامی دباؤ اور فوجی کمانڈروں کے دباؤ میں آ کر انہوں نے غلط فیصلہ کیا اور ہنی بال کو روم پر لشکر کشی کی اجازت دے دی۔ ہنی بال جانتا تھا کہ اپنے محدود لشکر کے ساتھ وہ رومنوں کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے دوسری حکمت عملی اختیار کی۔

ہنی بال نے موجودہ اسپین سے اپنی تجارتی کوٹھیوں سے نکل کر رومن قلعوں کے خلاف کارروائی کی اور اس میں مقامی آبادیوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا جو رومنوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے خوشی خوشی ہنی بال کا ساتھ دیا اور وہ رومنوں کو دباتا اور انہیں علاقوں سے بے دخل کرتا ہوا کوہ الپس کی دوسری طرف نکل گیا۔ یہ جرمنی کا علاقہ تھا۔ یہاں ہنی بال نے ایسے مقامی گائیڈز کی خدمات حاصل کیں جو کوہ الپس کے خوفناک پہاڑوں اور گھاٹیوں کے درمیان خفیہ راستوں سے واقف تھے۔ ان کی مدد سے اس نے آنے والے موسم گرما میں یوں کوہ الپس عبور کیا کہ اس کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک جھنڈ بھی تھا۔ وہ یہ جنگی ہاتھی خاص طور سے روم کو تباہ کرنے کے لیے لایا تھا۔ رومنوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی فوج ان پہاڑوں کو عبور کر سکتی ہے اس لیے ہنی بال کا حملہ ان کے لیے سخت غیر متوقع ثابت ہوا۔

ہنی بال نے اس سفر میں سردی، بیماریوں اور بلندی سے گرنے کے واقعات میں اپنے ہزاروں فوجی گنوا دیے تھے مگر وہ کوہ الپس عبور کرنے میں کامیاب رہا۔ چند مہینے کے آرام کے بعد اس کی فوج نے جنوب کی طرف پیش قدمی شروع کی اور چند سالوں میں رومنوں کو تین بڑی جنگوں میں شکست دے کر پورے اٹلی پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ رومن اب ہمیشہ کے لیے مغلوب ہو گئے ہیں کیونکہ آج تک کوئی حملہ آور اٹلی پر قابض نہیں ہو سکا تھا۔ رومن ہی دوسرے ملکوں پر حملہ کرتے اور قبضہ کرتے رہتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی حملہ آور اٹلی تک پہنچے اور اسے فتح کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ مگر اٹلی سے باہر رومی مقبوضات اور افواج برقرار تھیں اور وہ انتظار کر رہی تھیں کہ کب ہنی بال کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے اور وہ اٹلی کو واپس حاصل کرتے ہیں۔

ہنی بال ایک انتقامی جذبے کے تحت روم وارد ہوا تھا مگر یہاں تک آتے آتے اس کا جذبہ انتقام خاصی حد تک سرد پڑ گیا تھا اس لیے اس نے سوائے میدان جنگ کے رومنوں کے قتل عام سے گریز کیا۔ روم کا شہر اپنی شان و شوکت کے ساتھ برقرار رہا۔ البتہ جب ہنی بال کو واپس بلایا گیا تو رومی ایک انتقامی جذبے کے تحت اس کے پیچھے پڑ گئے اور انہوں نے قرطاجنہ کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہنی بال کو ان کے حوالے کیا جائے۔ رومنوں سے بچنے کے لیے وہ آرمینیا چلا گیا مگر رومی اس کا پیچھا کرتے وہاں بھی آ گئے تو اس نے زہر سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ اس پر بھی رومیوں کا جذبہ انتقام سرد نہیں ہوا انہوں نے قرطاجنہ کے خلاف بڑے پیمانے پر فوجی مہم شروع کی اور بالآخر اس سلطنت کا خاتمہ کر کے رہے۔ اگرچہ قرطاجنہ کی سلطنت کے خاتمے میں اور بھی اسباب تھے لیکن اس میں ہنی بال کے روم پر حملے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اگر ہم تاریخ کو بہ غور دیکھیں تو آج تک دنیا میں صرف تین سلطنتیں ایسی گزری ہیں جو طاقت، شان و شوکت اور اثر و رسوخ میں عالمگیر حیثیت رکھتی تھیں۔ ان میں اولین سلطنت روم کی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ روم میں جمہوریت تھی یا شہنشاہیت اور اس کا دارالحکومت روم تھا یا قسطنطنیہ۔ درحقیقت یہ دو ہزار سالہ رومی سلطنت کا تسلسل تھا جو کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا اور اس نے اپنے دشمنوں پر ہیبت طاری کر کے رکھی۔ دوسری اسلامی سلطنت تھی جو خلافت راشدہ سے شروع ہو کر خلافت عثمانیہ کے خاتمے تک کسی نہ کسی صورت میں قائم رہی اور اس نے بھی دشمنوں پر رعب رکھا۔ اب تیسری سلطنت امریکا کی ہے جو آج کی دنیا میں سپر پاور ہے۔ اگرچہ امریکا کا عرصہ سب سے کم ہے اور اسے سپر پاور بنے صرف پون صدی گزری ہے لیکن اثر و رسوخ اور عالمگیریت کے حوالے سے یہ دو سابقہ سلطنتوں سے آگے ہے۔

اٹلی کی چھوٹی شہری ریاستوں نے بالآخر روم کی شکل میں ادغام کیا اور ایک قوت بن کر ابھریں۔ یورپ کو قدرت نے دو ایسی خصوصیات سے نوازا جس سے باقی دنیا محروم تھی۔

اول سرد اور صحت بخش آب و ہوا جو مضبوط جسموں کی پرورش کرتی تھی دوسرے لوہے کا استعمال۔ روزِ اول سے جنگ و جدل کی زندگی گزارنے والے اہلِ یورپ کا وتیرہ رہا ہے کہ وہ ہر نئی چیز کا سب سے پہلے جنگی استعمال سوچتے ہیں اس لیے انہوں نے لوہے سے ہتھیار بنائے اور ان کے استعمال میں مہارت حاصل کی۔ ذرائع زندگی محدود تھے اس لیے نوجوانوں کے پاس عزت اور دولت حاصل کرنے کا آسان طریقہ فوجی ملازمت تھی۔ ان دو عوامل نے رومنوں کو بہت تیزی سے دنیا کی سب سے طاقتور فوج میں تبدیل کر دیا۔

فوجی قوت بننے کے بعد آس پاس کی قوموں پر حملہ کرنا اور ان کو اپنا غلام بنانا فطری امر تھا۔ تین صدی قبل مسیح میں روم ایک متمدن شہر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ یہ اس وقت دنیا کے چند بڑے شہروں میں سے ایک تھا۔ شہری ریاستوں کا سسٹم قائم ہوا اور ایک باقاعدہ جمہوریہ وجود میں آگئی۔ اگرچہ اس میں دولت مند اور چالاک لوگ ہی سیاست داں بنتے اور عہدے حاصل کرتے تھے۔ جو ایک بار اوپر آ جاتا وہ اپنے بھائی بندوں کو آگے لاتا۔ فوجی خدمت لازمی تھی اس کی چھلنی سے گزرے بغیر کوئی اوپر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ بات ایلیٹ کلاس کو سخت ناگوار گزرتی تھی کہ ان کے بچے بھی عام سپاہیوں کی طرح کڑی مشقتوں اور جنگوں میں حصہ لے کر آگے آئیں اس لیے جمہوریہ بننے کے فوراً بعد ہی جمہوریت کے خلاف جوڑ توڑ شروع ہو گیا۔ عوام حکمرانوں کا آمرانہ رویہ برداشت کر لیتے تھے لیکن وہ اپنے جمہوری حق سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔

روم کی خوش قسمتی کہ اسے ہر دور میں قابل ترین فوجی کمانڈر میسر رہے جنہوں نے روم کے پرچم کو سربلند رکھا مگر یہ جنرل ہمیشہ سیاست دانوں کی سیاست کا شکار ہوتے رہے۔ اکثر کو اپنی خدمات سے قطع نظر عبرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ آخری صدی قبل مسیح میں جب روم کی فوجی طاقت عروج پر تھی اور دور دور تک اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہاں بیک وقت تین عظیم جنرلوں کا ظہور ہوا۔ یہ پومپی، سیزر اور انتونی تھے۔ پومپی اعلیٰ درجے کا فوجی کمانڈر اور ساتھ ہی باظرف جمہوریت پسند تھا۔ اس نے جنگوں کے لیے سینیٹ سے جو اختیارات حاصل کیے جنگوں کے بعد خاموشی سے ان سے دست بردار ہو گیا۔ سیزر جاہ پسند اور اس کا شدید مخالف تھا۔ اس نے سینیٹ سے بغاوت کی اور پومپی کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ بدقسمتی سے ناموافق حالات کی وجہ سے پومپی نے شکست کھائی اور مصر چلا گیا جہاں اسے دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ بعد میں سیزر کو جمہوریت پسند ٹولے نے قتل کر دیا اور انتونی اس کے انتقام کا نعرہ لگا کر اوپر آیا اور مصر جا کر قلوپطرہ سے شادی کر لی جو پہلے ہی سیزر کے بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔

کہتے ہیں اس سانحے کے پیچھے جس نے جمہوری روم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی، سینیٹ کے چند طاقتور سیاستداں تھے۔ جو دراصل روم میں شہنشاہیت کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ انہوں نے ہی پومپی اور سیزر کی چپقلش کو ہوا دی۔ یہی سیزر کو آمر بنانے میں پیش پیش تھے اور جب وہ آمر بن گیا تو اس کے قتل کی سازش بھی ان ہی لوگوں نے تیار کی تھی۔ یہ لوگ دراصل سیزر کے بھتیجے آگسٹس کو شہنشاہ بنانا چاہتے تھے۔ آگسٹس انتہا درجے کا مکار اور دل کی بات دل میں رکھنے والا شخص تھا۔ وہ سیزر کی زندگی میں پیچھے رہا لیکن اس کے مرنے کے بعد وہ آگے آیا اس نے نہایت چالاکی سے انتونی کو مجبور کیا کہ وہ مصر چلا جائے۔ اس نے اٹلی اور رومن افواج پر اپنا کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس نے تین ہزار ایسے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جن کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہ اس کی شہنشاہیت کی راہ میں رکاوٹ ہو سکتے ہیں۔ ان میں سینیٹ کے نصف ارکان بھی تھے۔ بعد میں آگسٹس نے مصر پر فوج کشی کی۔ بہ ظاہر اس کا مقصد مصر پر روم کا تسلط قائم کرنا تھا لیکن درحقیقت وہ انتونی اور سیزر و قلوپطرہ کے بیٹے سیزرین کا خاتمہ کرنے آیا تھا جو اس کی شہنشاہیت کی راہ میں واحد رکاوٹ رہ گئے تھے۔ اس نے بیک وقت انتونی اور سیزرین کا خاتمہ کیا۔ اس نے نہایت مکاری سے قلوپطرہ کو قابو کر کے سیزرین کو جلاوطنی سے واپس بلایا اور اس کے آتے ہی اسے جلاد کے حوالے کر دیا۔ بعد میں قلوپطرہ نے خودکشی کر کے اس کا کام اور آسان کر دیا۔

ماہرین سیاست رومی سینیٹ کے اس فیصلے کو فاش ترین خطا قرار دیتے ہیں جس میں انہوں نے سیزر کو آمر مقرر کیا جس نے رومی جمہوریت کی بساط لپیٹ دی۔ درحقیقت جس دن سیزر کو قتل کیا گیا سینیٹ میں اس کے حامی اس کی شہنشاہیت کی قرارداد پیش کرنے والے تھے جس کے بعد سیزر باقاعدہ یہ منصب سنبھال لیتا مگر اس سے پہلے ہی سازشی ٹولے نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ یوں رومی ریاست ایک فردِ واحد کے اشارہ ابرو کی غلام بن کر رہ گئی۔ ایسے ایسے شہنشاہ آئے اور انہوں نے ایسے فیصلے دیے کہ عقل حیران رہ جائے۔ جیسے کیلی گولا نامی شہنشاہ نے اپنے گھوڑے کو چیف جسٹس مقرر کر دیا۔ یہ انصاف اور عوام کا مذاق اڑانے کے

مترادف تھا۔ رومی فوج جو پہلے ملک کے کام کرتی تھی اب ان شہنشاہوں کے اشارے پر اپنی ہی قوم کی گردن پر تلوار چلانے لگی۔

رومی بت پرست تھے پھر عیسائیت قبول کر لی لیکن اس سے شہنشاہیت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ رومی سلطنت زوال کے اس انتہا تک پہنچی کہ یہ دو حصوں میں بٹ گئی۔ مشرق میں بازنطینی رومی سلطنت قائم ہو گئی جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں مغربی رومی سلطنت دوبارہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر ختم ہو گئی لیکن مشرقی سلطنت پندرھویں صدی تک قائم رہی تھی سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر کے اس کا خاتمہ کیا۔ سیاست دانوں کے ایک غلط فیصلے نے نہایت طاقتور رومی سلطنت کو بہت تیزی سے زوال کی راہ پر گامزن کر دیا تھا۔

رومن سلطنت بہت تیزی سے پھیلی لیکن اس کی وسعت ہی اس کی تقسیم کا سبب بنی۔ یورپ اور افریقہ کا بڑا حصہ فتح کرنے کے بعد رومیوں نے مشرق کا رخ کیا تھا اور موجودہ یونان اور اس کے بعد ترکی کے کچھ علاقے بھی فتح کر لیے پھر وہ مشرقی یورپ میں داخل ہوئے۔ سلطنت کی وسعت نے بالآخر اسے دو حصوں میں بانٹ دیا۔ سب سے پہلے شہنشاہ ڈیوکلیٹین نائن نے 285 عیسوی میں سلطنت کو مشرقی اور مغربی انتظامی صوبوں میں تقسیم کیا۔ بالآخر شہنشاہ کونسٹنٹائن نے مشرقی سلطنت کو باقاعدہ حیثیت دے دی اور اپنا دارالحکومت موجودہ استنبول منتقل کر دیا۔ جب کہ مغربی سلطنت بدستور اٹلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر قائم رہی۔ صرف سلطنت ہی تقسیم نہیں ہوئی تھی بلکہ مذہب بھی مختلف ہو گیا تھا۔ کونسٹنٹائن نے عیسائیت اختیار کی تھی اور اس کے بعد تھیوڈوسیس نے عیسائیت کو سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دے دیا تھا۔

ماہرین عیسائیت کے مذہبی پیشواؤں کو اس تقسیم کا ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ عیسائی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ کو رومی گورنر نے صلیب کی سزا سنائی تھی۔ اگرچہ اس کے پس پشت یہودی کارفرما تھے بلکہ رومی گورنر نے سزا پر عمل درآمد سے بچنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود عیسائی مذہبی رہنماؤں نے صلیب کو رومی سلطنت کے کھاتے میں ڈال دیا۔ پھر ابتدائی عیسائی مشنریز جن میں سینٹ پال کا نام سب سے نمایاں ہے۔ جب انہوں نے یورپ میں عیسائیت کی ترویج کی کوشش کی تو بت پرست رومیوں کی طرف سے انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا

اور سینٹ پال کو روم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جن لوگوں نے عیسائیت قبول کی تھی ان کو ناقابل بیان اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا۔ حتیٰ کہ انہیں بھوکے شیروں کے سامنے پھینک دیا جاتا تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیت اور رومی سلطنت آمنے سامنے آ گئے اور کلیسا نے آغاز سے ہی بیر باندھ لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے ہی کونسٹنٹائن نے عیسائیت قبول کی اس کے فوری بعد رومی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی جتنی قوت اور عظمت بھی تقسیم ہو گئی۔ آنے والے برسوں میں دونوں سلطنتوں میں کئی بار جنگ ہوئی اور ان کی رہی سہی قوت اس میں برباد ہوئی۔ مشرقی بازنطینی سلطنت نے تو پھر بھی عثمانی ترکوں کے خلاف خود کو خاصے عرصے تک سنبھال کر رکھا اور عیسائیت کے لیے پشت پناہ کا کام کرتی رہی۔ شام اور وسط ایشیا میں صلیبی حملہ آوروں کے لیے راہداری بنی رہی۔ اسی وجہ سے یہ پندرھویں صدی تک قائم رہ سکی تھی۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ضعیف ہوتی چلی گئی اور اس کے ایشیائی مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔

لیکن مغربی رومن سلطنت بہت تیزی سے زوال پذیر ہوئی۔ اگرچہ یہاں بھی عیسائیت نے غلبہ پا لیا تھا مگر کلیسا کو اٹلی کی رومن سلطنت برداشت نہیں تھی اس لیے اس کی طرف سے کی جانے والی کوششیں رنگ لائیں۔ مقامی با اثر افراد جنہوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی وہ رومی سلطنت کے خاتمے میں کلیسا کے دست و بازو بن گئے۔ اس کے مقبوضات پہلے ہی اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے اور اب اٹلی کی خاص سلطنت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہونے لگی تھی۔ یہ تیزی سے خود مختار شہری ریاستوں میں تبدیل ہوئی اور جلد یہ نام نہاد جمہوریاں آمروں اور سرداروں کے قبضے میں آ گئیں جن کے لیے اقتدار کی واحد شرط کلیسا کی منظوری تھی اور اس منظوری کے لیے وہ کلیسا کے آگے سر تسلیم خم کیے رہتے تھے۔ ایک مورخ نے اس دردناک صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کیا۔ "سونے کی سلطنت مٹی اور لوہے کی سلطنت میں بدل گئی۔"

درحقیقت سلطنت رہی نہیں تھی۔ پورا یورپ اور خاص طور سے اٹلی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا تھا جو آپس میں لڑتی رہتی تھیں اور اس کے پس پشت بھی کلیسا کی سازشیں تھیں۔ اس کا منشا یہ تھا کہ یورپ میں کوئی ریاست اتنی طاقتور نہ ہو کہ وہ کلیسا کے سامنے کھڑی ہو سکے۔ وہ تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھی مگر اس کی اس

تنگ نظر پالیسی نے عیسائیت کو آغاز سے ہی بڑی طاقتوں سے محروم کر دیا۔ مغربی سلطنت کے خاتمے کے بعد مشرقی سلطنت باقی رہ گئی تھی اور وہ بھی کاروبار حکومت میں کلیسا کی مداخلت سے تنگ تھی خاص طور سے صلیبی جنگوں میں کلیسا کی طرف سے اسے مجبور کیا جاتا رہا کہ وہ یورپ سے آنے والے صلیبی جنگجوؤں کی مکمل مدد کرے اور یہ سب سلطنت کے وسائل پر بہت بڑا بوجھ ہوتا تھا پھر صلیبی جنگوں کے نتیجے میں مسلمانوں کے قہر و غضب کا سامنا بھی مشرقی سلطنت کو کرنا پڑتا تھا۔

ایشیائے کوچک میں صلیبی حملے نے ترکوں کے لیے اناطولیہ میں داخلے کا راستہ کھولا۔ صلیبی حملہ آور یہیں سے گزر کر سلجوق ترکوں کے علاقے میں داخل ہوئے۔ جب صلیبیوں کا ریلا گزر گیا تو ترکوں نے جوابی کارروائی کی اور خاص ترک علاقے میں داخل ہوئے جس پر وہ ہمیشہ سے دعوے دار رہے تھے۔ نتیجے میں سلطنت قسطنطنیہ تک محدود ہو کر رہ گئی اور بالآخر ترکوں نے یہ بھی اس سے چھین کر اسے آبنائے باسفورس کے پار یورپ میں دھکیل دیا۔ جہاں کچھ عرصے تک مشرقی سلطنت نے سانس لی اور پھر دم توڑ دیا۔

ایسے میں اگر مشرقی اور وسطی یورپ کی ابھر کر آنے والی طاقتیں مدافعت نہ کرتیں تو یقیناً ترک یورپ کے بڑے حصے پر قابض ہو جاتے۔ اس کے باوجود بھی وہ موجودہ سابق یوگوسلاویہ بلغاریہ اور رومانیہ پر قابض ہو چکے تھے اور اب ویانا کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ ایشیا کے پاس تمام یورپی عیسائی ریاستوں جیسے آرمینیا، جارجیا اور مالدیویا پر ترک پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے۔ ایسے میں اگر آسٹریا اور ہنگری کی ریاستیں مزاحمت نہ کرتیں اور یونان ترکوں کے آگے نہ ڈٹا رہتا تو ترکوں کے سیلاب کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ اس ساری کشمکش میں ریفی کن تھی جس نے روما کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ اس کا کردار نہایت محدود اور کسی قدر منافقانہ تھا۔ بیت المقدس کے نام پر سارے یورپ سے لاکھوں کا لشکر جمع کر لینے والے چرچ نے مشرقی سلطنت اور وسطی و مشرقی یورپ کو ترکوں سے بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ وہ کسی بڑی قوت کو کھڑا نہیں کرنا چاہتے تھے جو بعد میں ان کے لیے مصیبت بن جائے۔

ماہرین ریفی کن سٹی اور پوپ کی اس تنگ نظر پالیسی کو یورپ کے زوال کی سب سے بڑی وجہ قرار دیتے ہیں۔ عیسائی تعلیمات کے مطابق وہ صرف مذہبی قیادت دے سکتے تھے اور سیاسی قیادت سے گریز لازمی تھا۔ اس لیے معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے ریاستوں اور حکمرانوں کو کمزور کیا گیا اور اس کا نتیجہ ایک پسماندہ یورپ کی صورت میں نکلا تھا جو سترھویں صدی تک پسماندہ ہی رہا جب تک کہ اس نے چرچ کے تسلط سے آزادی حاصل نہیں کر لی۔

صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرا لیا تو اس پر ساری عیسائی دنیا اور خاص طور سے یورپ میں آگ لگ گئی تھی۔ مغربی سلطنت ختم ہو چکی تھی اور مشرقی سلطنت اپنے آخری دنوں میں تھی اس لیے مغربی یورپ سے فرانس، انگلینڈ اور جرمن جیسے طاقتور ممالک نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور اپنے تمام وسائل صلیبی جنگ کے لیے وقف کر دیے تھے۔ باقاعدہ لشکروں کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں رضاکار بھی لڑنے کو تیار ہو گئے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس لشکر کی تعداد دس لاکھ سے اوپر تھی جو یورپ سے روانہ ہوا۔ اٹلی اور سسلی کی بندرگاہوں سے بحری جہازوں میں اس لشکر کا ایک حصہ براہ راست شام کی طرف روانہ ہوا جہاں کچھ ساحلی قلعے عیسائیوں کے قبضے میں تھے۔ باقی لشکر خشکی کے راستے بازنطینی دارالحکومت قسطنطنیہ پہنچا۔

راستے میں اس عظیم لشکر نے اپنے ہی ہم مذہبوں پر جو تباہی نازل کی اس نے قیصر روم کو فکر مند کر دیا تھا اور جیسے ہی لشکر آیا اس نے زور دینا شروع کر دیا کہ یہ لشکر جلد از جلد فلسطین کی طرف روانہ کر دیا جائے۔ منصوبہ یہ تھا کہ بحیرہ اسود کے راستے یہ ایشیائے کوچک میں اترے گا اور وہاں سے راستے میں آنے والی مسلم ریاستوں کو ملیامیٹ کرتا ہوا فلسطین پہنچنے والے لشکر سے جا ملے گا۔ اس لشکر کی تعداد چھ لاکھ سے اوپر تھی کیونکہ رضاکاروں میں زیادہ تر اوباش اور جرائم پیشہ افراد تھے جو مقدس جنگ لڑ کر اپنی نجات کرانے آئے تھے مگر ان کی فطرت نہیں بدلی تھی۔ انہوں نے قسطنطنیہ میں بھی اپنی حرکتیں جاری رکھیں۔ پورے شہر میں بدمعاشی اور عیاشی کا ایسا طوفان آیا کہ شریف شہری فریاد کناں بن کر قیصر کے پاس حاضر ہوئے اور اس سے مطالبہ کیا کہ انہیں اس طوفان بدتمیزی سے نجات دلائی جائے اس لیے قیصر نے عجلت میں کشتیاں مہیا کر کے اور تقریباً دھکا دے کر ان کو رخصت کیا۔ یہ گرما کا وسط تھا اور گندم کی فصل پک رہی تھی ایک مہینے بعد فصل اتر جاتی اور لشکر سامان رسد کے ساتھ جاتا مگر قیصر کے فیصلے پر انہیں خالی ہاتھ ہی جانا پڑا۔

اس وقت جرمن اور فرانسیسی شاہ جو اس لشکر کے ہمراہ

تھے ان کا خیال تھا کہ وہ خوراک کی کمی مسلم علاقوں سے پوری کر لیں گے مگر یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ سلجوقی خاندان کا حکمران غیاث الدین مسعود بلجوقی اس لشکر کی آمد سے واقف تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ لشکر کے پاس خوراک قلیل ہے اس لیے اس نے نہایت شاندار فوجی حکمت عملی ترتیب دی۔ اس نے بحیرہ اسود کے کنارے تمام ساحلی آبادیوں کو جو غیر محفوظ تھیں انہیں اپنے دارالحکومت بلوا لیا۔ اس کے بعد خوراک کے ذخائر بھی منگوا لیے بچ جانے والی خوراک قلعوں میں ذخیرہ کروا دی بھی اور جو فصل ابھی پکی نہیں تھی اس کو آگ لگوا دی۔ تمام چراگاہیں کرچا دیا۔ درخت کاٹ دیے۔ پانی کے کنویں پاٹ دیے اور چشموں میں گندگی اور زہر ملوا دیا۔ قلعوں میں تھوڑی بہت فوج چھوڑ دی اور اسے حکم دیا کہ آخر دم تک دفاع کریں اور جب دیکھیں کہ دشمن غالب ہونے والا ہے تو قلعے میں خوراک کے ذخائر کو آگ لگا دیں۔

جب صلیبی لشکر اناطولیہ کے ساحل پر اترا تو انہوں نے دور دور تک سبزے کا نام و نشان نہ پایا۔ آبادیاں خالی تھیں اور جو اکا دکا آبادیاں تھے وہ ان کے ظلم کا نشانہ بن گئے مگر انہیں بس یہی چند ہزار لوگ ملے۔ قلعے بند تھے۔ صلیبی بے ترتیبی سے آس پاس پھیل گئے اور ان کی پہلی جستجو خوراک ہی تھی جس کے خواب دکھا کر ان کے رہنما انہیں یہاں لائے تھے۔ جو کچھ ساتھ لائے تھے وہ چند ہفتوں میں ختم ہو گیا اور جب فاقے شروع ہوئے تو لشکریوں نے اپنے جانور کاٹ کر کھانا شروع کر دیے مگر یہ بھی کب تک چلتے۔ گھوڑے اور دوسرے جانور نہ رہے تو لشکری پیدل ہو گئے۔ اسی حالت میں انہوں نے چند قلعے فتح کیے مگر بے پناہ نقصان کے بعد ان کے ہاتھ سوائے چند لاشوں اور خوراک کے راکھ ہو جانے والے ذخائر ہی ہاتھ آئے۔ جانوروں تک کے لیے چارہ نہ رہا اور وہ بھوک سے مرنے لگے۔ لشکری ان کو بھی کھا گئے مگر یہ بھوک کا مداوا نہیں تھا۔ خوراک ساحلوں سے دور تھی اور جب بھوک اور گرمی سے بے حال لشکر نے مشرق کی جانب پیش قدمی شروع کی تو سلطان مسعود کی مستعد فوج کے چھوٹے چھوٹے دستوں نے چھاپہ مار کارروائی کر کے ان کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ ان کا نشانہ بچ جانے والی خوراک، جانور اور پانی کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ وہ اچانک حملہ کرتے اور ان چیزوں کو نشانہ بنا کر غائب ہو جاتے۔ صلیبی بھوک، گرمی اور بیماریوں سے مرنے لگے۔

کہا جاتا ہے کسی طرح قسطنطنیہ پہنچنے والے لشکر کی تعداد دو لاکھ بھی نہیں تھی۔ باقی سب مارے جا چکے تھے۔ بحیرہ اسود کے کنارے بہت سے میدانوں میں ان صلیبیوں کی ہڈیاں برسوں تک پڑی رہیں اور وہاں سے گزرنے والے انہیں نگاہ عبرت سے دیکھتے تھے۔ یورپ کے صلیبی جنگوں کے ماہر بیشتر تاریخ دان اسے قیصر کی فاش غلطی قرار دیتے ہیں کہ اس نے عجلت میں صلیبی لشکر کو روانہ کیا۔ اگر وہ ایک سہ ماہی رک جاتا تو گندم کی فصل کٹ جاتی اور لشکر کو خوراک کے ساتھ اپنے جانوروں کے لیے وافر چارہ بھی دستیاب ہو جاتا اور اس کے بعد وہ یقیناً بہتر طور پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔

اس عبرتناک شکست اور لاکھوں کے لشکروں کی تباہی نے یورپی اقوام پر تقریباً ویسی ہی مایوسی طاری کر دی جیسی منگول حملے نے مسلمانوں پر طاری کی تھی۔ مگر مسلمان ترک دنیا کر بیٹھے اور اہل یورپ نے کلیسا سے جان چھڑانے کا فیصلہ کیا جو ان جنگوں کا اصل محرک تھی۔ مغربی یورپ یعنی فرانس، انگلینڈ اور جرمنی جو ان جنگوں میں سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے وہی کلیسا سے جان چھڑانے میں پیش پیش رہے اور یورپ میں سب سے پہلے انہوں نے مذہب کو عام معاملات سے الگ کیا۔

☆☆☆

سکندر اعظم مقدونیہ کی چھوٹی سی ریاست سے اٹھا اور فتوحات کا سلسلہ دراز کرتا ہوا کئی ہزار میل دور ہندوستان تک آن پہنچا۔ سکندر اعظم کی فتوحات میں جہاں اور عوامل

سکندر اعظم انتہائی کم عمری میں بے شمار ممالک فتح کر چکا تھا۔ لیکن آپ نے یہ نہیں سنا ہوگا کہ اس نے اپنی کوئی مستقل سلطنت بھی قائم کی تھی۔ اس نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ جب وہ بستر مرگ پر تھا تو کسی نے اس سے پوچھا۔ "اے عظیم انسان سلطنت کس کے سپرد کر کے جا رہے ہو۔"

اس نے جواب دیا۔ "سب سے زیادہ طاقتور کے۔"

اور ہوا بھی یہی۔ اس کی موت کے بعد اس کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ یہ ایک بڑے انسان کی بہت بڑی غلطی تھی۔

مرسلہ: جمیلہ قادر حسن شادی پور

کارفرما تھے وہاں اس کی فیصلہ کرنے کی صلاحیت نے ان فتوحات میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اس نے اپنی فوج کے لیے بہترین آدمی چنے۔ جن ملکوں کو فتح کیا وہاں عوام کا قتل عام کرنے کی بجائے ایلیٹ کلاس کا خاتمہ کیا اور عام لوگوں کو امان دی۔ ان کی جائدادوں اور کھیتیوں سے تعرض نہیں کیا اور نہ ہی کسی چیز پر قبضہ کیا۔ فتوحات کے بعد اس نے قابل اور باصلاحیت مقامی افراد کی خدمات حاصل کیں۔ انہیں مناصب سے نوازا۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے سکندر اعظم کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اس کے ان فیصلوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آرام سے مغرب سے مشرق تک فتوحات حاصل کرتا چلا گیا اور بہت کم ایسا ہوا کہ اس کے جانے سے اس کے مقبوضہ علاقوں میں بغاوت رونما ہوئی۔

سکندر اعظم نے ایک نئی حکمت عملی اپنائی اس سے پہلے فاتحین راستے میں آنے والی عام آبادیوں کو تاراج کر کے وہاں موجود آبادی کا قتل عام کرتے تھے اور اپنے عقب کو محفوظ بنا کر آگے جاتے تھے مگر سکندر اعظم نے عام آبادیوں اور چھوٹی بستیوں کو چھیڑے بغیر اپنا سفر جاری رکھا۔ بلکہ وہ ان بستیوں سے ہنرمند افراد اور لڑنے کے قابل لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیتا تھا۔ ان کی اضافی فصلیں اور اجناس خرید لیتا تھا۔ اس وجہ سے یہ لوگ اس کے خلاف بغاوت کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے تھے۔ سکندر اعظم کی حکمت عملی کی وجہ سے اس کا لشکر جو آغاز میں پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ نہیں تھا پھیل کر لاکھوں افراد پر مشتمل ہو گیا۔ یونانی اقلیت میں چلے گئے تھے مگر وہ فوج کے تقریباً تمام اعلیٰ عہدوں پر قابض تھے اور وہ نئے آنے والی سپاہ کو یونانی طرز جنگ کے مطابق تربیت کرتے تھے۔

جب سکندر اعظم کسی ایک علاقے کو فتح کر لیتا تو وہاں یونانی حاکم مقرر کر کے اس کے ماتحت غیر یونانی فوج کا کچھ حصہ کر دیتا تھا کیونکہ فوج کا اس ملک سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ پوری طرح یونانی حاکم کی فرمانبردار رہتی تھی۔ کسی بغاوت کی صورت میں وہ ذرا بھی نرمی سے کام نہیں لیتی تھی۔ سکندر اعظم یونان سے نکلا اس نے موجودہ ترکی اور ایشیائے کوچک کے علاقے فتح کیے پھر شام عراق کو فتح کیا اس کے ایک جرنیل بطلیموس نے مصر فتح کر لیا۔ یہاں سے سکندر اعظم اپنی فوج جمع کر کے ایران کی عظیم الشان مملکت کی طرف بڑھا۔ اس نے شہنشاہ دارا کی لاکھوں کی فوج کو پے در پے شکستیں دیں اور بالآخر دارالحکومت پر قابض ہو گیا۔ شاہ اپنا خزانہ اور اپنا خاندان چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا سکندر اعظم نے شاہی خاندان سے تعرض نہیں کیا اور انہیں عزت و احترام کے ساتھ شاہ کے پاس بھجوا دیا۔ ایران پر اپنا قبضہ مستحکم کر کے اس نے ہندوستان کا قصد کیا۔

اسی موقع پر سکندر اعظم نے وہ بڑی خطا کی جس نے اس کی ساری فتوحات پر پانی پھیر دیا۔ اس کے کمانڈروں نے اصرار کیا کہ اتنی بڑی سلطنت ہاتھ آنے کے باوجود وہ خالی ہاتھ ہیں اس لیے مقبوضہ علاقے ان میں تقسیم کر دیے جائیں۔ مگر بدقسمتی سے سکندر اعظم درست فیصلہ نہ کر سکا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کے کمانڈروں کے تیور خطرناک ہو رہے ہیں۔ اب انہوں نے وطن سے دوری اور تھکاوٹ کی شکایت کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ آگے بڑھنے سے جی چرا رہے تھے۔ وہ اس کے دست و بازو تھے اور سکندر اعظم ان پر اتنا انحصار کرنے لگا تھا کہ وہ ان کے بغیر خود کو مفلوج سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ یہ ان کمانڈروں کی نہیں بلکہ خود سکندر اعظم کی اہلیت تھی جس نے ان سے کام لیا اور انہوں نے فتوحات حاصل کیں۔ وہ اس کے فیصلوں پر عمل کرتے تھے اور اسی وجہ سے کامرانی ان کے قدم چومتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے سکندر اعظم کے مرنے کے بعد اپنے طور پر علاقے سنبھالے تو سوائے چند ایک کے باقی سب اپنے علاقے گنوا بیٹھے۔ سوائے بطلیموس کے کوئی کسی خطے پر حکمرانی نہ کر سکا اور بطلیموس بھی مصر کا فاتح ہونے کی وجہ سے وہاں رہ گیا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے بعد وہ صرف ایک عام حکمران رہ گیا اور کوئی کمانڈر کا کردار ادا نہیں کر سکا تھا۔

قلوپطرہ اسی بطلیموس کی نسل سے تھی۔ وہ اس سلسلے کی ساتویں اور آخری حکمران بھی تھی۔ اگرچہ بطلیموس کے فوراً بعد مصر روم کا باج گزار بن گیا تھا مگر قلوپطرہ کے بعد رومن مکمل طور پر اس زرخیز اور دولت مند ملک پر قابض ہو گئے۔ سکندر اعظم پر سب سے زیادہ دباؤ ڈالنے والا بھی بطلیموس تھا اور اس کی نظر شروع سے مصر پر لگی تھی اسے خدشہ تھا کہ کہیں سکندر اعظم اس کی فتح کسی اور کو نہ عنایت کر دے یا خود مصر نہ چلا جائے کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ مصر اس وقت دنیا کا معاشی حب تھا۔ اس کی بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کی بندرگاہیں پر تجارتی جہاز رانی عروج پر تھی اور ساری دنیا سے دولت کھنچ کر مصر کا رخ کر رہی تھی۔ ممکن ہے سکندر اعظم فاتح عالم کی حیثیت سے مصر کو حکمرانی کے لیے منتخب کر سکتا تھا۔ اس موقع پر جب اسے اپنی مہم کا اہم ترین مرحلہ درپیش تھا تو اس نے ایک بڑی سیاسی غلطی کی اور اپنے کمانڈروں کی بات مان کر مفتوحہ ممالک کو اپنے کمانڈرز میں بانٹ دیا۔

اس سے ان کمانڈروں کا رہا سہا جوش و ولولہ بھی ختم ہو گیا اور ان کی پوری کوشش رہی کہ سکندر اعظم کسی طرح ہندوستان کی مہم ملتوی کر کے واپس مقدونیہ چلے اس وقت انہیں نہ صرف تھکن یاد تھی اور نہ وطن کی یاد ستا رہی تھی۔ ایسے میں غیر یونانی فوج نے سکندر اعظم کا ساتھ دیا اور وہ افغانستان کے پہاڑوں سے ہوتا ہوا پنجاب کی سرزمین پر وارد ہوا۔ راستے میں اسے ایک دوشیزہ رخسانہ پسند آ گئی اور اس نے اس سے شادی کر لی اسی سے سکندر اعظم کا بیٹا ہوا مگر اس کی موت کے بعد یہ دونوں ماں بیٹا پُراسرار حالات میں قتل کر دیئے گئے۔ سکندر اعظم نے راجا پورس کو شکست تو دے دی لیکن اس جنگ میں اس کا بھی بہت جانی نقصان ہوا تھا پورس صرف ایک مقامی راجا تھا۔ اس جیسے بہت سے راجا اور پھر ہندوستان کی مرکزی حکومت بھی تھی جس سے مقابلہ یقیناً بہت دشوار کام تھا۔

ہندوستان میں بے پناہ گرمی تھی جس کے یونانی اور سرد علاقوں کے رہنے والے سپاہی عادی نہیں تھے۔ نچلے پنجاب سے ہو کر سکندر اعظم راجستھان تک پہنچا۔ یہاں اسے اطلاع ملی کہ ایرانی بغاوت پر آمادہ ہیں اس لیے وہ عجلت میں واپس پلٹا۔ اس نے ایران جانے کے لیے مختصر راستہ اختیار کیا۔ کہتے ہیں واپسی کے سفر میں اس کی طبیعت خراب ہوئی۔ اس کی موت پُراسرار حالات میں ہوئی۔ سکندر اعظم کی موت کے سلسلے میں کئی مفروضات ہیں۔ ایک مفروضہ ملیریا کا ہے اسے مچھر نے کاٹا اور وہ بیمار ہو گیا۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ شاہی خاندان ایک غیر یونانی لڑکی سے شادی پر ناخوش تھا اور اس نے سکندر اعظم کے کمانڈروں کے ساتھ مل کر اسے کوئی ایسا زہر دلوایا جس نے بظاہر اسے بیمار کیا اور پھر وہ مر گیا۔ تیسرا مفروضہ وہ تیر کا زخم تھا جو اسے ملتان کی جنگ میں لگا تھا۔

اس کی موت قدیم بابل شہر کے آس پاس کہیں ہوئی تھی اور اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش مصر لے جا کر بحیرہ روم کے ساحلی شہر اسکندریہ میں دفن کی گئی بعد میں یہ شہر سکندر اعظم کے نام سے موسوم ہوا۔

ممکنہ طور پر بطلیموس کا خدشہ درست تھا کہ سکندر اعظم نے مصر کو اپنے دارالسلطنت کے طور پر منتخب کر لیا تھا اور وہ وہیں سے باقی دنیا پر حکمرانی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسی بنا پر اس نے مصر میں دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ دونوں چیزیں تعجب انگیز تھیں۔ اصولاً اسے اپنی لاش یونان لے جانے کی وصیت کرنا چاہیے تھی پھر یونانی اور رومن بت پرست اپنے مردے جلاتے تھے ان کو دفناتے نہیں تھے۔ دفنانے کا رواج مصر میں تھا۔ سکندر اعظم کے مرتے ہی اس کے کمانڈروں نے سلطنت کی بندر بانٹ شروع کر دی۔ اکثر نے اس کی آخری رسومات میں بھی شرکت نہیں کی۔ اس سے پہلے کہ اس کی لاش دفنائی جاتی اس کی بیوی اور بچہ بھی نامعلوم قاتلوں کا نشانہ بن چکے تھے یوں سلطنت کا واحد دعوے دار شیر خوارگی ہی میں ختم کر دیا گیا۔ سکندر اعظم کے ایک غلط سیاسی فیصلے نے اس کی چودہ برسوں پر محیط عالمی فتوحات کو یوں منتشر کر دیا جیسے تند ہوا کا جھونکا ریت کے گھروندے اڑا لے جاتا ہے۔

☆☆☆

رومی جمہوریت کے رومی شہنشاہیت میں بدلنے کے بعد دو صدیوں تک کا عرصہ امن کا دور کہلاتا ہے کیونکہ اس دوران میں نہ تو رومنوں کو کسی قابل ذکر دشمن کا سامنا کرنا پڑا اور نہ ہی مطیع قبائل نے بغاوت کی تھی۔ رومی شہنشاہ آس پاس کے ممالک پر فوج کشی سے زیادہ عیش و عشرت کی زندگی پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں رومن آرٹ اور کلچر نے بہت زیادہ ترقی کی۔ روم میں بے شمار عالی شان عمارات اور اسٹیڈیم بنائے گئے جن کے آثار آج بھی ملتے ہیں۔ شہنشاہوں کی عیاشیوں کو چھپانے کے لیے عوام کو کھیل تماشوں پر لگا دیا گیا۔ مشرق میں کئی علاقے رومی سلطنت کا حصہ بنے اور کئی مشرقی شاہ روم کے باجگزار بن گئے مگر تیسری صدی عیسوی سے مسائل نے جنم لیا۔ اس دوران میں جرمن قبائل طاقتور ہو چکے تھے اور وہ بڑھتے ہوئے کوہ الپس کے دوسری جانب تک پہنچ گئے تھے۔ جرمن رومنوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور وہ مسلسل دو صدی سے روم کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ امن کے دور نے انہیں مضبوط ہونے کا موقع دیا۔

جس زمانے میں ہن اٹیلا کی قیادت میں متحد ہو کر رومن سلطنت کے لیے حقیقی خطرہ بن گئے تھے اسی دور میں جرمن بادشاہ وراذرک ایک طاقتور حکمران کے طور پر سامنے آیا۔ اس نے بکھرے جرمن قبائل کو جمع کیا اور ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی۔ ہنوں کی طرح جرمن بھی چرواہے تھے اور ان کی نظریں ہنگری اور پولینڈ کے زرخیز چراگاہوں پر مرکوز تھیں جن پر ہن قابض تھے۔ یہی واحد وجہ تھی کہ ہنوں اور جرمنوں نے اپنے مشترکہ دشمن روم کے خلاف اتحاد نہیں کیا۔ اس میں کسی حد تک رومن سازشوں کا بھی دخل تھا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے ایک طرف ہنوں کو جرمنوں کی

طرف متوجہ کیا اور پھر ان کے خلاف لڑائی میں روم کی فوجی مدد کی پیشکش کر دی۔ اٹیلا اس چارے کو نگل گیا۔ دوسری طرف والزرک نے بھی ہنوں سے اتحاد کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ نتیجے میں یورپ کی یہ دو بڑی طاقتیں آپس میں لڑ گئیں۔ کئی سال تک جاری رہنے والی اس جنگ میں جرمنوں کو شدید نقصان برداشت کرنا پڑا۔

دو صدیوں کے دوران جرمن قبائل نے جس طرح رومی فوج کا مقابلہ کیا اور اسے جانی نقصان سے دوچار کیا اس نے ان کی دھاک بٹھا دی تھی۔ اگرچہ جرمن غیر منظم جنگ کرتے تھے اور وہ رومنوں کی طرح باقاعدہ فوجی تنظیم بھی نہیں رکھتے تھے مگر کوہ الپس کے پار جرمنی کے گھنے جنگلوں میں مخصوص طرز کی چھاپا مار جنگ سے رومنوں کو بیشمار بار شکست دی۔ ہنوں کی آمد تک رومنوں نے جرمنی کی حدود سے پسپائی اختیار کر لی تھی اور صرف چند سرحدی قلعوں میں اس کی سپاہ موجود تھی جو آگے بڑھ آنے والے جرمنوں کے خلاف کارروائی کے لیے رکھی تھی۔ جرمن اپنی حد سے نکل کر چھاپا مار جنگ کر سکتے تھے مگر وہ باقاعدہ جنگ کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسی طرح ہن بھی غیر منظم جنگ کے عادی تھے۔ اگر یہ دونوں طاقتیں مل جاتیں تو رومی سلطنت کا اسی وقت خاتمہ ہو سکتا تھا۔

شاہ والزرک نے رومنوں کی طرف سے اپنی بیٹی کی واپسی کے بدلے ہنوں سے اتحاد نہ کرنے کی یقین دہانی کرائی اور اس کی یہ سیاسی غلطی اس کے زوال اور جرمن قبائل کی شکست کا باعث بن گئی۔ رومنوں نے پہلے ہنوں کا صفایا کیا۔ اٹیلا کے مرتے ہی ہن افراتفری میں مشرقی یورپ سے پسپا ہو گئے اور پھر ایسے غائب ہوئے جیسے ان کا کوئی وجود بھی تھا ہی نہیں۔ ان کے بعد رومنوں نے آرام سے جرمنوں کو شکست دی اور ان کو آنے والے ایک ہزار سال کے لیے وسطی یورپ سے بے دخل کر دیا۔ ماہرین سیاست شاہ والزرک کی اس غلطی کو جرمن قوم کی پسپائی اور شکست کی وجہ قرار دیتے ہیں جو اس نے ہنوں سے اتحاد نہ کر کے کی تھی۔

☆☆☆

انگلینڈ اور فرانس کی روایتی دشمنی میں اس وقت تیزی آئی جب نپولین فرانس کا حکمران بنا اور اس نے انگریزوں کو پے در پے شکستوں سے دوچار کیا ہی نہیں بلکہ وہ انگریزوں سے ان کی طاقت کا اصل ذریعہ یعنی ان کی کالونیاں چھیننے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ نپولین بونا پارٹ نے آغاز برطانیہ کے افریقی مقبوضات سے کیا اور لیبیا پر قبضہ کرتا ہوا وہ مصر تک آ پہنچا جس پر اس وقت ترکی گورنر حکمران تھا۔ دوسری طرف انگریز بھی مصر پر نظر جمائے بیٹھے تھے کیونکہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کے سنگم پر واقع مصر افریقہ اور ایشیا کی کنجی تھا۔ انگریزوں نے مصر کے لیے عجلت سے کام نہیں لیا وہ جانتے تھے کہ ابھی عثمانی حکمران کمزور نہیں ہوئے ہیں۔ براہ راست کارروائی کی بجائے انگریز حسبِ معمول سازشوں سے کام چلا رہے تھے اور قومی و قبائلی عصبیتوں کو ابھارتے ہوئے مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ کر رہے تھے۔

ایسے میں جس واحد یورپی طاقت نے مسلمانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا وہ نپولین بونا پارٹ تھا۔ اس نے برصغیر میں ٹیپو سلطان سے خط و کتابت کی اور طے پایا کہ نپولین ایک بیڑا ہندوستان بھیجے گا جو ٹیپو سلطان سے مل کر وہاں سے انگریز اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دے گا مگر نپولین نے بدقسمتی سے اس بیڑے کو بحیرۂ قلزم کے راستے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ فرانسیسی ماہرین پہلے ہی نیل کو قلزم سے ملا رہے تھے نیل کے راستے بیڑا قلزم سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچ جاتا۔ بحیرۂ روم میں انگریزوں کا بیڑا بھی موجود تھا اور جاسوس بھی۔ وہ نپولین کے عزائم سے واقف ہو گئے اور انگریز ایڈمرل نیلسن نے اسکندریہ کے پاس فرانسیسی بیڑے پر اچانک حملہ کر کے اسے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔

اس جنگ میں نہ صرف نپولین کے تین ہزار جنگی سپاہی مارے گئے بلکہ وہ اپنی بحری قوت کے بڑے حصے سے بھی محروم ہو گیا۔ اس کے بعد اسے مصر سے بھی پسپا ہونا پڑا۔ سیاست کے ماہرین نپولین کی اس خطا کو اس کے روس پر حملہ کرنے سے بھی بڑی خطا قرار دیتے ہیں کیونکہ روس میں صرف اسے جنگی شکست ہوئی تھی مگر اس بحری شکست نے انگریزوں کے دل سے اس کا خوف نکال دیا اور سب سے بڑھ کر انہوں نے نپولین اور ٹیپو سلطان کا مشترکہ منصوبہ ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا اور نپولین کو واٹرلو میدان جنگ میں شکست دے کر گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا۔ نپولین کی غلطی نے صرف یورپ کی سیاست سے فرانس کی حیثیت ہی ختم نہیں کی تھی بلکہ اس ایک غلطی نے برصغیر کو آنے والے ڈیڑھ سو سال کے لیے انگریزوں کی غلامی میں دے دیا تھا۔

☆☆☆

یورپ میں صنعتی انقلاب کا آغاز مغربی یورپ سے ہوا۔ برطانیہ، فرانس اور جرمنی اس انقلاب کے سرخیل تھے پھر اٹلی، اسپین اور مغربی یورپ کے دوسرے ممالک اس میں

شامل ہوئے۔ یورپ کے جس ملک تک یہ انقلاب سب سے آخر میں پہنچا وہ روس تھا۔ حد یہ کہ ترکی جو یورپ میں ایک غیر ملکی تھا وہاں بھی اس انقلاب نے قدم جما لیے تھے۔ زار روس پیٹر نے سب سے پہلے اپنی قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں خود کفیل بنانے کا عزم کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ سترھویں صدی تک ایک زرعی ملک رہنے والا روس اٹھارویں صدی میں ایک صنعتی ملک کے طور پر سامنے آیا۔ روس کے پاس وسائل تھے اور جرمن افرادی قوت کی کمی بھی نہیں تھی۔ اگر وہ اسی رفتار سے ترقی کرتا رہتا تو اسے یورپ کی سب سے بڑی طاقت بننے سے روکنا ناممکن ہو جاتا اور یہ بات فرانس اور برطانیہ جیسے ممالک کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ یہ ممالک سمجھتے تھے کہ صنعتی انقلاب ان کی ایجاد ہے اس لیے وہی یورپ کے لیڈرز ہیں۔

فوجی اور معاشی لحاظ سے روس کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ نپولین کی ناکام فوجی مہم اور پھر برطانیہ کی طرف سے روسی صنعتوں کے بائیکاٹ سے روس کی مضبوطی ابھر کر سامنے آئی۔ اس نے یورپ کے دوسرے ممالک کو اپنی منڈی بنا لیا تھا۔ اب روس کو سپر پاور بننے سے روکنے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ طریقہ سازش کا تھا۔ پرانے دشمن برطانیہ اور فرانس روس کے خلاف ایک ہو گئے اور انہوں نے روسی باغیوں کو پناہ دینا شروع کر دی۔ ان میں وہ یہودی پیش پیش تھے جو روسی جبر کا شکار ہوئے تھے۔ لندن اور پیرس ان باغیوں کے گڑھ بن گئے تھے۔ لندن کے سرمایہ دار ماحول میں بیٹھ کر کارل مارکس نے کیپیٹل داس لکھی اور مزے کی بات ہے کہ اس کا انگریزوں پر رتی بھر اثر نہیں ہوا۔ اس کی بجائے روس میں سوشلزم کی تحریک شروع ہوئی اور یہ دونوں سرمایہ دار ممالک اس کی پشت پناہی کرنے لگے۔ ان کی مدد سے سوشلسٹ مضبوط ہوتے چلے گئے۔ بالآخر زار روس شکست کھا گیا اور روس کمیونسٹوں کے ہاتھ آ گیا۔

ماہرین سیاست نے سوویت یونین کے قیام کو مغرب کی بدترین غلطی قرار دیا۔ اس غلطی کی وجہ سے نہ صرف پورا یورپ ایک صدی تک شدید متاثر رہا بلکہ اس نے دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی مغرب کے مفادات کو شدید نقصان پہنچایا۔ پہلی بار لوگوں کے سامنے سرمایہ داری کا ایک متبادل نظام آیا۔ ایشیا اور جنوبی امریکا میں بیشتر ملکوں نے اسے کسی نہ کسی صورت میں اپنایا۔ اگرچہ وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ ایک مصنوعی نظام تھا جو سازش کے تحت پروان چڑھایا گیا اور یہ انسان کی فطرت کے بالکل خلاف تھا اسی لیے جو لوگ اسے لے کر آئے تھے انہوں نے ہی اسے مسترد کر دیا۔

☆☆☆

پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمنوں نے پہلی بار آبدوز کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور اس نے اتحادی بحریہ پر دہشت طاری کر دی تھی۔ اب تک بحری جنگ آمنے سامنے موجود دشمنوں کے درمیان ہوتی آئی تھی یہ پہلا موقع تھا جب ایک فریق نظروں سے اوجھل پانی کے نیچے سے حملہ کر رہا تھا اور دوسرا فریق اس کے حملے سے اس وقت آگاہ ہوتا جب وہ اس حملے کا شکار ہو چکا ہوتا تھا۔ اس جرمن حکمت عملی نے اس کے یورپی حریفوں کو بوکھلا دیا تھا۔ وہ خود جرمنوں کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے اس لیے ان کی کوشش تھی کہ امریکا اس جنگ میں شامل ہو جائے۔ اس وقت امریکا پہلی جنگ عظیم میں شامل نہیں ہوا تھا اور واشنگٹن میں جرمن سفارت کاروں نے امریکی حکومت کو یقین دلایا تھا کہ اس کی آبدوزیں ایسے بحری جہازوں کو نشانہ نہیں بنائیں گی جن پر امریکی سوار ہوں۔ اس وقت جرمن بلا امتیاز مخالف ممالک کے جنگی اور عام مسافر بردار بحری جہاز ڈبو رہے تھے۔ جرمنی کی یقین دہانی کے جواب میں امریکا نے بھی یقین دلایا کہ وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہوگا۔ مگر پھر جرمنوں نے وعدہ خلافی کی اور ان کی آبدوزوں نے ایسے بحری جہازوں کو بھی ڈبونا شروع کر دیا جن پر ہزاروں امریکی سوار تھے۔ اپنے شہریوں کی ہلاکت کے نتیجے میں امریکا جنگ میں کود پڑا اور جنگ کا پانسا پلٹ گیا۔ جرمنی کو شکست فاش ہوئی۔ بعد میں علم ہوا کہ جرمن چانسلر نے امریکی بحری جہازوں کو نشانہ بنانے کا حکم دیا تھا اور یہ جرمنی کی بہت بڑی سیاسی غلطی تھی۔

ایسی ہی غلطی جرمنی نے دوسری جنگ عظیم میں کی۔ روس پر حملے کو ہٹلر کی فاش غلطی قرار دیا جاتا ہے۔ اس وقت جرمن تقریباً پورا مغربی یورپ فتح کر چکے تھے۔ اسپین اور سوئٹزرلینڈ نے غیر جانب دار رہ کر جان بچائی تھی اور صرف برطانیہ مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا۔ مشرقی یورپ بھی جرمن قبضے میں تھا۔ اٹلی اور آسٹریا جرمنی کے اتحادی تھے۔ اسپین اور سوئٹزرلینڈ غیر جانبدار تھے۔ ایسے میں واحد طاقت سوویت یونین تھا جو اب تک اس جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ روس کا جرمنی سے الجھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کمیونسٹ پارٹی سرمایہ دار مغرب کی تباہی پر خوش تھی اور وہ سکون سے بیٹھ کر سرمایہ داروں کی آپس کی لڑائی کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ روس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ امریکا بھی اس جنگ میں شامل ہو جائے۔ مگر ہوا اس کے برعکس، یعنی جرمنی روس پر چڑھ

دوڑا۔ یہ یقیناً امریکا اور مغربی یورپی ممالک کی خواہش ہو گی۔ اس لیے جب روس اس جنگ میں کمزور پڑا تو اس کے مغربی اتحادیوں نے اسے فراخ دلی سے اسلحہ اور مدد فراہم کی تاکہ وہ جرمنوں کے مقابلے پر ڈٹا رہے ورنہ جس وقت جرمن افواج اسٹالن گراڈ تک پہنچ گئی تھیں تو کریملن کی حکومت خود جلاوطن ہو کر سائبیریا جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ جہاں وہ اپنے معتوبوں کو بھیجتی تھی۔

جرمن رسد کی لائن خاصی طویل ہو گئی تھی اور روسیوں کو موقع مل گیا وہ اسے جا بجا سے توڑنے لگے اور جرمنوں کی پیش قدمی رک گئی۔ ہٹلر کے پاس ایک موقع تھا کہ وہ اپنے غلط سیاسی فیصلے کی تصحیح کر لیتا اور جرمن فوجوں کو بتدریج اس نقصان دہ جنگ سے نکال لیتا جیسا کہ اس کے جرنلوں کی رائے بھی مگر ہٹلر کی انا اسے پسپائی کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ وہ ہر صورت روس کو شکست دینے کا خواہاں تھا اور اس کے لیے بے دریغ طاقت کا استعمال کر رہا تھا۔ اس جنگ میں روسیوں کا بے پناہ جانی نقصان ہوا لیکن وہ یہ نقصان برداشت کر سکتے تھے۔ اول ان کے پاس افرادی قوت تھی اور پھر وسط ایشیائی اور سائبیریا کی مفتوح اقوام سے بھی انہیں سپاہی مل گئے تھے۔ روس کی صنعتی بنیاد کمزور لیکن بہت وسیع تھی۔ اس کے پاس خام مال کی کمی نہیں تھی۔

جرمنی صنعتی اور فوجی لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ تھا لیکن اس کے پاس افرادی قوت کے ساتھ خام مال کی بھی قلت ہو چکی تھی۔ جرمنی کی نظر اسٹالن گراڈ کے تیل صاف کرنے والے کارخانوں پر تھی۔ مگر وہ ان تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے کم سے کم دس لاکھ بہترین سپاہی روس کے محاذ پر مارے گئے۔ یہ نقصان بہت بڑا تھا۔ اس سے پہلے پوری جنگ میں جرمنی کو اس سے آدھا نقصان بھی نہیں اٹھانا پڑا تھا اور کئی ممالک تو اس نے ایک بھی سپاہی گنوائے بغیر فتح کر لیے تھے۔ ہٹلر اور جرمنی کی دہشت نے کام دکھایا تھا مگر روس میں شکست نے اس کی یہ دہشت ختم کر دی اور مفتوحہ ممالک کے عوام بھی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنگ کا پانسا پلٹ گیا اور جرمن فوجوں نے جنگ کے آغاز میں جتنی تیزی سے پیش قدمی کی تھی اب اتنی ہی تیزی سے مفتوحہ ممالک سے پسپا ہونے لگیں۔

روس نے دوسری جنگ عظیم میں بے پناہ جانی نقصان اٹھایا مگر اس جنگ نے اسے سپر پاور بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ روسی قوم حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر جرمنوں کے آگے ڈٹ گئی۔ انہوں نے اپنے وسائل استعمال کیے کارخانے قائم کیے اور ان میں جدید ہتھیاروں کی تیاری شروع کر دی۔ روس نے اپنی صنعتوں کو جدید کیا۔ اس سے روسی فوج کو بہتر ہتھیار ملے اور بالآخر وہ جرمنوں کو ملک سے نکالنے میں کامیاب رہے۔ جنگ سے پہلے روس کے پاس صرف پانچ لاکھ کی فوج اور چار سو طیاروں پر مشتمل فضائیہ تھی مگر دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک اس کی فوج ایک کروڑ سپاہیوں پر مشتمل ہو چکی تھی اور اس کی فضائیہ کے پاس دس ہزار جنگی طیارے تھے۔ یہ اس وقت دنیا میں سب سے بڑی جنگی مشینری تھی۔ امریکا پہلے ہی سپر پاور تھا لیکن سوویت یونین کو دوسری جنگ عظیم نے جنم دیا اور اس کے بعد آنے والی نصف صدی تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔

ملکوں کے بعض سیاسی فیصلے بظاہر غلط نظر آتے ہیں لیکن ان کے دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں ایسے ہی کچھ غلط فیصلے امریکا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کیے۔ سب سے پہلے وہ جنگ کوریا میں کودا۔ اس جنگ کے نتیجے میں تقریباً بیس لاکھ کوریائی باشندے اور تقریباً چھتیس ہزار امریکی فوجی مارے گئے۔ تقریباً دو ٹریلین ڈالرز کا خرچ آیا۔ جزیرہ نما کوریا دو حصوں میں بٹ گیا۔ جنوبی کوریا جو امریکا کے زیر اثر اور آج دنیا کی آٹھویں بڑی معاشی قوت ہے۔ شمالی کوریا جو پہلے سوویت یونین اور پھر چین کا اتحادی رہا۔ معاشی لحاظ سے کسی زمرے میں نہیں آتا مگر امریکا کے لیے دردِ سر ضرور ہے۔ پھر امریکا نے ویت نام کی جنگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اٹھارہ سال کی طویل جنگ میں تین ملین ویت نامیوں اور تقریباً ساٹھ ہزار امریکی فوجی مارے گئے۔ کم و بیش پانچ ٹریلین ڈالرز کا خرچ ہوا۔ یہاں بھی ملک دو حصوں میں بٹا ہوا تھا مگر اس بار سوشلسٹ کامیاب رہے اور امریکا کو ناکام یہاں سے نکلنا پڑا۔ پھر امریکا نے افغانستان اور عراق پر حملے کا فیصلہ کیا۔ گزشتہ تیرہ سال کے دوران میں ان ممالک کے کوئی تین ملین مقامی اور کوئی چودہ ہزار امریکی یا اتحادی فوجی مارے گئے۔ خرچ کا تخمینہ کوئی دس ٹریلین ڈالرز بنتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم سے امریکا نے سبق حاصل کیا کہ جنگیں ہی کسی ملک کی فوجی اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں مرکزی کردار ادا کرتی ہیں۔ جنگ کوریا میں امریکا نے پہلی بار جدید ہتھیار استعمال کیے۔ ان میں جیٹ طیارے اور کلسٹر بم جیسے ہتھیار بھی شامل تھے۔ ویت نام کی جنگ میں امریکا نے جدید فضا سے فضا میں مار کرنے والے میزائل استعمال

گیے۔ اسی جنگ میں پہلی بار طیارہ بردار بحری بیڑا استعمال ہوئے۔ جنگ سے حاصل شدہ نتائج کی روشنی میں مزید جدید ہتھیاروں کی تیاری ممکن ہوئی۔ اب افغانستان اور عراق کی جنگ میں امریکا نے نسبتاً نئی نسل کے ہتھیاروں کی آزمائش کی۔ ان جنگوں سے مزید نئے ہتھیاروں کے خیال وغیرہ میں آچکے ہوں گے اور ان کی تیاری بھی شروع کی جا چکی ہوگی۔

یوں امریکا بظاہر غلط سیاسی فیصلوں سے اپنی جنگی مہارت میں اضافہ کرتا ہے جہاں تک امریکی معیشت کا تعلق ہے تو ان جنگوں سے اسے نقصان ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر وہ فائدے میں رہتا ہے۔ عام افراد معاشی لحاظ سے مشکل میں پڑتا ہے لیکن ہتھیار ساز ادارے اور ملٹی نیشنل کارپوریشن خوب فائدہ اٹھاتی ہیں۔ جنگوں کے درمیان مناسب وقفوں سے معیشت کی بحالی میں مدد ملتی ہے اور امریکا اگلی جنگ کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر دنیا کا معاشی نظام اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنی اس برتری کو استعمال کرتا ہے امریکی کرنسی ڈالر دنیا کی کرنسی ہے۔ وہ صرف ڈالر چھاپ کر کچھ بھی خرید سکتا ہے۔ دنیا کی معیشت ہر سال جتنی ترقی کرتی ہے اس کے لیے اضافی ڈالرز امریکا ہی فراہم کرتا ہے۔ گویا دنیا کی ترقی اصل میں امریکا کی ترقی ہوتی ہے۔

مگر امریکا کے کچھ فیصلے حقیقتاً اس کی ناکامی ثابت ہوئے۔ جیسے جنوبی امریکا میں سوشلزم کے خلاف جنگ میں امریکی حکمت عملی بری طرح ناکام ہوئی اور اس نے وہاں سے بڑی شکست کھائی۔ بے شک وہ آمروں کی مدد سے کئی ملکوں میں سوشلسٹوں کو دبانے میں کامیاب رہا مگر ان کے جبر، تشدد اور بدعنوانیوں کا سارا ملبا امریکا پر گرا۔ کیوبا اور وینزویلا جیسے چھوٹے اور کمزور ملک کامیابی سے امریکا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے رہے۔ برازیل اور ارجنٹائن جیسے ممالک اس کے حلقہ اثر سے نکل گئے اور اب وہ غیر جانبدار ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کے حامل ہونے کے باوجود جنوبی امریکا کے بیشتر ملکوں کا رویہ امریکا سے معاندانہ ہے۔ معاشی اور فوجی لحاظ سے کمزور ہونے کے باوجود یہ ممالک امریکا کو کسی خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ اس کی کئی ایک مثالیں ہیں کہ جب امریکا کو سپر پاور ہونے کے باوجود اپنی ناک نیچی کرنی پڑی۔ جب امریکا نے اپنے ائرپورٹس پر غیر ملکیوں کے لباس اور جوتے اتروا کر ان کی تلاشی لینا شروع کی تو برازیل نے قانون بنا دیا کہ برازیل آنے والے ہر امریکی کی اسی طرح تلاشی لی جائے گی حالانکہ برازیل میں ہر سال لاکھوں امریکی سیاح آتے ہیں۔ برازیل کے اس فیصلے نے امریکا کو مجبور کر دیا کہ وہ برازیلی شہریوں کو تلاشی سے مستثنیٰ قرار دے۔ جنوبی امریکا میں تیل کے ذخائر پر قابو پانے کی امریکی حکمت عملی ناکام رہی۔

افریقا میں بھی امریکی حکمت عملی ناکام ثابت ہوئی۔ چند مسلم افریقی ملک جیسے مصر، تیونس، الجزائر اور مراکش اس کے حلقہ اثر میں رہے لیکن سوڈان، لیبیا اور صومالیہ میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسی طرح جنگ انگولا میں ناکامی سے وسطی اور جنوب مغربی افریقا میں امریکی اثر و رسوخ کو نقصان ہوا۔ نسل پرست حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی جنوبی افریقا اور اس کے پڑوسی ممالک سے بھی امریکی اثر کا خاتمہ ہو گیا۔ زمبابوے جیسے چھوٹے سے ملک نے زرعی اصلاحات کے معاملے میں امریکا اور مغرب کی ڈکٹیشن لینے سے صاف انکار کر دیا اور بالآخر فتح اسی کی ہوئی۔ اسلام اور دہشت گردی کے معاملے میں یک طرفہ پالیسی نے امریکی خارجہ پالیسی کی وسعت کو محدود کر دیا ہے اور اب وہ دنیا کے بہت سے معاملات میں ایک حد سے زیادہ دخل نہیں دے سکتا۔ ماہرین کے مطابق امریکا اپنا کھویا ہوا مقام صرف اس صورت میں حاصل کر سکتا ہے جب وہ ان دونوں معاملات میں اپنی پالیسی کو متوازن بنا لے۔

امریکا کی طرح یورپ بھی اسلام اور فیوبرازم فوبیا کا شکار ہے۔ قطع نظر اس کے کہ یورپ میں چند فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یورپی ممالک مسلمانوں کے خلاف امتیازی فیصلوں میں کسی طرح امریکا سے پیچھے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف ایسے قوانین بنائے جا رہے ہیں جو بنیادی انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہیں اور ان قوانین کو جبراً مسلمانوں پر تھوپا جا رہا ہے۔ مغرب آج کے جدید دور میں بھی صلیبی ذہنیت کے ساتھ موجود ہے۔ مترا اور اسی کی دہائی کی لبرل سیاست کی بجائے اب یورپ کے بیشتر ممالک میں قدامت پرست اور انتہا پسند سیاسی قوتیں برسر اقتدار ہیں اور ان قوتوں کا اولین نشانہ یورپ میں بسنے والے سات کروڑ مسلمان ہیں۔ نیو نازی ازم کیونکہ مسلمانوں کے خلاف ہے اس لیے اب یہ قابل قبول ہے۔ جب کہ بیسویں صدی پہلے کا یہودیوں کے خلاف نازی ازم آج بھی قابل سزا جرم ہے۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ مغرب اپنے اس دوہرے معیار کی کیا قیمت ادا کرتا ہے۔

خطائے رزم

جنگی خطائیں

آصف ملک

میدان کارزار میں قتال کا بازار گرم کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتی فوجیں فتح سے نزدیک تر ہوتی جا رہی تھیں کہ ایک معمولی سی خطا نے پانسہ پلٹ دیا۔ شکست سے دوچار کر دیا۔ ایسی غلطیاں بارہا مختلف ممالک کی افواج سے سرزد ہوئیں۔ انہی خطاؤں میں سے چند ایک کا تذکرہ جس نے جنگی تاریخ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

وہ خطائیں جن سے بازی گر کے بجائے لوگ آپ پچھتاتے ہیں اور پھر لوگ خوش ہوتے ہیں

انسانی تاریخ کے آغاز سے جو واقعہ انسانوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتا آیا ہے، وہ جنگ ہے۔ اکثر قوموں کی تاریخ تو جنگ کے گرد گھومتی ہے۔ ان کی خوشی، ان کے غم، ان کے ہیرو اور ان کے ولن جنگ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ جنگ نہ صرف انسانوں کو جسمانی اور معاشی لحاظ سے متاثر کرتی آئی ہے بلکہ یہ انسانی ذہن اور ان کی ثقافت پر بھی اہم اثرات مرتب کرتی ہے۔ آپ آرٹ دیکھیں تو اس میں جنگ کا حصہ بہت زیادہ ملے گا۔ دنیا کی بہترین شاعری جنگوں کے احوال پر ہی مبنی ہے۔ ڈراما، مصوری، مجسمہ سازی اور حتیٰ کہ رقص جیسی اصناف فن بھی جنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی ہیں۔ قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال جنگوں سے منسلک رہے ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی میدان جنگ سے کوئی قوم عروج کی طرف اٹھی تو اسی میدان جنگ سے دوسری قوم نے زوال کی طرف قدم بڑھایا۔ ایک فریق کو فتح جب کہ دوسرے کے نصیب میں شکست اور رسوائی آئی۔

ہر شعبہ انسانی کی طرح جنگ بھی خطا سے خالی نہیں ہے بلکہ میدان جنگ میں ہونے والی خطائیں بہت دوررس نتائج مرتب کرتی آئی ہیں۔ ذرا تصور کریں کہ دوسری جنگ عظیم میں جاپانی ایڈمرل یاماموتو اپنے بہترین طیارہ بردار بحری جہاز اور مشن سے خالی طیاروں کے ہمراہ مڈوے کی جنگ میں نہ بھیجتا یا پھر ہٹلر روس سے مڈبھیڑ نہ کرتا تو دوسری جنگ عظیم کا حتمی نقشہ کیا ہوتا، یہ کہنا بہت دشوار ہے لیکن نتائج یقینی طور پر سامنے آنے والے نتائج سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتے۔ اسی طرح اگر امریکا ویت نام میں کمیونسٹوں کے خلاف کارپٹ بمباری نہ کرتا (اس بمباری میں کم سے کم بیس لاکھ عام ویت نامی مارے گئے، امریکا کے خلاف نفرت عام ہوگئی اور بالآخر امریکا کو شکست کھا کر ویت نام سے نکلنا پڑا تھا) اسی طرح سوویت یونین کے بہترین دستے وادی پنج شیر کا آپریشن نہ کرتے تو افغان جنگ کا نتیجہ شاید کسی حد تک وہ نہ ہوتا جو سوویت یونین کے خلاف ہوا۔

فوجی کمانڈروں کی غلط فہمی، نااہلی، ناواقفیت اور نچلے درجے کے ماتحتوں کا غرور عام طور سے میدان جنگ میں ناکامی کا سبب بنتے ہیں۔ اسی طرح میدان جنگ کے آس پاس ہونے والی سازشیں بھی شکست کا ایک حصہ ہوتی ہیں جو دشمنوں کے لیے غیر متوقع شکست کا سبب بن جاتی ہیں لیکن کبھی کبھی اتفاقی حادثات بھی جنگ کا رخ موڑ دیتے ہیں مگر اس مضمون میں ہمارا موضوع وہ خطائیں ہیں جو فوجی کمانڈروں سے سرزد ہوئیں اور جیتی ہوئی بازی پلٹ گئی۔

آج کے جدید دور میں جنگ کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ پہلے جنگیں آبادیوں سے دور میدانوں میں ہوتی تھیں یا مرکزی شہروں پر قبضے کی جنگ ہوتی تھی اور عام طور سے چھوٹی آبادیاں اس سے متاثر نہیں ہوتی تھیں مگر اب پورا ملک جنگ سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے ہم جدید دور کی چند ایسی جنگی غلطیوں کا احوال بیان کرتے ہیں جنہوں نے دور

رس نتائج مرتب کیے۔

معرکہ گیلی پولی جدید جنگی حکمت عملی میں ایک کلاسیک حیثیت رکھتا ہے۔ اس معرکے نے جدید جنگی رجحانات کو جنم دیا اور جنگی حکمت عملی کو بدل کر رکھ دیا۔ اس معرکے تک جنگ میں حملے کا قدیم انداز برقرار تھا۔ جس میں حملہ آور فوج اپنے ہتھیار اور جھنڈے لہراتے ہوئے حملہ کرتی تھی۔ شور اور جارحانہ تیوروں سے دشمن کو متاثر اور مرعوب کیا جاتا تھا۔ پچھلے زمانے میں جب تک بارودی ہتھیار ایجاد نہیں ہوئے تھے یہی طریقہ جنگی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ انتظار کرتے دشمن کو دفاعی پوزیشن میں رکھنے کے لیے اس پر عقب سے آتش باری اور تیر باری کی جاتی تھی۔ جب تک حملہ آور فوج دفاعی مورچوں تک پہنچتی اسے خاصا نقصان ہو چکا ہوتا تھا۔ ایسے میں رکی ہوئی کسر حملہ آور دستے پوری کر دیتے تھے۔ اس وقت جارحانہ جنگ ہی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔

پھر پستول اور بندوق کی ایجاد ہوئی۔ اس سے پہلے توپ خانہ تھا مگر اس نے صرف تیر اندازوں کی جگہ لی تھی۔ حملہ پیدل یا گھڑ سوار دستوں کو ہی کرنا ہوتا تھا۔ البتہ پستول اور بندوق کے آنے کے بعد میدان جنگ کا نقشہ بدلنے لگا۔ اب گھڑ سوار اور پیدل دستوں کے پاس بھی ایسے ہتھیار آگئے تھے جن سے وہ دور سے اپنے دشمن کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں جنگوں میں آتشیں ہتھیاروں کا استعمال عام ہو گیا تھا مگر تعجب کی بات ہے آنے والی ڈیڑھ صدی تک جنگوں کا قدیم انداز برقرار رہا۔ آتشیں ہتھیاروں کے سامنے بھی فوجیں اسی جارحانہ طرز سے حملہ کرتی تھیں اور اسے کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا مگر معرکہ گیلی پولی نے اس جنگی حکمت عملی کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک یہ تو واضح تھا کہ ترکی کی سلطنت زوال کی طرف گامزن تھی۔ اس کے ایشیائی مقبوضات ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے نکل رہے تھے۔ افریقا کی بحیرہ روم کی ساحلی پٹی پر پہلے ہی یورپی طاقتیں قابض ہو چکی تھیں۔ عرب خطے ترکوں سے آزادی کے خواہاں تھے اور ان کے پس پشت بھی یورپی طاقتیں تھیں۔ اگرچہ جنگی لحاظ سے ترکی اس وقت بھی بہت بڑی قوت تھا۔ اس کے پاس جدید ترین توپ خانہ، بہترین جنگی جہاز اور بہت منظم رسل و رسائل کے ساتھ تربیت یافتہ بری فوج تھی۔ خاص طور سے ترک توپ خانہ ہمیشہ سے اس کے یورپی دشمنوں کے لیے ہیبت کا باعث رہا تھا مگر دوسری طرف معاشی لحاظ سے ترکی سخت ترین حالات سے گزر رہا تھا مسلسل جنگوں نے اقتصادی حالت کو تباہ کر دیا تھا۔ ایک طرف ترک وسط ایشیا اور یورپ میں روس اور مشرقی یورپ کی طاقتوں سے نبرد آزما تھے تو دوسری طرف مغربی یورپ کی طاقتیں جیسے انگلینڈ، اسپین، اٹلی اور پرتگال اس کے ایشیائی خطوں پر اپنا قبضہ مستحکم کر رہے تھے۔ زار روس نے کھلے

لفظوں میں ترکی کو یورپ کا مرد بیمار قرار دے دیا تھا۔ یعنی اب ترکی کی یورپ میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اسے جلد یا بدیر یورپ سے نکلنا ہی تھا۔

نئی صدی کے آغاز میں پہلی جنگ عظیم کا طبل بجا تو ترکی نے بجا طور پر یورپ میں جرمن اور اس کے اتحادیوں کا ساتھ دیا کیونکہ یہ وہ ممالک تھے جو ترکی کی مسلم سلطنت کے خلاف سازشوں میں شامل نہیں تھے مگر بدقسمتی سے جرمنی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی ترکی کے حصے بخرے شروع کر دیے گئے۔ اس کے ایشیائی، افریقی اور یورپی مقبوضات مختلف یورپی ممالک نے آپس میں بانٹ لیے، اس بندر بانٹ کے بعد ان کی نظریں ترکی کے اصل جزیرہ نما اور اس سے ملحق علاقوں پر تھی۔ مغربی ممالک سے ایک آزاد مسلم ملک کسی طور برداشت نہیں ہو رہا تھا جہاں خلافت کی صورت میں مسلم امہ کو متحد رکھنے کا سامان بھی موجود تھا اس لیے انہوں نے سقوط قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کے لیے ایک فوجی منصوبہ بنایا جسے معرکہ گیلی پولی کا نام دیا گیا۔ اصل منصوبہ ساز برطانیہ اور فرانس تھے جب کہ انہیں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوجی مدد حاصل تھی۔

منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کی ذمے داری برطانوی جنرل سر آئن ہملٹن کے سپرد کی گئی۔ وہ برطانیہ کی بری فوج کا جنرل تھا مگر حیرت انگیز بات ہے کہ اس مہم کا بیشتر حصہ بحری فوج پر مشتمل تھا۔ اس میں برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے کئی بڑے جنگی بحری جہاز تھے اور ان کی معاونت کے لیے لاتعداد فریگیٹس اور چھوٹے جنگی جہاز تھے۔ جنرل ہملٹن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شرمیلا، تنہائی پسند اور ہر وقت آرام اور سکون کی تلاش میں رہنے والا شخص تھا۔ ان خصوصیات کے باوجود اسے برطانوی وزیر جنگ لارڈ کچنر نے اس مہم کے لیے منتخب کر لیا۔ ہملٹن کو جنگی بحری جہازوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں اس لیے اس نے جدید اور ہلکے جنگی جہازوں کے مقابلے میں پرانے اور بھاری بھرکم جہاز طلب کر لیے۔ ان پر توپ خانہ پرانا تھا اور ان کی رفتار بھی سست تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس مہم کے لیے بحریہ کے ایک مستعد نوجوان افسر ونسٹن چرچل کو کوئی خاص ذمے داری نہیں سونپی گئی تھی۔ یہ وہی چرچل تھا جس نے دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی خوفناک جنگی مشینری کے مقابلے میں اپنی قوم کی ولولہ انگیز قیادت کی تھی۔

گیلی پولی ترکی کے یورپی حصے میں آتا تھا۔ یہیں سے وہ مختصری آبنائے گزرتی ہے جو استنبول کو بحیرہ روم اور میڈی ٹیرینین سے ملاتی ہے۔ گیلی پولی پر قبضے سے ایک طرف تو ترکی کے ایشیائی حصے میں مغربی فوج کا قدم پہنچ جاتا اور دوسری طرف ترک بحریہ غیر مؤثر ہو جاتی۔ بحیرہ اسود میں ترک بحریہ بہت مضبوط تھی اور وہاں روسی اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ مگر میڈی ٹیرین اور بحیرہ روم میں مغربی ممالک کی بحری افواج بہت مضبوط تھیں اور یہاں ترک بحریہ دفاعی پوزیشن لیے ہوئے تھی۔ ترکی کا پرانا دشمن یونان ان مغربی ممالک کی پشت پر تھا اور وہ پوری طرح ان کی مدد کر رہا تھا حالانکہ جنگ عظیم اول میں اس کا کوئی خاص کردار نہیں تھا مگر ترکی سے دشمنی میں اس نے حملہ آوروں کو اپنا ساحل استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہی نہیں بلکہ یونان نے حملہ آوروں کو بیس ہزار سپاہ کی پیشکش بھی کی تھی جو ترکوں سے لڑائی میں ماہر تھی۔

مگر ہملٹن نے یونان کی یہ پیشکش مسترد کر دی اور یونان سے صرف لاجسٹک مدد کا مطالبہ کیا۔ تقریباً سو کے قریب چھوٹے بڑے بحری جہازوں جن میں اٹھارہ بڑے جنگی جہاز بھی شامل تھے اور ڈیڑھ لاکھ سپاہیوں کے ساتھ گیلی پولی پر چڑھائی کو کافی سمجھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ترک اتنی بڑی قوت کو دیکھ کر ہی ہتھیار ڈال دیں گے۔ اس وقت مغربی طاقتوں کے مقابلے میں ترک فوجی ساز و سامان میں اتنا ترقی یافتہ ملک نہیں تھا اس کے پاس جدید ہتھیاروں اور توپ خانے کی کمی تھی کیونکہ یورپی ممالک کی طرف سے ترکی کو ہتھیاروں اور جدید ٹیکنالوجی کی فراہمی پر سخت پابندی تھی۔ حد یہ کہ ترکی کے اتحادی جرمنی نے بھی جدید ہتھیاروں کے معاملے میں اس کی مدد نہیں کی تھی۔ اس وجہ سے بھی جنرل ہملٹن کا خیال تھا کہ وہ با آسانی گیلی پولی پر اپنا تسلط قائم کر لیں گے اور یہاں سے وہ ترکی کے دارالحکومت استنبول کی طرف پیش قدمی کر سکیں گے جو صرف انتالیس میل کی دوری پر تھا۔ گیلی پولی کا جزیرہ نما علاقہ ہموار نہیں ہے بلکہ ساحل کے ساتھ ہی اس پر بلند ہوتے میدان ہیں۔ ان دور تک میدانوں میں ترک فوج نے اپنے مورچے بنا رکھے تھے۔ یہاں ان کے مشین گنز اور بھاری توپ خانہ دشمن کی پیش قدمی کا منتظر تھا۔

نوجوان ونسٹن چرچل اس صورت حال سے باخبر تھا اور اس نے جنرل ہملٹن کو اپنا منصوبہ پیش کیا کہ ایک طرف اگر عراق سے ترکی کی طرف پیش قدمی کی جائے اور دوسری

طرف گیلی پولی کے ساحل کا محاصرہ جاری رکھا جائے تو جلد ترکی اس سینڈوچ میں پھنس کر ہار مان لے گا مگر ہملٹن نے اس کا یہ منصوبہ مسترد کرتے ہوئے چرچل کے بحری دستوں کو گیلی پولی کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ اس کا اندوہناک نتیجہ فوراً ہی سامنے آ گیا۔ پہلے حملے میں ان کے پانچ بحری جہاز ڈوب گئے اور تقریباً دو ہزار افراد مارے گئے یا لاپتا ہو گئے۔ ترکوں نے سمندر میں بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی تھیں اور بیشتر بحری جہاز ان کے ساحلوں پر موجود توپ خانے کا شکار ہوئے تھے۔ لیکن اس دھچکے کے باوجود جنرل ہملٹن نے اپنا منصوبہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے منصوبے کے مطابق گیلی پولی پر کم سے کم بارہ مقامات پر بری افواج اور توپ خانہ اتارا جائے گا۔ ان کی مدد کے لیے گاڑیاں ہوں گی اور یہ برق رفتاری سے بری دستوں کو مطلوبہ مقام تک پہنچا سکیں گی۔

یہ دوسری جنگ عظیم میں بنایا جانے والا ڈی ڈے قسم کا منصوبہ تھا جس میں اتحادی افواج نے فرانس کے مقام نارمنڈی پر سمندر سے خشکی پر افواج اتاری تھیں اور یہاں سے جرمنی کی شکست کا آغاز ہوا تھا۔ مگر گیلی پولی کا منصوبہ ڈی ڈے منصوبے سے بالکل مختلف تھا۔ اول تو حملہ آوروں کے پاس سمندر سے خشکی پر فوج اتارنے کے خاطر خواہ انتظامات نہیں تھے۔ ان کے پاس ایسی کشتیاں تھیں جو دست اور خشکی کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ کے جواب میں دفاع سے محروم تھیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بحری جہاز سے دو سو افراد کو خشکی کی طرف روانہ کیا گیا اور ان میں سے بہ مشکل بیس افراد زندہ خشکی تک پہنچے تھے۔ اس وقت بھی جنرل ہملٹن کا خیال بلکہ یقین تھا کہ مہم کامیاب رہے گی اور جیسے ہی اس کی ساری فوج گیلی پولی کے ساحل پر اترے گی یہ ترک سلطنت کی بربادی کا آغاز ہو گا۔ 25 اپریل 1915ء کی صبح جنرل ہملٹن نے اپنے منصوبے کے تحت حملے کا آغاز کر دیا۔

اس حملے سے پہلے جنرل ہملٹن نے ایک حیرت انگیز فیصلہ کیا تھا اس نے گولیوں سے تحفظ رکھنے والی چھوٹی حملہ آور کشتیوں کو بیکار قرار دے کر انگلینڈ واپس بھیج دیا تھا اور جب اس سے پوچھا گیا کہ اب سپاہی کس طرح ساحل پر اتریں گے تو جنرل نے بتایا کہ بڑے جنگی جہازوں کو ممکنہ حد تک چٹانی ساحلوں کے نزدیک لایا جائے گا اور پھر لائف بوٹس کی مدد سے پیدل دستوں کو ساحلوں پر اتارا جائے گا۔ اس ایک فیصلے سے جنرل ہملٹن کی داخلی اور بحری جنگوں سے اس کی عدم واقفیت سامنے آ گئی۔ بحریہ سے تعلق رکھنے والے افسران نے اسے بتانا چاہا کہ لائف بوٹس اس قسم کے کاموں کے لیے قطعی موزوں نہیں تھیں۔ مگر جنرل ہملٹن نے ان کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ جب حملے کا آغاز ہوا تو اس نے ایک شفیق انکل کی طرح باقی ساری معاملات اپنے ماتحت جنیلوں پر چھوڑ دیے تھے۔ مگر انہیں بھی علم نہیں تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے؟

غالباً جنرل ہملٹن قدیم یونانی طریقوں سے متاثر تھا جس میں گھڑ سوار دستے تیرتے پلیٹ فارمز پر کھڑے ہوتے اور جیسے ہی یہ پلیٹ فارمز خشکی پر لگتے تو گھڑ سوار پانی چند گز کا فاصلہ چھلانگ لگا کر طے کرتے ہوئے خشکی پر چڑھ جاتے تھے۔ مگر یہاں پلیٹ فارمز نہیں تھے بلکہ لائف بوٹس تھیں اور ان پر گھڑ سوار دستے نہیں آ سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ پیدل افراد آ سکتے تھے۔ لندن آرٹ میوزیم کی ایک گیلری میں ایک میورل موجود ہے جس میں برطانوی بحریہ کے پرانے دخانی جہاز ریور کلائیڈ سے پیدل دستوں کو اتر کر ساحل تک پہنچنے کی کوشش کرتے دکھایا گیا ہے۔ اسٹیمر کے پہلوؤں پر خانے کھلے ہیں اور سپاہی اپنے سامان اور ہتھیاروں سمیت تیر کر دوسری طرف جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک طرف گھڑ سوار پانی میں غوطے کھا رہے ہیں اور یہ سب بلندی پر موجود ترک مشین گنز کا آسان نشانہ ثابت ہو رہے تھے۔ اس جہاز سے اترنے والے دو سو افراد میں سے صرف بیس ساحل تک پہنچ سکے تھے اور ان بیس کے ساتھ بھی نہ جانے کیا ہوا تھا؟

جنرل ہملٹن نے اپنی کمانڈ میں موجود سب سے بڑے جنگی جہاز ایچ ایم ایس کوئن الزبتھ کو اپنے ہیڈ کوارٹر کے طور پر چنا تھا اور وہ اس کے عرشے سے اس حملے کی کمان کر رہا تھا۔ یہ خاص طور سے گہرے سمندر میں دوبدو جنگ کے لیے تیار کیا جانے والا بحری جہاز تھا جس کی توپیں پندرہ میل سے زیادہ دوری تک مار کر سکتی تھیں۔ یہ کھلے سمندر سے ساحلوں پر حملے کے لیے بھی موزوں تھا۔ ایسے کارآمد جنگی جہاز کو صرف کمانڈ پوسٹ کے لیے مخصوص کرنا اسے ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ بڑا ہونے کی وجہ سے کوئن الزبتھ ساحل سے خاصے فاصلے پر لنگر انداز تھا اور اتنی دور سے جنرل ہملٹن کو قطعی علم نہیں تھا کہ ساحلوں پر اس کی سپاہ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اسی طرح اس کے دستوں کے کمانڈرز بھی حملے کے ابتدائی چند گھنٹوں میں بکھر گئے تھے اور ان کا

آپس میں رابطہ بھی نہیں رہا تھا۔ اس لیے کسی کو علم نہیں تھا کہ دوسرے پر کیا گزر رہی ہے۔ یہ کسی بھی جنگ میں بدترین صورت حال کہی جا سکتی ہے۔ جس سے اس وقت حملہ آور فوج دوچار تھی۔

سینئرز کی غیر موجودگی اور مواصلاتی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ساحلوں پر اترنے والے اکثر دستوں کے جونیئر کمانڈرز کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے اوپر انحصار کریں۔ دو ہزار برطانوی سپاہی گیلی پولی میں ایک مقام پر اترے جسے انہوں نے وائی بیچ کا نام دیا۔ یہاں اترنے کے بعد انہیں پتا چلا کہ اوپر ڈھلانوں پر ترک موجود تھے اور وہ یہاں اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔ انہیں اوپر جانے اور ترک پوسٹوں کو ختم کرنے کا حکم ملا تھا مگر وہ اوپر نہیں جا سکتے تھے اور ان کے پاس کوئی متبادل پلان بھی نہیں تھا اس لیے انہوں نے ساحل پر خندقیں کھود کر اس میں پناہ لینا شروع کر دی۔ اس دوران میں کہیں نزدیک سے بے پناہ فائرنگ اور مرنے والوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ ان کو علم نہیں تھا کہ ذرا دور شمال میں ایک ساحل پر اترنے والے آسٹریلوی اور نیوزی لینڈ کے سپاہی ترکی مشین گنوں کی زد میں تھے۔ ترک تعداد میں زیادہ نہیں تھے۔ ان کی تعداد دو درجن بھی نہیں تھی مگر وہ بلندی پر بہترین چھپوں پر مشین گنوں کے ساتھ تعینات تھے اور انہوں نے مشکل سے ایک گھنٹے میں دو ہزار سے زیادہ اتحادی فوجیوں کو ڈھیر کر دیا۔

یہ بہت بڑا نقصان تھا مگر یہ صرف آغاز تھا۔ اس جنگ کے لیے آسٹریلوی اور نیوزی لینڈ کے لوگوں نے آج تک انگلینڈ کو معاف نہیں کیا ہے کیونکہ جنگ سے نا آشنا ان کے فوجی دستے جب میدانِ جنگ میں گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے تو اس وقت بیشتر انگریز افسران محفوظ بحری جہازوں میں چائے اور میووں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے سروں پر سائے کے لیے چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔ جب برطانوی دستوں کے فیلڈ کمانڈر جنرل سر ولیم برڈ ووڈ نے جنرل ہملٹن کو یہ اطلاع پہنچائی کہ آسٹریلوی اور نیوزی لینڈ کے دستے شدید مشکل سے دوچار ہیں اور ان کی فوری مدد کی جائے تو جنرل ہملٹن نے ان الفاظ میں جواب دیا۔ ”ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ زمین کھودیں اور اس وقت تک کھودتے رہیں جب تک وہ محفوظ نہیں ہو جاتے۔“

ان فوجیوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اور انہوں نے اس لڑائی میں سوائے خندقیں کھودنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ اسی وجہ سے بعد میں آسٹریلوی دستے ”ڈگرز“ یعنی کھودنے والے کہلائے جانے لگے۔ اس صورت پر جنرل ہملٹن نے لارڈ کچنر کو تار بھیجا۔ ”موسم کا شکریہ اور ہمارے جوانوں کی بہادری پر ہم پیش قدمی کر رہے ہیں۔“

یہ سراسر جھوٹ تھا۔ برطانوی فوجی آرام سے بحری جہازوں میں تھے یا محفوظ ساحلوں پر اترے تھے ان کے مقابلے میں آسٹریلوی اور نیوزی لینڈ کے سپاہی انتہائی خطرناک جگہوں پر اتارے گئے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ساری جنگ میں پانچ لاکھ افراد مارے گئے۔ ان میں سے بیشتر آسٹریلوی، نیوزی لینڈ اور افریقی تھے۔ برٹش اور فرنچ کا نقصان صرف سات سو افراد کا تھا اور یہ ترکوں کے نقصان سے تھوڑا ہی زیادہ تھا۔ آٹھ مہینے تک جاری رہنے والی اس فضول جنگ میں مغربی اتحادیوں کے ہاتھ سوائے جانی و مالی نقصان کے کچھ نہیں آیا۔ ترکوں نے کم فوج اور محدود جنگی وسائل کے باوجود بہادری سے لڑ کر اپنی سرزمین کا دفاع کیا اور دشمن کو شدید نقصان پہنچایا۔ اتحادی فوج بدترین ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اس کے باوجود جنرل ہملٹن کا واپسی پر کسی ہیرو کی طرح استقبال ہوا اور اسے اعزازات سے نوازا گیا لیکن آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ والے آج بھی اپنے سپاہیوں کا سوگ مناتے ہیں۔

معرکہ گیلی پولی نے جدید حرب کا تصور ہی بدل کر رکھ دیا۔ اب پیدل دستے، آرمرڈ دستوں کے ساتھ اور اس کی پناہ میں پیش قدمی کرتے ہیں جہاں انہیں آرمرڈ دستوں کی معاونت حاصل نہیں ہوتی ہے وہاں انہیں فضائی مدد دی جاتی ہے۔ جرمنوں نے معرکہ گیلی پولی سے سبق حاصل کیا اور فوری طور پر اپنے پیدل دستوں کو ٹینکوں اور آرمرڈ گاڑیوں کی پناہ دے دی جب کہ اس کے مخالف اتحادی افواج نے دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں یہ حکمت عملی نہیں اپنائی تھی اور وہ بدستور پیدل دستوں کی حفاظت کے لیے خندقوں اور سرنگوں کو استعمال کر رہے تھے مگر اس طرح پیدل دستے پیش قدمی کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جرمنوں نے اپنی پیدل فوج کی حفاظت کو ٹینکی بنا کر تیز رفتار پیش قدمی کی بنیاد رکھی اور دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً سارا یورپ فتح کر لیا۔ اس کے بعد اتحادی افواج نے جوابی کارروائی میں یہی حکمت عملی اپنائی۔

☆☆☆

جنگوں میں جہاں جدید ہتھیار، ان کو استعمال کرنے کی تربیت اور سب سے بڑھ کر کمانڈر کی حکمت عملی کامیابی

میں اہم کردار ادا کرتی ہے وہیں کچھ عوامل ایسے ہیں جو بہ ظاہر تو نظر نہیں آتے اور ان کی زیادہ اہمیت بھی نہیں ہوتی لیکن کسی موقع پر وہ فتح و شکست میں بنیادی فرق بن جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک عنصر موسم ہے۔

موسم کی قہرناکی کا جو سامنا عظیم فرانسیسی جنرل نپولین بونا پارٹ نے کیا وہ کسی نے شاید ہی کیا ہو۔ انیسویں صدی کے آغاز تک نپولین یورپ میں ایسا نام بن چکا تھا جس سے سب ڈرتے تھے اور جس کا دم بھرتے تھے۔ یورپی اقوام ایک طرح سے نپولین کی باجگزار بن چکی تھیں۔ صرف برطانیہ اور روس نپولین کے حلقۂ اثر سے باہر تھے۔ فرانسیسیوں اور انگریزوں کی دشمنی صدیوں پرانی تھی اور اس وقت بھی دونوں ملک تقریباً حالتِ جنگ میں تھے صرف یورپ نہیں بلکہ اس سے باہر جہاں ان دونوں ملکوں کے مفادات ٹکرا رہے تھے وہاں یہ آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ ایسے میں نپولین نے روس پر چڑھائی کا عجیب فیصلہ کیا۔ اس وقت روس یورپ کے طاقتور ترین ملک کے طور پر ابھر کر سامنے آ رہا تھا اور سارا یورپ اس سے خوفزدہ تھا۔ روس کی بے پناہ وسیع زمین، معدنی وسائل اور بہترین جنگی مشینری کے ساتھ ساتھ اس کی تیزی سے بڑھتی ہوئی اقتصادی قوت بھی اس خوف کا سبب تھی۔ قفقاز اور وسط ایشیا کی مسلم سلطنتوں پر قابو پا کر روسی زار چرچ کی نظر میں بھی ہیرو بن گئے تھے۔

روسی بنیاد پرست عیسائی قوم تھے اور زار روس پر پادریوں کا گہرا اثر و رسوخ تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں سے بھی ان کا سلوک معاندانہ تھا۔ زار شاہی کے ستائے بیشتر یہودی مشرقی یورپ یا روس کے سرحدی علاقوں میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں بھی ان کے لیے امتیازی قوانین بنائے گئے تھے۔ ایسے میں مغربی یورپ کی لادین حکومتوں نے خطرہ محسوس کیا کہ روسی لہر یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ اصل خطرہ یہودیوں نے محسوس کیا تھا اس وقت تک وہ مغربی ممالک کی شہ رگ یعنی اقتصادیات پر اپنا پنجہ پوری طرح جما چکے تھے۔ اس لیے روس پر حملے کے پس پشت یہودیوں کا ہاتھ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر فیصلہ بہرحال نپولین بوناپارٹ کا تھا۔ اس نے نہ صرف فرانس بلکہ وارسا، نپولین کے زیرِ قبضہ اٹلی، نیپلز، کنفیڈریشن آف رائنے، باویریا، ورٹمبرگ، ویسٹ فالیا، نپولین کے زیرِ قبضہ اسپین اور سوئس کنفیڈریشن کی سپاہ کو براہ راست اپنی ماتحتی میں لیا جب کہ آسٹریا اور پرشیا نپولین کے اتحادی تھے مگر اس کی افواج نپولین کی کمان میں نہیں تھیں۔ ان کے کمانڈر الگ تھے مگر انہیں نپولین کی جنگی حکمتِ عملی پر عمل کرنا تھا۔

تقریباً پونے سات لاکھ ڈاکوؤں اور سرووں کے افراد پر مشتمل اس لشکر میں کوئی پانچ لاکھ جنگجو سپاہی تھے۔ یہ لشکر مئی 1812ء کے آغاز میں یورپ سے روس کی طرف روانہ ہوا۔ موسم گرما اپنے عروج پر تھا۔ ایسے میں لشکریوں کے لیے سرما سے حفاظت کا خاص بندوبست نہیں تھا۔ سپاہیوں کے پاس عام وردیاں تھیں اور ہلکے کمبل تھے۔ راستے میں مسلسل بارشوں کی وجہ سے لشکر کو مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور بڑی مشکل سے ایک مہینے بعد یہ لشکر روس کی حدود میں داخل ہوا۔ یہاں 24 جون کو نپولین کی فوج نے نیمان دریا عبور کیا اور دوسری طرف موجود زار الیگزنڈر کی فوج کو باآسانی شکست سے دوچار کیا۔ روسی افواج یورپ کے اس متحدہ حملے کے لیے تیار نہیں تھیں اور ابھی وہ قفقاز میں امام شامل منصور کے خلاف نصف صدی پر محیط جنگ سے فارغ ہوئی تھیں۔ اس گوریلا جنگ میں روسیوں نے اتنے نقصان اٹھائے تھے کہ بقول ایک روسی جنرل کے اگر ہمارے پاس وہ لشکر ہوتے جو ہم نے قفقاز میں گنوائے ہیں تو ہم ساری دنیا فتح کر سکتے تھے۔ بہرحال اس جنگ سے روسیوں کو اپنی فوجی تنظیم اور ہتھیاروں کو بہتر بنانے میں بہت مدد ملی تھی۔

نپولین کا اصل مقصد روس اور برطانیہ کے درمیان تجارتی تعلقات کو ختم کرنا تھا۔ جب کہ مہم کا بہ ظاہر مقصد پولینڈ کو روس کے خطرے سے محفوظ رکھنا تھا۔ نپولین نے اسے دوسری پولش جنگ قرار دیا تھا جس کا مقصد پولش عوام کو روسی استبداد سے بچانا تھا۔ نپولین کے ساتھ بہت بڑی فوج تھی اور اس میں متعدد اقوام کے افراد شامل تھے۔ اسے پیچھے سے مسلسل رسد بھی مل رہی تھی۔ دوسری طرف روس کی کل فوج ایک لاکھ بیس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ جب کہ اس سے دوگنے ریزرو تھے۔ اپنی فوجی برتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نپولین روسی فوج کو پے در پے شکست دیتا ہوا مغربی روس سے شمال مشرقی روس یعنی ایشیائی روس تک لے گیا۔ اب نپولین کی نظریں ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ پر مرکوز تھیں مگر اسے احساس نہیں تھا کہ روسی فوج ایک حکمت عملی کے تحت پسپا ہو رہی ہے۔ جھڑپوں میں اس کا نقصان معمولی تھا اور اس دوران میں وہ مہلت حاصل کر کے اپنی فوجی قوت بڑھا رہی تھی۔

نپولین کو واحد بڑی کامیابی اسمولینسک کی جنگ میں ملی۔ روسی فوجوں نے یہاں شدید مزاحمت کی لیکن شکست

کھائی۔ مگر انہوں نے نپولین کو اگست تک یہیں روکے رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اگست میں موسم گرما کا خاتمہ تھا اور اب سرد موسم کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہی نہیں کہ روسی افواج نے نپولین کو تادیر روکے رکھا بلکہ انہوں نے یہ کیا کہ پسپا ہوتے ہوئے اسمولینسک کو آگ لگا دی اور اس شہر کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد وہ پیچھے جاتے ہوئے راستے میں آنے والی ہر آبادی کو آگ لگاتے گئے اور وہاں موجود افراد کو روس کے دوسرے علاقوں میں بھیجتے رہے۔ اس حکمت عملی سے روسی عوام کا بے پناہ جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔ ان میں سے بہت سے علاقے ہمیشہ کے لیے ویران ہو گئے تھے۔ بہت سے قصبے دوبارہ کبھی نہیں بس سکے۔ روسیوں نے اپنی ہی آبادیوں کی بربادی کے لیے قازقوں کی خدمات حاصل کیں اور ان کی مدد سے اس پورے علاقے میں استحصال اور پناہ کے قابل ایک جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔

نپولین اور اس کے اتحادیوں کے لیے روسیوں کی یہ حکمت عملی سمجھ سے باہر تھی کہ وہ کیوں اپنی ہی آبادیوں کو برباد کر رہے تھے اور اپنے ہی لوگوں کو مشکل میں ڈال رہے تھے۔ ایک طرف جیسے جیسے نپولین کی فوج آگے بڑھ رہی تھی اسے عقب سے رسد میں کمی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ سپلائی لائن طویل ہونے سے غیر محفوظ ہو گئی تھی۔ دوسری طرف ہر فاتح کی طرح نپولین کا خیال تھا کہ وہ دشمن کی سرزمین سے وسائل اور خوراک حاصل کرے گا۔ تقریباً سات لاکھ کے لشکر کی خوراک کا بندوبست کرنا آسان کام نہیں تھا۔ خوراک کی کمی ہوئی تو سپاہی لڑنے کی بجائے پیٹ بھرنے کی فکر میں لگ گئے۔ وہ راتوں کو کیمپوں سے خوراک کی تلاش میں نکلتے تھے مگر انہیں آس پاس کہیں خوراک کا ایک ذرہ بھی نہیں ملتا تھا۔ روسیوں نے ایسے درخت اور پودے تک کاٹ دیے تھے جن سے کھانے کی کوئی چیز حاصل ہو سکتی تھی۔

نپولین کی طرف سے لشکر کے جانوروں کو کھانے کی سخت ممانعت تھی اور ایسا کرنے والے کو سزائے موت دی جاتی تھی اس کے باوجود سپاہی بھوک سے مجبور ہو کر اپنے گھوڑے، خچر، گدھے اور دوسرے مویشی چوری چھپے کاٹ کر کھا رہے تھے۔ کیونکہ پکانے سے سب کو پتا چل جاتا اس لیے وہ جانور کاٹ کر خاموشی سے اس کا کچا گوشت اور دوسرے اعضا کھا جاتے تھے اس کی آلائشیں اور کھال زمین میں دبا دیتے۔ جانور کم ہونے سے لشکر کی رفتار کم ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ستمبر کے آغاز میں ہی موسم سرما اپنی پوری شدت سے آ گیا تھا اور برفیلی بارش کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس وقت فرانس میں درختوں کے پتے زرد ہونے کا عمل شروع ہوتا تھا اور یہاں درجہ حرارت منفی میں جا چکا تھا۔

ایسے میں لشکر کی اپنی بقا خطرے میں پڑ گئی تھی۔ نپولین کی طرف سے مسلسل پیش قدمی جاری رکھنا وہ عظیم غلطی تھی جس نے بالآخر اس مہم کو المناک انجام میں بدل دیا۔ نپولین کے اتحادی اور جرنیل اسے دبی زبان میں واپسی کا مشورہ دے رہے تھے مگر نپولین کی ڈکشنری میں شکست کے ساتھ پسپائی کا لفظ بھی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اپنے ساتھیوں کے مشوروں پر کان دھرنے کی بجائے پیش قدمی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ یہ خستہ حال فوج بغیر دشمن سے مڈبھیڑ کے گرتی پڑتی آگے جا رہی تھی۔ جو سپاہی راتوں کو خوراک کی تلاش میں نکلتے تھے آس پاس منڈلاتے قازق ان کو پکڑ لیتے یا قتل کر دیتے تھے۔ ہزاروں سپاہی اسی طرح بنا کسی جنگ کے مارے گئے تھے۔

دراصل روسی کمانڈر ان چیف جنرل فیلڈ مارشل برکلے اپنے ملک کی وسعت اور دور دراز علاقوں پر پھیلی وسیع روسی مملکت کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ یورپی روس سے نکال کر وہ نپولین اور اس کی فوج کو ایشیائی روس میں لے آیا تھا۔ مگر روس کی عوام اور اشرافیہ کو اس کی یہ بزدلانہ حکمت عملی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ انہوں نے زار الیگزینڈر پر دباؤ ڈالا کہ روسی فوجوں کو میدان میں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا جائے نہ کہ یوں بزدلوں کی طرح اپنے ہی ملک میں مسلسل پسپا کیا جائے۔ پھر برباد گاؤں اور شہروں کے پناہ گزین جب دوسرے روسی شہروں تک پہنچے تو اس سے لوگوں میں مزید اشتعال پیدا ہوا تھا۔ زار اگرچہ جنرل برکلے کی حکمت عملی سے متفق تھا لیکن اپنے امرا کے مجبور کرنے پر اس نے برکلے کو کمانڈ سے ہٹا کر ایک پرانے جنرل مائیکل کیوتزوف کو کمانڈر ان چیف بنا دیا۔ اسی دوران میں نپولین اپنی فوج سمیت ماسکو سے صرف ستر میل دور ایک پہاڑی قصبے بروڈینو تک آ پہنچا تھا۔ یہاں روسیوں نے پہاڑی ڈھلانوں پر مورچے بنائے ہوئے تھے اور نپولین کے آتے ہی وہ حملہ آور ہوئے تھے۔

یہ اس مہم کی سب سے خونی جنگ تھی۔ اس میں دونوں طرف سے ڈھائی لاکھ سپاہیوں نے حصہ لیا اور ان میں سے ستر ہزار اسی میدان جنگ میں ہلاک ہوئے۔ نپولین کو فتح ہوئی لیکن اس کی قیمت اسے اپنے پچاس اعلیٰ فوجی کمانڈروں اور ہزاروں سپاہیوں کی موت کی صورت میں ادا کرنی پڑی تھی۔ اس کے ایک ہفتے بعد نپولین ماسکو میں

داخل ہوا تو وہاں بھی اس کا استقبال کسی حکومتی نمائندے کی بجائے شعلوں نے کیا تھا۔ روس کی ساری حکومت اور اہم شہری شہر چھوڑ کر جا چکے تھے اور ماسکو کے گورنر فیوڈور راسٹوپچن نے شہر کو آگ لگانے کا حکم دیا تھا۔ نپولین کے لیے یہ ایک اور مایوس کن لمحہ تھا۔ شہر پر قبضہ اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا وہ تو زار روس سے بالمشافہ ملاقات اور امن معاہدے کا خواہش مند تھا جس کی آڑ میں زار اور شاہ انگلستان کے درمیان موجود معاہدے کا خاتمہ ہوتی مگر زار روس کی پسپائی نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

نپولین کا مقصد بہرحال روس فتح کرنا نہیں تھا وہ صرف اسے شکست دے کر اپنے اتحادیوں میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ ماسکو میں قیام کے دوران میں اس نے بات چیت کے لیے کئی وفد زار الیگزینڈر کے پاس بھیجے مگر اسے خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ واضح طور پر روسی دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی اپنائے ہوئے تھے۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ نپولین زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکے گا اور بالآخر اسے واپس جانا ہو گا اس لیے وہ وقت لینے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے تھے۔ ماسکو میں ایک مہینا ضائع کرنے کے بعد نپولین اکتوبر کے وسط میں کالوگا کی طرف بڑھا جہاں کیوٹوزوف اپنی فوج کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ دریائے وولگا کے کنارے سردی سے منجمد ہونے لگے تھے اور ہر طرف برف کی سفیدی چھا گئی تھی۔ نپولین کے ساتھی مسلسل اس پر زور دے رہے تھے کہ اب انہیں واپسی کی راہ اختیار کرنی چاہیے اس سے پہلے کہ موسم ناقابلِ برداشت ہو جائے۔ مگر نپولین کا آگے بڑھنے کا فیصلہ برقرار رہا۔

کالوگا کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ان کا سامنا ایک روسی فوج سے ہوا اور مختصر جھڑپ کے بعد روسی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ وہ بہتر پوزیشن میں تھے۔ اس شکست کے بعد روسی بڑی افراتفری میں پسپا ہوئے تھے۔ مالویاروزلاوتس کی اس جنگ سے ثابت ہو گیا تھا کہ روسی کسی بھی تک کر نپولین کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ شاید وہ نپولین سے مرعوب تھے یا پھر اپنی فوجی قوت بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ روسیوں کا نقصان نپولین کے مقابلے میں بہت کم ہوا تھا۔ البتہ ان کے بیشمار سپاہی غائب تھے جن کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ جنگ سے بچنے کے لیے فرار ہو گئے تھے۔ ان کی تعداد سوا لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ روسی فوج کے نئے کمانڈر نے بھی جنگ گریز پالیسی کو جاری رکھا اور بالآخر سرما نپولین اور اس کی فوج کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

نہ ہونے کے برابر راشن، سرمائی لباس کی عدم موجودگی اور سبزے سے محروم کمزور ہو جانے والے گھوڑے اور دوسرے باربردار جانور ابتر حالت میں تھے۔ اب نپولین کے پاس واپس جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ عقب میں روسیوں نے ماسکو اور دوسرے گاؤں دیہات اور شہروں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ ماسکو میں صرف کریملن کی تاریخی عمارت اور کچھ اور قدیم عمارات بچی تھیں۔ اب نپولین اسمولینسک جا کر یورپ سے رسد کا انتظار کرنا چاہتا تھا مگر جب وہ اسمولینسک پہنچا تو وہاں دور دور تک رسد کا نام و نشان نہیں تھا۔ ماسکو سے واپسی کے سفر میں اس کے کم سے کم دس ہزار سپاہی سردی اور بھوک کی شدت سے ہلاک ہو گئے تھے۔ ان کی لاشیں شاہراہوں پر پڑی تھیں۔ البتہ ہلاک ہونے والے جانور فوری کھا پی کر ختم کر دیے جاتے تھے۔ بھوکے سپاہی ان کا چمڑا اور کھر تک ابال کر کھا رہے تھے۔ بعد میں روسیوں کو فرانسیسی اور اتحادیوں کی لاشیں، ہتھیار اور ساز و سامان تو بہت ملا مگر انہیں کسی ایک جانور کی لاش بھی نہیں ملی تھی۔

اس تھکے ہارے اور درماندہ لشکر کا تعاقب ایک طرف تو روسی فوج کر رہی تھی۔ دوسری طرف روسی سرما ان پر قہر بن کر ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ نپولین کے آدمیوں سے ذرا بھی رعایت نہیں برت رہا تھا۔ البتہ روسی فوج اب بھی احتیاط کا دامن تھامے ہوئے بہت خاموشی سے نپولین کے لشکر کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ صرف پیچھے رہ جانے والے بے بس اور کمزور سپاہیوں کو گرفتار کر رہی تھی اور اب بھی کسی مڈبھیڑ سے بچنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ روسی فوج کے ساتھ قازقوں کے دستے بھی اب نپولین کے دستوں پر چھاپا مار کارروائیاں کر رہے تھے۔ وہ اچانک جنگلوں اور پہاڑوں سے نمودار ہوتے اور کسی خستہ حال دستے پر ٹوٹ پڑتے۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے بعد وہ اسی طرح اچانک غائب ہو جاتے جیسے اچانک آتے تھے۔ اسمولینسک کے بعد نپولین کی امید ولنیس سے تھی کہ شاید وہاں تک رسد آ چکی ہو۔

مگر ایسا لگ رہا تھا کہ عقب میں روسی فوج نے تمام رسد کا سامان روک دیا تھا یا لوٹ لیا تھا۔ اب نپولین اور اس کے سپاہیوں کے لیے ولنیس میں بھی کچھ نہیں تھا۔ نپولین نے واپسی کا فیصلہ کیا مگر اس میں بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ جب نپولین کی فوج نے بریزینا دریا کراس کیا جو مغرب میں روس کی آخری حد بھی شمار ہوتا تھا تو اس کے ساتھ صرف ستائیس ہزار صحت مند فوجی باقی رہ گئے تھے۔ کم سے کم چار لاکھ افراد

مارے گئے تھے اور ان کا صرف دسواں حصہ جنگوں میں مارا گیا تھا باقی سب سردی اور بھوک سے ہلاک ہوئے تھے۔ ایک لاکھ افراد روس کی قید میں چلے گئے تھے۔ اتحادی دستے راستے میں الگ ہو گئے تھے۔ نپولین کو بہت مجبوری کے عالم میں اپنی فوج کا توپ خانہ اور ایک بڑا حصہ بریزائن دریا کے دوسری طرف چھوڑنا پڑا تھا کیونکہ وہ اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ بعد میں یہ سب روسیوں کے ہاتھ لگ گیا۔

تھکا ہوا اور شکست خوردہ نپولین بہت تیزی کے ساتھ پیرس واپس پہنچا تھا کہ اپنی شہنشاہ کی حیثیت برقرار رکھ سکے اور روس کی طرف سے جوابی حملے کے تدارک کے لیے تازہ دم فوج تیار کر سکے۔ 14 دسمبر 1812ء کے دن نپولین کی یہ مہم مکمل ناکامی اور تباہی کے بعد بالآخر خاتمے کو پہنچی اور اسی دن سے عظیم نپولین کا زوال شروع ہو گیا۔ اس نے جس لشکر کے ساتھ روس پر چڑھائی کی تھی وہ لشکر باقی سارے یورپ کی فتح کے لیے کافی تھا۔ اپنے ازلی دشمن انگلینڈ پر چڑھائی کی بجائے جو اس کی بغل میں تھا نپولین نے دور دراز روس کا انتخاب کیا۔ حالانکہ اس وقت یورپ میں اس کے مدمقابل کوئی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ مگر اس عبرت ناک شکست نے نپولین کے سحر کے بت کو توڑ دیا۔ یورپ میں فرانس کی برتری کو ناقابل تلافی نقصان ہوا تھا اور جلد پرشیا اور آسٹریا جیسے طاقتور اتحادی فرانس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے نپولین نے انگریزوں کے خلاف مہم جوئی شروع کی مگر مصر کے پاس اسکندریا کی بحری جنگ اور واٹرلو میں شکست کے بعد بالآخر نپولین کے اقبال کا ستارہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ اس نے روس پر حملے کی خطا کا بھاری جرمانہ ادا کیا۔

کتنی حیرت انگیز بات ہے۔ ٹھیک سوا صدی بعد یورپ کے ایک اور طالع آزما ہٹلر نے بالکل یہی خطا دہرائی۔ ہٹلر نے سن بیالیس تک پورا مشرقی یورپ اور سوائے اسپین، انگلینڈ اور سوئٹزرلینڈ کو چھوڑ کر پورا مغربی یورپ فتح کر لیا تھا۔ امریکا اس جنگ سے دور تھا۔ اسپین اور سوئٹزرلینڈ غیر جانب دار تھے۔ جب کہ اٹلی، آسٹریا اور سارا ریاستیں ہٹلر کی وفاداری کا دم بھر چکی تھیں ایسے میں صرف ایک انگلینڈ تھا جو اب تک ہٹلر کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ برطانوی افواج جس طرح فرانس سے پسپا ہوئی تھیں ان کی ہمت اور حوصلے پر خود برطانوی انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ چرچل کی دلیرانہ پسپائی کی اصطلاح پر طرح طرح کی پھبتیاں کسی جا رہی تھیں۔ جرمن طیاروں کی مسلسل بمباری نے انگلینڈ کی فوجی تنصیبات اور اسلحہ سازی کی صنعت کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ دنیا کے تین بر اعظموں میں پھیلی انگریز افواج کی استعداد کو آرام طلبی اور عیاشی نے بھی نقصان پہنچایا تھا اور یہ تاثر عام تھا کہ اگر ہٹلر کے تحت جان باز دستوں نے براہ راست انگلینڈ پر حملہ کیا تو ان کا راستہ روکنا برطانوی جنگی مشینری کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

ایسے میں جب ساری دنیا کا یہی خیال تھا کہ اب ہٹلر کا ہدف برطانیہ ہوگا تو اس کی طرف سے سوویت یونین پر حملے کا حیرت انگیز فیصلہ سامنے آیا۔ حالانکہ اس خطا سے پہلے دونوں ملکوں میں کوئی تنازعہ نہیں تھا بلکہ خاصے اچھے تعلقات تھے۔ روس نے مشرقی یورپ پر جرمن قبضے کا قطعی برا نہیں منایا تھا حالانکہ وہ اس خطے کو تاریخی طور پر روس سے جوڑتا آیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہٹلر کے ٹولے کے بعض لالچی مشیروں نے اسے روس کے بے پایاں وسائل کا لالچ دیا۔

جرمنی صنعتی ترقی کے لحاظ سے تمام یورپ میں سب سے آگے تھا مگر وہ خام مال کی کمی کا شکار تھا خاص طور سے دھاتوں اور معدنی تیل کی کمی تھی۔ اس کے مدمقابل برطانیہ کو ساری دنیا کے خام مال پر اجارہ داری حاصل تھی۔ جرمنی کے پاس ایسی کالونیاں نہیں تھیں جہاں سے وہ خام مال حاصل کر سکتا ایسے میں اسے واحد راستہ سوویت یونین دکھائی دیا جو نہ صرف ضروری دھاتوں بلکہ معدنی تیل کی دولت سے بھی مالا مال تھا۔ خاص طور سے اسٹالن گراڈ کے نزدیک موجود آئل فیلڈز اور تیل صاف کرنے والے کارخانے جرمنی کی اشد ضرورت تھے۔ اس کی جنگی مشینری کو نئے ساز و سامان اور ان کو چلانے کے لیے تیل کی ضرورت تھی۔

سوویت یونین پر حملے میں ہٹلر کی فوجوں کو بھی ان ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن سے نپولین دوچار ہوا تھا۔ اول بہت طویل ہو جانے والی رسد کی لائنیں اور دوسرے روس کی بے پناہ سردی۔ جرمنی خود شدید سرد ملک ہے مگر روس کی سردی کچھ الگ ہی تھی۔ یہ ایسی سردی تھی کہ گاڑیوں کے انجن جام ہو جاتے تھے اور توپوں میں گولے پھنس جاتے تھے۔ وسائل کے چکر میں کیا جانے والا حملہ ہٹلر کے گلے پڑ گیا اور یہ بذات خود وسائل کھانے لگا۔ اس موقع پر ہٹلر سے بھی بالکل وہی غلطی ہوئی جو نپولین سے ہوئی تھی اس نے کمان دار کی غلطی تسلیم کرنے اور اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دینے کی بجائے حملے پر اصرار جاری رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال بعد جب جرمن افواج کی پسپائی شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی نازی جرمنی کا زوال بھی شروع ہو گیا۔ جرمنی

نے تقریباً تیس لاکھ اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی، کھربوں ڈالرز کا فوجی اور غیر فوجی ساز و سامان اور دو سال کا قیمتی وقت اس محاذ پر ضائع کر دیا جس میں اسے پسپائی ہی ملی۔

اس دوران میں برطانیہ کو نہ صرف سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ بلکہ اس نے اپنی اسلحہ سازی کی صنعت کو دوبارہ سے قائم کر لیا۔ پھر اس نے مغربی یورپ کے مقبوضہ ممالک میں حریت پسند تحریکوں کا جال بچھا دیا جنہوں نے جرمنوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ تیسری طرف امریکا بھی اپنی کھانے کے لیے اس وقت میدان جنگ میں کودا جب جرمنی کی شکست کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اب تک وہ اسلحے اور سامان سے اتحادی فوج کی مدد کر رہا تھا۔ امریکا کی شمولیت کے ساتھ ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ دوسری طرف سوویت یونین کمزور پڑتے جرمنی پر ایک انتقامی جذبے کے ساتھ چڑھ دوڑا۔ حالانکہ جرمن حملے کے وقت کریملن پر ایسا لرزہ طاری ہوا تھا کہ حکومت خود جلاوطن ہو کر سائبیریا جانے کی تیاری کر رہی تھی جہاں حکومت کے معتوبوں کو بھیجا جاتا تھا۔ جب روسی عوام نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر بے پناہ قربانیاں دے کر جرمنوں کو پسپا کیا تو کریملن والے شیر بن کر یورپ پر چڑھ دوڑے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک کروڑ روسی سپاہی اور عام شہریوں نے اس جنگ میں اپنی جان دے کر سپر پاور سوویت یونین کو جنم دیا۔ بہرحال ہٹلر کا روس پر حملہ اس کی فاش غلطی ثابت ہوا۔

☆☆☆

ویت نام پر فرانس کا قبضہ تھا لیکن جاپانیوں نے اسے فرانس سے چھین لیا اور جنگ عظیم کے دوران میں کئی سالوں تک ویت نام جاپانیوں کے قبضے میں رہا۔ ویت نامی اتحادیوں کے تعاون سے جاپانی قبضے کے خلاف گوریلا جنگ لڑتے رہے اور انہوں نے بے پناہ قربانیاں دیں مگر جب جاپانی پسپا ہوئے اور فرانسیسی دوبارہ آئے تو فرانس نے ویت نام کو آزادی دینے سے انکار کر دیا۔ فرانس نے یہاں پر بھی الجزائر والی پالیسی اپنائی اور قوت کے بل پر حریت پسندوں کو دبانے لگا۔ نتیجے میں ویت نامی سوویت یونین سے مدد کے طلب گار ہوئے جو پہلے ہی ایشیا میں چین اور شمالی کوریا کی مدد سے اپنے پاؤں پھیلا چکا تھا۔ روس کی جانب سے اسلحہ، تربیت اور نظریات ملنے لگے۔ ایسے میں ویت نامی جنرل وو گوین گائپ نے حریت پسندوں کو منظم کیا اور فرانس کے خلاف میدان جنگ میں آ گیا۔

جنرل گائپ بلاشبہ گوریلا جنگ کی تاریخ کے چند عظیم ترین کمانڈروں میں سے ایک ہے۔ اسے امام شامل اور مہدی سوڈانی کے درجے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جنرل گائپ نے سولہ سترہ سال کے عام سے ویت نامی نوجوانوں کو بہترین لڑاکا سپاہیوں میں بدل دیا۔ مغرب نے ایشیا کی جنگی استعداد کا ہمیشہ غلط اندازہ لگایا اور جنگوں میں مات کھائی۔ چاہے وہ 1905ء میں ہونے والی روس سے جاپان کی بحری جنگ ہو جس میں جاپانیوں نے روسی بحریہ کے تمام جنگی جہاز ڈبو دیے تھے یا 1942ء میں جاپانی مٹسوبشی زیرو لڑاکا طیارے ہوں جنہوں نے بہترین گرومین وائلڈ کیٹس کو مار گرایا جن کو بہترین تربیت یافتہ امریکی اور برطانوی پائلٹس اڑا رہے تھے۔ جنگ کوریا میں اگرچہ اسلحہ روسی تھا مگر اسے استعمال کرنے والے کورین سپاہی تھے اور انہوں نے جدید ترین امریکی اسلحے سے لیس فوج کو شکست دی تھی۔

فرانسیسی کمانڈرز کا خیال تھا کہ جنرل گائپ اور اس کے دستے جن کے پاس پہننے کو کپڑے تک نہیں تھے وہ تربیت یافتہ اور بہترین ساز و سامان سے لیس فرنچ دستوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ جنگ کا آغاز جنرل گائپ کے ڈین بین پھو کی وادی پر ایک چھوٹے حملے سے ہوا جس میں اس کے گوریلوں نے چند معمولی فرانسیسی فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ اس پر فرانسیسی کمانڈر جنرل ہنری نوارے کو پچاس ہزار کی کثیر فوج کے ساتھ جنوبی ویت نام کی طرف روانہ کیا گیا جہاں موجودہ ہیرچی منہ اور قدیم سائیگان کے قریب فرانسیسیوں کی ویت نامی گوریلوں سے مڈبھیڑ ہوئی اور اس جنگ میں سولہ ہزار فرانسیسی سپاہی مارے گئے۔ دو ہزار گوریلوں کے ہاتھ لگ گئے اور باقی زخمی تھے۔ بہت کم صحیح سلامت سپاہی واپس آ سکے تھے۔ فرانسیسیوں کو فضائی مدد بھی حاصل تھی۔ مگر ڈین بین پھو میں ہونے والی اس جنگ نے فرانسیسیوں کو اس خطے سے اپنا بوریا بستر ہمیشہ کے لیے گول کرنے پر مجبور کر دیا۔ البتہ وہ جاتے جاتے بھی ویت نام کو آزادی دینے کی بجائے اسے امریکی سامراج کے سپرد کر گئے۔

اس جنگ میں ماہرین نے جنرل ہنری کی کوتاہ نظری کو اس کی سب سے بڑی خطا قرار دی کہ وہ ویت نامی گوریلوں اور ان کے لیڈر جنرل گائپ کی صلاحیتوں اور قوت کا درست اندازہ نہیں لگا سکا۔ اسے قطعی یقین نہیں آیا تھا کہ سیاہ پاجاموں اور بنیانوں کے بیٹ چینی چاول اگانے والے کسانوں نے اعلیٰ تربیت یافتہ فرانسیسی فوج کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ وہ بھول گیا کہ جنگیں بہترین ہتھیاروں

اور نشست و برخاست کے اعلیٰ طریقوں سے نہیں بلکہ میدانِ جنگ میں خون اور آگ کے درمیان لڑی جاتی ہیں۔ یہاں وہی کامیاب رہتا ہے جو مرنا مارنا جانتا ہو۔ وزین زنا پھو کی وادی نے بھی جنگ میں مرکزی کردار ادا کیا۔ یہاں کے گھنے جنگل اور بے پناہ مرطوب موسم فرانسیسیوں کے لیے عذاب بن گیا تھا۔ وہ پانی سے لے کر ایمونیشن تک کے لیے فضائی مدد پر انحصار کر رہے تھے۔ ایسے میں ویت کانگ گوریلوں نے علاقے کی دو واحد اسٹرپس پر گولہ باری کر کے ان کو ناکارہ بنا دیا۔ اس کے بعد فرانسیسی سامان کے لیے پیرا شوٹس پر انحصار کرنے لگے مگر آدھی رسد جھول اسلحے کے دشمن کے علاقے میں گرنے لگی۔

ویت کانگ جو زیادہ تر اے کے سینتالیس سے مسلح تھے اور کسی حد تک بھاری مشین گنیں بھی تھیں انہوں نے ہر طرح کے جدید ہتھیاروں سے لیس فرانسیسی فوج کو ناقابل فراموش سبق دیا تھا۔ فرانسیسی ایک ہی جنگ سے سبق سیکھ کر ویت نام سے رخصت ہو گئے لیکن امریکی آنے والے سترہ اٹھارہ سال تک فرانسیسی حماقت کا بوجھ اٹھاتے رہے اور اپنی تاریخ کی سب سے متنازعہ جنگ میں بالآخر ذلت و رسوائی کے ساتھ پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ ماہرین جنگ کہتے ہیں کہ اگر فرانسیسی جنرل گائپ اور اس کی فوج کے بارے میں درست اندازہ لگا کر حملہ کرتے تو شاید ویت نامی تحریک مزاحمت وہیں ختم ہو جاتی مگر فرانسیسیوں کی غلط جنگی حکمت عملی نے ایک گوریلا تحریک کو ناقابلِ شکست بنا دیا۔ جس نے بالآخر دنیا کی سپر پاور کو بھی شکست سے دوچار کر دیا۔

☆☆☆

افریقہ گزشتہ تین صدیوں سے دنیا کا بدقسمت ترین براعظم رہا ہے۔ یہ پسماندہ ترین براعظم بھی ہے۔ جب یورپ جدید ہتھیاروں اسلحے سے لیس ہوا اور اس نے یہاں کے تقریباً ننگے قبائل اور بے پایاں وسائل کو دیکھا تو اس کی رال بری طرح ٹپک پڑی۔ ایشیا میں طاقتور سلطنتوں اور حکومتوں کی کمی نہیں تھی اس لیے ایشیا سے پہلے سفید فاموں نے افریقہ کا رخ کیا۔ برطانیہ، فرانس، اسپین، پرتگال، نیدر لینڈ، جرمنی، بیلجیم اور حتیٰ کہ سویڈن اور ڈنمارک جیسے چھوٹے ممالک نے بھی افریقہ میں اپنی کالونیاں بنالی تھیں مگر اٹلی ابھی اس معاملے میں خاصا پیچھے تھا۔ اٹلی کے بالکل سامنے لیبیا، تیونس اور مصر کی افریقی ساحلی پٹی ہے مگر سوائے ریتیلے صحرا کے یہاں اور کچھ نہیں تھا اس لیے اٹلی نے بھی اس خطے میں دلچسپی نہیں لی۔ ہاں جب صحراؤں نے تیل اگلنا

شروع کیا تو یہ بیکار خطہ یکایک ہی دنیا کا اہم ترین خطہ بن گیا۔ اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔

بہرحال انیسویں صدی کے آخر میں جب اٹلی نے افریقہ کا رخ کیا تو اسے پتا چلا کہ اس کے لیے یہاں صرف ایتھوپیا اور صومالیہ کی سرزمین بچی ہے۔ اٹلی نے ایتھوپیا پر قناعت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک طرف سوڈان اور دوسری طرف صومالیہ سے جڑے اس ملک میں صحرا بھی تھے اور زرخیز علاقے بھی۔ بحیرہ قلزم اس کے ساتھ لگتا ہے لیکن اریٹیریا کے الگ ہونے کے بعد اب بحیرۂ قلزم ایتھوپیا سے نہیں لگتا ہے اور یہ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا لینڈ لاک ملک بن گیا ہے یعنی اس کی زمین کہیں سے بھی سمندر سے نہیں لگتی ہے مگر انیسویں صدی میں جب یہاں عیسائی شہنشاہیت تھی تو ایتھوپیا افریقہ کے چند بڑے اور طاقتور ممالک میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا دارالحکومت ادیس ابابا افریقہ میں ایک مرکزی مقام رکھتا تھا۔ اس وقت ملک سینیلک دوم ایتھوپیا پر حکومت کر رہی تھی۔

جیسے ہی اطالوی دستے ایتھوپیا میں داخل ہوئے شروع ہوئے حکمران ملکہ سینیلک دوم نے ان کے خلاف مزاحمت منظم کرنے کا آغاز کر دیا۔ پھر دونوں فوجوں کا سامنا ایدوا کے میدان میں ہوا۔ افریقی سرزمین پر لڑی جانے والی اس خونریز ترین جنگ میں دونوں طرف سے تقریباً سوا لاکھ افراد نے حصہ لیا اور ان میں سے چودہ ہزار کے قریب افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اٹلی کی فوج کی کمان جنرل اوریسٹو براتیری کے ہاتھ میں تھی اور اس نے ایتھوپیائی فوج کی صلاحیتوں کا نہایت غلط اندازہ لگایا اس کے نتیجے میں یورپ کو افریقہ میں اپنی بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جنرل براتیری کو یقین تھا کہ افریقی سپاہی اس کی جدید ترین اسلحے سے لیس فوج کا کسی صورت سامنا نہیں کر سکیں گے۔ جب ایدوا کے میدان میں سرخ سنہری اور سبز رنگ کے پرچم میں ملبوس ایتھوپیائی فوج نمودار ہوئی تو اسے لگا جیسے وہ کوئی میلہ دیکھ رہا ہو۔ جنرل براتیری کچھ وقت جبکا میں گزار چکا تھا اور وہاں اس نے کرتب دکھانے والے افریقیوں کو تقریباً اسی حلیے میں دیکھا تھا۔

صرف چھ سال پہلے 1889ء میں اٹلی اور ایتھوپیا کی حکومتوں نے پہلا معاہدہ امن کیا۔ اس کی رو سے اٹلی کو یہاں تجارتی حقوق حاصل ہوئے اور ملکہ سینیلک دوم جس کا اصل نام بیٹے مریم تھا۔ اسے خوش کرنے کے لیے اٹلی نے سینکڑوں کی تعداد میں رائفلیں اور توپوں کے حساب سے

ایموشن تحفے میں دیا تھا ایسا کرتے ہوئے غالباً اٹلی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک دن اس کی فوجوں کو ان ہی رائفلوں اور گولیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس معاہدے کی رو سے ایتھوپیا تمام بیرونی طاقتوں سے معاملات کے لیے اٹلی کا محتاج ہو گیا مگر مسئلہ وہاں سے شروع ہوا جب ایتھوپیائی معاہدے کی کاپی میں اس نکتے کی وضاحت یوں کی گئی کہ ملک مینیلک اگر چاہے تو وہ بیرونی معاملات میں اٹلی کی مدد لے سکتی ہے۔ اٹلی اس وقت ایتھوپیا کو مالی اور فوجی امداد دے رہا تھا۔

دوسری طرف ایتھوپیا کے قبائل اس مداخلت پر بے حد مشتعل تھے۔ یہ خطہ صدیوں سے آزاد چلا آرہا تھا۔ یہاں مسلم اور عیسائی قبائل مل جل کر رہتے تھے اور یہ روایت حبشہ کے شاہ نجاشی اصحمہ کے دور سے چلی آرہی تھی۔ مسلمان کبھی اس خطے پر حملہ آور نہیں ہوئے حالانکہ یہ مسلم مملکت سے صرف تیس پینتیس میل کی سمندری مسافت پر تھا۔ آج بھی یہاں عیسائی اکثریت میں ہیں۔ افہام و تفہیم اور رواداری یہاں کے قبائل کا شیوہ تھی لیکن وہ کسی بیرونی قوت کو اپنے اوپر حکومت کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے۔ اس لیے جب اٹلی نے یہ معاہدہ کیا تو قبائل نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا صرف عیسائی قبائل ہی نہیں بلکہ مسلم عثمانی قبائل بھی اس معاملے میں اٹلی کے خلاف تھے۔ بعد میں ان ہی قبائل نے ایتھوپیا سے لڑ کر اریٹیریا کو آزاد کرایا۔ اس پر ملک مینیلک نے اصرار کیا کہ ایتھوپیا اپنی خارجہ پالیسی خود بنائے گا اور چلائے گا۔ اٹلی اس معاملے میں اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

اس پر اٹلی نے فیصلہ کیا کہ وہ بزور قوت ایتھوپیا کو اس معاہدے پر عمل کرنے پر مجبور کرے گا اور جنرل براتیری کی قیادت میں ایک بہترین فوج ایتھوپیا کے لیے روانہ کی گئی۔ اس فوج کو پہلی مزاحمت کا سامنا اریٹیریا میں باہتا باگوس سردار کی قیادت میں اکیلے گوزے قبائل کی طرف سے کرنا پڑا۔ میجر پیترو توسلی کے دستے نے قبائل کو کچل دیا اور باہتا اس جنگ میں مارا گیا۔ اٹلی کی فوج نے صوبہ تیگریان کے دارالحکومت ایڈوا پر قبضہ کر لیا۔ جنوری 1895 تک اٹلی اپنی پوزیشن بہت مضبوط کر چکا تھا اور اب وہ ایتھوپیا کے خلاف فیصلہ کن مہم کے لیے تیار تھا۔ اسی دوران میں جنرل براتیری نے جنگ کواتیت میں راس منگیشا یوہانس قبائل کو شکست دی اور انہیں جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ اس کامیابی نے اطالویوں کو مزید پر اعتماد کر دیا۔ مگر فروری میں صورت حال کی خرابی سامنے آنے لگی

جب رسد کے راستے پر قبائلیوں نے اپنے دستے لگا دیے اور فوج کے لیے سامان آنا تقریباً بند ہو گیا دوسری طرف ملک مینیلک کے حکم پر ملک بھر سے قبائل ایڈوا کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر ان رائفلوں سے مسلح تھے جو اٹلی نے فوجی مدد کے طور پر ایتھوپیا کو دی تھیں۔ یہ قبائل آہستہ آہستہ ایڈوا کے اہم پوزیشنوں پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ ایڈوا کے وسطی میدان کے آس پاس چھوٹی پہاڑیاں ہیں جن پر قائم پوسٹوں نے اس جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔ فوجی برتری کے زعم میں جنرل براتیری نے ان پہاڑیوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔ رسد کی کمی سے اس کے سپاہی متاثر ہونے لگے تھے۔

فروری کے آخر میں جنرل کے افسران نے اسے آگاہ کیا کہ رسد کی صورت حال گمبھیر ہوتی جا رہی ہے۔ اگر جلد اس سلسلے میں کچھ نہ کیا گیا تو فوج کا مورال بری طرح متاثر ہو سکتا ہے۔ اس میٹنگ میں افسران نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اسمارا کی طرف پسپا ہو جائے اور مزید رسد اور فوج کے ساتھ واپس آئے۔ یہ مشورہ صائب تھا مگر جنرل براتیری نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس نے کہا کہ پسپائی سے فوج کے مورال پر بہت برا اثر پڑے گا اور انہوں نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ رائیگاں جائیں گی مگر بعد کے حالات نے واضح کیا کہ افسران کا مشورہ درست تھا۔ رسد کی صورت حال خراب ہونے کے بعد ان کے لیے اسمارا کی طرف جانا ہی مناسب تھا جہاں اٹلی کی مضبوط فوجی تنصیبات تھیں۔ وہاں سے انہیں نہ صرف رسد بلکہ مزید فوجی کمک بھی مل سکتی تھی۔

یہاں ایک عجیب بات ہوئی اٹلی کی حکومت کی طرف سے جنرل براتیری کو تار بھیجا گیا کہ وہ واپس اسمارا آئے اور جنرل نے اس پر چند گھنٹے بعد فیصلے کا کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے کچھ جاسوسوں کی طرف سے اطلاعات کا انتظار ہے۔ ان کے آنے کے بعد وہ پسپائی کا فیصلہ کرے گا مگر نصف رات کے بعد سپاہیوں کو بتایا گیا کہ اگلی صبح انہیں جنگ لڑنی ہے۔ سپاہی جو واپس جانے کے خیال سے مگن تھے بادل نا خواستہ انہوں نے جنگ کی تیاری شروع کی۔ پہلی مارچ کی صبح نمودار ہوئی۔ جنرل براتیری کی کل فوج پونے اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ تھی اور یہ چار بریگیڈز میں تقسیم تھی۔ ان میں سے تقریباً سوا تین ہزار افراد مرد و مزید معصوم تھے اور اصل لڑاکا افراد کی تعداد ساڑھے چودہ ہزار تھی۔ اٹالین فوج کے پاس کل چھپن توپیں تھیں۔

مدمقابل افریقی قبائل کی تعداد ایک لاکھ سے ایک لاکھ بیس ہزار کے درمیان تھی اور وہ سب رائفلوں سے مسلح تھے۔ ان کے پاس ساٹھ کے قریب توپیں تھیں اور مزے کی بات ہے کہ رائفل اور توپ چلانے کی تربیت بھی انہیں اٹلی کی فوج نے دی تھی۔ اب وہ ان کی تربیت ان ہی پر آزمانے جا رہے تھے۔ اٹلی کی فوج میں ایک بریگیڈ اریٹیرین عسکری قبائل پر مشتمل تھا اور ان کی قیادت اطالین آفیسر کر رہے تھے۔ باقی ساری فوج اطالین سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس جنگ کی ناکامی کا ذمے دار جنرل براٹیری کو قرار دیا جاتا ہے لیکن اٹلی کی حکومت بھی اس میں برابر کی شریک تھی۔ اس نے فوج کو جدید میگزین والی رائفلیں دینے کی بجائے ان ہی پرانی رائفلوں پر انحصار کیا جنہیں ایک فائر کے بعد دوبارہ گولی اور بارود کا ذخیرہ بھر کر تیار کرنا پڑتا تھا اور ایک فائر کرنے میں ایک منٹ لگتا تھا۔ جب کہ نئی رائفل ایک منٹ میں چھ فائر کر سکتی تھی۔ اس کے بعد اس میں گولیاں بھرنا پڑتی تھیں اور اس میں بارود کے ذخیرے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ماہرین کہتے ہیں کہ اگر اطالین فوجوں کے پاس یہ رائفل ہوتی تو جنگ کا نقشہ بدل سکتا تھا۔ نامعلوم وجوہات کی بنا پر اٹلی نے یہ رائفل جنرل براٹیری کے دستوں کو نہیں دی تھی۔

جنگ کے آغاز سے ہی انجام واضح تھا۔ اطالوی فوج چاروں طرف سے گھر گئی تھی۔ ملک میلیک کے کمانڈر نہایت ہوشیاری اور سکون سے اپنے دستے استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے رائفل برداروں کی لہریں بنا رکھی تھیں جب ایک لہر فائر کر دیتی تو وہ پیچھے ہٹ جاتی اور دوسری لہر سامنے آکر فائر کرتی تھی۔ ان کی توپیں بھی بہتر پوزیشن میں تھیں۔ پھر ان کے پاس تیر انداز اور چاقوؤں سے مسلح چھاپا مار دستے بھی تھے۔ وہ گولیوں اور توپوں کے فائر کے دھوئیں سے اچانک نمودار ہوتے اور اطالوی دستوں کو خاک و خون میں نہلا کر غائب ہو جاتے تھے۔ پھر ان کے پاس گھڑ سوار دستے تھے جو لمبے نیزوں سے مسلح تھے۔ جب کسی جگہ اطالوی فوج کے پاس ایمونیشن ختم ہو جاتا تو وہ حملہ کر دیتے تھے۔ ملک میلیک کا خیال تھا کہ جنگ دوسرے دن تک جائے گی اور اس نے پہلے ہی اپنے فوجی مشیروں کو شام کے وقت طلب کر لیا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

دوپہر میں ہی شکست کے آثار دیکھ کر جنرل براٹیری نے پسپائی کا فیصلہ کر لیا تھا اور سہ پہر تک اطالوی فوجی میدان جنگ سے رخصت ہو گئے تھے۔ وہاں صرف مردہ، شدید زخمی اور قیدی بن جانے والے اطالوی بچے تھے۔ اس

پہلی اٹالین اتھوپیائی جنگ میں آٹھ ہزار اطالوی فوجی مارے گئے۔ جب کہ پندرہ سو شدید زخمی ہوئے تھے۔ تین ہزار اتھوپیائی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ اتھوپیا کی فوج کا نقصان چار سے ساڑھے چار ہزار کے درمیان رہا اور آٹھ ہزار زخمی ہوئے تھے۔ ملک میلیک نے اٹلی سے معاہدہ ختم کرنے اور اتھوپیا کو ایک آزاد ملک ہونے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ بعد میں اٹلی یہاں قابض ہو گیا تھا مگر وہ اتھوپیا کو ایک آزاد ملک کے طور پر ختم نہ کر سکا۔

☆☆☆

جنگی غلطیوں سے ہماری تاریخ بھی خالی نہیں ہے۔ پاکستان نے اپنے قیام کے بعد صرف بھارت سے تین جنگیں لڑیں۔ اس کے بعد وہ افغان جنگ میں شامل رہا اور اس وقت اپنی تاریخ کی اہم ترین جنگ لڑ رہا ہے۔ پاکستان کی جنگی تاریخ اور جنگی نفسیات میں کشمیر کا خطہ بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ کشمیر جغرافیائی اور آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا فطری حصہ ہے لیکن اس پر انڈیا نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس قبضے کے نتیجے میں پاکستان کو نہ صرف بہت سے مسائل اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا بلکہ یہ مسئلہ اب دریائی پانی سے محرومی کے بعد ہمارے لیے زندگی و موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ سینتالیس میں آزادی کے فوراً بعد کشمیر اور آزاد قبائلی علاقوں سے سابق فوجیوں اور رضاکاروں نے اپنے طور پر کشمیر کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ معمولی اسلحے اور ناکافی سہولتوں کے ساتھ یہ مجاہدین بھارت اور مہاراجا کی ڈوگرہ فوج کو پے در پے شکست دیتے ہوئے ایک وقت سری نگر کے پاس آپہنچے تھے اور وہ سری نگر ائرپورٹ سے صرف چند گھنٹے کی مسافت پر تھے مگر مجاہدین نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر چوبیس گھنٹے کی تاخیر کی اور اس دوران میں انڈین ائرفورس نے سری نگر ائرپورٹ پر اتر کر قبضہ کر لیا اور پھر اس کے دستوں کی آمد شروع ہوئی یوں کشمیر کی آزادی کا اولین سنہری موقع ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔

دوسرا سنہری موقع انیس سو باسٹھ کی چین بھارت جنگ میں ملا جب کشمیر خالی تھا اور ہماری فوج باآسانی اس پر قبضہ کر سکتی تھی مگر ہمارے حکمران سوتے رہ گئے اور یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اقوام اس وقت ترقی کرتی ہیں جب وہ ملنے والے مواقعوں سے فائدہ اٹھائیں اور جب وہ ایسا نہیں کرتیں تو ان کا حال ہمارے جیسا ہوتا ہے۔

دولت کی خاطر

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

بھارت کی اس بیٹی نے حسن کی بھرپور قیمت وصولنے کی خاطر برطانوی ایوان کے کئی صاحب حیثیت افراد کی عزت داؤ پر لگادی اور یہی کوشش اس کے لیے پھندا بن گئی۔ اس کی طرف انگلیاں اٹھنے لگیں۔

ایک حسینۂ عالم کے احوال شب و روز کا قصہ

وہ خطاؤں پر خطائیں کرتی جا رہی تھی۔ اس کی یہ فاش و فاحش غلطیاں ہی اسے لے ڈوبیں۔ وہ خطائیں کیا تھیں، یہ بتانے سے پہلے اس وقت کے حالات نظر میں رکھیں کہ وہ دو ہفتے قبل لندن میں اپنی پسندیدہ رنگین زندگی گزار رہی تھی۔ پارٹیوں کی تو وہ زینت تھی۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ تصاویر اتروانے وقت لوگوں کے چہروں پر فخر و انبساط نمایاں ہوتا تھا۔

اسے برطانیہ منتقل ہوئے صرف چار برس ہی ہوئے

تھے مگر حسن و جمال کے اس پیکر سابق مس انڈیا یعنی پامیلا بوردز نے اپنی غیر معمولی شخصیت کے باعث برطانوی اخبارات میں نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔ آئے دن پامیلا کی تصاویر اخبارات و جرائد کی زینت بنتی تھیں اور لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے تھے۔ چار برس کے مختصر عرصے میں پامیلا نے بااثر اور معقول سیاست دانوں، اہم صحافیوں اور معروف فنکاروں پر گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ امیر ترین افراد بھی پامیلا کی دلکشی و دلربا شخصیت سے متاثر تھے۔ اس کے مداحوں کی تعداد بھی بہت ... زیادہ تھی۔ وہ محفل کی جان کہلاتی تھی۔ اسی دوران اس کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب در آیا اور وہ دنیا بھر کے اخبارات کی شہ سرخیوں میں آگئی۔ اس طرح اس کی زندگی کا دوسرا قابل اعتراض رخ سامنے آیا اور پوری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اس کی شخصیت کے اس رخ نے برطانیہ کے طبقہ امراء کو حیران کردیا۔

پامیلا کی پراسرار شخصیت کے بارے میں متعدد سوالات لوگوں کے اذہان میں گردش کررہے تھے۔ اور ان میں اہم ترین سوال یہ تھا کہ کیا پامیلا سنگھ مارگریٹ تھیچر کی حکومت کو ناکام بنانے یا اسے کمزور کرنے میں کامیاب ہوجائے گی جیسا کہ چھبیس برس پہلے کرسٹین کیلر نے کیا تھا؟

☆☆☆

ایک روز پامیلا سنگھ صبح سویرے بیدار ہوئی تو خود کو تازہ دم اور ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔ شب خوابی کے بیش قیمت لباس کو درست کرتے ہوئے پامیلا نے اخبارات کا پلندا اٹھایا۔ اینڈریو کا اخبار سنڈے ٹائمز، ڈونالڈ کا آبزرور، ڈیوڈ کا سنڈے اسپورٹس اور سنڈے مرر، پامیلا کے پسندیدہ اخبارات و جرائد تھے اور یہ تینوں صاحبان پامیلا کے قریبی دوست تھے۔ نیوز آف ورلڈ سے تو پامیلا کو بڑی انسیت تھی۔ نیوز دی ورلڈ میں پامیلا کی نظر اپنی ایک تصویر پر رو سکتے میں آگئی۔ اس کے بارے میں سرخیاں بیچھے اسے بچھوؤں کی طرح ڈنک مارنے لگیں۔ اس نے بہ مشکل تمام اپنی چیخ روکی اور فوراً ہی اپنی شخصیت کے بارے میں ہنگامہ خیز انکشاف پڑھنے لگی۔

وہ حیران تھی کہ اس کے راز اخبارات تک کیسے پہنچ گئے؟ وہ ہمیشہ اس بارے میں محتاط رہتی تھی۔ اپنے گھر سے اور خاص دوستوں کے بارے میں اس نے آج تک کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے بلیک میلنگ سے محفوظ رہنے کے لیے بھی کئی اقدامات کررکھے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کہاں خطا ہوئی ہے؟

پامیلا سنگھ کا دماغ بری طرح گھوم رہا تھا۔ جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی ناگفتہ بہ حالت پر قابو پایا اور تمام تر توجہ سے خبر پڑھنے لگی۔ دھیرے دھیرے پامیلا کے ذہن پر چھائی دھند چھٹنے لگی۔

اسے یاد آیا کہ گزشتہ رات پارٹی میں ایک خوش پوش شخص نے اس کے ساتھ گھر چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور اس نے جواب میں پانچ سو پاؤنڈ طلب کیے تھے۔ پتا نہیں وہ اتنی غیر محتاط کیوں ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ ایسے مراحل سے گزری تھی۔ اس نے بڑے تحمل اور عمدگی سے معاملات طے کیے تھے مگر اس اسٹاک بروکر سے بات کرتے ہوئے نہ جانے کیوں اسے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ دراز قد گورو چہرہ اسٹاک بروکر نے پانچ سو پونڈ دینے کی ہامی بھرلی تھی۔ اس نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی بھی تھی پھر اچانک اسے کوئی بات یاد آگئی اور وہ نوٹوں کی گڈی جیب میں ڈال کر چلا گیا۔ اسٹاک بروکر سے جان چھوٹنے پر پامیلا نے اطمینان کا گہرا سانس بھی لیا تھا۔

پامیلا اپنی شخصیت کے بارے میں بہت بری خبر کو دیکھتے ہوئے اپنی خطا پر سخت پچھتا رہی تھی۔ وہ اپنے اس غیر محتاط رویے پر حیران بھی تھی۔ اسے کیوں یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ اس کے لیے جال پھیلایا گیا ہے؟ حالانکہ کال گرل کی حیثیت سے وہ جانتی تھی کہ اجنبی لوگ بڑے زہریلے ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اور کیا نہ کرے۔ کیا اسے اپنے دوست آبزرور کے ڈونالڈ کو فون کرنا چاہیے؟ سنڈے ٹائمز کے اینڈریو کو اس نے چند روز قبل زوردار تھپڑ سے نوازا تھا۔ بے چارے اینڈریو نے کئی فون بھی کیے تھے مگر پامیلا نے آپریٹر کو سختی سے ہدایت دے دی تھی کہ وہ اس کے ساتھ بات کرنا نہیں چاہتی۔ ممکن ہے ڈونالڈ اس کی مدد کرسکے آخر تو وہ آبزرور کا ایڈیٹر تھا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ چند روز کے لیے کہیں روپوش ہوجائے؟ مگر وہ جانتی تھی کہ اخباری نمائندے بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ کئی صحافی اس کی رہائش گاہ کے اردگرد بھی منڈلا رہے ہوں گے۔ وہ تھوڑی دیر بولائی بولائی سی اپنی خواب گاہ میں چکراتی رہی پھر اس نے ایک بڑے تھیلے میں کپڑے اور روزمرہ استعمال کی چیزیں بھرنی شروع کردیں۔

پیکنگ سے فارغ ہونے کے بعد پامیلا نے چند فون کیے اور یوں "نیوز آف دی ورلڈ" میں اپنے بارے میں بری

خبر پڑھنے کے آدھے گھنٹے بعد وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی پامیلا بورڈز نہیں تھی۔ سات سال پہلے تو وہ سیدھی سادی شریف اور خوش اطوار پامیلا سنگھ تھی۔ اس نے جے پور میں جنم لیا تھا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے وطنی امریکا چلی گئی تھی۔ گلابی شہر جے پور کے مہارانی گایتری دیوی اسکول میں اس نے یادگار دن گزارے تھے۔ پھر پندرہ برس کی عمر سے اس کے خیالات تبدیل ہونے لگے۔ وہ دہلی، بمبئی، کیلی فورنیا اور لندن کے خواب دیکھنے لگی۔ اس زمانے سے ہی پامیلا کے تعلقات اپنے والدین سے کشیدہ ہونے لگے۔ پامیلا کے باپ نے ابتداء میں اسے نظر انداز کیا تھا البتہ اپنی ماں کے وہ بہت زیادہ قریب تھی۔ اسے بننے سنورنے اور مت نئے ملبوسات کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ بہت جلد اس نے اونچی سوسائٹی کے ادب و آداب سیکھ لیے تھے۔

1978ء میں وہ دہلی منتقل ہوئی تو اس کی انگریزی زیادہ اچھی نہ تھی۔ ٹینس کھیلنے کا اسے جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس زمانے میں اس نے اشتہاری فرموں کے لیے ماڈلنگ شروع کر دی اور اسے تھوڑے بہت پیسے بھی ملنے لگے۔

ایک روز پامیلا ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے مالک کول جی پی سنگھ کے دفتر پہنچ گئی۔ اسے پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ خاندان میں کوئی بھی فرد اس کی مدد نہیں کرتا تھا۔ کھانے پینے رہنے اور تعلیم وغیرہ کے تمام اخراجات اسے خود ہی ماڈلنگ وغیرہ کر کے پورے کرنا پڑ رہے تھے۔ پامیلا خوش پوش نہیں تھی۔ اس کے پاس ڈھنگ کے کپڑے تک نہیں تھے اور یہی وجہ ہے کہ اشتہاری ایجنسیاں اسے ٹرخا رہی تھیں۔ کئی لوگوں کی رائے تھی کہ وہ کبھی ماڈلنگ کے پیشے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کول سنگھ نے پامیلا کے حالات سے متاثر ہوتے ہوئے اسے کئی کام دلوا دیے۔ کئی بڑی فرموں کے لیے اس نے ماڈلنگ کی تھی۔ کول سنگھ نے پامیلا کے بارے میں کچھ اس طرح اظہار خیال کیا: ”پامیلا کے ساتھ میرا برتاؤ کوئی خاص نہیں تھا۔ میں نے اسے ایک عام سی ماڈل گرل خیال کیا تھا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دبلی پتلی دلکش لڑکی اتنی اہمیت اختیار کرے گی۔ جو کچھ میں نے اس کے بارے میں پڑھا ہے اس سے مجھے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔“

مشہور فوٹو گرافر اویناش نے پامیلا کے بارے میں بتایا۔ ”پامیلا میرے بیٹے کی دوست تھی۔ کبھی کبھار وہ ہمارے گھر آتی تھی۔ بے باک اور جارحانہ فطرت کی باغی قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے کارنامے سن کر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے بیٹے کو منع بھی کیا تھا کہ وہ اس قسم کی لڑکیوں سے دوستی نہ کرے۔ مگر آج کل کی باغی نسل ہم پرانے لوگوں کی باتیں کہاں مانتی ہیں۔“

ایک معروف اشتہاری ایجنسی کے اکاؤنٹ ایگزیکٹو راشد ابراہیم نے کہا۔ ”مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ پامیلا دراز قد اور پُرکشش لڑکی تھی۔ مردوں سے دوستی کرنے کا اسے کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔“

نیشا سنگھ بمبئی کی مشہور ماڈل گرل ہے اور پامیلا کے ساتھ کئی مرتبہ ماڈلنگ کر چکی ہے۔ اس نے پامیلا کے بارے میں بتایا۔ ”وہ میرے ساتھ دو بڑے رنگین اشتہارات کے لیے کام کر رہی تھی۔ ہماری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کبھی پامیلا سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے ایک اشتہار کے لیے نامناسب لباس پہننے سے انکار کر دیا جبکہ پامیلا جھٹ راضی ہو گئی تھی۔ لڑکوں میں وہ بے حد مقبول تھی۔ دولت سے اسے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ ہر وقت پیسے کمانے اور پُرتعیش زندگی کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔“

ایک اور ساتھی ماڈل گرل ریتا، جو آنکھوں میں فلم اسٹار بننے کے سپنے سجائے بمبئی آئی تھی۔ پامیلا کی دوست رہ چکی تھی۔ اس نے پامیلا کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں ایسی لالچی لڑکی نہیں دیکھی جو ہر اپنے غیرے مرد سے تحائف کا مطالبہ کرنے سے نہیں چوکتی تھی۔“ پامیلا کے ایک اور پرانے ساتھی ساجد نے بتایا۔ ”وہ ذہنی طور پر الجھی ہوئی لڑکی تھی۔ الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی تھی۔ مغربی طرز زندگی سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ پہلے تو میں سمجھا تھا کہ وہ منشیات کی عادی ہے۔ ہیروئن کوکین وغیرہ سے شغل کرتی ہے مگر پھر معلوم ہوا کہ وہ صرف چرس پیتی ہے۔ یہ سن کر مجھے شدید دھچکا لگا ہے کہ پامیلا کال گرل ہے۔ میں تو اسے بہت شریف اور معصوم سمجھتا تھا۔ پھر ایک روز وہ غائب ہو گئی اور ایک طویل عرصے تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا پھر میں نے اخبارات میں پڑھا کہ پامیلا نے مس انڈیا کا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔“

☆☆☆

ماڈلنگ کرتے ہوئے پامیلا نے ترقی کی خاطر کئی بااثر اور امیر آدمیوں سے دوستی کی تھی۔ ان میں بالی ڈے ان بمبئی کے مالک رمیش کھنہ دواؤں کی ایک بڑی فرم کے

مانک اجیت سنگھ اور مشہور فوٹو گرافر پابلو شامل ہیں۔ پابلو کے ساتھ پامیلا کے تعلقات بہت قریبی تھے۔ پامیلا نے مس یونیورس کے مقابلے میں شرکت کے لیے بیرون جانے کی خواہش ظاہر کی۔ تو پابلو نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بھارت سے نکلنے کے بعد پامیلا بھی واپس نہیں آئے گی اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔

☆☆☆

کہا جاتا ہے کہ پامیلا بنیادی طور پر ایک کال گرل تھی جو اپنے گاہکوں سے یومیہ پانچ سو پاؤنڈ (ساڑھے سترہ ہزار روپے) اور ویک اینڈ کی دو ہزار پاؤنڈ (70 ہزار روپے) وصول کرتی تھی۔ یہ برطانیہ میں کسی بھی کال گرل کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ ہے۔ پھر حکمران ٹوری پارٹی کے ایک رکن پارلیمنٹ ڈیوڈ شا نے تحقیقی مقاصد کے لیے اس کی خدمات حاصل کیں۔ جس کے ساتھ ساتھ کھیلوں کے وزیر کولن موئی ہان کے ساتھ اس کے تعلقات قائم ہو گئے۔ قومی سطح کے اخبارات مثلاً ''سنڈے ٹائمز'' اور ''آبزرور'' کے مدیروں سے بھی اس کی آشنائی ہوئی۔ اسے خصوصی سیکیورٹی پاس جاری کیا گیا۔ رفتہ رفتہ پامیلا کا معاملہ دارالعوام میں زیر بحث آیا اور پھر پریس میں آتا چلا گیا۔ یہاں ضروری ہے کہ چوتھائی صدی پیشتر شہرت پانے والی کال گرل کرسٹین کیلر کا قصہ مختصر دہرا دیا جائے، کیوں کہ پامیلا کا کیس کرسٹین کیلر سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔

یہ 1963ء کی بات ہے۔ برطانیہ میں اس وقت بھی کنزرویٹو پارٹی کی حکومت تھی۔ حکومت کے وزیر دفاع پروفیومو کا کرسٹین کیلر نامی ایک کال گرل سے معاملہ چلا اور اس کال گرل کے تعلقات سوویت نیول اتاشی کے ساتھ تھے اور وہ اس کے اشارے پر کام کر رہی تھی۔ یہ مضحکہ خیز صورت حال اور کیلر کے ساتھ وزیر دفاع کے تعلقات جب دارالعوام میں زیر بحث آئے تو نتیجے کے طور پر پروفیومر کو وزارت سے مستعفی دینا پڑا اور اگلے انتخابات میں کنزرویٹو پارٹی شکست کھا گئی۔ یوں کیلر سے تعلقات کی غلطی کا خمیازہ اس طرح بھگتنا پڑا کہ پروفیومر اور پھر ٹوری حکومت کو لے ڈوبی۔

پامیلا کا قصہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ٹوری پارٹی سے تعلق رکھنے والے رکن پارلیمنٹ اور حکومت کے ایک وزیر سے تعلقات، دارالعوام میں موضوع بحث اور اپوزیشن کی طرف سے حکومت پر زبردست تنقید...... واقعات بالکل اسی تسلسل سے چل رہے تھے۔ تاہم کرسٹین کیلر اور پامیلا بورڈز کے معاملات شاید اس طرح شہرت نہ پاتے اور برطانیہ کے تمام اخبارات، چاہے وہ ''مرر'' کی طرح محض اسکینڈل چھاپنے والا اخبار ہو یا ''ٹیلی گراف'' جیسا سنجیدہ اخبار ہر ایک میں روزانہ اس کیس کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر نہ ہوتی۔ اگر معاملہ لڑکی بلکہ ایک بہت خوب صورت لڑکی کا نہ ہوتا۔

برطانوی قوم کے لیے سیکس اسکینڈل سے بڑھ کر کوئی قصہ مزیدار نہیں ہوتا۔ پھر اسکینڈل بھی کس کا؟ برطانیہ کی سب سے مہنگی کال گرل کا...... چنانچہ اس قصے کو زیادہ سے زیادہ شہرت ملتی چلی گئی اور اخبارات والے حقائق کی تلاش میں بمبئی، چنڈی گڑھ، پیرس اور نیویارک کے چکر لگانے لگے اور مدتوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

پامیلا افیئر، کیلر کے اسکینڈل سے مکمل مشابہت رکھتا ہے مگر اس میں ابھی تک ایک آنچ کی کسر تھی۔ دونوں کیسوں میں یکسانیت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی تھی جب تک سوویت نیول اتاشی، یعنی کوئی ایسا غیر ملکی جو برطانیہ کے دشمن ملک سے تعلق رکھتا ہو، اس قصے میں شامل نہ ہو جاتا۔ جلد ہی یہ شرط بھی پوری ہو گئی۔ سوویت نیول اتاشی کا کردار لیبیا کے احمد قذافی الدائم نے ادا کیا۔ جو معمر قذافی کا رشتے کا بھائی اور لیبیا کی سیکیورٹی سروس میں میجر کے عہدے پر فائز تھا۔ الدائم برطانوی انٹیلی جنس کے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت تھا۔ تاہم یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ الدائم کی حیثیت کو محض اس کے فوجی عہدے کے حوالے سے نہ دیکھا جائے، کیوں کہ معمر قذافی بھی تو محض ایک کرنل تھے۔

میجر الدائم کے منظر میں داخل ہوتے ہی پامیلا کا معاملہ محض ایک سیکس اسکینڈل نہ رہا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ایک سیاسی اور قومی سلامتی کا معاملہ بن گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پامیلا کے ذریعے برطانیہ کے خفیہ راز لیبیا تک پہنچے ہوں گے اور پھر وہاں سے کریملن تک...... یہ راز کس طرح حاصل ہوتے ہوں گے؟ پامیلا کا حسن اور اس کی شخصیت کا سحر ایسا ہے کہ مرد بے اختیار اس کے گرد منڈلانے لگتے۔ آسانی سے اس کے ہاتھوں بے وقوف بنا جاتے۔ بہت سے اعلیٰ عہدے دار، معاشرے میں بلند مقام کے حامل انگریز مرد اس کے خدوخال کے اسیر رہے ہیں۔ تاہم جو نہی یہ معاملہ پریس میں آیا تو وہ سارے مرد جن کے پامیلا کے ساتھ تعلقات رہ چکے تھے، اپنی اس غلطی کے ازالے کی کوشش میں اس کی تردید کے لیے دوڑ پڑے۔

جب ان اخبارات کے مدیر سے رابطہ قائم کیا گیا جن سے پامیلا کے تعلقات تھے تو انہوں نے اس کی تردید کی۔ تاہم "سنڈے ٹائمز" کے مدیر اینڈریو نیل نے جو تاحال کنوارا تھا خود پر لگائے گئے الزامات کی تائید یا تردید نہیں کی اور اس معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کرلی۔

ادھر حزب اختلاف نے الزام لگایا کہ سیکورٹی کے مسئلے سے توجہ ہٹانے کے لیے ٹوری پارٹی اس معاملے کو محض اخباری اسکینڈل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دارالعوام میں اس معاملے میں ٹوری پارٹی پر زبردست تنقید جاری تھی اور اس ہنگامے نے برطانیہ کی حکومتی پارٹی کو مشکلات میں مبتلا کردیا۔

پامیلا مقابلے میں شرکت کے لیے جب پیرو کے شہر لیما پہنچی تو اس کے پاس محض 1500 امریکی ڈالرز تھے۔ وہ مقابلے میں کوئی ایوارڈ نہ جیت سکی مگر اس بات نے اسے یہ موقع فراہم کردیا کہ وہ بھارت کے اوسط درجے کی بور زندگی سے چھٹکارا پا کر ایک نئی سنسنی خیز خوب صورت دنیا میں پہنچ گئی۔ چنانچہ مقابلے کے اختتام پر اس نے نیویارک میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

نیویارک میں پامیلا فلموں اور ماڈلنگ کے شعبے میں کام حاصل کر سکتی تھی لیکن وہ اس سے بھی بڑا کھیل کھیلنے کی خواہش مند تھی۔ ایسا کھیل جس سے اسے بے پناہ دولت حاصل ہو اور اس کا چرچا ملک ملک اور شہر شہر ہو۔ وہ محض دوسری پرنس کھمبا نہیں بننا چاہتی تھی جسے بالی وڈ کے فلم بینوں کے حلقے سے باہر کوئی بھی نہ جانتا ہو۔ چنانچہ اس نے اپنے لیے ایک الگ لائن کا انتخاب کیا۔

1983ء میں یہ مختصر وقت کے لیے بھارت آگئی۔ اس کی ایک جاننے والی ماڈل گرل شرمیلا رائے چودھری کا کہنا ہے کہ پامیلا اب پہلے والی پامیلا نہیں لگتی تھی۔ وہ جدید فیشن کا قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی اور ایک عرب اس کے ساتھ تھا۔ یہ اس کی نئی طرز زندگی کا آغاز تھا۔ وہ اب بھارتی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ نیویارک میں اس کے حلقۂ احباب میں اسلحے کے بین الاقوامی تاجر عدنان خشوگی جیسے لوگ شامل تھے۔ نیویارک سے وہ پیرس چلی گئی جہاں اس نے ایک فرانسیسی تاجر ہنری بوروز سے شادی کرلی۔ یہ بندھن زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکا۔ پیرس سے لندن، جہاں ایک اور معاشقہ اور پھر بلگریویا کے علاقے میں اپنے ایک وکیل دوست کے گھر میں ایک کمرا حاصل کر کے رہنے لگی اور لندن میں کاک ٹیل پارٹیوں اور سماجی تقریبات میں شرکت کرنے لگی۔ جہاں اس نے خود کو اپنی نئی شخصیت کے روپ میں پیش کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے کلکتہ میں تربیت حاصل کر رکھی ہے اور کیٹرنگ کا کاروبار کرنا چاہتی ہے۔ اس دوران میں اس کے دوستوں میں "بورڈ روم" میگزین کا تقار نولی ربے کلک بھی شامل تھا۔ کلک، پامیلا کی حسن اور شخصیت کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے۔ "پامیلا خوبصورت، مسحور کن شخصیت کی مالک ہے اور اس کی دلچسپیوں کا دائرہ کار (کام سے) سے زیادہ وسیع ہے......"

کلک کا کہنا ہے کہ اس وقت وہ کسی مالدار شوہر کی تلاش میں تھی۔ وہ اپنی زبان سے یہ بات نہیں کہتی تھی مگر اس کی باتوں سے یہی تاثر ملتا ہے۔ پامیلا کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ وہ بے حد ذہین ہے اور اس کے پاس وہ جادو ہے جو ہر جگہ اس کے کام آتا ہے۔ کرسٹین ریلیاورز نے اس بات کا تجزیہ کیا ہے کہ مرد پامیلا کے اس قدر دیوانے کیوں ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ پامیلا حسین خدوخال اور خوبصورت جسم کی مالک ہونے کے علاوہ ذہین بھی ہے اور حس مزاح کی مالک بھی۔ چنانچہ جہاں پارٹیوں میں خواتین مردوں کی باتوں پر بے وجہ زور زور سے قہقہے لگاتی ہیں تاکہ دیگر عورتوں کو "کارنر" کیا جاسکے وہاں پامیلا اس عادت میں مبتلا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے اس طرح کی کوئی حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس کی اپنی باتیں ہی اس قدر دلچسپ اور پُرمزاح ہوتی ہیں کہ مرد انہیں سننے کے لیے بے

ہاتھ پر پہنا جانے والا کمپیوٹر

ٹیکنالوجی میں ترقی کی بدولت نت نئی ایجادات سامنے آرہی ہیں۔ کمپیوٹر ہی کی مثال لے لیں۔ اس میں نت نئی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ حال ہی میں ایئر ماؤس کے نام سے ایسا کمپیوٹر تیار کیا گیا ہے۔ جسے دستانے کی طرح ہاتھ پر پہنا جا سکتا ہے۔ ایئر ماؤس میں ایسے سنسرز نصب کیے گئے ہیں جو قریب موجود کمپیوٹر سے منسلک ہونے کے باعث ہاتھ کی حرکات کو سیکنڈوں میں نوٹ کر کے اس پر عمل درآمد کرتے ہیں۔ اسے پہن کر ہاتھ کو زیادہ ہلانے جلانے کی مشقت نہیں کرنی پڑتی۔ لہٰذا کسی بیماری میں مبتلا افراد یا زخمی افراد کے لیے یہ ایک موثر ترین ایجاد ہے۔ وہ بھی اسے آسانی سے استعمال کر سکیں گے۔

تن گوش رہے۔ چنانچہ دوسری خواتین جو مقصد مردوں کی باتوں پر بھونڈے قہقہے لگا کر حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں پامیلا بڑی خوب صورتی سے وہی مقصد اپنی متانت اور مزاج سے حاصل کر لیتی ہے۔

پامیلا نے ''بورڈ روم'' اور ''ہارپر اینڈ کوئن'' جیسے لندن کے بڑے بڑے رسالوں میں اپنے کیٹرنگ کے بزنس کے بارے میں اشتہارات دیے مگر اس کا یہ کاروبار محض برائے نام ہے۔ اس کے پاس اتنی رقم کہاں تھی کہ وہ اپنے لیے ہوٹلوں کے سوٹ بک کرا سکے اور جیولری سے بھری رہے۔ یہ بات سب کے لیے راز تھی۔ وہ دوستوں کو بتاتی تھی کہ بھارت سے اس کی ماں اور فرانس سے اس کا شوہر اسے پیسے بھیجتے ہیں۔ کسی کو یاد نہیں کہ اس نے کبھی اپنے کسی عرب دوست کا تذکرہ بھی کیا ہو۔

مارچ 1988ء میں ٹریمپ ٹائٹ کلب میں وہ سنڈے ٹائمز کے مدیر اینڈریو نیل سے ملی۔ نیل اور وہ مارچ کے وسط سے لے کر اگست تک اکٹھے رہے۔ نیل کے ساتھ تعلقات کے نتیجے میں پامیلا سرکاری تقریبات، عشائیوں اور دعوتوں میں جانے لگی۔ تقریبات میں اس کی تصاویر کھینچی جاتیں جو اخبارات میں چھپتیں۔ یوں اس کے حسن کو شہرت ملتی گئی۔

پامیلا کے دوستوں اور بہی خواہوں کے مطابق وہ جس قدر تیزی کے ساتھ ہم عمروں میں اپنے شائقین کو چھوڑ کر دنیا کی اہم سیاسی اور کلیدی عہدوں پر فائز شخصیات سے روابط بڑھا رہی تھی وہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ وہ ان سے تعلقات کے فائدے میں دولت اور شہرت سمیٹ کر چلتی بنتی..... یہ بات اس کی جان کو ایک دن ضرور خطرے سے دوچار کر سکتی ہے۔ مگر پامیلا ان کی باتوں پر کان دھرے بغا اپنی ہی دھن میں مست تھی۔

دوستوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ نیل اور پامیلا کے تعلقات انتونی اور قلوپطرہ کے تعلقات کی مانند تھے۔ شوخیوں اور شرارتوں سے بھرپور۔ ان کے تعلقات اگست میں اختتام کو پہنچے مگر یہ تعلقات کا مکمل خاتمہ نہیں تھا۔ اکتوبر کے اواخر میں ایک دوست نے وکیل کے ذریعے پامیلا کو نوٹس بھیجا کہ اگر اس نے نیل سے کوئی تعلق رکھنے کی کوشش کی تو اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جائے گی۔ نیل سے تعلقات کے خاتمے کے بعد پامیلا اس کے مخالف اخبار ''آبزرور'' کے ایڈیٹر ڈونالڈ ٹریلفورڈ سے ملی۔

ٹریلفورڈ کا کہنا ہے کہ پامیلا نے اسے نیل کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی جنھیں نیل کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ٹریلفورڈ کے بقول اس نے یہ پیش کش مسترد کر دی تاہم دونوں کے بیچ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

ٹریلفورڈ کا کہنا ہے کہ وہ پامیلا سے محض چھ بار ملا ہے۔ یہ ملاقاتیں بزنس میٹنگز اور تقریبات میں ہوتی رہیں مگر ان کے بیچ کوئی تعلق نہیں تھا اور اس سلسلے میں وہ کچھ نہیں چھپا رہا۔

ٹریلفورڈ نیل کی طرح کنوارا نہیں تھا۔ اپنی ازدواجی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانے کی خاطر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ نیل کی طرح خود پر لگائے گئے الزامات کے جواب میں محض خاموش نہ رہے۔ سو پامیلا اور اپنے تعلق کے بارے میں خبریں چھاپنے پر اس نے پریس کی مزدور مذمت کی۔ اگست ہی میں اپنے پرانے دوست کنگ کی وساطت سے وہ ''بورڈ روم'' کا ایڈیٹر مارک بورکا سے متعارف ہوئی، بورکا پچھلے عام انتخابات میں ڈیوڈ شا کا پرسنل اسسٹنٹ رہ چکا تھا اور اس نے شا کی انتخابی مہم چلائی تھی۔ ستمبر میں بورکا نے ہوٹل سے فیئر میں چھ دوستوں کو دعوت دی جس میں شا، پامیلا اور ٹریلفورڈ بھی شریک ہوئے۔ سات ہفتے بعد پامیلا نے شا سے رابطہ قائم کیا اور اس سے پوچھا کہ کیا کسی رکن پارلیمنٹ کو ریسرچ اسسٹنٹ کی ضرورت ہے..... شا نے اندازہ لگایا کہ پامیلا تعلقات عامہ یا پارلیمانی لابی میں کام حاصل کرنے کی خواہاں ہے۔

''وہ دارالعوام میں مجھ سے ملی۔ میں نے اس سے مختلف سوالات کیے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش چاہی کہ اس کا شوق کس درجے پر ہے۔ میں نے اس سے ایسے سوالات کیے اور کام کی نوعیت کو اتنا مشکل ظاہر کیا کہ اگر اسے کام میں انتہائی درجے کی دلچسپی نہ ہوتی تو وہ بھاگ جاتی۔''

''شا کا کہنا ہے کہ پامیلا مجھے ذہین اور اوسط درجے کے تحقیقی کاموں کے لیے موزوں نظر آئی۔ شا نے اسے بلا معاوضہ ریسرچ اسسٹنٹ رکھ لیا۔ اسے شا کے اس مجوزہ بل کے بارے میں تحقیق کرنا تھی جس کا مقصد ''نیٹ بک اگریمنٹ'' کو ختم کرنا تھا۔ اس اگریمنٹ کی رو سے دکان والے رعایتی نرخوں پر کتابیں نہیں بیچ سکتے تھے۔ پامیلا نے دسمبر کے اواخر سے کام شروع کیا اور 21 فروری تک یہ کام کرتی رہی۔

دارالعوام میں کام کرنے والے دیگر ملازمین کی

طرح تحقیقی کام کرنے والوں کو بھی پاس حاصل کرنا پڑتا ہے۔ نئے قواعد کے مطابق تحقیقی کام کرنے والوں کو پاس جاری کرنے کے لیے اراکین کا کوٹہ مقرر کیا گیا ہے۔ شا کے ایک ساتھی رکن جیری بیلنکم کے کوٹے میں مزید پاس جاری کرنے کی گنجائش موجود تھی اس لیے شا کے کہنے پر بیلنکم نے پامیلا کے لیے پاس جاری کرا دیا۔

شا کا کہنا ہے کہ اس نے یورکا سمیت اپنے بہت سے دوستوں سے پامیلا کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ کیوں کہ وہ شخص سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھا اس لیے اس سے اس بارے میں دریافت نہ کیا جا سکا۔ شا کا کہنا ہے کہ پامیلا کا تحقیقی کام بہت شاندار تھا اور اس سے اسے بل کی تیاری میں بے حد مدد ملی۔ پامیلا سے تعلق رکھنے والے دوستوں لوگوں کی مانند شا بھی اس کی پُر زور سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ملنے والا یہ کام پامیلا کے سیاسی و سماجی اثر و نفوذ کو بڑھانے میں بے حد مددگار ثابت ہوا۔ اس کے ذریعے کھیلوں کے وزیر کولن موئنی ہان سے اس کی شناسائی ہوئی اور موئنی ہان اسے لوری پارٹی کے سالانہ زمستانی محفل رقص میں لے گیا۔

اخبارات نے اس تقریب کی تصاویر شائع کیں جن میں پامیلا موئنی ہان کے ہمراہ ہال میں داخل ہو رہی ہے۔ ان تصاویر کے شائع ہوتے ہی ہنگامہ مچ گیا اور پامیلا کے بارے میں انکشافات شروع ہو گئے۔ شا کے لیے تحقیقی کام ختم کرنے کے بعد پامیلا نے دارالعوام میں مزید کام حاصل کرنے کی کوششیں کی تھیں۔

"نیوز آف دی ورلڈ" کی طرف سے پامیلا پر الزام لگائے جانے سے بیشتر ہی پامیلا ایک اتاشی یورکر کے ساتھ اپنی منگنی کا اعلان کر چکی تھی اور دوستوں کو بتاتی پھر رہی تھی کہ ان کا انڈونیشیا کے جزیرے بالی میں ہنی مون منانے کا پروگرام ہے۔ تاہم بعد میں یہ پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔

لیبیا کے ساتھ پامیلا کے ممکنہ روابط کی خبر پھیلتے ہی اراکین پارلیمنٹ میں ہلچل مچ گئی۔ دارالعوام میں اپوزیشن کے رہنما فرینک ڈابسن نے مطالبہ کیا کہ اس بات کی پوری تحقیقات کرائی جائے کہ پامیلا دارالعوام میں کب اور کیوں کر داخل ہوئی اور کون کون لوگ اس معاملے میں ملوث ہیں۔ لیبر پارٹی کے رکن پارلیمنٹ ڈیل کیمبل سیوورز کا کہنا ہے کہ اگر پامیلا پر لگائے جانے والے الزامات درست ہیں تو اس بات سے قطع نظر کہ وہ کال گرل تھی یا نہیں...... ہم

طور...... حفاظتی اقدامات کے ناقص ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر اس کا قذافی کے ساتھ کوئی تعلق بنتا ہے تو پھر یہ مسئلہ بھی زیرِ غور آتا ہے کہ وہ دارالعوام میں کیا کررہی تھی اور کون لوگ ہیں جو ایوان میں اس کے داخلے کا ذریعہ بنے۔

کہانی میں مزید دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب ڈیوڈ سیلوان نے بھی اس موضوع پر لب کشائی کی۔ سیلوان ''سنڈے سپورٹ'' کا مالک اور پورنوگرافر ہے۔ وہ بہت بڑا گپ باز ہے اور اس کی بیان کردہ بہت سی خبریں بے حد دلچسپ ہوتی ہیں۔ مثلاً اس نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ایڈولف ہٹلر، میخائل گورباچوف کا روپ دھارے کریملن میں براجمان ہے اور یہ خبر بھی اس کی بیان کردہ ہے کہ چاند کی سطح پر B.52 بمبار ملا ہے۔ تاہم کبھی کبھار وہ حقیقت پر مبنی خبریں بھی بیان کرتا ہے۔ سیلوان نے دعویٰ کیا کہ وہ پامیلا سے ملا تھا۔ پامیلا کے ساتھ اچھی دوستی کا قصہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

''وہ سو فیصد معصوم نہیں ہے۔ مگر وہ سو فی صد گناہ گار بھی نہیں۔ اگرچہ وہ کال گرل رہ چکی ہے، مگر نہیں۔ وہ اس سے بھی آگے کی کچھ شے بن چکی ہے اور مجھے ڈر ہے اس کا اسے جنون ہے۔ اسے کچھ خفیہ ایجنسیاں استعمال کرنے لگی ہیں اور اس میں وہ سنسنی محسوس کرنے لگی ہے۔ دولت کے انبار کا ڈھیر اپنے گرد جمع کرنے کے ساتھ ساتھ بلاشبہ وہ خود کو ان دیکھے مگر متوقع یقینی خطرات کی گود میں ڈالنے کی بھی بڑی فاش غلطی کررہی ہے۔''

☆☆☆

پامیلا کال گرل ہے یا نہیں؟ کیا واقعی اس کے لیبیا کے ساتھ روابط تھے یا وہ محض ایک اندازہ ہے؟ اس نے ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر جو کام حاصل کیا وہ کسی خاص مقصد کے لیے تھا یا محض اپنے شوق کی تکمیل کے لیے؟ اگر یہ سچ ہے تو معاملہ کس حد تک سنگین ہے؟ یہ وہ سوالات تھے جو برطانوی حلقوں میں گردش کرتے رہے۔ حقیقت کیا ہے؟ اب صرف پامیلا ہی بتا سکتی تھی مگر وہ چپ رہی اور کسی خفیہ مقام پر روپوش ہوگئی۔ اس کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ وہ مناسب وقت کے انتظار میں چھپی بیٹھی تھی اور سیلوان کو کہا تھا کہ پامیلا اپنی کہانی بیان کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ معاوضے کے طور پر 10 لاکھ پونڈ دیے جائیں۔ اس کی زندگی کے واقعات پر بھی فلم بنائی جائے۔ اس میں مرکزی رول اسے ہی دیا جائے۔ سیلوان کے مطابق پامیلا نے دعویٰ کیا کہ اگر وہ اراکین پارلیمنٹ اور ٹوری حکومت کے وزراء کے ساتھ اپنے روابط کی داستان بیان کردے تو ٹوری پارٹی کی حکومت دھڑام سے نیچے آ گرے گی۔ وہ ان کی کئی فاش غلطیوں سے ہی نہیں بلکہ فحش غلطیوں سے بھی واقف تھی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی کہ پامیلا کے تعلقات صرف برطانوی اراکین پارلیمنٹ، وزراء، کرنل قذافی کے کزن سے ہی نہیں تھے بلکہ راجیو گاندھی کی کابینہ کے بہت سے وزراء اور اراکین پارلیمنٹ بھی اس کی زلفوں کے اسیر تھے۔ چنانچہ پامیلا صرف مارگریٹ تھیچر ہی کے لیے خطرہ نہیں تھی بلکہ اس وقت کے راجیو گاندھی کی حکومت کے لیے بھی خطرہ بن سکتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پامیلا نے شروع ہی میں یہ منصوبہ بنایا تھا کہ وہ اس نوعیت کا کوئی کام کرے گی کہ جس سے اسے بے پناہ دولت بھی حاصل ہو اور اسے عالمگیر شہرت بھی ملے۔

پامیلا اپنے دونوں مقاصد میں کامیاب رہی۔ چاہے اس کے لیے اسے کوئی بھی راہ اختیار کرنا پڑی۔ اور یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ پامیلا اسکینڈل ان دنوں منظرعام پر آیا جب برطانیہ میں کرسٹین کیلر کی کہانی پر بنی فلم ''اسکینڈل'' کی نمائش جاری تھی اور دونوں کیسز کے واقعات بھی آپس میں بے حد مماثلت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ 1963ء کی طرح 1980ء کے شروع میں بھی برطانیہ میں ٹوری پارٹی کی حکومت تھی۔ تاریخ کا اپنے آپ کو دہرانا اس کو کہتے ہیں۔ بلکہ یہاں تو محض تاریخ نہیں بلکہ واقعات بھی اپنے آپ کو دہرا رہے تھے اور سینما گھروں کے پردے پر جو فلم دکھائی جارہی تھی۔ برطانیہ میں حقیقی زندگی کے پردے پر بھی وہی فلم چل رہی تھی اور سینما گھروں سے کہیں زیادہ رش لے رہی تھی۔

ان سب تیزی اور گرمی سنسنی خیز اور ہلچل مچا دینے والے حالات و واقعات کے بعد پامیلا اچانک منظرِعام سے غائب ہوگئی یا غائب کردی گئی۔

اس کے پُراسرار ''غیاب'' پر بھی لوگوں کو چین نہ ملا اور اس کو تلاش کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ہر طرف نئی خبر چلنے لگی۔ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ پامیلا بورڈز کو بھی ''انڈر ورلڈ'' دہشت گرد مافیا نے بھی بڑی سرپرستی اور وہ یا مقتدرہ سیاسی شخصیات کے ایماء پر قتل کردینے کی دھمکیاں دینا شروع کردی تھیں۔ خفیہ ایجنسیاں اور ایک مافیا بھی اس کے پیچھے تھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پامیلا بورڈز کو بالکل آخر میں اپنی ''فاش اور ''فحش'' غلطیوں کا احساس ہوچکا تھا۔ کیا پانی سر سے اونچا ہوگیا تھا۔ یا پھر اونچا ہونے سے پہلے ہی......؟

جب محمد بن قاسم نے سندھ فتح کرنے کے لیے ہندوستان کا رخ کیا تو اس کے لشکر کی تعداد صرف بارہ ہزار تھی جبکہ ہندوستان کے ہندوؤں کی آبادی اس زمانے میں کروڑوں کی تھی۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا تو ان سے بڑا جاہل اور متعصب کوئی نہ ہوگا۔ مسلمانوں نے ہزار سال ہندوستان پر حکومت کی تھی اگر ہر ہندو کے لیے مسلمان ہونے کی شرط لگا دیتے تو سارے ہندوستان میں

اسلام اور مسلمانوں کا دور ہوتا اور ہندو تا مرتے نظر آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام پھیلانے میں صوفیائے کرام اور بزرگان دین کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ گاؤں، قصبوں اور دیہاتوں میں جا کر آباد ہوئے تو ہندو ان کے اخلاق و طور طریقے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس طرح اپنے عمل کے ذریعے انہوں نے ہندوؤں کے ذہنوں کو متاثر کیا اور وہ ان کے لیے ایک اعلیٰ انسانی نمونہ ثابت ہوئے۔

یہ جس زمانے کا تذکرہ ہے ان دنوں حضرت نظام الدین اولیا کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ کچھ لوگ ان سے منحرف تھے مگر وہ اپنے روحانی کشف و کرامات کے ذریعے انہیں اسلام کی طرف راغب کرتے چلے گئے۔

ذیل میں ایک ہندو مہندر دیو کے اسلام سے قدرتی وابستگی کی داستان بیان کی جا رہی ہے۔ مہندر دیو کو قدرتی طور پر اسلام اور خصوصاً حضرت نظام الدین کی ذات سے دلی وابستگی تھی، وہ ان کی خاطر ان کے مخالفین سے بھی لڑ جاتا تھا۔ اس زمانے میں خسرو خاں نامی طاقتور اور بااثر حکمران دہلی پر قابض تھا جو مذہب بدل کر مسلمان ہو گیا تھا۔ خسرو خاں سے سب خوفزدہ رہتے تھے اور کبھی اس کی کسی بات سے انکار نہیں کرتے تھے۔ وہ بادشاہوں کی طرح رہتا تھا اور ہندو بھی اس سے مرعوب تھے۔ مہندر دیو کے خاندان نے خوف و خطر میں رہ کر دہلی کا سفر طے کیا کیونکہ ہندو ہو یا مسلمان سب خسرو خاں کے نام سے کانپتے تھے۔ خسرو خاں کا اتنا رعب تھا کہ کوئی اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا۔

غرضیکہ ایک ہنگامہ خیز دور تھا۔

اپنے بارے میں وہ لکھتا ہے:

"جب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوا تو ہر قدم پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے خسرو خان کے آدمی ہمارا پیچھا کر رہے ہیں مگر یہ میرا وہم ثابت ہوا۔ کوئی ہمارے تعاقب میں نہیں تھا۔ سلطان علاء الدین نے دہلی سے دیوگڑھ تک کا راستہ بہت اچھا بنا دیا تھا۔ جگہ جگہ سرائے موجود تھے اور راستے کے دونوں طرف ہرے بھرے درخت کھڑے تھے۔ میں نے سفر کے دوران ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ دیوگڑھ سے دہلی کی طرف آنے والے مسافر بے شمار تھے۔ وہ سب کے سب ہندو تھے اور مجھ سے خسرو خان کی بادشاہت کا حال پوچھتے تھے۔ میں انہیں یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں تو دہلی کے دیہات کا رہنے والا ایک معمولی انسان ہوں اور اپنے عزیزوں سے ملنے دیوگڑھ جا رہا ہوں۔ وہ لوگ میری بے خبری کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے۔ "ہندو ہو کر تجھے پتا نہیں کہ خسرو خان ہمارا بادشاہ ہے اور اس نے ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت دوبارہ قائم کر دی ہے۔" وہ سب کے سب بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اس کے برعکس مجھے راستے میں مسلمان برائے نام ہی ملے۔ اگر اتفاق سے کوئی مسلمان نظر بھی آیا تو وہ خاموش اور بہت زیادہ فکر مند دکھائی دیتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اپنے لباس اور شکل و صورت سے ہندو معلوم ہوتا تھا اس لیے مسلمان مجھ سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ میں خسرو خان کا آدمی ہوں...... اور میں بھی یہ سوچ کر خوفزدہ رہتا تھا کہ کہیں وہ خسرو خان کے طرف دار نہ ہوں۔ غرض اسی اذیت ناک کشمکش اور خوف و ہراس کے عالم میں یہ طویل سفر تمام ہوا۔

پھر جب میں اپنے ملک میں داخل ہوا تو عجیب ویرانی کا منظر تھا۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے آخری حملے نے دیوگڑھ کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ اپنے آبائی وطن کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دہلی کے انقلاب کی خبریں یہاں بھی پہنچ چکی تھیں۔ بعض مسلمان کہتے تھے کہ خسرو خان مسلمان ہو گیا ہے اور اس کی حکومت بھی اسلامی حکومت ہے۔ اب میں کسے بتاتا کہ خسرو خان کون ہے اور وہ مذہب اسلام کے ساتھ کیا بیہودہ سلوک کر رہا ہے؟ بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ خسرو خان نے منافقانہ طور پر اسلام قبول کیا ہے۔ اس لیے اس کی حکومت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے میرا جینا محال کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت اور ہر محفل میں مجھ سے دہلی کے متعلق اتنے سوالات کرتے تھے کہ میں پریشان ہو جاتا تھا۔ مجھے جتنے ہندو بھی ملے ان میں سے ہر ایک کا اس بات پر یقین تھا کہ تمام ہندوستان کے ہندو خسرو خان کی مدد کریں گے اور اس طرح اسے کوئی مسلمان شکست نہیں دے سکتا۔ میں کچھ دن تک اپنے ماں باپ کے ساتھ دیوگڑھ میں رہا۔ ہماری ساری جاگیر ضبط کر کے شاہی مقبوضات میں شامل کر لی گئی تھی۔ اس لیے وہاں جتنے دن بھی گزرے رنج و پریشانی میں گزرے۔"

شاید حضرت نظام الدین اولیا اسی لیے چاہتے تھے کہ مہندر دیو دہلی میں رہے اور دیوگڑھ جا کر اپنی املاک کی تباہی کا تکلیف دہ منظر نہ دیکھ سکے مگر اس کے اعصاب پر خسرو خان کا خوف اس قدر مسلط تھا کہ وہ آبائی وطن جانے اور اپنے آشیانے کی راکھ دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

مہندر دیو کے قبول اسلام کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے جس سے حضرت نظام الدین اولیا کے روحانی کرامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مہندر دیو دیوگڑھ (دکن) کے علاقے کا ایک بڑا جاگیردار تھا۔ آسودہ حال زندگی گزارنے کے باوجود اسے ایک عجیب سی خلش کا احساس ہوتا تھا۔ اپنے اسی اضطراب کے زمانے میں مہندر نے اپنے ہم مذہبوں کی زبانی حضرت نظام الدین اولیا کا نام مبارک سنا۔

''وہ اپنے وقت کے بڑے درویش ہیں اور ان کی دعاؤں سے بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔'' حضرت محبوب الٰہی کی بزرگی کے قصے دیوگڑھ کے گلی کوچوں میں عام تھے۔ مہندر دیو غیر محسوس طور پر حضرت نظام الدین اولیا کی ذات گرامی کا اسیر ہوتا چلا گیا۔ پھر شوق دید اس قدر بڑھا کہ وہ اپنی ماں سے اجازت لے کر دوبارہ دہلی روانہ ہو گیا۔

''میں مذہباً ہندو ہوں اور حضور کی زیارت کے لیے دیوگڑھ سے آیا ہوں۔'' مہندر دیو نے حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

حضرت نظام الدین اولیا نے اسے جماعت خانے میں ٹھہرایا اور اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ہندو مہمان کا بطور خاص خیال رکھا جائے۔ مہندر دیو کئی دن تک جماعت خانے میں مقیم رہا۔ حضرت نظام الدین اولیا کے خدمت گار اس کے آگے پیچھے رہتے تھے۔ درس شروع ہوتا تو وہ بھی حاضرین میں شامل ہو جاتا اور حضرت نظام الدین اولیا کی باتیں غور سے سنتا رہتا۔ اگرچہ دکن کا ہندو ہونے کی وجہ سے حضرت محبوب الٰہی کی گفتگو کا بیشتر حصہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن وہ خانقاہ کے ظاہری آداب کو دیکھ کر بہت متاثر تھا۔

پھر ایک دن حضرت امیر خسرو پیر و مرشد کی اجازت سے مہندر دیو کو اپنے مکان پر لے گئے۔ باقی واقعات وہ اس طرح تحریر کرتا ہے۔

''رات کو میں امیر خسرو کے مکان پر رہا تھا۔ زیادہ دیر تک جاگنے کے سبب میری آنکھ دیر سے کھلی۔ میں نے دیکھا کہ امیر خسرو گھر پر موجود نہیں ہیں۔ نوکروں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ امیر خسرو علی الصباح دربار سلطانی میں تشریف لے گئے ہیں۔ آج کوئی خاص جشن ہے۔ اس لیے امیر رات کو ذرا دیر سے واپس آئیں گے۔ اکیلے میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے سوچا کہ اپنی قیام گاہ پر چلا جاؤں۔ امیر خسرو کے ملازموں نے میری خاطر مدارت کی۔ پھر میں جماعت خانے واپس جانے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ راستے میں دہلی کا وہ بازار بھی آتا تھا جہاں بخارا، ترکستان اور ایران کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان دکانوں کو دیکھتا جا رہا تھا جہاں ہر قسم کے کپڑے، پوستین، کمبل، قالین، کمانیں، ڈھالیں، تیر، تلواریں، نیزے اور خنجر موجود تھے۔ میں ایک دکان پر رک کر کچھ تلواریں اور خنجر دیکھنے لگا۔ یہ دکان کسی

ترک کی تھی مگر وہاں سامان فروخت کرنے والا ایک ہندوستانی نوکر بھی تھا۔

میں نے ملازم سے قیمتیں بھی دریافت کیں اور ان چیزوں کے متعلق یہ بھی پوچھا کہ انہیں کن شکلوں میں تیار کیا گیا ہے؟ دکاندار بہت اخلاق سے پیش آیا اور میرے سوالات کا جواب دیتا رہا۔

پھر اس نے میرے بارے میں پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟

میں نے اسے بتایا کہ میرا نام مہندر دیو ہے اور دیوگڑھ کا رہنے والا ہوں۔ امیر خسرو کے یہاں قیام ہے اور حضرت نظام الدین اولیا کے یہاں بھی جا تا رہا ہوں۔

حضرت محبوب الٰہی اور امیر خسرو کا نام سن کر وہ شخص اس طرح بھڑک اٹھا کہ جیسے میں نے کوئی بہت بری بات کہہ دی ہو۔ ”وہ دونوں بے دین ہیں۔ انتہائی گانا سنتے ہیں۔ قوالوں کی محفلوں میں ناچتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی شریعت میں گانا اور باجا سننا قطعاً حرام ہے۔“

دکاندار کی باتیں سن کر مجھے سخت غصہ آیا۔ حالانکہ میں اس شہر میں اجنبی تھا مگر میں نے اسے غضب ناک لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اپنی زبان بند کرو۔ میں ان دونوں بزرگوں کے بارے میں ایک لفظ بھی سننے کے لیے تیار نہیں۔“

دکاندار نے بڑے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ”تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ تمہارا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔

”ہندو ہوتے ہوئے تمہیں ایک مسلمان فقیر سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“ دکاندار کی حیرت برقرار تھی۔

میں نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔ ”میں دکن سے صرف حضرت نظام الدین اولیا کی زیارت کے لیے دہلی آیا ہوں۔ میں نے ان کی باتیں سنی ہیں اور ان کی محفلوں کا رنگ دیکھا ہے۔“

دکاندار نے میری باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی اور نہایت تحقیر آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ ”تم امیر خسرو کے پیر کو نہیں جانتے۔ وہ سیدھے سادے لوگوں سے اپنے آپ کو سجدہ کراتے ہیں اور انہوں نے مکروفریب کا ایک جال بچھا رکھا ہے۔“

میں نے دکاندار کی باتوں کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔ ”میں کل رات امیر خسرو کے مکان پر رہا تھا۔ میں نے ان میں اور ان کے پیر میں کوئی بات مکروفریب کی نہیں دیکھی۔“

دکاندار نے کہا۔ ”تم بھی بت پرست ہو اور تمہارا دوست امیر خسرو بھی بت پرست ہے۔ اور اس کا پیر بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ اسی لیے تم اس کے گرویدہ ہو گئے ہو۔“

دکاندار کی یہ تحقیر آمیز گفتگو سن کر میں اپنے غصے پر قابو نہ پاسکا۔ ”اب میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے زندگی بھر اس کا افسوس رہے گا کہ میں تمہارے پاس کیوں آیا؟ نہ یہاں ٹھہرتا اور نہ ایسی تکلیف دہ باتیں سننے کو ملتیں۔“

دکاندار ہنس کر کہنے لگا۔ ”میں صاف اور کھرا آدمی ہوں۔ تم مسافر اور اجنبی ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان حکومت کے ذمی ہو۔ اس لیے میں نے تمہیں برائی سے بچانا ضروری سمجھا۔“

”ذمی کا کیا مطلب ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

دکاندار نے جواب دیا۔ ”جس کی حفاظت مسلمان حکومت کے ذمے ہو، اسے اسلامی شریعت میں ذمی کہتے ہیں۔ میں بھی اسلامی حکومت کا ایک فرد ہوں اور تمام ہندوؤں کو ذمی سمجھتا ہوں، اس لیے تمہاری حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔“

”مجھے تمہارے اس خیال سے بہت خوشی ہوئی۔“ میں نے دکاندار کی بات سن کر کہا۔ ”تم نے مجھے لفظ ذمی کا مفہوم سمجھایا۔ میں بھی شکر گزاری کے طور پر تمہیں ایک گناہ سے بچانا چاہتا ہوں جس میں تم نادانستہ طور پر مبتلا ہو گئے ہو۔ صرف ایک بار نظام اولیا کے پاس چلے جاؤ۔“

میری بات سن کر دکاندار ہنسا اور پھر کہنے لگا۔ ”اچھا میں کل شام ضرور جاؤں گا۔“

”آج دن میں کیوں نہیں؟“ میں نے اصرار کیا۔

"دن میں مجھے فرصت نہیں ملتی۔" دکاندار نے جواب دیا۔ "چونکہ شام کو سارا بازار بند ہوجاتا ہے، اس لیے وہی مناسب وقت ہے۔"

دکاندار کا عذر سن کر میں نے زیادہ زور نہیں دیا۔ "ٹھیک ہے، کل تم حضرت شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں پہنچ جانا۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔"

"مگر میری ایک شرط ہے۔" دکاندار نے کہا۔ "اگر تم نے وہ شرط پوری نہیں کی تو میں خانقاہ کے دروازے سے لوٹ آؤں گا۔"

"تم حضرت شیخ کی زیارت کو جا رہے ہو یا کسی سوداگر کی طرح کاروباری شرطیں عائد کر رہے ہو؟" اچانک میرا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔

"تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔" دکاندار نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے خدشہ ہے کہ کہیں تم وہاں پہنچ کر کسی سے میری باتوں کا ذکر نہ کردو۔"

"اس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا کہ میں اپنی زبان کھولوں یا خاموش رہوں۔" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

"دراصل میں تمہارے دوست امیر خسرو کے شیخ کی روحانی طاقت دیکھنا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے دکاندار کے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ "جاہل عقیدت مندوں میں نظام الدین اولیا کے کشف باطن کے بے شمار افسانے مشہور ہیں۔ دہلی کے گلی کوچوں میں ان کی روشن ضمیری کا بڑا چرچا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ شیخ کو میرے خیالات کی خبر ہوتی ہے یا نہیں؟"

"اگر تم یہ شرط عائد نہ کرتے، تب بھی میں تمہاری گستاخانہ گفتگو کا ذکر کسی سے نہیں کرتا...... مگر تم ایک بدگمان شخص ہو۔ اس لیے میں شام تک یہیں ٹھہرے جاتا ہوں۔" میں نے دکاندار سے کہا۔ "تم آج ہی حضرت شیخ کی خانقاہ میں چلو۔ میں شام تک تمہارا مہمان ہوں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" دکاندار نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"میں ایک لمحے کے لیے بھی تمہاری نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہتا۔" میں نے اسے مزید اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"میں آج شام تمہارے حضرت نظام الدین اولیا کے پاس چلوں گا اور مجلس میں ایسی جگہ بیٹھوں گا کہ شیخ کی نگاہ مجھ پر نہ پڑے مگر تم مجھے دیکھتے رہو اور اس بات کا جائزہ لیتے رہو کہ میں کسی سے تمہارا ذکر تو نہیں کر رہا ہوں۔"

دکاندار پوری طرح مطمئن ہوگیا اور اس نے مجھے دوپہر کا کھانا کھلایا۔ اس دوران خریدار آتے جاتے رہے۔ پھر جب عصر کا وقت آیا تو اس نے دکان بند کی اور ہم دونوں حضرت شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے بھر وہ شخص مختلف انداز میں شیخ کی ذات گرامی کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتا رہا۔

جب ہم دونوں خانقاہ میں داخل ہوئے تو وہاں عام دنوں سے زیادہ ہجوم تھا۔ مجلس میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ مجبوراً میں سب سے پیچھے بیٹھ گیا۔ مگر وہ دکاندار حاضرین کی صفوں کو چیرتا ہوا حضرت نظام الدین اولیا کے قریب پہنچا اور نہایت بے ادبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ مجھے اس شخص کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ اگر آداب مجلس کا لحاظ نہ ہوتا تو میں اسے آگے جانے سے روک دیتا...... مگر وہ میری دسترس سے دور تھا اس لیے کچھ نہ کرسکا اور اپنی جگہ بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر میں نے اپنے گردوپیش نظر ڈالی۔ ہر شخص کے چہرے سے شدید غصے کے آثار نمایاں تھے مگر کوئی شخص بھی حضرت شیخ کے احترام کے پیش نظر لب کشائی کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیا نے بڑی محبت کے ساتھ دکاندار کو اپنے پاس بٹھایا اور مزاج پرسی کی۔ "غالباً تم اسی شہر کے رہنے والے ہو۔"

"جی ہاں! میں دہلی کا قدیم باشندہ ہوں۔ میرے باپ دادا بھی یہیں رہتے تھے۔"

"تمہارا بہت شکریہ کہ تم اس فقیر کی مجلس میں آئے۔" حضرت نظام الدین اولیا نے دلنواز لہجے میں فرمایا۔

جب حضرت نظام الدین اولیا نے بات مکمل کی تو دکاندار نے مڑ کر میری طرف دیکھا..... مگر میں ایسے زاویے سے اتنی دور بیٹھا ہوا تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر میں اس کی ایک ایک حرکت کا مشاہدہ کرسکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوف کی کیفیت طاری تھی۔ دراصل حضرت نظام الدین اولیا نے ان ہی چیزوں کا ذکر چھیڑ دیا تھا، جنہیں بنیاد بنا کر وہ دکاندار شیخ کی شان میں گستاخیاں کرتا تھا۔

حضرت شیخ کی یہ باتیں سن کر دکاندار نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ پوری مجلس گونج گئی۔ پھر وہ حضرت نظام الدین اولیا کے ہاتھ پکڑ کر ہچکیوں سے رونے لگا۔ "شیخ! مجھے معاف کردیجیے۔ میں بڑی گمراہی میں مبتلا تھا۔"

حضرت نظام الدین اولیا انتہائی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ "اگر اللہ ہدایت نہ دے تو ہم سب گمراہ ہوجائیں۔" حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے شیخ زادے خواجہ سید محمد سے فرمایا جو قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

"انہیں اٹھاؤ! انہیں پانی پلاؤ، کھانا کھلاؤ اور ان کے لیے حلوا لاؤ۔"

حضرت شیخ کا حکم سن کر خواجہ سید محمد اٹھے اور جماعت خانے کی طرف چلے گئے۔

پھر آپ نے بلند آواز میں فرمایا۔ "آج ہمارا ہندو مہمان ہردیو کہاں ہے؟"

میں نے حضرت شیخ کی زبان مبارک سے اپنا نام سنا تو میرے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ پھر میں اسی حالت میں اپنی جگہ کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "حضور! آپ کا غلام یہاں حاضر ہے۔"

حضرت شیخ نے میری طرف دیکھا۔ اس وقت آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ نہایت پرسوز لہجے میں فرمانے لگے۔ "ہردیو! ہم سب اللہ کے ذکیا ہیں۔ کوئی انسان کسی انسان کا ذکی نہیں ہوسکتا۔ اللہ کے سوا کسی کو کوئی قدرت حاصل نہیں۔ ہم سب بے اختیار ہیں۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی ایسی حفاظت نہیں کرسکتا جیسی اللہ اپنے بندوں کی نگہبانی کرتا ہے۔"

حضرت نظام الدین اولیا کا اخلاق کریمانہ دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور حاضرین مجلس بھی رونے لگے، یہ سن کر دکاندار کی تو حالت ہی غیر ہوگئی۔ اس نے ایک بار پھر چیخ ماری اور مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔

اتنے میں خواجہ سید محمد کچھ کھانا، حلوا اور پانی لے کر آگئے۔

حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے دست مبارک سے دکاندار کو ایک نوالہ کھلایا۔ حلق سے غذا اترتے ہی اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ "شیخ! بس یہ بہت ہے۔" الغرض دکاندار نے حلوا کھایا اور بہت عاجزی سے بولا:

"شیخ! جب آپ نے مجھ گناہگار کو معاف کردیا تو اتنا کرم اور فرما دیجیے۔"

"اب کیا چاہتے ہو؟" حضرت نظام الدین اولیا نے دکاندار کو اٹھاتے ہوئے فرمایا۔

"مجھے اپنی غلامی کا شرف بخش دیجیے۔" دکاندار گریہ وزاری کرنے لگا۔

حضرت نظام الدین اولیا نے خواجہ سید محمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ پیرومرشد کا نواسا ہے اور میرا بیٹا ہے تم اس سے بیعت کرو پھر خواجہ سید محمد کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "محمد! یہ تمہارے مہمان ہیں۔ آج رات انہیں اپنے گھر ٹھہراؤ۔" اس کے بعد مجھے حکم دیا۔ "ہردیو! آج تم بھی سید محمد کے مہمان ہوگے۔"

ہم دونوں نے حکم شیخ کی تعمیل کی اور خواجہ سید محمد کے مکان پر حاضر ہوئے۔

پھر وہ دکاندار حضرت خواجہ سید محمد کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا۔

اہل شہر نے اس انقلاب پر بڑی حیرت کا اظہار کیا، دکاندار کا ہزاروں گاہکوں سے سابقہ پڑتا تھا اور وہ حضرت نظام الدین اولیا کے ہر عقیدت مند سے یہی کہتا تھا۔ "تم سب بت پرست ہو۔"

آج جب ان ہی لوگوں نے حضرت نظام الدین اولیا کے آستانۂ مبارک پر اس شخص کو عقیدت سے جھکے ہوئے دیکھا تو حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "تو بھی بت پرستوں میں شامل ہوگیا؟"

"بت پرستوں میں تو شامل نہیں ہوا مگر حضرت نظام الدین اولیا کا غلام ضرور بن گیا ہوں۔" دکاندار کی ساری چرب زبانی ختم ہوگئی تھی اور اس کے لہجے سے اس قدر عاجزی کا اظہار ہونے لگا تھا جیسے وہ کوئی گداگر ہے۔

"آخر تو نے شیخ کی غلامی کیوں اختیار کی؟" لوگ اس سے سوال کرتے۔

"یہ مت پوچھو کہ میں نے حضرت شیخ کی ذات میں کیا دیکھا؟" یہ کہہ کر دکاندار رونے لگا۔

جب تک میں دہلی میں رہا، وہ روزانہ میرا شکریہ ادا کرتا۔ "ہر دیو! تمہارا دکن سے دہلی آنا میرے لیے بڑا مبارک ثابت ہوا۔ اللہ کے بڑے عجیب انتظامات ہیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ کس کو کس طرح ہدایت بخشے گا۔ نہ تم میری دکان پر آتے اور نہ میں حضرت شیخ کے دربار میں حاضر ہوتا۔ اللہ تمہیں دونوں جہان میں عزتیں بخشے۔"

اس رات مہندر دیو حضرت خواجہ سید محمد کا مہمان تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سید محمد سے عرض کیا۔ "آج میں نے اپنی آنکھوں سے بیک وقت حضرت شیخ کی کئی کرامات دیکھیں...... اور ان کرامات کا تعلق ہم دونوں کی ذات سے تھا۔" مہندر دیو نے دکاندار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میری درخواست ہے کہ آپ حضرت شیخ کی کوئی اور کرامت بیان فرمائیں۔"

حضرت خواجہ سید محمد نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ "میں حضرت شیخ کی کس کس کرامات کا ذکر کروں؟ آپ کی حیات مبارک کا ہر عمل اور روز و شب کا ہر لمحہ کرامت ہے۔" حضرت خواجہ سید محمد نے اختصار سے کام لیا۔

مہندر دیو چونکہ غیر مسلم تھا، اس لیے آپ کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکا اور مسلسل اصرار کرنے لگا۔

آخر حضرت خواجہ سید محمد نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس روز میں بھی حضرت شیخ کی مجلس میں حاضر تھا۔ سیدی! درس دے رہے تھے کہ اسی دوران ایک شخص داخل ہوا اور خاموشی سے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اگرچہ وہ آداب مجلس کا لحاظ رکھتے ہوئے خاموش بیٹھا تھا لیکن اس کے چہرے سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ حضرت شیخ کا درس ختم ہو اور وہ اپنی درخواست پیش کرے۔ آخر بہت دیر بعد درس ختم ہوا تو وہ شخص کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا۔

"شیخ! میرے حق میں دعا فرمایئے۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"آخر تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے؟" حضرت نظام الدین اولیا نے متبسم لہجے میں فرمایا۔ "کوئی طبیب مرض کے بارے میں جانے بغیر کس طرح دوا دے سکتا ہے؟"

"شیخ! آپ پر تو سب کچھ روشن ہے۔" وہ شخص اپنے ظاہری لباس اور گفتگو سے بہت شائستہ نظر آتا تھا۔

"یہ تمہاری خوش گمانی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔" حضرت نظام الدین اولیا نے فرمایا۔ "اللہ جب چاہتا ہے تو اپنے کسی بندے پر کوئی راز منکشف کر دیتا ہے ورنہ ہم سب بے خبر ہیں۔"

"میری جاگیر کی سند گم ہو گئی ہے۔" اس شخص نے عرض کیا۔

"دوسری سند بھی بن سکتی ہے۔" حضرت نظام الدین اولیا نے فرمایا۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"میں نے سلطان کے اہلکاروں سے کہا تھا مگر وہ نئی سند دینے سے انکار کرتے ہیں۔" اس شخص نے عرض کیا۔ "آپ دعا فرمایئے کہ میری گمشدہ دستاویز مل جائے ورنہ کوئی بھی دشمن اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"اگر تم مجھے بہترین حلوا کھلاؤ تو میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں۔" حضرت نظام الدین اولیا نے خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

وہ شخص اسی وقت مجلس سے اٹھا اور حلوائی کی دکان تلاش کرنے لگا۔ دکانیں تو بہت تھیں مگر وہ لوگوں سے اس دکان کا پتا پوچھنے لگا جہاں بہترین حلوا تیار ہوتا تھا۔ آخر وہ ایک دکان پر پہنچا اور حلوا طلب کیا۔

پھر جب وہ واپس آیا تو اہل مجلس نے دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں کاغذ تھا اور دوسرے ہاتھ میں حلوا۔ اس نے دونوں چیزیں حضرت نظام الدین اولیا کے سامنے رکھ دیں۔

"یہ کیا ہے؟" حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔

"یہی تو میری گم شدہ دستاویز ہے۔" اس شخص کے چہرے سے بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"یہ تمہیں کہاں ملی؟" حضرت نظام الدین اولیا نے فرمایا۔

"جب دکاندار نے حلوا ایک کاغذ میں رکھنا چاہا تو میری نظر اس کاغذ پر پڑی۔ وہ ردی کاغذ نہیں بلکہ میری کھوئی ہوئی سند تھی۔ میں نے دکاندار سے کاغذ مانگ لیا اور اس طرح میں حضرت کی دعاؤں کے طفیل اپنے مقصد کو پہنچا۔"

پورا واقعہ سن کر حضرت نظام الدین اولیا نے تبسم فرمایا۔ "پہلے میرے پیر و مرشد حضرت بابا فرید گنج شکر کی روح کو ایصال ثواب کرو۔ پھر یہ حلوا اپنے بچوں میں تقسیم کر دو۔"

حضرت خواجہ سید محمد نے حضرت نظام الدین اولیا کی یہ مخصوص کرامت صرف اس لیے بیان کی تھی کہ دکاندار اور جاگیردار کے واقعات میں ایک چیز مشترک تھی۔ حضرت

محبوب الٰہی نے گستاخیاں کرنے والے رکاندار کو تو اشرح میں خود طلوا پیش کیا تھا۔ اور جاگیردار کو حکم دیا تھا کہ وہ ملوے پر حضرت بابا فرید کی فاتحہ دلائے۔

اردو زبان کی ابتداء کے بارے میں کئی روایات مشہور ہیں لیکن مہندر دیو نے اپنے روزنامچے میں جس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی بنیاد حضرت نظام الدین اولیا کے حکم پر رکھی گئی۔ مہندر دیو لکھتا ہے کہ ایک رات حضرت محبوب الٰہی نے اپنی مجلس خاص امیر خسرو، خواجہ حسن سنجری، خواجہ سید محمد، ان کے بھائی خواجہ سید موسیٰ اور اپنی بہن کے پوتے خواجہ سید رفیع الدین ہارون، میرے ہم وطن سنبل دیو، چنچل دیو، سکل دیو اور مجھے طلب فرمایا۔ پھر جب ہم لوگ جمع ہو گئے تو ارشاد ہوا۔

”تم سب مل کر ایک ایسی زبان تیار کرو جو ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور باہر کے آئے ہوئے مسلمان استعمال کریں تاکہ تمام لوگوں کو آپس کی بات چیت اور لین دین کے معاملات طے کرنے میں آسانی ہو۔“ یہ کہہ کر حضرت محبوب الٰہی نے کچھ دیر کے لیے سکوت اختیار کیا۔ پھر ایک خاص نظر التفات سے حضرت امیر خسرو اور حضرت خواجہ سید محمد کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ”میں تم سے یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔“

حضرت امیر خسرو اور حضرت خواجہ سید محمد نے یک زبان عرض کیا۔ ”ہم دونوں مخدوم کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔“

حضرت امیر خسرو نے مزید عرض کیا۔ ”میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مختصر کتاب تحریر کر رہا ہوں۔ جس کا نام ”خالق باری“ تجویز کیا ہے۔“

”اس کتاب کا کچھ حصہ سناؤ۔“ حضرت نظام الدین اولیا نے حضرت امیر خسرو کو حکم دیا۔

حضرت امیر خسرو نے اپنی اس منفرد کتاب ”خالق باری“ کے کچھ اشعار پیر و مرشد کو سنائے۔ حضرت محبوب الٰہی نے ان اشعار کو پسند کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ”یہ بہت مفید چیز ہے مگر ہندی زبان میں ایسے اشعار بھی لکھو جنہیں لوگ گایا کریں۔“

اس کے بعد حضرت شیخ نے دوسرے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”آج کل ہماری فارسی اور خسرو کی ترکی زبان کے ساتھ ہندوؤں کی بول چال کے بہت سے الفاظ مل گئے ہیں اور اب لوگ اپنے گھروں اور محفلوں میں بھی ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں لیکن بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو فارسی، عربی اور ترکی زبانوں میں سنسکرت کی آمیزش نہیں چاہتے۔ اس لیے انہیں سمجھانا چاہیے کہ ان کا اور ان کی حکومت کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے دل کی بات سمجھا سکیں اور خود ان کے دلوں کی حالت کو سمجھ سکیں۔ اور یہ جب ہی ہوگا کہ وہ ضد چھوڑ دیں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہندی بول چال کو فروغ دیں۔“

مہندر دیو کے بیان کردہ اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا نے نہ صرف اردو زبان کی بنیاد رکھی بلکہ اسلام کی تبلیغ کے لیے بھی ایک نیا اور موثر راستہ کھول دیا۔

مہندر دیو مکمل طور پر حضرت نظام الدین اولیا کی جاں نواز شخصیت کے زیر اثر آچکا تھا۔ وہ بڑے بڑے سادھوؤں اور جوگیوں سے ملا تھا۔ اس نے اپنے ہم مذہبوں کی سخت ترین ریاضتیں بھی دیکھی تھیں مگر اسے کسی رشی یا منی نے اس قدر متاثر نہیں کیا کہ وہ ان کے حلقہ عقیدت میں شامل ہو جاتا۔ اس کے برعکس مہندر دیو حضرت نظام الدین اولیا کی ایک نظر کی بھی تاب نہ لاسکا تھا۔ حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد کی شان میں ایک منقبت تحریر کی تھی جس کی گونج آج بھی برصغیر پاک و ہند کے گلی کوچوں میں سنائی دیتی ہے۔

”چھاپ تلک سب چھین لی موسے نیناں ملا کے۔“ (تیری ایک نظر کا یہ اثر ہے کہ تو نے بت پرستی کے سارے نشانوں کو مٹا ڈالا)

حضرت امیر خسرو کا یہ مصرعہ مہندر دیو پر پوری طرح صادق آتا تھا۔ اس کی ذات میں بہت دنوں سے ایک خوفناک جنگ جاری تھی۔ کعبے کا تصور مہندر کو اپنی طرف کھینچتا تھا مگر اس کے پیروں میں بت خانے کی زنجیریں پڑی تھیں۔ آخر حضرت محبوب الٰہی کی نگاہ کیمیا اثر رنگ لائی اور مہندر دیو نے اپنے عقیدے کی تمام بندشوں کو توڑ ڈالا۔ ایک دن حاضرین مجلس کے سامنے عرض کرنے لگا۔

”حضور! یہ تو فرمائیں کہ مسلمان کس طرح بنتا ہے؟“

”جب تو اللہ کو ایک مان لے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرے گا تو مسلمان ہو جائے گا۔“

”اگر مسلمان ہونا اتنا ہی آسان ہے تو مجھے اسی وقت مسلمان کر لیجیے۔“ مہندر دیو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کیا۔

''مسلمان کرنا اور ہے مسلمان ہونا اور ہے۔''

حضرت نظام الدین اولیا نے ایمان لانے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ''مسلمان کرنے کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا جبر، دباؤ، لالچ یا ذاتی غرض بھی شامل ہے.....اور مسلمان ہونا ایک الگ بات ہے۔ اگر تو اس بات کا یقین کرلے کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں تو اس یقین کے ساتھ ہی تو مسلمان ہوجائے گا۔''

مہندر دیو پر حضرت نظام الدین اولیا کے ارشاد گرامی کی اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ وہ گھبرا کر کہنے لگا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔''

حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔ ''بس تو مسلمان ہے۔''

مہندر دیو کے چہرے پر خوشی کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی جیسے اسے غیر معمولی دولت حاصل ہوگئی ہو۔ ''جب میں مسلمان ہوچکا ہوں تو پھر مجھے بیعت بھی کر لیجئے!''

ارشاد ہوا۔ ''ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ تو اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے اور تیرا نام تبدیل کیا جائے۔''

مہندر دیو حضرت محبوب الٰہی کے حکم پر عمل کرتا رہا مگر اس کے ساتھ ہی وہ حلقہ ارادت میں شامل ہونے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ آخر کچھ دنوں بعد اس نے عرض کیا۔ ''حضور! مجھے بیعت کا شرف بھی بخش دیجئے ورنہ یہ خلش مجھے ہمیشہ بے قرار رکھے گی۔''

حضرت نظام الدین اولیا نے مہندر دیو کی درخواست کو قبولیت کا اعزاز بخشا اور بیعت کے بعد اپنے دست مبارک سے کلاہ چہار ترک اس کے سر پر رکھی۔

حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد مہندر دیو نے دیوگڑھ جانے کی اجازت مانگی۔

''حضور! میں نے بہت دنوں سے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا ہے۔''

''تم اپنے وطن جاسکتے ہو۔'' حضرت نظام الدین اولیا نے مہندر دیو کو دکن جانے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا۔ ''اگر تمہارے ماں باپ اجازت دیں تو دوبارہ آجانا......اگر وہ تمہارے ساتھ دہلی آنا چاہیں تو تم انہیں بھی لاسکتے ہو۔''

ابھی مہندر دیو اپنے وطن جانے کی تیاریاں کررہا تھا کہ وہ ساز شوں کے طوفان میں گھر گیا اور اس کا سفینۂ حیات ڈگمگانے لگا۔ اس خوفناک واقعے کے بارے میں خود مہندر دیو تحریر کرتا ہے۔

''میں دیوگڑھ روانہ ہونے والا تھا کہ حضرت خواجہ سید محمد کا خادم شیخ میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

''کوتوال علاء الملک کا ایک آدمی تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

علاء الملک حضرت نظام الدین اولیا کا مرید تھا۔

''علاء الملک کے آدمی کو مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے؟'' میں نے خواجہ سید محمد کے خادم سے پوچھا۔

''میں کیا بتاسکتا ہوں؟'' شیخ نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر شیخ سے کہا کہ کوتوال صاحب کے آدمی کو اندر بلالو۔

جب وہ شخص اندر آیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی نامعلوم خطرہ بہت تیزی سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔

''میں کوتوال علاء الملک صاحب کا نائب ہوں۔'' اس شخص کی آواز میں گرج تھی اور لہجہ تند و تیز تھا جیسے وہ اپنے کسی دشمن سے مخاطب ہو۔

میں نے علاء الملک کے نائب کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ مسلح تھا۔ اس کی لمبی داڑھی تھی اور چہرے سے خونخواری برس رہی تھی۔

''آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' میں نے نرم لہجے میں پوچھا اور میں ایسا کرنے کے لیے مجبور تھا۔

اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا جیسے وہ کسی مجرم کی تلاشی لے رہا ہو۔ ''تم سے جو سوال کیا جائے اس کا صحیح جواب دینا۔'' وہ گرجا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔'' میں نے بھی ہمت سے کام لیا۔

''کیا تمہارا اصلی نام مہر دیو ہے؟'' وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔

جب اس نے میرا نام لیا تو میں سمجھ گیا کہ یقیناً کوئی ناگوار واقعہ پیش آنے والا ہے۔ تاہم میں نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! میرا اصلی نام مہر دیو ہے۔''

''تم دیوگڑھ کے رہنے والے ہو۔'' علاء الملک کے نائب نے دوسرا سوال کیا۔ وہ میرے بارے میں پوری معلومات رکھتا تھا اس لیے کچھ چھپانا فضول تھا۔ میں نے

صاف صاف کہا۔ ''ہاں! میرا وطن وہی تو ہے۔''

''کیا تم کچھ دن پہلے اجمیر، ہانسی، ملتان اور بدایوں گئے تھے؟'' کوتوال علاء الملک کے نائب نے تیسرا سوال کیا۔

مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کوئی جاسوس ہے اور میرے ایک ایک لمحے کی نگرانی کرتا رہا ہے۔ ''میں حال ہی میں ان تاریخی مقامات کی سیاحت کر کے دہلی واپس آیا ہوں۔''

میں نے اعتراف کر لیا کہ اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

''کیا تم نے اس سفر میں سلطان معظم کے خلاف کسی سے کوئی بات کی تھی؟'' جیسے ہی اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا

ہوئے مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔

میں اپنی اس کمزوری سے پوری طرح واقف ہوں کہ میرے اندر اپنے جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جو کچھ دل میں ہوتا ہے اسے بے دھڑک زبان پر لے آتا ہوں۔ ایک بار میں نے حضرت امیر خسروؒ سے سلطان علاؤ الدین خلجی کے خلاف باتیں کی تھیں۔ اگرچہ امیر ایک نہایت صالح انسان تھے اور ان ہی کے طفیل مجھے حضرت نظام الدین اولیا کی غلامی کا شرف حاصل ہوا تھا لیکن گھبراہٹ اور پریشانی میں خیال گزرا کہ کہیں امیر نے نادانستگی میں سلطان کے سامنے میرا ذکر نہ کر دیا ہو۔

میں نے جواباً ہاں کہا تو وہ مجھے باندھ کر ساتھ لے گیا۔ میں راستے بھر ذلت برداشت کرتے ہوئے گیا مگر جب دربار میں پہنچا تو معاملہ ہی کچھ اور نظر آیا۔ مجھے عزت و احترام ...... سے کرسی دی گئی۔

میں سب کچھ سمجھ گیا کہ یہ میرے پیر کی نظر کا کرم ہے کہ میں اتنے بڑے خطرے سے ایک بڑی سازش سے بچ گیا ہوں۔

☆☆☆

خالد یزدانی لکھتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں بھی مزاحیہ فنکاروں نے بڑا نام کمایا۔ اردو فلموں کے معروف مزاحیہ اداکار لہری آج بھی کراچی میں بیماری سے لڑ رہے ہیں اور خالد سلیم موٹا شوگر کی وجہ سے ایک پاؤں کٹوانے کے بعد بھی اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ وہ صحت یاب ہو کر پھر سے لوگوں کو ہنسائے گا کہ آج کے دور میں اس سے بڑی خدمت کوئی نہیں۔ (یہ جملہ انتقال سے پہلے لکھا گیا ہے) اردو پنجابی فلموں کے کئی مزاحیہ اداکار تھے جن کی فلموں کے لوگ دیوانے ہوا کرتے تھے۔ ظریف، الے شاہ شکارپوری، ننھا، رنگیلا، منظور ظریف، ترالا، منور اور زلفی کی فلموں کو شوق سے دیکھا جاتا تھا آج بھی ان کی فلمیں چھوٹی اسکرین پر دکھائی جائیں تو لوگ اسے شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی کیسی تھی، اس سے قطع نظر وہ اپنے غموں کو بھلا کر دوسروں کو خوشیاں بانٹتے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

سید مظفر حسین زیدی کی حیثیت سے مختلف تقریبات میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا جادو جگا کر لوگوں کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کرنے والا جب یہ نوجوان فلمی دنیا میں آیا تو اس کا فلمی نام اس کے منفرد انداز بیان کی وجہ سے ترالا تجویز کیا

گیا، یوں نرالا جو پہلے صرف اسٹیج پر قادر مرحقا، نے "فلم اور بھی غم ہے" سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا اور اس کے بعد ہدایتکار داؤد چاند کی فلم سیپرنی، ہدایت کار اے ایچ صدیقی کی چھوٹی بہن میں مزاحیہ کردار ادا کیا لیکن اسے شہرت فلم ہیرا اور پتھر سے ملی۔ اس کے بعد ارمان، احسان جیسی سپرہٹ فلموں میں بھی نرالا کے کردار کو سراہا گیا اور وہ اردو فلموں کی ضرورت بن گئے۔ غرض سو کے لگ بھگ فلموں میں کام کیا اور پھر جیسا کہ ہوتا ہے، ہر عروج کے بعد زوال، مصروفیت کے دور میں لاہور ان کا ٹھکانا تھا بعدازاں پھر کراچی چلے آئے، ان دنوں عمر شریف کے ساتھ بھی اسٹیج پر کام کرتے رہے اور آخر کار بیماری اور بے

پوٹ ہوجاتے تھے۔ اگرچہ بطور ہدایت کار ان کی فلمیں زیادہ کامیاب نہیں رہیں لیکن انہیں فلم کے تمام شعبوں پر دسترس تھی بلکہ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ بڑے اچھے نثر نگار اور شاعر بھی تھے۔ ملک کے معروف آرٹسٹ ظہور کاشمیری نے کلفٹن روڈ پر اپنے آفس میں ایران کے اس وقت کے پریس اتاشی آقائے خردمند کے اعزاز میں دعوت کی جس میں آصف جاہ بھی موجود تھے، وہیں میری ان سے آخری ملاقات بھی ہوئی اور انہوں نے اپنے چند اشعار بھی سنائے مگر افسوس، میں ان کا بطور شاعر ایک تفصیلی انٹرویو کرنا چاہتا تھا نہ کرسکا۔ آصف جاہ 7 ستمبر 1994ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

کاری سے لڑتے لڑتے اور دوسروں کو ہنساتے ہنساتے منوں مٹی تلے جا سوئے۔

ڈاکٹر لقوہ کے کردار کو فلم "دو آنسو" میں شائقین فلم نے خوب سراہا اور یوں راتوں رات پہلی فلم سے ہی اس کردار کو ادا کرنے والا آصف جاہ فلموں میں مصروف ہوگیا، ان دنوں اداکار مختلف اداروں کے ساتھ منسلک ہوکر کام کرتے تھے، فلم دو آنسو کے ہدایت کار انور کمال پاشا تھے لہٰذا ان کے ادارے کے تحت بننے والی متعدد فلموں میں آصف جاہ نے اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ ان کا بولنے اور چلنے کا انداز بھی بڑا منفرد تھا۔ کچھ لوگ اسے چارلی چپلن کی نقل بھی کہتے تھے مگر آصف جاہ کا اپنا انداز تھا، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ولایت باس کے شیخ چلی کے ٹائٹل رول میں ایسی اداکاری کی کہ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ

رفیع خاور جس نے ننھا کے نام سے فلم اور ٹی وی میں شہرت پائی، کو اداکاری کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ جن دنوں وہ بینک میں ملازمت کرتا تھا، ان دنوں اپنے بینک کے دو تین ساتھیوں کے ساتھ کبھی کبھار اسٹیج پر کام کر لیتا تھا۔ ٹی وی کی سیریل "الف نون" سے اسے صحیح معنوں میں شناخت ملی اور اس کے بعد اس کے فلمی سفر کا آغاز بھی شباب کیرانوی کی فلم سے ہوا اس کی جوڑی علی اعجاز کے ساتھ کسی بھی فلم کی کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی تھی۔ اس نے مزاحیہ کرداروں کے ساتھ دوسرے کردار بھی ادا کیے۔ سینما اسکرین پر اسے دیکھتے ہی لوگ مسکرا پڑتے تھے۔ انہوں نے ہر بڑے ہدایت کار کی فلم میں کام کیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ننھا نے عشق میں ناکامی پر خودکشی کرلی جبکہ کچھ کا خیال یہ بھی ہے کہ جب فلموں میں ایک جیسے کردار ادا کرتے کرتے

دیکھ کر اس کی فلمیں ناکام ہونے لگیں تو فلمسازوں نے بھی منہ موڑ لیا اور فنکار تو ویسے بھی حساس ہوتا ہے لہٰذا وہ یہ برداشت نہ کر سکا اور یوں اپنی زندگی کو ختم کر کے اس جہان سے کوچ کر گیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کی کئی فلمیں آج بھی اس کے کام کی وجہ سے دیکھی جاتی ہیں، اس طرح سالہا سال گزرنے کے باوجود الف نون جیسی مزاحیہ ڈراما سیریل کوئی اور نہ بن سکی اس کی اس سیریل کی آج بھی سی ڈیز بڑی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔

محمد سعید رنگیلا کا اصل نام تھا ابتدا میں اسے باڈی بلڈنگ کا شوق تھا مگر ذریعہ معاش پینٹنگ تھا، مگر اداکاری کا شوق بچپن سے ہی تھا لہٰذا ایم جے رانا کی فلم ''جٹی'' میں اسے کام کرنے کا موقع ملا اور پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنے قدم جمانے شروع کر دیے، اگرچہ ابتدا میں اسے مختصر کردار بھی ملا تو اس نے اپنی پر نقار حس سے دیکھنے والوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ منور ظریف اور رنگیلا کے نام سے فلم کا آغاز ہوتا تو لوگ اس فلم کی نمائش کا انتظار کرنے لگ جاتے۔ اس دوران اس نے اپنی ذاتی فلم ''دیا اور طوفان'' بنائی اور اس کی کامیابی کے ساتھ اس کے نئے سفر کا آغاز ہو گیا اور اس نے پھر ثابت کیا کہ وہ جتنا اچھا اداکار ہے، اتنا اچھا ہدایت کار بھی ہے، کئی فلموں میں اس نے اپنی آواز میں گانے بھی گائے۔ اردو اور پنجابی فلموں میں کام کرنے کے ساتھ وہ دیگر فلموں میں بھی کام کرتا گیا۔ اسی دوران کبڑا عاشق فلم کا آغاز کیا، یہ فلم اس وقت بڑی مہنگی بنائی گئی اور اس کی بڑی تشہیر بھی کی گئی، ان دنوں اکثر یہ مشہور تھا کہ بالی ووڈ کے مشہور اداکار انتھونی کوئین نے فلم ''ہنچ بیک'' میں جو کبڑے کا کردار ادا کیا رنگیلا اس سے بڑا متاثر تھا اور کبڑا عاشق کا آئیڈیا وہیں سے لیا۔ بہرحال فلم کبڑا عاشق ایک اچھی فلم ہونے کے باوجود اس وقت زیادہ بزنس نہ کر سکی۔ رنگیلا پر یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ایک ملاقات میں جب اس سے پوچھا گیا کہ اس فلم کی ناکامی کی وجہ کیا تھی تو اس نے کہا دراصل لوگ مجھے دیکھنے آتے تھے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ فلم میں میرا کردار ایک گونگے کبڑے کا تھا اور جب مجھے اللہ کی رحمت سے قوت گویائی مل جاتی ہے تو ایک واقعہ کے نتیجہ میں میں اپنی زبان خود کاٹ لیتا ہوں۔ لہٰذا میں ساری فلم میں نہ بول سکا، ہال میں بیٹھے لوگ ''بول اٹھے'' اور فلم ذرا بیٹھ گئی کیونکہ لوگوں کے ذہن میں تھا کہ میں ان کو ہنساؤں گا مگر میں نے کردار کی مناسبت سے کام کیا تھا۔ بہرحال اس کے بعد بھی رنگیلا نے بہت سی بہاری اور کئی کامیاب فلموں میں کام کیا اور جب فلموں میں کام ملنا کم ہوا تو انہوں نے اسٹیج کا رخ بھی کیا۔ اس دوران رنگیلا کی صحت بھی متاثر ہوئی اور ایک دن انکشاف ہوا کہ وہ گردوں کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ بیماری کے دوران گردوں کی صفائی کے مہنگے اخراجات کو پاکستان کے سابق (آج موجودہ) وزیراعظم نواز شریف جو اداکار رنگیلا کے فین بھی تھے، نے پہلے اتفاق اسپتال اور پھر رائے ونڈ کے اسپتال میں مفت علاج کی ہدایات دیں یا اس کا خرچ خود برداشت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رنگیلا کچھ عرصہ مزید زندہ رہے اور آخرکار اس بیماری کے ہاتھوں اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن فن کی دنیا میں ان کا نام کل کی طرح آج بھی زندہ ہے اور اب ان کی صاحبزادی فرح نے رنگیلا فاؤنڈیشن بھی تشکیل دے دی ہے اور اپنے والد کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

نذر کا تعلق میرٹھ سے تھا۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل بمبئی اور لاہور فلمی دنیا کے دو بڑے مرکز تھے اور نذر نے اپنی قسمت آزمانے کے لیے لاہور کا رخ کیا، اسی دوران برصغیر کی تقسیم ہوئی اور پاکستان معرض وجود میں آیا اور نذر نے بھی فلم ''تیری یاد'' سے اپنی فنی سفر کا آغاز کیا، دبلے پتلے بدن کی وجہ سے اور مکالموں کی ادائیگی کا ان کا اپنا انداز تھا، جس کی وجہ سے وہ اردو پنجابی فلموں کے معروف ترین کامیڈین بن گئے۔ نذر نے تقریباً پونے دو سو کے قریب فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے، جس میں صرف اداکار ہیرو ولن ہوتے مگر کامیڈین صرف نذر ہی ہوا کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی صحت بھی متاثر ہوئی، اگرچہ وہ فلموں میں کام نہیں کرتے تھے مگر فلموں کے بارے میں ان کی معلومات ایسی تھیں کہ ان کو ہنسنے والا ان کے دلائل کو مان جاتا تھا۔

اے شاہ شکارپوری نے اپنے فلمی سفر کا آغاز 1939ء میں کیا تھا، کاردار صاحب کی فلم شاردا میں منشی کا کردار انہوں نے اس خوبی سے نبھایا تھا کہ اس فلم کے مصنف نذیر اجمیری صاحب نے بھی انہیں داد دی جبکہ کئی سال بعد ہدایت کار اشفاق ملک کی فلم سلمیٰ میں بھی اے شاہ شکارپوری نے منشی کا کردار بخوبی ادا کیا۔ اے شاہ شکارپوری جتنے اچھے اداکار تھے، اتنے اچھے ادیب بھی تھے بلکہ اپنی ذاتی فلم حقیقت پر بطور مصنف، شاعر، ہدایت کار اپنا بھی نام اے ایس عاجز کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک دور میں جب فلموں میں کام ملنا کم ہوا تو انہوں نے کئی ناول بھی تحریر

کیے۔ اسے شاد و شکارپوری نے فلم سفت بہرہ چاچا خواہ مخواہ اور چغل خور میں ٹائٹل کردار ادا کیا۔ فلم موج میلہ، سوکن، لاڈو، بدحرام، تقدیر، راوی پار، گھر کا اجالا، آبرو میں بھی انہوں نے اچھی اداکاری کی تھی۔ جب وقت گزرنے کے ساتھ صحت جواب دینے لگی اور وہ مکالمے بھی بھولنے لگے تو آہستہ آہستہ چھوٹے کرداروں میں بھی فلم سازوں نے لینا چھوڑ دیا۔ سنا ہے کہ آخری ایام میں انہوں نے ایک دکان کھول لی تھی جہاں وہ چنگیں بنا کر بیچا کرتے تھے۔

ظریف مرحوم کے بعد جس نے دنیائے فلم میں اپنے آپ کو منوایا، اس کا نام منور ظریف ہے۔ جن کی فن اداکاری کے آج بھی سب معترف ہیں۔ اگرچہ 1961ء میں منور ظریف نے فلم ڈنڈیاں سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کر دیا تھا پھر فلم چاچا صاحب، موج میلہ، مجریا میلہ، جگری یار، یاراں نال بہاراں اور کئی فلموں میں کردار ادا کیا جبکہ جاپانی گڈی، اج دا مہینوال، چکر باز، خوشیا، گامائے میں اس کی اداکاری کو سراہا گیا لیکن نوکر ووہٹی دا اور زینت کے ساتھ ہیر رانجھا میں اس نے اپنے کردار کو جس طرح نبھایا وہ قابل داد ہے۔ ایک دور میں جب رنگیلا اور منور ظریف کی ہٹ جوڑی کسی بھی فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی ان دنوں دونوں اداکار لکھے گئے مکالموں سے ہٹ کر بھی مکالمے بول لیا کرتے تھے۔ ایک پنجابی فلم کی عکسبندی ہو رہی تھی۔ آج کل جو راوی کا پل ہے، اس کے ساتھ ملک کا باغ ہوا کرتا تھا، وہاں فلم کی عکسبندی کا یومیہ کرایہ ایک سو روپیہ ہوا کرتا تھا اور تمام زیادہ تر پنجابی فلموں کے گانے وغیرہ اسی باغ میں عکسبند ہوا کرتے تھے۔ اسی باغ میں ایک پنجابی فلم کی عکسبندی تھی۔ ہدایت کار جہاں تک مجھے یاد ہے ظفر ڈار تھے۔ اس پنجابی فلم میں منور ظریف ہیرو کے ساتھ آتا ہے اور وہاں ولن اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہاتھا پائی ہوتی ہے، اس دوران فلم کا ہیرو ولن کو پکڑ لیتا ہے اور ولن کو کہتا ہے ”اگے لگ اوئے“ تو ساتھ ہی منور ظریف اسکرپٹ سے ہٹ کر مکالمہ بولتا ہے۔ ”لگے اگ اوئے“۔ ہدایت کار نے ”کٹ“ اور ”اوکے“ کی آواز لگائی اور منور ظریف کو اس کی حاضر جوابی پر داد دی۔ منور ظریف اور رنگیلا عموماً فلموں میں بات سے بات نکالنے کا فن جانتے تھے اور ان کے مکالموں سے شائقین فلم محظوظ ہوتے تھے۔ فلمی دنیا کے

اس ستارے کو بھی نظر لگ گئی اور ظریف کے بعد منور ظریف بھی اس دنیا کو چھوڑ گئے۔ منور ظریف کی زندگی ہی میں منیر ظریف نے فلموں میں اداکاری شروع کر دی تھی اور مجید

ظریف کو بھی کام ملا مگر وہ بات نہ بن سکی۔

☆☆☆

ناشاد صاحب، ذاتی طور پر بھی بہت سریلے تھے۔ سر کے ساتھ ساتھ آواز میں سوز اور تاثر بھی تھا۔ شاید اسی لیے بہت سے ہدایت کاروں اور فلمسازوں کو ان سے یہ شکایت رہتی تھی کہ ناشاد نے دھن تو اچھی بنائی تھی مگر ریکارڈ ہونے کے بعد اتنی اچھی نہیں لگی۔ دراصل بات یہ تھی کہ جب ناشاد صاحب دھن سناتے تو اس میں ان کی آواز کا تاثر اور اتار چڑھاؤ نمایاں ہوا کرتا تھا۔ ریکارڈ کرنے کی باری تو بعد میں آتی تھی۔ پہلے تو ریہرسل کے موقعے پر ہی ہدایت کار کو شکایت پیدا ہو جاتی تھی کہ یہ وہ دھن نہیں ہے جو ناشاد صاحب نے سنائی تھی۔ حالانکہ فرق صرف آواز کا ہوا کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناشاد صاحب اپنی خداداد آواز میں جو دھن گا کر سناتے تھے اور اس میں مناسب مقامات پر جو ”جھنجیں“ باریکیاں اور نزاکتیں رکھتے تھے اور ان کا گائیکی میں اظہار بھی کرتے تھے وہ بہت سے گلوکاروں کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں کسی ایک گلوکار کی نشاندہی نہیں کروں گا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے تجربے اور مشاہدے کے مطابق ناشاد صاحب کی بنائی ہوئی چند دھنوں کے سوا بہت کم دھنیں ہو بہو اسی انداز میں گائی گئی ہیں جس طرح ناشاد صاحب نے اسے ترتیب دیا تھا۔ حالانکہ ناشاد صاحب کا دور پاکستان میں بہت اچھے، نامور اور ہنرمند گلوکاروں کا دور تھا۔ مہدی حسن، استاد امانت، میڈم نور جہاں، اخلاق احمد، مجیب عالم، احمد رشدی، رونا لیلیٰ، ثریا خانم، غلام علی، مالا، فریدہ خانم، اقبال بانو، مسعود رانا، سلیم رضا، غرض کس کس کا نام

نوں۔ ایک سے بڑھ کر ایک گلوکار موجود تھے اور اپنی آواز کا جادو جگا رہے تھے۔ وہ پاکستان کی فلمی موسیقی کا زریں اور سنہاک دور تھا۔ نغمہ نگار، گلوکار، موسیقار، اداکار اور پھر ان گانوں کو فلمانے کے لیے ہدایت کار بھی اپنی اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح ہوا کرتے تھے۔ مگر میرا وہ اعتراض اس کے باوجود موجود ہے کہ ناشاد صاحب جس طرح خود گا کر گلوکاروں کو سناتے تھے اور گائیکی میں مناسب جگہیں اور ضروری جوڑ بتاتے تھے گلوکار ان کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کرتے تھے۔ شاید ایک وجہ یہ تھی کہ گلوکار اپنی مصروفیت کے باعث مناسب وقت اور توجہ نہیں دیتے تھے۔ اس قدر شوق اور لگن کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے جس کی موسیقار ان سے توقع رکھتے تھے۔ بے پروائی یا خود کو موسیقار سے بلند سمجھنا بھی غالباً اس کا ایک سبب تھا۔ یہ شکایت اس زمانے میں ہر اچھے موسیقار کو تھی جس کا اظہار وہ بڑے گلوکاروں کے سامنے کرتے بھی رہتے تھے۔

میڈم نور جہاں نے پنجابی گانوں کی صدا بندی پر توجہ مبذول کر دی تھی اور ان کی مصروفیت بھی بہت زیادہ تھی۔ اس لیے ان کی آواز کی کوالٹی پر بھی فرق پڑ گیا تھا۔ ریہرسل کی کمی کی وجہ سے مجموعی طور پر گانا بھی متاثر ہوتا تھا۔ مہدی حسن صاحب نے اس زمانے میں تقریبات اور محفلوں کا سلسلہ اس قدر دراز نہیں کیا تھا اور عموماً فلمی گانوں کی صدا بندی کے لیے دستیاب ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی لاہور سے باہر ہوتے تو فلم سازوں کو ان کا انتظار بھی کرنا پڑتا تھا۔ اگر انتظار ممکن نہ ہوتا تو پھر کسی اور کی آواز میں گانا صدا بند کیا جاتا۔ مہدی حسن کی مشکل یہ ہے کہ انہیں گانا دیر سے یاد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک دو ریہرسلوں کے بعد ریکارڈنگ کے موقعے پر انہیں پورا گانا یاد نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار وہ میری فلم "جاگیر" کے لیے گانا ریکارڈ کرا رہے تھے۔ موسیقار ناشاد صاحب تھے۔ مہدی حسن ہر بار دھن میں تبدیلی کر دیتے یا پھر بولوں میں گڑبڑ ہو جاتی۔ ناشاد صاحب چڑ کر بولے "خان صاحب۔ گانا تو اس وقت صحیح گاؤ گے جب بول یاد ہوں گے۔ سامنے تو بولوں کا پرچہ رکھا ہوا ہے۔ دھیان بولوں کی طرف ہے تو پھر طرز اور گائیکی پر کیسے توجہ دو گے؟" یہ مہدی حسن کی کمزوری رہی ہے کہ انہیں بول پوری طرح یاد نہیں رہتے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کے مقبول عام گانے جو وہ اکثر محفلوں میں سنایا کرتے ہیں انہیں گاتے وقت بھی وہ کاپی کی جانب انکھیوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ان کا دم غنیمت تھا اور اس زمانے کے فلمی نغموں میں جو وقار، شستگی اور سریلا پن موجود ہے وہ ان ہی جیسے گلوکاروں کا مرہونِ منت ہے۔ بعد میں جب مہدی حسن نے آئے دن ملک کے اور لاہور سے باہر رہنا شروع کر دیا تو موسیقاروں اور فلم سازوں نے ان کے نعم البدل تلاش کرنے شروع کر دیے۔ میری ایک فلم "اجنبی" کے لیے موسیقار نثار بزمی صاحب نے ایک غزل کی دھن مہدی حسن کو پیش نظر رکھ کر بنائی تھی۔ مگر عین وقت پر پتا چلا کہ مہدی حسن دستیاب نہیں ہو سکتے۔ وہ ملک سے باہر تھے۔ میرے لیے انتظار کرنا ممکن نہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ یا تو گانے کی صدا بندی ہی سرے سے ملتوی کر دی جائے یا پھر کوئی اور آواز تلاش کی جائے۔ غلام عباس نئے نئے آئے تھے اور انہوں نے صرف چند پنجابی نغمے گائے تھے۔ مگر ان کی آواز کی کوالٹی بہت اچھی تھی۔ بزمی صاحب نے غلام عباس کو بلا کر ریہرسل کرائی تو طرز کی ضرورت کافی حد تک پوری ہوتی نظر آئی چنانچہ ہم نے غلام عباس کی آواز میں یہ غزل ریکارڈ کر لی۔

وہ آ تو جائے مگر انتظار ہی کم ہے

وہ بے وفا تو نہیں میرا پیار ہی کم ہے

غلام عباس نے غزل کا حق ادا کر دیا۔ مزیدار بات یہ ہے کہ جب میں یہ فلم سنسر کرانے کے لیے اسلام آباد گیا تو فلم سنسر بورڈ کے بہت سے عہدیداران نے بھی مہدی حسن کے اس نغمے کی بہت تعریف کی۔ جب انہیں بتایا کہ یہ ایک نئے گلوکار غلام عباس نے گایا ہے تو انہیں بہت تعجب ہوا۔ اس طرح اردو فلموں میں غلام عباس کی گلوکاری کا آغاز "اجنبی" سے ہوا۔

ذکر ناشاد صاحب کا ہو رہا تھا۔ بات مہدی حسن تک پہنچ گئی۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ انہوں نے اکثر ناشاد صاحب کی دھنوں میں گائیکی کا پورا پورا حق ادا نہیں کیا۔ دوسرے گلوکاروں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

ناشاد صاحب کیونکہ بہت آسانی سے نئی نئی دھنیں بنا لیا کرتے تھے اس لیے اکثر جب اگلے دن ریہرسل کے لیے آتے تو اصل دھن بھول کر کوئی اور دھن سنانے لگتے۔ دھن وہ بھی بہت اچھی ہوا کرتی تھی مگر جو دھن ایک بار پسند آ جائے وہ کانوں میں رچ بس جاتی ہے جب انہیں ٹوکتے کہ یہ وہ دھن نہیں ہے۔ نہ وہ جگہیں ہیں جو اور جگل دھن میں تھیں تو وہ ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے اور مختلف انداز میں گاتے یہاں تک کہ بھولی ہوئی دھن یاد آ جاتی۔ افسوس کہ ہمارے ہاں بے پروائی کی وجہ سے اکثر میوزک ڈائریکٹر

ریکارڈنگ کے جدید آلات تو کیا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر بھی ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے ورنہ یہ آڈیو ٹیپ نہ صرف خود ان کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے تھے بلکہ آنے والے دور میں ایک یادگار ریکارڈز کی حیثیت اختیار کر جاتے۔ ذرا غور فرمایئے کہ خود ناشاد، رشید عطرے، ماسٹر عنایت یا نثار بزمی کی آواز میں ایک ہی گیت کی بے شمار طرزیں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ یا بالکل مختلف انداز میں سننے کا موقع ملے تو یہ بذات خود ایک پُرلطف تجربے سے کم نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان چیزوں کو بطور خاص محفوظ کیا جاتا ہے۔ ہم شاید اس لیے پروا نہیں کرتے کہ موسیقار بھی سستا مل جاتا ہے اور گلوکار بھی۔ نغمہ نگار کو بھی معمولی سا معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ پھر بلاوجہ یہ دردِ سر کون مول لے۔ اگر ترقی یافتہ ملکوں کی طرح یہاں بھی معاوضے زیادہ ہوں، ہر چیز کے لیے کاپی رائٹ کا قانون موجود ہو اور ذرا سی تبدیلی کے لیے بھی معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہو تو پھر کوئی اس غفلت اور بے پروائی کا مظاہرہ نہ کرے۔

ناشاد صاحب کو اچھے موسیقاروں کی مانند شعر کی سمجھ بھی تھی اور اکثر وہ بے دھیانی میں طرز بناتے ہوئے اچھے مکھڑے بھی بنا لیا کرتے تھے۔ راگ داری ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ ٹپ ایسا لگاتے تھے کہ دھن میں جان پڑ جاتی تھی۔ پھر دھنیں بھی کہ ہارمونیم سے اور ان کے منہ سے موسلادھار بارش کی طرح برسا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے نغمے دل میں اتر جاتے تھے اور آج بھی اسی طرح لطف دیتے ہیں اور بھلے لگتے ہیں۔

ناشاد صاحب ذاتی زندگی میں ایک سیدھے سادے بلکہ بھولے آدمی تھے۔ چالاکی اور ہوشیاری ان میں نہیں تھی۔ انہیں دھوکا دینا مشکل نہیں تھا۔ سادگی پسند تھے اور ہر معاملے میں سادگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ لباس ہو، رہن سہن ہو، بول چال ہو، ہر معاملے میں تکلف اور تصنع سے دور تھے۔ اکثر اپنی سادگی اور بھولے پن کی وجہ سے نقصان بھی اٹھاتے تھے۔ ان کے دھن بھول جانے کا تذکرہ پہلے کر چکا ہوں۔ جب ان کے بڑے صاحبزادے واجد ناشاد نے بی اے پاس کرلیا تو ناشاد صاحب نے انہیں اپنا اسسٹنٹ بنا لیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ واجد نئی نسل کا نوجوان تھا۔ موسیقی میں بھی اس کی پسند ناپسند ماڈرن تھی جبکہ ناشاد صاحب خالص اور ٹھیٹ قدیم راگ راگنیوں کے عادی تھے۔ واجد کے معاون خصوصی بن جانے کے بعد یہ ہوا کہ ہارمونیم کے سروں اور طبلے کے ردھم میں واجد نے ماڈرن انداز

پیدا کرنے کی کوشش میں ناشاد صاحب کی موسیقی کی روح کو مجروح کرنا شروع کر دیا۔ ناشاد صاحب ایک راگ میں دھن بنا رہے ہیں اور واجد صاحب اس میں ماڈرن انداز کے پیوند لگا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجموعی تاثر پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ اس طرح ناشاد صاحب دھن میں ایک انداز رکھتے تھے مگر واجد صاحب ڈنڈی مار کر اس میں کوئی تبدیلی یا آمیزش کر دیتے تھے۔ اس طرح دھن بگڑ جاتی تھی۔ ان دنوں ہدایت کار اور موسیقاروں کے ساتھ ناشاد صاحب کے جھگڑے اسی بات پر ہوتے تھے کہ آج کوئی طرز منتخب ہوئی ہے مگر اگلے روز وہ تبدیلی کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔ ناشاد صاحب کو تو بھولنے کی عادت تھی مگر فلم ساز کو وہ دھن یاد ہو جایا کرتی تھی۔

مجھے اس پرابلم کا احساس ہوا تو میں نے واجد کو مشورہ دیا کہ وہ ناشاد صاحب کی طرزوں اور دھن میں تبدیلی کرنے کی کوشش نہ کریں اس طرح آدھا تیتر، آدھا بٹیر ہو جائے گا اور طرز خراب ہو جائے گی۔ اس طرح میں نے تو اس مسئلے پر قابو پالیا مگر دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے ساتھ یہ مسئلہ برقرار رہا۔ میرے خیال میں آخری سالوں میں ناشاد صاحب کی مصروفیات اور ناکامی کا سبب بھی یہی تھا کہ ناشاد صاحب تو خالص راگ داری کے لحاظ سے دھن بنانے تھے مگر آرکسٹریشن واجد صاحب کرتا اور وہ سرے جدید ساز اور ردھم شامل کر دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے اس کا رنگ کچھ اور ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات ناشاد صاحب خود بھی تنگ آ کر واجد کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے تھے مگر واجد کی اس عادت نے ناشاد صاحب کی موسیقی کو متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا۔

واجد نے موسیقی کے میدان میں قدم رکھا تو ایک مشفق اور ذمہ دار باپ کی طرح ناشاد صاحب نے دوستوں اور جاننے والوں سے کہنا شروع کر دیا کہ اپنے بھتیجے کو فلم کی موسیقی بنانے کا موقع دیجئے تاکہ اس کا بھی نام ہو بہت ہوشیار ہے۔ ہم نے ایک دن مذاق میں کہا۔ ناشاد صاحب۔ اگر واجد کی پہلی فلم ہی موسیقی کے لحاظ سے ہٹ ہو جائے تو اسے مستند میوزک ڈائریکٹر تسلیم کر لیا جائے گا۔

کہنے لگے۔ ''ہاں۔ یہ بات تو ہے۔''

''تو پھر اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک فلم میں موسیقی بنا کر آپ موسیقار کے طور پر واجد کا نام دے دیجیا۔''

ناشاد صاحب بھڑک گئے۔ ''ارے میاں یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اپنی میوزک پر اس کا نام کیسے دے دوں؟''

''آخر وہ آپ کا بیٹا ہے۔ بلکہ ولی عہد ہے۔''

''کچھ بھی ہو میں اپنے کام پر اس کا نام نہیں دے سکتا۔''

ہم نے شرارت سے کہا۔ ''تو پھر آپ دوسروں کو اتنا مہنگا تجربہ کرنے کا مشورہ کیوں دے رہے ہیں؟ وہ اتنا بڑا رسک کیسے لے سکتے ہیں؟ اچھا۔ ایسا کریں کہ کسی فلم پر اپنا اور واجد دونوں کا نام دے دیں۔''

ناشاد صاحب کو یہ مشورہ بھی پسند نہیں آیا۔ بولے۔ ''یہ غلط ہے۔ ہر شخص کو خود کنواں کھود کر پانی نکالنا چاہیے۔ واجد کا نام خود اس کے کام کے حوالے سے ہونا چاہیے۔''

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ناشاد صاحب کثیر العیال آدمی تھے۔ جب ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ ناشاد صاحب ماشاءاللہ 14 بچوں کے باپ ہیں تو حیران رہ گئے۔ پوچھا۔ ''بیویاں کتنی ہیں؟''

بڑے فخر سے بولے۔ ''ارے میاں اللہ کے فضل سے ایک ہی بیگم ہیں۔ ہم دوسری شادی کے قائل نہیں ہیں۔''

اس ضمن میں یاروں نے ایک لطیفہ بھی بنا رکھا تھا۔ ہوا یہ کہ سہیل رعنا ماڈرن نوجوان تھے۔ ہر وقت بنے ٹھنے، اچھا لباس پہنے خوشبو لگائے نظر آتے۔ کسی دوست نے ناشاد صاحب سے کہا۔ ''استاد۔ اپنا حلیہ درست کرو۔ سہیل رعنا کو دیکھا۔ وہ بھی تو میوزک ڈائریکٹر ہے۔''

بولے۔ ''چپ کرو یار۔ موسیقی کو ٹھٹے سے کیا تعلق ہے؟''

''وہ کتنا ویل ڈریس رہتا ہے اور ایک تم ہو کہ پاجامہ اور چپل پہنے پھرتے ہو۔''

کہنے لگے۔ ''بھئی اس کا کیا ہے۔ وہ تو سنگل آدمی ہے۔ ایک بیوی، دو بچے۔ ہمارے تو اللہ کے فضل سے چودہ بچے ہیں۔''

ناشاد صاحب فن کار قسم کے آدمی تھے۔ کھوئے کھوئے سے رہتے۔ اپنی موسیقی میں گم رہتے۔ گھریلو باتوں سے عموماً بے تعلق ہی رہا کرتے تھے۔ ثناء اللہ خان گنڈاپور سے ان کی بہت بے تکلفی تھی۔ ایک دن ثناء اللہ خان نے چھیڑنے کو کہا۔ ''ناشاد صاحب آپ کیسے باپ ہیں کہ آپ کو اپنے بچوں کی تعداد بھی معلوم نہیں ہے۔'' ناشاد صاحب بگڑ کر بولے۔ ''فضول باتیں مت کرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔''

''اچھا تو پھر بتا ہے۔ کتنے بچے ہیں خیر سے؟''

ناشاد صاحب نے پریشان بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ کچھ دیر سوچا۔ حساب لگایا اور پھر انگلیوں پر گن کر بولے۔ ''اللہ کے فضل سے چودہ بچے ہیں۔''

''آپ کو ان کے نام یاد ہوں تو وہ بھی بتا دیجیے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں اپنے بچوں کے نام نہیں جانتا؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''استاد۔ اگر آپ صحیح ترتیب سے اپنے تمام بچوں کے نام بتا دیں تو یہ سو کا نیا نوٹ آپ کا ورنہ آپ سو روپے دیں گے۔''

ناشاد صاحب مسکرائے۔ ''تو بس یہ نوٹ میری جیب میں ڈال دو۔'' پھر انہوں نے سوچنا شروع کر دیا۔ بولے۔ ''سب سے بڑا واجد۔ اس کے بعد پپو۔ اور پھر...... پھر عمران......'' اس کے بعد وہ بھول گئے۔ ظاہر ہے کہ سو روپے کی شرط ہار گئے۔

ثناء اللہ خاں نے ان کے بارے میں ایک یہ لطیفہ بھی بتایا تھا کہ ایک بار وہ نئی گاڑی خرید کر گھر لے گئے تو محلے کے ڈھیر سارے بچوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ کوئی ہاتھ لگا رہا ہے۔ کوئی اوپر چڑھنے کی کوشش میں ہے، کوئی شیشوں پر لکیریں کھینچ رہا ہے۔ ناشاد صاحب کو بہت ناگوار گزرا۔ غصے سے بولے۔ ''ارے بھئی۔ تم سب اپنے گھر کیوں نہیں جاتے۔ گاڑی کو خراب مت کرو۔''

ایک بچہ بولا۔ ''ابا۔ میں تو آپ ہی کا بچہ ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم ادھر آ جاؤ۔''

''اور میں بھی آپ کا بیٹا ہوں۔ فوٹو۔''

''تم بھی ادھر آؤ۔''

پتا چلا کہ سب ان ہی کے بچے تھے۔

ناشاد صاحب اس قسم کے لطیفوں پر خود بھی ہنسا کرتے تھے۔ کہتے تھے ''یار خدا کا خوف کرو۔ اللہ کی دین ہے۔ اس کی نعمت ہے کیوں مذاق اڑاتے ہو۔''

''مذاق کہاں اڑا رہے ہیں۔ ہم تو تعریف کر رہے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ آپ کو چودہ سر بنانے کے صلے میں تمغہ دے۔''

تمغے ناشاد صاحب نے کافی حاصل کیے۔ سب سے بڑا تمغہ تو یہ ہے کہ ان کی موسیقی کی دھنوں کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی آج تک لوگوں کے دلوں پر نقش ہے۔ ان کی نمایاں خوبی یہ بھی کہ وہ دوسروں سے حسد نہیں کرتے تھے بلکہ اچھی موسیقی کی تعریف کرتے تھے بعض موسیقار ''دھن تخلیق'' کرنے کے سلسلے میں جس کرب اور اذیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ناشاد صاحب اس سے بالکل محفوظ تھے۔ انتہائی آسانی سے باتوں باتوں میں طرز بنا لیتے تھے اور طرز بھی ایک نہیں۔ بے تکی۔ اور ہر ایک دوسری طرز سے بڑھ کر۔

ناشاد صاحب نے انتقال سے چند سال پہلے ایک فلم بھی بنائی تھی۔ دوستوں نے بہت سمجھایا مگر ان کا کہنا تھا کہ موسیقاری سے جو کچھ کماتا ہوں وہ روزمرہ کے اخراجات میں چلا جاتا ہے۔ بچوں بچیوں کے لیے کچھ سرمایہ تو پیدا کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے ایک فلم کا آغاز کیا جس کا نام غالباً ''محبت مر نہیں سکتی'' تھا۔ فلم سازی اور کاروبار کا انہیں پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یوں بھی شریف، سیدھے سادے اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ فلم کی تکمیل کے سلسلے میں ان کا ناک میں دم آ گیا۔ مالی پریشانیاں الگ پیدا ہو گئیں۔ جن اداکاروں سے بہت اچھے مراسم تھے انہوں نے بھی لحاظ نہیں کیا۔ خاصے تنگ آ گئے۔ خدا خدا کر کے طویل عرصے کے بعد فلم مکمل ہوئی۔ وہ تو کچھ سرمایہ حاصل کرنے کی لگن میں تھے مگر قرضدار ہو گئے۔ اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہ ہاری اور نئے سرے سے فلموں کی موسیقی بنانے میں مصروف ہو گئے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان کا ایک اپنا الگ انداز اور رنگ تھا۔ میلوڈی ان کی موسیقی کی نمایاں خصوصیت ہوا کرتی تھی۔ موسیقی ان کی آخر دم تک بہت ہوتی رہی مگر فلمیں ناکام ہو جاتی تھیں نتیجہ یہ کہ کام ملنا کم ہو گیا۔ وضعدار اور غیور آدمی تھے۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے تھوڑے پر اکتفا کرنے پر مجبور ہے۔ جو تھوڑا بہت کام ملتا رہا پوری توجہ اور محنت سے سرانجام دیتے رہے۔ ان کی دھنیں مقبول ہوتی رہیں۔ مگر فلمی صنعت کے رواج کے مطابق نئے نئے لوگوں پر فلم سازوں کی توجہ زیادہ ہو گئی۔ حالانکہ وہ نہ صرف بہت اچھے موسیقار تھے بلکہ موسیقی پر فلم ساز کے اخراجات بھی زیادہ نہیں کراتے تھے۔

میں 1980ء میں امریکا اور کینیڈا گیا ہوا تھا کہ وہاں خبر ملی کہ ناشاد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کچھ عرصے بعد پاکستان واپس آیا تو اسٹوڈیو میں سب کچھ ویسا ہی تھا بس ناشاد صاحب نہیں تھے۔ سفید ڈھیلے کرتے اور کھلے پائنچوں کے پاجامے میں ملبوس، بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے سانولے رنگ کے دبلے پتلے دراز قد کے کسی آدمی کو بھی نہیں دیکھا تو پھر ناشاد کہاں مل جاتے؟

(جاری ہے)

خطائے محبت

زین مہدی

تاریخ کے دریچے سے ایک ایسے خطا کار کا تذکرہ جس کے مذہب میں عورتوں سے باتیں کرنا بھی گناہ تھا کیونکہ وہ مہاپنڈت جو تھا۔ مگر اس کے دل نے دھوکا دے دیا۔ دھڑکتا اسی کے سینے میں تھا مگر دھڑکن کسی اور کے نام ہوگئی تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بستیوں کی بستیاں خاک ہوگئیں اور اس کی محبوبہ کو تباہی کی دیوی کا لقب دے دیا گیا۔

دھوپ کی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر اس کے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھیں مگر وہ اس انداز میں بیٹھا تھا کہ جیسے اسے ذرا بھی احساس نہ ہو کہ دھوپ کی برچھیاں اسے برما رہی ہیں۔ اس کے جسم کو چھید رہی ہیں
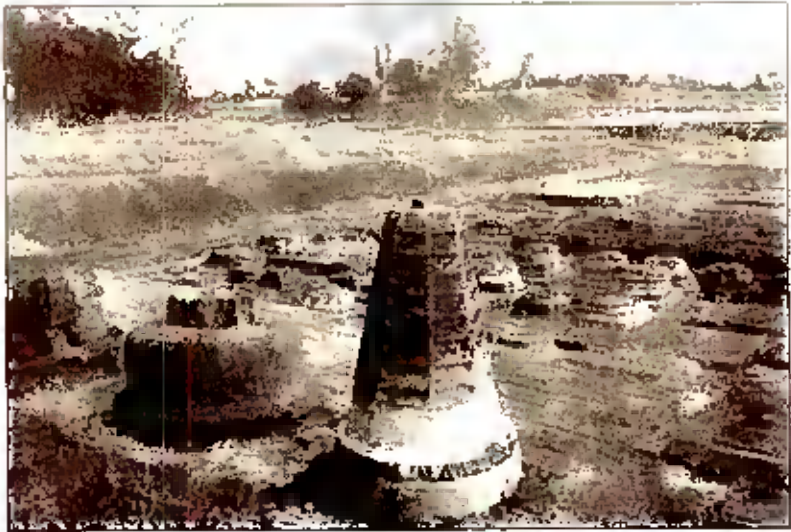
وہ ہر طرف سے لاتعلق بنا گیان دھیان میں مگن تھا۔ وہ پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھا۔ اس خاص انداز کو "پدم آسن" کا نام دیا گیا ہے۔ آریائی لوگوں کا خیال تھا کہ اس

انداز میں بھگوان کو یاد کرنے سے جسم میں نئی شکتی آجاتی ہے اور ذہن سے فاسد خیالات دور ہوجاتے ہیں۔ اس طرح انسان یکسو ہوکر بھگوان کو یاد کرسکتا ہے۔ وہ بھی بھگوان کو یاد کررہا تھا۔ اور اس سے تھوڑی دوری پر دراوڑ نسل کے لوگ تیر کمان لیے بیٹھے تھے۔ ان کے تیر انتہائی مہلک "زہر" میں بجھے ہوئے تھے۔ یہ خبر اسے بھی تھی کہ دشمن تاک میں بیٹھا ہے۔ پھر بھی وہ یہاں آتا تھا۔ گیان دھیان کرتا تھا کیونکہ وہ دوار پال بھی تھا۔

اسے لوگ دیودت کے نام سے پہچانتے تھے۔ وہ وکرم شیلہ وہار کا ایک اہم استاد تھا۔ اسے لوگ پردھان اودھا پک (سب بڑا استاد) کہتے تھے، وکرم شیلہ وہار میں اس جیسا قابل استاد کوئی اور نہ تھا۔ جبکہ وکرم شیلہ وہار کا شمار اس دور کی بڑی یونیورسٹی میں ہوتا تھا۔ نالندہ وہار کے بعد اس کی اہمیت تھی۔ یہ یونیورسٹی پالا راج (آٹھویں صدی) میں راجا دھرم پال نے بنوایا تھا جہاں پڑھنے کے لیے پورے برصغیر کے علاوہ چین اور مالایا تک سے لوگ آتے تھے۔ اس وہار میں بیک وقت ایک ہزار طلبا موجود ہوتے تھے۔ اور تعلیم دینے والوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ تقریباً دو سو اساتذہ ہوا کرتے تھے۔ ان میں دیودت کا شمار بڑے استاد میں ہوتا تھا۔ اس نے یہ مقام بہت کم عمری میں حاصل کرلیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہستنا پور کے ایک وہار میں تھا۔ وہاں سے اسے بلوایا گیا تھا۔ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ آٹھویں صدی میں اس سے قابل استاد اور کوئی نہ تھا۔ پال دواج (راجا پال کا عہد) میں پانچ یونیورسٹیاں زیادہ مشہور تھیں۔ نالندہ، سوما پورا، اودنت پورا، جگدلہ اور وکرم شیلہ۔ یہ سارے وہار اب بھارتی صوبہ بہار کا حصہ ہیں۔ وہار ہی بگڑ کر بہار بنا۔ وہار سنسکرت میں یونیورسٹی کے معنوں میں استعمال ہوا کرتا تھا۔

وکرم شیلہ وہار بھی بہت اہمیت کا حامل تھا اور اس کی اہمیت اس کے قابل اساتذہ کی وجہ سے تھی۔ ان قابل اساتذہ میں دیودت کا بھی ایک نام تھا۔ اسے ودیہ ساگر یعنی علم کا سمندر کا لقب ملا ہوا تھا۔ اسی کی وجہ سے لوگ چھ چھ مہینے کا سفر کرکے آتے تھے۔ جب کہ یہ وہار (جامعہ) برصغیر کے انتہائی مشرق میں (آج یہ بہار کے ضلع بھاگل پور میں) واقع ہے۔ مگر آثار قدیمہ نے اسے زمین کے نیچے سے کھود کر نکالا ہے۔ آس پاس دور دور تک صرف جنگل ہی جنگل تھا اور آج بھی یہ جنگلوں کے بیچ میں ہے۔ ان جنگلوں میں سنتھال نامی قبائل آباد تھے جو دیگر اقوام سے دور رہتے۔ یہ جنگلی آدھے بہار اور آدھے بنگال پر قابض تھے اور آج بھی قابض ہیں۔ یہ دراوڑ نسل سے ہیں اس لیے آریہ نسل کے لوگ ان سے اچھوت (نیچی ذات جس کو چھونا بھی گناہ ہے) جیسا سلوک کرتے تھے۔ دونوں نسل ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں نے بھی کوشش کی کہ ان کے علاقے میں کوئی آریہ نہ آپائے۔ یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر استعمال کرتے تھے اور کھرے نشانہ باز تھے۔ اسی وجہ سے وکرم شیلہ وہار کے طلبا کو سختی سے ممانعت تھی کہ وہ وہار سے باہر نکلیں تو صرف حفاظتی امور پر معمور سپاہیوں کے ساتھ۔

یہ جامعہ پہلے سناتن دھرمی ہندوؤں کے قبضہ میں تھا مگر بعد میں یہاں بدھ مت کے پیروکار چھا گئے۔ دیودت بھی بدھ مت کا پیروکار تھا۔ اس کے آنے سے پہلے یہاں چینی طرز پر تعلیم دی جاتی تھی۔ یعنی سوتے جاگتے، ہر لمحہ ہر گھڑی تعلیم حاصل کرتے رہو۔ تب کتابیں نام نہ تھیں اور بھوج پتر (ایک خاص قسم کے پتے پر لکھی تحریریں) پڑھائی جاتی تھیں اور ان کو انتہائی قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ ان کی حفاظت وہاں کے پہریدار اپنی جان سے بڑھ کر کرتے تھے اور اسے معقول رقم جمع کرانے پر ہی طالب علموں کو دیا جاتا تھا، جب پانڈولیپیا (مسودہ) طالب علم واپس کرتا تھا تب ان کی جمع شدہ رقم واپس کی جاتی تھی۔ لیکن دیودت نے یہ قانون ختم کر دیا اور ہر طالب علم کو حق دے دیا کہ مطلوبہ پانڈولیپی بغیر کسی رقم کے ہر طالب علم حاصل کرسکتا ہے۔

اس دور میں طالب علم پر ایک اور پابندی تھی......

عورت سے دوری برقرار رکھنا نہایت ضروری تھا۔ یوں بھی اہل ہنود عورت کو ناپاکی کا پرتو قرار دیتے ہیں۔ وید اور پوران جیسی اہم کتابوں میں بھی اہل ہنود نے عورت کو برائی کی جڑ قرار دیا ہے۔ رامائین میں تو صاف الفاظ میں لکھا گیا ہے کہ "ڈھور ڈنگر اور ناری... یہ ہیں پرتاڑنا کے ادھیکاری" یعنی جانور اور عورت صرف مار سے قابو میں رہ سکتے ہیں۔

جب ہندو مذہب کی اہم کتابوں میں عورت کو ایسا سمجھا جائے گا تو پھر عام زندگی میں عورت کو توقیر کہاں سے ملے گی؟

اس وہار میں اب تک بہت سے قوانین سناتن دھرم والوں کے رائج تھے۔ ان میں سے ایک قانون یہ بھی تھا کہ عورت کا وہار کے نزدیک آنا منع ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہاں وہاں تھوڑی تھوڑی دوری پر طلب علم کے متلاشی بیٹھ کر گیان دھیان کرتے تھے۔ عام طلبا تو وہار کے

اندر سمادھی لگانے تھے مگر دیوورت دیبار سے باہر جنگل میں ایک مخصوص جگہ پر سمادھی لگاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ جنگل کے اسی خاموش حصے میں سمادھی لگانے بیٹھا تھا۔ وہ حصہ انتہائی دشوار گزار علاقے میں تھا۔ ایک بڑا سا پیپل کا پیڑ تھا جس کے گرد قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ اس نے جھاڑیوں کو صاف کر کے دائرہ نما جگہ بنائی تھی اور وہ اسی دائرے میں بیٹھا کرتا تھا تاکہ کوئی مخل نہ ہو۔

اس وقت بھی وہ سکون سے بیٹھا تھا۔ پتوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔

یہ ایک گرم دوپہر تھی۔ گرمی سے بے حال جانور تک ٹھنڈی چھاؤں میں دبکے اونگھ رہے ہوں گے مگر اس علم کے متلاشی کو گرمی کا احساس تک نہ تھا۔ وہ دھیان میں مست تھا، ہر طرف سے بے پروا تھا۔ تبھی سامنے کی جھاڑیاں ہلیں اور ایک دوشیزہ نے سر اندر ڈال کر اسے دیکھا۔ دیوورت کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ آئی۔ وہ صورت شکل سے دراوڑ لگتی تھی جب کہ دیوورت آریہ تھا۔ خوب گورا چٹا اور پورے قد کاٹھ کا۔ جب کہ دوشیزہ کی رنگت سانولی تھی۔ عام دراوڑ جیسی...... کالی رنگت کی وجہ سے آریہ انہیں حقیر سمجھتے تھے۔ ان پر پابندی تھی کہ جب وہ مرکزی شاہراہ پر چلیں تو اپنے پیچھے جھاڑیاں باندھ کر چلیں تاکہ ان کے قدموں کے نشان مٹتے جائیں۔ جس قوم سے آریہ اس قدر نفرت کرتے تھے اس قوم کی دوشیزہ کا دیوورت کے گیان دھیان میں مخل ہونا عجیب بات تھی مگر وہ ذرا بھی گھبرائی نہیں۔ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ وہ عمر کے جس حصے میں تھی اس میں شوخی کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی ہے۔ اس نے بھی شوخی دکھائی۔ منہ سے بندر کے خرخرانے کی آواز نکالی۔ دیوورت چونک گیا اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھولتے ہی اس کی نظر دوشیزہ پر پڑی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''ڈر گئے؟'' دوشیزہ نے سوال کیا۔

''تم...... تم کون ہو؟'' اس کی آواز میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے ثابت ہوتا کہ وہ غصے میں ہے۔

''میں ایک لڑکی ہوں۔'' اس نے معصومیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''یہاں آئی کیسے......''

''ان پیڑوں سے چل کر۔'' اس نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہیں پتا نہیں ہے کہ سنیاسی کو ادھر آنا منع ہے۔''

''ہم بن دیوی کے پجاری ہیں...... سارا بن (جنگل) ہمارا ہے پھر تمہارے علاقے میں مردوں کو منع ہے میں تو عورت ہوں...... مجھ سے کیا ڈر ہے؟''

''ڈرنے کی بات نہیں ہے...... اگر تمہاری بستی کے کسی نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ایک جنگ شروع ہو جائے گی۔''

''گاؤں والوں کو ہماری پرواہ کب ہے۔''

''اچھا......'' دیوورت کو بھی اس سے باتیں کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔

''اور کیا۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔ اس کا انگ انگ بول رہا تھا۔ باتیں کرتے وقت وہ ہاتھ نچاتی اور چہرے پر خاص اثر لے آتی۔ اس کا یہ انداز دیوورت کو بھی پسند آ رہا تھا۔

''اب تم جاؤ...... مجھے تپسیا کرنا ہے۔''

''اچھا میں چلتی ہوں۔'' وہ ان جھاڑیوں سے باہر نکل گئی اور ادھر دیوورت پھر سے آنکھیں بند کر کے دھیان میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مہینا گزر گیا۔ وہ روزانہ آتی اور دیوورت کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرتی اور چلی جاتی۔ دیوورت کو بھی یہ بات بری نہیں لگ رہی تھی۔ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ ناوانستگی ایک بڑی خطا کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا جس کا نتیجہ ایک بڑی تباہی ہے۔

اس دن جب وہ آئی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کافی دیر تک روتی رہی تھی۔ چہرے پر غم و الم کی پرچھائیوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ کچھ بجھی بجھی سی نظر آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے...... آج تم کچھ زیادہ ہی غمزدہ نظر آ رہی ہو؟''

''میرے اپنے ہی میری جان کے دشمن بن گئے ہیں...... تم لوگوں کے دھرم میں جیسا ہوتا ہے ویسا ہی میرے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔''

''ایسا کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''میرا پتی ترک فوج (مسلمان فوج) میں چلا گیا تھا۔ میرے خاندان کے اور بھی لوگ ترک بن گئے ہیں۔ ترک فوج میں رہتے ہوئے وہ کسی لڑائی میں مارا گیا۔

اب سب کہتے ہیں کہ مجھے بھی مرنا ہوگا۔ستی ہونا ہوگا۔اس کی لاش لائی جارہی ہے۔اس لاش کے ساتھ مجھے ستی کیا جائے گا زندہ جلا دیا جائے گا۔" دوشیزہ کی آواز میں کرب تھا۔

اس کے منطق نے یا پھر کسی اور جذبے نے دیودت کو کچھ زیادہ ہی متاثر کردیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی کڑا رخ اختیار نہ کرسکا۔

"تمہارا بھگوان مجھ پر رحم کرے گا.....تین دن بعد مجھے ستی کیا جائے گا۔وہ مجھے بچا سکتا ہے؟" اس نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بھگوان سے پرارتھنا کرو۔وہ ضرور سنے گا۔"

"تم سکھا دو نا..... مجھے پرارتھنا کرنا نہیں آتا ہے۔"

"بس تم اسے دل ہی دل میں پکارتی رہو۔اس سے کہتی رہو۔وہ دل کی بات بھی سن لیتا ہے......"

"میں ایسا کر کے دیکھوں گی.....اب میں جاؤں؟" اس نے ایسے پوچھا جیسے دیودت نے اسے روک رکھا ہو۔اس کے ہونٹوں پر پھر سے شریری مسکراہٹ آگئی تھی۔

"ہاں ہاں جاؤ۔" دیودت نے جلدی سے کہا۔مگر اسے ایسا لگا جیسے یہ الفاظ اس نے نہیں کسی اور نے ادا کیے ہوں کیونکہ اس کا دل نہیں کررہا تھا کہ ابھی الوداع کہے۔وہ ابھی اس سے اور باتیں کرنا چاہتا تھا۔اب تک وہ عورتوں سے دور بہت دور رہا کرتا تھا مگر جانے کس جذبے کے تحت وہ ایک عورت سے اس قدر اپنایت سے باتیں کرنے لگا تھا۔شاید یہ اس کے دبے کچلے جذبے تھے جو امنڈ آئے تھے۔دوشیزہ کے جانے کے بعد بھی وہ اسی کے تصور میں کھویا رہا۔اسے ذرا بھی احساس نہ تھا کہ وہ ایک بڑی خطا کا مرتکب ہوچکا ہے۔اسے عورتوں سے دور رہنا چاہیے تھا مگر وہ عورت سے باتیں کرنے کی غلطی کرچکا تھا۔اس نے ایک عرصے تک عورت کو دیکھا تک نہیں تھا۔مہاتما بدھ نے نروان پالینے کی چاہ میں بیوی کو گھربار کو چھوڑ دیا تھا۔وہ بھی نروان کی چاہ میں عورت سے دور رہا یہی اس کا عہد تھا جو اب کرچی کرچی ہوچکا تھا۔

محل تعمیر کرنے میں برسوں لگتے ہیں مگر وہ محل ایک پل میں ڈھیر ہوجاتا ہے۔اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔اس نے کردار بنانے کے لیے برسوں ریاضت کی تھی مگر اس ایک تیر نظر نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔اسے اپنا اندر خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔وہ اس دوشیزہ کے لیے دل میں نرم گوشہ محسوس کررہا تھا۔اسے دکھ محسوس ہورہا تھا کہ یہ نوخیز دوشیزہ ماردی جائے گی۔بدھ مت کے مطابق جیو ہتھیا یعنی جاندار کا قتل سب سے بڑا پاپ ہے۔وہ سوچنے لگا کہ اس پاپ کو کیسے روکے۔اس کا دل پھر سے گیان دھیان میں نہ لگا اور وہ وقت سے پہلے ویہار جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے قدم ویہار کی جانب اٹھ رہے تھے۔وہ تھکے تھکے قدموں سے وکرم شیلا کی جانب بڑھ رہا تھا۔اس وقت ویہار کے کل چھ دروازے تھے۔مغربی۔مشرقی۔مرکزی اول۔مرکزی دوم۔شمالی اور جنوبی دروازے اور ان دروازوں سے کسی ایک استاد کے احاطہ میں جایا جاسکتا تھا۔ان اساتذہ کے عہدے کا نام تھا دوار پالا۔یہ چھ دوار پال ویہار کے بڑے معلم تھے۔انہیں مہا پستا کہا جاتا تھا۔ان کے بعد ایک سو آٹھ معلموں کا نام آتا تھا جو مہا گیانی یا مہا پستا سے کم علم رکھتے تھے اور ان کو پستا کہا جاتا تھا۔ان کے بعد اچاریہ (معلم) تھے جن کی تعداد ایک سو ساٹھ تھی۔اور طالب علموں کی تعداد ایک ہزار ہوتی تھی۔دیودت کا شمار بھی دوار پالا میں ہوتا تھا۔اس کا حصہ سب سے الگ تھا۔وہ اپنے حصے کی طرف جارہا تھا۔مگر اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔کس طرح اس دوشیزہ کی زندگی بچائی جائے وہ اسی بات میں الجھا ہوا تھا۔اسے یہ خوف بھی نہ تھا کہ اگر کسی کو معلوم ہوگیا کہ وہ ایک دوشیزہ سے ملا ہے تو قیامت آجائے گی۔پورے ویہار میں یہ بات گونجی تو لوگ انگلیاں اٹھانے لگیں گے۔

وہ جس عہدے پر تھا اس عہدے کے کئی دعوے دار تھے۔وہ اس بات کو لے اڑتے اور اس کے لیے پریشانیاں کھڑی ہوجاتیں مگر اسے ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔اسے یہ تک احساس نہیں تھا کہ جھاڑیوں سے کسی نے دوشیزہ کو کسی نے دیکھ لیا ہے۔اور وہ کوئی اور نہیں ادما تھا۔ادما بھی اچاریہ تھا اور دیودت کے عہدے کا دعویدار تھا۔دونوں میں پہلے سے ہی رسہ کشی چل رہی تھی۔اگر دیودت کی نظر اس پر پڑجاتی تو شاید وہ ہوشیار ہوجاتا مگر اسے تو خبر بھی نہ تھی کہ اس کے ایک دشمن نے اسے ایک دوشیزہ سے ملتے دیکھ لیا ہے جو بدھ بھکشو کے لیے نہایت سنگین خطا ہے۔وہ ہر جانب سے بے پروا اپنے کمرے کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔

وہ اداس دل کے ساتھ واپس آرہا تھا۔حالانکہ یہ کام جو اس نے کیا تھا اس کے اصول کے خلاف تھا۔اس کے مذہب میں یہ کام پاپ تھا مگر اس ایک نظر نے سب کچھ بھلا

دیا تھا۔ اسے بس اتنا یاد رہ گیا تھا کہ وہ انسان ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل ہے اور دل میں ارمان ہے۔ اور ارمان کا تقاضہ ہے کہ وہ اس حسینہ کی زندگی بچا لے۔ اسے اپنا لے۔

اپنے کمرے میں آکر وہ لیٹ گیا مگر اس کا دل نہیں لگا اور وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ اس کے قدم باہر کی جانب اٹھنے لگے۔ وہ مرکزی دروازے سے باہر نکلا۔ اب اس کا رخ بستی کی طرف تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بستی میں جائے گا۔ برسوں سے دیہار کا کوئی شخص وہاں نہیں گیا وہ اس پابندی کو توڑے گا۔ یہی سوچ کر وہ تیز تیز قدموں سے بستی کی طرف چل پڑا۔

اس وقت اسے مطلق احساس نہیں تھا کہ بستی میں پہریداری بھی ہوتی ہے اور پہرے دار چوکس ہیں۔ ان سب کے پاس زہر میں بجھے تیر ہیں اور وہ اسے نشانے پر لیے ہوئے ہیں۔ وہ ہر جانب سے بے پروا آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ پگڈنڈی کے کنارے کھڑے ایک جھرے سے برگد کے پیڑ سے رحب دھب کی آواز کے ساتھ کئی سنتھال کودے اور اسے اپنے برچھوں کی زد پر لے لیا اور خاموش کھڑے ہو گئے۔ وہ بھی تھم کر کھڑا ہو گیا۔ ان سب نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

''تم اچاریہ ہو نا؟'' ان میں سے ایک نے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' دیودت نے جواب دیا۔

''ادھر کیوں آئے ہو...... یہ علاقہ ہمارا ہے۔''

''یہ پوری دھرتی بھگوان کی ہے۔''

''یہ جنگل بن دیوی کا ہے اور ہم بن دیوی کے پجاری ہیں۔ تم لوگوں نے ہمارے بن' ہمارے علاقے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کے لیے تم لوگوں نے ہمارا کتنا خون بہایا ہے یہ ہم بھولے نہیں ہیں۔''

''جو ہوا وہ ہو چکا ہے...... اب اسے بھول کر ہم سب کو ایک ہو جانا چاہیے۔''

''نہیں ہم اپنے بن کر جنگلوں میں کسی اور کا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔''

''ہم تو پھر بھی تمہارے دیس واسی ہیں مگر تم لوگ تو ترکوں کا ساتھ دے رہے ہو...... اصل میں وہ لوگ ادھری ہیں' ہم نہیں۔''

''ترک تم لوگوں کے دشمن ہیں اور دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ ہم اسی وجہ سے ترک فوج کا ساتھ دے رہے ہیں۔ بختیار خلجی تم لوگوں سے ہمارا بدلہ لے گا۔''

''ہم لوگ لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتے۔ ہم دیا دان کرتے ہیں۔ لڑنے کا کام چھتریوں کا ہے۔ راجپوتوں کا ہے۔''

''کچھ بھی ہو۔ تم لوگوں کو یہ جگہ تو انہی راجپوتوں نے دی ہے۔''

''پرانی باتوں کو بھول جاؤ اور اتحاد بنانے کی کوشش کرو۔''

''یہ سب ہمیں مت سکھاؤ اور سیدھے سیدھے لوٹ جاؤ۔'' اس نے اس بار برچھے کو اس کے سینے پر رکھ دیا تھا۔

دیودت نے ضد کرنا مناسب نہ سمجھا اور مرے مرے قدموں سے لوٹ آیا۔ وہ دوبارہ سے اسی جگہ جا رہا تھا جہاں بیٹھ کر وہ دھیان کیا کرتا تھا۔ اس مسئلہ سے نمٹنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ خود کو دھیان میں ڈبو دے۔ سب کچھ بھولنے کی کوشش کرے۔

ابھی اس نے جھاڑیوں کے پیچھے قدم رکھا ہی تھا کہ وہ دوشیزہ پھر آ گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ اس کا تعاقب کرتی رہی ہے۔ اس نے مسکراہٹ کے تیر چلاتے ہوئے کہا ''بستی میں کیا کرنے جا رہے تھے؟''

''تم سے ملنے۔'' دیودت نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''کیا...... مجھ سے ملنے؟ کہیں یہ بات تم نے شیو سورین کو بتائی تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''یہ اچھا کیا...... وہ بہت برا آدمی ہے...... اس نے مجھے رشتہ بنانے کو کہا...... میرے انکار پر اس نے بستی والوں کو مشورہ دیا کہ مجھے ستی کر دینا چاہیے...... وہ بہت بڑا پاپی ہے۔ اس سے دور ہی رہنا۔''

''تم چاہتی کیا ہو؟''

''تم مجھ سے شادی کر لو۔''

''تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اچاریہ ہمیشہ کنوارے رہتے ہیں؟''

''تم اچاریہ سے انسان بن جاؤ...... انسان تو شادی کرتے ہیں نا؟'' اس نے ہنس کر کہا ''ہم کہیں اور چل کر رہیں گے۔''

''مگر میں تو صرف پڑھا سکتا ہوں۔ دیا دان کے علاوہ مجھے کچھ آتا بھی نہیں ہے؟''

''جب پڑتی ہے تو سب آ جاتا ہے...... تم حوصلہ تو دکھاؤ...... میں عورت ہو کر اتنا بڑا قدم اٹھانے پر تیار

ہوں..... اپنے قبیلے سے بغاوت کر رہی ہوں اور تم مجھے سہارا بھی دینے پر تیار نہیں ہو؟''

''میں نے کب کہا کہ میں سہارا نہیں دوں گا تم جو بھی مدد مانگو گی نہیں دوں گا۔''

''بات سہارا دینے کی نہیں..... انسان ہونے کا ثبوت دینے کی ہے۔''

''جب تم کہتی ہو تو آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ میں آج سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں..... میں اچاریہ ہوں اور تم ستھال یہ بھی بھلا دینا ہے۔'' کہتے ہوئے دیودت نے بازو پھیلا دیے اور وہ اس میں سما گئی۔ سورج کا سفر اختتام پر تھا اور خنک ہوا چلنے لگی تھی۔ اس خوشگوار موسم میں وہ دونوں دنیا و مافیہا کو بھول چکے تھے۔ ہندو مت کے مطابق مینکا نے رشی کی تپسیا توڑنے کے لیے خود کو پیش کیا تھا۔ اپنے جسمانی حسن و جمال میں رشی کو الجھا کر اس کی زندگی بھر کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہی کہانی یہاں دہرائی جا رہی تھی۔ دیودت کی تپسیا توڑ دی گئی تھی۔

کافی وقت گزر گیا اور جب انہیں ہوش آیا تو دیودت نے پوچھا ''اب تک تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔''

''اروما'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور اپنے بالوں کو سنبھالنے لگی تھی۔

وہ دونوں ایک ساتھ جھاڑیوں کی باڑ کے پیچھے سے برآمد ہوئے تھے۔ اروما نے کہا ''میں اب کہاں جاؤں؟ تم ساتھ رکھنے کا وعدہ کرتے ہو؟''

''ہاں میں ساتھ رکھوں گا مگر آج نہیں..... آج تم بستی والوں کے ساتھ رات بسر کرو کل بات ہوگی۔'' کہہ کر وہ وہار کی جانب بڑھنے لگا۔

اروما واپس اپنی بستی کی طرف جا رہی تھی۔ ابھی اس نے کچھ ہی قدم بڑھائے تھے کہ یکایک اس کے سامنے اروا آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کینہ بھرے لہجے میں کہا:

''تم ایک اچھوت ہو کر اچاریہ کے پاس رہی۔ تم دونوں کی ایک ایک حرکت میں نے دیکھی ہے۔ میں یہ سب تمہارے سردار شیو سورین کو بتا دوں گا۔''

شیو کا نام سنتے ہی اس کے چہرے پر خوف چھا گیا۔ اسے اپنی موت صاف نظر آنے لگی تھی۔ وہی جو کچھ دیر پہلے خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب سمجھ رہی تھی اب اسے موت کی چاپ سنائی دینے لگی تھی۔ وہ کچھ کہتی کہ اروا نے کہا ''ایک طریقہ ہے اگر تم پردھان اچاریہ کے سامنے یہ کہہ دو کہ دیودت نے تمہارے ساتھ وقت گزارا ہے تو میں

معاف کر دوں گا...... شیبو کو معلوم بھی نہیں ہو پائے گا کہ تم نے کسی اچاریہ کے ساتھ وقت گزارا ہے۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تو پھر اپنا انجام سوچ لو۔" یہ کہتا ہوا وہ اپنے راستے پر بڑھ گیا۔

ابھی وہ کچھ ہی دور گیا ہو گا کہ اس کی نظر گیروے کپڑوں میں ملبوس دیودت پر پڑی جو ایک پیڑ کے نیچے کھڑا ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا یا پھر وہ کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی الجھن کو سلجھا رہا تھا کہ ادما جا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیودت سے کہا "تم نے جو کھیل شروع کیا ہے یہ پورے وہار کی بدنامی کا باعث ہے... میں اس بارے میں لوگوں کو خبر دے رہا ہوں... تم اس قابل نہیں ہو کہ اس وہار میں رہ پاؤ۔"

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں تو ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔"

"یہاں سے جا کر کسی دوسرے وہار میں رہو گے اور وہاں بھی یہی کھیل شروع کر دو گے...... نہیں تمہیں اچاریہ کی پدوی چھوڑنی ہو گی...... سب کے سامنے معافی مانگنا ہو گی کہ تم نے دھرم کے خلاف کام کیا ہے۔" وہ کسی شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ اس کی آواز دوسروں کو متوجہ کر سکتی تھی۔ وہ اس سے پہلے کہ ابھی دیودت اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور ادما کے جسم میں ترازو ہو گیا۔ وہ چیخ مار کر گرا۔ اسے تڑپتے دیکھ دیودت گھبرا گیا اور اس نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ بھی رہا تھا کہ تیر چلایا کس نے ہے۔ تبھی اسے کمان تھامے دور کھڑی اروما نظر آئی۔ اس نے دیودت کو اشارہ کیا کہ وہ بھاگ جائے۔ دیودت کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ تبھی اسے دور سے ڈھول تاشے کی آواز سنائی دی۔ آواز بتا رہی تھی کہ یہ جنگی ترانہ ہے۔ سنتھال حملہ کرنے والے ہیں۔ وہ حملے سے قبل اسی انداز میں ڈھول تاشے بجاتے ہیں۔

"یہ...... یہ کیا ہے؟" دیودت نے گھبرا کر کہا۔

"وقت کم ہے یہاں سے نکل چلو کیونکہ شیبو کو ادما نے بتا دیا تھا کہ میں تم سے ملتی ہوں پھر اس نے مجھے بھی بے وقوف بنانے کی کوشش کی تمہارے خلاف پردھان اچاریہ کے پاس جانے کو کہا۔ میں تو اس کی چال میں نہ آئی مگر شیبو آ گیا اور اس نے وہار پر حملے کے لیے آس پاس کے سنتھالوں کو جمع ہونے کا حکم دے دیا۔ ادما کا قتل اس آگ کو بھڑکائے گا۔ وہار کی جانب سے بھی کارروائی ہو گی اور ایک بڑی جنگ کا خطرہ ہے۔"

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ اودادت کچھ سوچ بھی نہ سکا اور اروما اسے کھینچتی ہوئی پہاڑ کی جانب لے چلی۔

☆☆☆

ادما کی لاش مل گئی تھی۔ وہار والوں نے اس کے جسم سے سنتھالوں کا تیر نکال لیا تھا۔ یہ خبر آگے۔ راجا کے دربار میں بھیج دی گئی تھی۔ وہار والوں کا الزام تھا کہ سنتھالوں نے حملہ کر کے اچاریہ ادما کو مار دیا ہے اور اچاریہ دیودت کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ دیودت جیسے مہا گیانی کو ان کی قید سے چھڑایا جائے۔

اِدھر شیبو سورین نے بختیار خلجی کی سپاہ میں شامل تمام سنتھالوں کو پیغام دیا کہ وہ لوٹ آئیں اور اپنی عزت کا انتقام لینے کے لیے اس "یُدھ" میں ان کا ساتھ دیں کیونکہ وہار والوں نے ان کی ایک عورت کو اغوا کر لیا ہے۔ اروما نامی وہ عورت ستی ہونے والی تھی۔ اس کے شوہر کی لاش لائی جاتی کہ اس سے پہلے وہار والوں نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔

اختیار خلجی جو راجا کی سرکوبی کے لیے پوری طرح تیار تھا اسے بھی یہ خبر مل گئی۔ اس نے سنتھال سپاہیوں کو مدد دینے کی یقین دہانی کر دی اور فوج کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا۔ اس وقت بختیار خلجی کا پڑاؤ اس جگہ تھا جو آج بختیار پور کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ نالندہ وہار (اب بہار شریف) اور عظیم آباد (اب پٹنہ) کے درمیان اس کی فوج جمع تھی۔ حکم ملتے ہی فوج نے بھاگل پور کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ ترک فوج کا دوسرا بڑا حصہ جو اسنسول کے قریب تھا اس نے وہاں سے وہار کی جانب کوچ کیا (اب اس علاقے کو کوچ بہار کہتے ہیں) اور جانب سے بختیار خلجی کی فوج وکرم شیلہ وہار کی جانب بڑھی اور تیسری طرف سے سنتھالوں نے مورچہ سنبھال لیا۔ راجا کی فوج ہر طرف سے گھر گئی۔ ساون کے موسلا دھار بارش میں ایک ایسی جنگ ہوئی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ شیبو سورین کی دستے نے جنوبی سمت سے حملہ کیا اور بختیار خلجی کی فوج نے مغربی اور مشرقی سمت سے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وکرم شیلہ وہار کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ مگر اس جنگ کے مرکزی کردار جن کی ایک چھوٹی سی خطا 'پیار' کرنے کی خطا نے اس جنگ کو جنم دیا تھا وہ کہاں گئے اس کا پتا پھر نہ چل سکا۔ تاریخ بالکل خاموش ہے۔

خطائے ملازمین

نعمان احمد اعوان

چھوٹی چھوٹی غلطیاں بڑے بڑے حادثوں کو جنم دیتی ہیں۔ اک معمولی سی خطا، ذرا سی بھول کیا رنگ کھلاتی ہے۔ ایسی ہی "چوک" کا تذکرہ جو سیکڑوں اموات کا سبب بنیں۔

ہوشیار بندوں سے بھی چوک سرزد ہو جاتی ہے

بعض اوقات معمولی سی چیز جسے ہم توجہ بھی نہیں دیتے ہیں وہ کسی عظیم سانحے کا سبب بن جاتی ہے۔ کہتے ہیں جب ارض یمن میں آبپاشی کے لیے قوم سبا ڈیم تیار کر رہی تھی۔ یہاں پہاڑ سیڑھیوں کی طرح ہیں اور صرف ان پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے ورنہ باقی ملک یمن صحرا ہے جہاں بارش نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اس لیے اس خطے کی قدیم قوم نے مرحلہ وار ان پہاڑوں پر رکاوٹیں تعمیر کر کے ان کو بند کی صورت دینا شروع کر دی۔ کئی سو سال تک ان

بندوں کی تعمیر جاری رہی۔ حتیٰ کہ وہ بند بناتے ہوئے سب سے اوپر والے حصے تک جا پہنچے جہاں سے مزید اوپر جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ جب ان پہاڑوں پر بارش ہوتی تو سب سے پہلے سب سے اوپر والا بند بھرتا تھا پھر اس کے دروازے کھول دیے جاتے اور پانی اس سے نیچے والے بند میں آتا تھا اور یونہی ترتیب وار پانی آخری بند تک چلا آتا تھا جو یقیناً سب سے بڑا تھا۔

اس کے نیچے پھر کھیتوں اور باغات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو سینکڑوں میل تک دراز تھا۔ اس بند نے اس خطے کی تقدیر بدل دی جو علاقہ پہلے بنجر اور صحرا تھا اب وہ سبزے اور درختوں سے بھر گیا۔ باغات میں قسم قسم کے میوے لگتے تھے اور ان کے کھیتوں میں دنیا جہان کی چیزیں اگتی تھیں۔ ان نعمتوں کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا لیکن جب قوم صبا نے ان نعمتوں کا جواب کفر سے دیا تو اللہ کا عذاب آیا۔ یہ بند جسے مارب بند کا نام دیا گیا تھا ٹوٹ گیا اور سیلاب بالآخر ان کی بستیوں اور کھیتوں کو بہا لے گیا پھر یہ علاقہ بنجر اور ویران ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق جب مارب بند کا آخری حصہ تیار ہو رہا تھا تو سب سے اوپر لگائے جانے والے پتھر کے لیے مسالا ختم ہو گیا تھا تو معمار نے اسے یونہی گیلی مٹی سے جوڑ دیا اور سوچا کہ اس سے کیا فرق پڑے گا۔

یہ پتھر کئی ہزار سال اپنی جگہ برقرار رہا لیکن پھر عذاب کا آغاز اسی پتھر کے نکل جانے سے ہوا۔ ایک پتھر ٹوٹا تو پانی کے دباؤ نے باقی پتھروں کو بھی سرکا دیا۔ سب سے اوپر والے بند کی دیوار گری تو پانی کے آنے والے بے پناہ دباؤ نے ایک ایک کر کے نیچے کے بندوں کو توڑنا شروع کر دیا اور اس کے بعد پورا بند مٹی کے گھروندے کی طرح بکھر گیا۔ ہر بند ٹوٹنے کے بعد پانی کی چادر زیادہ بڑی اور خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ ایک معمولی پتھر کے سرکنے سے میلوں کے رقبے پر پھیلا ہوا بند تباہ ہو گیا۔ یمن کا دارالحکومت اس بند کے عین نیچے آباد تھا۔ پانی قوم صبا پر قہر بن کر ٹوٹا اور آن واحد میں پوری بستی غرقاب ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد بھی پانی کی یہ لہر اس پوری تہذیب کو نا کرتی اس کی بستیوں اور کھیتوں و باغات کو اجاڑتی ہوئی چلی گئی۔ چند سال بعد اس علاقے میں جو درخت اور پودے اگے وہ سخت خاردار اور کڑوے ذائقے والے تھے جنہیں جانور بھی منہ لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔

جدید دور میں ایسے واقعات بھی پیش آئے جب ایک معمولی اسکرو نکل جانے سے یا نہ لگنے کی وجہ سے سینکڑوں مسافروں کو لے کر پرواز کرنے والا طیارہ تباہ ہو گیا۔ روس کی پہلی ایٹمی آبدوز اپنے اولین سفر میں حادثے کا شکار ہوئی کیونکہ اس میں ری ایکٹر کا درجہ حرارت بڑھنے کا اشارہ دینے والا معمولی سا آلہ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ جب آبدوز کی تباہی کا خطرہ پیدا ہوا تو چھ کارکنوں نے ری ایکٹر میں گھس کر اسے پانی سے ٹھنڈا کیا۔ وہ آبدوز بچانے میں کامیاب رہے لیکن اپنی جان سے گزر گئے۔ ٹائی ٹینک کا واقعہ سب کے سامنے ہے جب صرف ایک نگران کے اپنی ڈیوٹی سے غفلت برتنے پر محفوظ ترین بحری جہاز برفانی تودے سے ٹکرا کر ڈوب گیا اور سینکڑوں لوگ اس حادثے میں ہلاک ہوئے۔ میں زیر نظر ایسا ہی ایک واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں جس میں ایک معمولی سی انسانی غلطی ڈیڑھ سو سے زیادہ انسانوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔

☆☆☆

بیسویں صدی کے آغاز میں ہی سمندر سے تیل نکالنے کی کوشش شروع کر دی گئی۔ صدی کے دوسرے نصف میں کئی بحری آئل پلیٹ فارم قائم ہوئے جس سے زیر سمندر تیل نکال کر آئل ٹینکروں میں بھر کر صفائی کے لیے ریفائنریوں میں بھیجا جاتا تھا۔ انہیں آئل رگ پلیٹ فارم بھی کہتے ہیں۔ یہ دیوہیکل پلیٹ فارم سمندر پر بہت بڑے ستونوں پر قائم ہوتے ہیں۔ ان کی اونچائی سطح سمندر سے ڈیڑھ سو سے پانچ سو فٹ تک بلند ہوتے ہیں اور ان کا رقبہ کئی ایکڑز پر محیط ہوتا ہے۔ ہزاروں ٹن وزنی فولاد سے بنے یہ آئل رگ پلیٹ فارم چھوٹے موٹے شہر کی طرح ہوتے ہیں کیونکہ ان میں کارکنوں کی رہائش اور تفریح کا بھی مکمل انتظام ہوتا ہے۔ ان کے بنانے میں مضبوطی کا خیال رکھا جاتا ہے کیونکہ یہ صرف کئی سو فٹ گہرے سمندر کے اوپر ہوتے ہیں بلکہ اکثر انہیں سمندری طوفانوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ پھر آئل اور گیس کی موجودگی کی وجہ سے یہاں خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ خاص طور سے آگ لگنے کا۔ اس صورت حال میں خاص حفاظتی انتظامات کیے جاتے ہیں تاکہ کارکن محفوظ رہیں۔ اس کے ساتھ پلیٹ فارم اور اس کی تنصیبات کی مرمت کا بھی مکمل خیال رکھا جاتا ہے اور خراب ہونے والے حصوں یا چیزوں کو وقت سے پہلے تبدیل کیا جاتا ہے۔

یورپ کے شمالی بحر اوقیانوس میں خام تیل و گیس کے کئی بڑے ذخائر دریافت ہو چکے تھے لیکن ابھی ٹیکنالوجی اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ اس طوفانی سمندر میں محفوظ آئل

رگ پلیٹ فارم قائم کیے جاسکیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس شعبے میں بہت تیزی سے ترقی ہوئی تھی۔ شمالی اوقیانوس میں یکے بعد دیگرے خام تیل و گیس کے بڑے بڑے ذخائر دریافت ہونے لگے اور 1960ء کے عشرے میں یہاں سے خام تیل و گیس نکلنے لگی تھی۔ یورپ کی چار آئل کمپنیوں نے ایک جوائنٹ وینچر کمپنی ''آئیکال'' قائم کی۔ کمپنی نے شمالی اوقیانوس میں سمندر میں تیل کے ذخائر کی تلاش اور ان سے تیل نکالنے کا لائسنس حاصل کیا کیونکہ ان کی تلاش کا محور برطانیہ کے پاس کا سمندر تھا اس لیے انہیں برٹش حکومت سے لائسنس لینا پڑا تھا۔ لائسنس کے تحت نکالا جانے والا خام تیل اور گیس برطانوی حکومت کی ملکیت شمار ہوتی اور وہی اس کی قیمت اور ممکنہ استعمال طے کرتی۔ مگر ساتھ ہی برطانوی حکومت نکالا جانے والا تمام خام تیل اور گیس خریدنے کی پابند بھی تھی۔

1972ء میں چند مہینوں کی تلاش کے بعد ہی آئیکال کو کامیابی ملی اور شمالی اوقیانوس میں ایک جگہ پر تیل و گیس کا بہت بڑا ذخیرہ دریافت ہوا۔ یہاں سمندر کی ساخت اور گہرائی ایسی تھی کہ پلیٹ فارم قائم کرنا بھی مسئلہ نہیں تھا۔ سمندر صرف ڈیڑھ سو فٹ گہرا تھا اور ''شیل'' صرف دو ہزار کی گہرائی میں تھا۔ اگلے سال پائپر الفا پلیٹ فارم کی تعمیر کے لیے کام شروع ہو گیا۔ 1974ء میں اس کا پہلا ڈیک تیار ہوا۔ تعمیر کا ٹھیکا یورپ کی مشہور صنعتی کنسٹرکشن کمپنی میک ڈرمٹ انجینئرنگ کو دیا گیا تھا، اس کے علاوہ بھی چند اور کاموں کے ٹھیکے دوسری کمپنیوں کو دیے گئے مگر مین کنٹریکٹر میک ڈرمٹ ہی کے نام پر تھا۔ یہ اتنا بڑا پلیٹ فارم تھا کہ اس کا پہلا ڈیک ہی سمندر سے سو فٹ اوپر تھا۔ اس کا آخری ڈیک تین سو ستر فٹ بلند تھا۔ کل چار ڈیک تھے اور حفاظتی نقطہ نظر سے سب کو الگ الگ رکھا گیا تھا کہ اگر کسی ایک ڈیک پر حادثہ پیش آئے تو باقی اس سے متاثر نہ ہوں۔ مخصوص زبان میں ان ڈیکس کو ''ماڈیول'' کہا جاتا ہے۔

پلیٹ فارم کی سمندر سے کل اونچائی چار سو چوہتر فٹ یا ایک سو چوالیس میٹرز تھی۔ اس پر دو بڑی کرینیں نصب تھیں جو سو ٹن تک وزن اٹھا سکتی تھیں۔ اس پر بیک وقت چار بڑے ہیلی کاپٹر اترنے کی گنجائش تھی۔ برطانیہ کے انتہائی شمالی جزیرے آرکنے کے شمال مشرق میں ایک سو اٹھائیس میل کی دوری پر واقع پائپر آئل رگ سے ایک چھتیس سینٹی میٹر کی فولادی پائپ لائن تعمیر کی گئی۔ جو ایک دن میں تین لاکھ بیرل آئل آرکنے پر موجود آئل ٹرمنل تک پہنچاتی۔ یہاں یہ آئل ریفائنریوں میں صاف ہوتا اور آگے صاف شدہ تیل آئل ٹینکرز اور پائپ لائنوں کی مدد سے سپلائی کیا جاتا۔ پائپر اور اس کے ساتھ دو عدد دوسرے آئل رگ پلیٹ فارم جو کلے مور اور تارتان کہلاتے تھے۔ ان سے تیل و گیس کی پیداوار کے آغاز کے ساتھ ہی برطانیہ نہ صرف ان چیزوں میں خود کفیل ہو گیا بلکہ یہ یورپ کے دوسرے ملکوں کو پیٹرولیم مصنوعات اور گیس برآمد کرنے لگا۔

شمالی اوقیانوس میں اس وقت دو درجن آئل رگ پلیٹ فارمز سے تیل کی کل پیداوار تیس لاکھ بیرل روزانہ تھی، اس کا مطلب ہے کہ صرف پائپر آئل رگ دس فیصد تیل پیدا کر رہی تھی۔ اس کی پائپ لائن سے کلے مور اور تارتان پلیٹ فارمز جڑے ہوئے تھے اور وہ بھی اپنا تیل اور گیس آرکنے آئل ٹرمنل تک بھیجتے تھے لیکن پہلے یہ تیل و گیس پائپر پلیٹ فارم تک آتا تھا اور اسے یہاں سے مزید آگے پمپ کیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے پائپر پر دو بہت طاقتور پمپ نصب کیے گئے تھے۔ جو ایک سو بیس کلومیٹرز کی دوری تک خام تیل اور گیس پمپ کرتے تھے۔ یہ پمپ ہی اصل میں اس پلیٹ فارم کی جان تھے اور ان کے چلنے سے ساری سرگرمیاں ہوتی تھیں یہ رک جاتے تو پلیٹ فارم پر تیل و گیس نکالنے اور ترسیل کا کام رک جاتا تھا اس لیے ان کی مرمت اور دیکھ بھال کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

1975ء میں یہاں سے خام تیل کی آزمائشی پیداوار شروع ہوئی اور صرف ایک سال کے عرصے میں پیداوار ڈھائی لاکھ بیرل روزانہ تک جا پہنچی۔ وزن کے لحاظ سے یہ چالیس ہزار ٹن روزانہ بنتا ہے۔ اس وقت برطانیہ کی کل ضرورت تقریباً اتنی ہی تھی۔ مزید ایک سال بعد پیداوار تین لاکھ بیرل روزانہ ہوگئی۔ اس تیل و گیس کے اس ذخیرے میں بڑی مقدار میں گیس بھی نکل رہی تھی مگر یہ گیس فضا میں چھوڑ دی جاتی تھی اور از خود آگ لگ کر ضائع ہو جاتی تھی۔ برطانیہ سرد ترین ملک ہے اور یہاں سال کے سات مہینے گرمائش کے بغیر رہنا مشکل ہے۔ گیس آسانی سے استعمال ہونے والا صاف ستھرا ایندھن ہے جو ماحول دوست بھی ہے اس لیے برطانوی حکومت نے پائپر، کلے مور اور تارتان سے گیس حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا اور کمپنی نے اس پر کام شروع کر دیا۔

یہ آسان کام نہیں تھا اور اس کا جائزہ لینے والے ماہرین نے اس پر کئی اعتراضات کیے تھے مگر حکومت اور کمپنی

نے ان اعتراضات کو نظر انداز کر دیا۔ 1978 میں کام شروع ہوا اور 1980 میں آکیال نے پائپر پلیٹ فارم پر ایک گیس ریکوری ماڈیول نصب کیا جس کے بعد خام تیل کی پیداوار گر کر ایک لاکھ چوبیس ہزار بیرل روزانہ رہ گئی کیونکہ یہ نہ نکالی جانے والی گیس کا دباؤ ہوتا ہے جو خام تیل کو ہزاروں فٹ زمین سے باہر نکلنے پر مجبور کرتا ہے۔ گیس نکالے جانے کے بعد دباؤ کم ہو گیا اور خام تیل کی پیداوار گھٹ گئی۔ مگر اس کے بدلے صرف پائپر آئل رگ سے روزانہ ایک ارب مکعب فٹ قدرتی گیس حاصل ہونے لگی جو صفائی میں کہیں آسان اور ماحول دوست ایندھن تھا۔ اس دوران میں کلے مور اور ٹارتان میں گیس ریکوری ماڈیول کی تنصیب کا کام جاری تھا۔ جب یہاں سے گیس آنا شروع ہوئی تو برطانیہ نے اپنے بجلی بنانے والے پلانٹس کو کوئلے سے گیس پر منتقل کر دیا۔

صرف اس ایک اقدام سے یورپ کی فضاؤں میں جانے والی نقصان دہ گیسوں میں دس فیصد کی آئی تھی کیونکہ برطانیہ کے یہ پلانٹ کل آلودگی کا دس فیصد پیدا کر رہے تھے۔ اس تنصیب کے بعد پائپر الفا پلیٹ فارم شمالی اوقیانوس میں بھاری ترین آئل پلیٹ فارمز میں سے ایک ہو گیا۔ اس کے ساتھ کے بھاری پلیٹ فارم میگنس اور برائے بی تھے۔ کم و بیش نصف درجن آئل پلیٹ فارم سے پیدا ہونے والا خام تیل آرکنے جزیرے پر پہنچایا جاتا تھا۔ اس وقت یہاں آئل ٹرمنل کم گنجائش کا تھا اس لیے خام تیل پائپ لائنوں کی مدد سے جنوبی انگلینڈ میں واقع تیل صاف کرنے کے کارخانوں تک بھیجا جاتا تھا۔ البتہ گیس کی صفائی کا پلانٹ جزیرے پر تھا اور یہاں سے صاف شدہ گیس نہ صرف پورے برطانیہ بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں کو بھی سپلائی کی جاتی تھی۔

1988 میں آرکنے آئی لینڈ میں بڑی گنجائش کا آئل ٹرمنل بنایا گیا اور اب شمالی اوقیانوس سے حاصل ہونے والا تمام خام تیل صفائی کے لیے یہیں لایا جانے لگا۔ ان میں کلے مور اور ٹارتان آئل رگ پلیٹ فارم سے ذیلی پائپ لائن پائپر آئل رگ پلیٹ فارم تک آتی تھی اور پھر یہاں سے سارا خام تیل ہی ایک بڑی لائن کی مدد سے آرکنے پہنچایا جاتا تھا۔ اس لائن کی تکمیل کے بعد برطانیہ مغربی یورپ کا واحد ملک بن گیا جو تیل اور گیس کی پیداوار میں خود کفیل تھا بلکہ وہ دوسرے یورپی ممالک کو برآمد بھی کر رہا تھا۔ صرف پائپر آئل فیلڈ کا تیل اور گیس اس کی ضرورت پورا کرنے کے لیے کافی تھا۔ کموڈٹی اسٹاک ایکسچینج میں یہ لندن کی برینٹ آئل کے نام سے خرید و فروخت کیا جاتا ہے اور دنیا بھر میں خام تیل کی قیمت طے کرنے میں نیویارک کموڈٹی ایکسچینج کے ساتھ اس کا بنیادی کردار ہے۔

پلیٹ فارم کے مختلف ماڈیول آرڈیسری مائی جزیرے میں تیار کیے گئے اور کیونکہ یہ خطرناک تھے اس لیے انہیں عام آبادی سے دور تعمیر کیا گیا اور پھر انہیں بحری پلیٹ فارمز پر لاد کر پائپر فیلڈ تک لے جایا گیا جہاں انہیں آپس میں جوڑا گیا۔ تقریباً پانچ سو فٹ گہرے سمندر میں متعدد ستون قائم کیے گئے اور ان پر پلیٹ فارم بنایا گیا مگر پلیٹ فارم پر ماڈیول کی تنصیب کے دوران میں حفاظتی اصولوں کو نظر انداز کیا گیا۔ جیسے گیس کمپریسر پمپ کنٹرول روم کے ساتھ تھے اور یہی حادثے کا بنیادی سبب بنا۔ جس وقت یہاں سے آئل نکالنے کی تیاری کی جا رہی تھی تو پلیٹ فارم کو اسی لحاظ سے تیار کیا گیا تھا کیونکہ آکیال کی دل چسپی آئل سے تھی۔ اس وقت مشرق وسطی میں آئل کرائسس نے ساری دنیا کو متاثر کیا تھا اور اب وہ ممالک جو آئل کے لیے دوسروں کے محتاج تھے وہ ایسے اقدامات کر رہے تھے کہ مستقبل میں ایسے کسی واقعے سے متاثر نہ ہوں۔

اس وقت گیس ایک نا قابلِ ذکر اور بہت سستا ایندھن تھا اس لیے تیل کمپنیوں کو اس میں خاص دل چسپی نہیں تھی۔ آکیال کی توجہ خام تیل کی طرف تھی اور اسی لیے پائپر پلیٹ فارم تیل کی پیداوار کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا تھا مگر دوسری طرف برٹش گورنمنٹ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ وہ اس پلیٹ فارم کو قدرتی گیس کی پیداوار کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ستر کے دوران یہ عمل ہوا۔ 1980 کے عشرے میں اس میں تبدیلیاں کی گئیں اور یہ بنیادی طور پر گیس پیدا کرنے والا پلیٹ فارم بن گیا اگرچہ اس کی ساخت اور حفاظتی انتظامات بدستور آئل پیدا کرنے والے پلیٹ فارم جیسے تھے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی تھی۔

گیس ماڈیول کی تنصیب میں حفاظتی اصولوں کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ پلیٹ فارم کی ساخت تھی۔ اس وقت حفاظتی ماہرین نے زور دیا کہ کسی حادثے سے بچنے کے لیے نہ صرف حفاظتی تدابیر دوگنی کی جائیں بلکہ پلیٹ فارم کے کنٹرول روم کو گیس کمپریسر سے دور منتقل کیا جائے۔ آئل کے ماڈیول نمبر دو کو گیس ماڈیول سے بدلا گیا تھا۔ اس کی جگہ بدلنا ممکن نہیں تھا مگر کنٹرول روم کو کسی محفوظ جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا مگر ان دونوں تجاویز کو نظر انداز کر دیا

گیا کیونکہ گیس ماڈیول کسی اور جگہ منتقل کرنے کی صورت میں نہ صرف بہت زیادہ لاگت آرہی تھی بلکہ پلیٹ فارم کی بنیادی ساخت میں تبدیلی بھی کرنا پڑتی۔ البتہ کنٹرول روم تبدیل کیا جاسکتا تھا مگر اس کی بجائے کمپنی نے مرمت اور اوور ہالنگ کا پروگرام بنایا کیونکہ جب سے پلیٹ فارم بنا تھا اس کی معمول کی مرمت ہوتی رہی تھی مگر اب تک مکمل مرمت اور اوور ہالنگ نہیں کی گئی تھی جب کہ دس سال میں یہ دونوں امور لازمی سرانجام دینے چاہیے۔

اہم بات یہ ہے کہ جس وقت مرمت اور اوور ہالنگ کا پروگرام بنایا گیا پلیٹ فارم پر چھ عدد مرمت کے اہم ترین کام پہلے ہی چل رہے تھے۔ ان سب سے اہم گیس کو کمپریس شدہ حالت میں بدلنے والے ماڈیول کی تبدیلی تھی۔ گویا جس وقت حادثہ ہوا اس وقت پلیٹ فارم اس ماڈیول کے بغیر ہی کام کر رہا تھا۔ اہم بات ہے کہ گیس کی پیداوار جاری تھی اور ایک چھوٹا کمپریسر گیس کو مائع صورت میں تبدیل کر کے لائن میں بھیج رہا تھا۔ لیکن حادثے کی بنیادی وجہ مرمت کے دوران میں اس کے ماڈیول روم میں کام جاری ہوتا تھا اور یہاں سے بدستور گیس نکالی اور پائپ لائن کے ذریعے آرکنے کی طرف بھیجا جا رہا تھا اور اسے اصل پلان کے مطابق شٹ ڈاؤن نہیں کیا گیا تھا پھر دوسرے پلیٹ فارموں سے آنے والا آئل بھی بدستور آرہا تھا۔ یہ سنگین بے احتیاطی تھی کیونکہ جب دھماکا ہوا تو پلیٹ فارم میں لاکھوں بیرل آئل موجود تھا اور جب اس نے آگ پکڑی تو بالآخر پورا پلیٹ فارم ہی تباہ ہو گیا۔

ماہرین کو یقین ہے کہ حادثے کا آغاز گیس کمپریسر سے ہوا کیونکہ اس کے تمام والوز کچھ دن پہلے ہی ساحل پر لے جا کر بدلے گئے تھے اور ان میں سے ایک پریشر سیفٹی والو خراب ثابت ہوا تھا۔ حادثے کی شام ہی یہ کمپریسر جنہیں اے اور بی کا نام دیا گیا تھا ضروری مرمت اور اوور ہالنگ کے بعد واپس آئے تھے اور ان کو نصب کیا گیا تھا۔ والو خراب ہونے کی رپورٹ کمپریسر سپر وائزر نے کی تھی۔ اصولاً اسے معمول کی بجائے ہنگامی رپورٹ کرنا چاہیے تھا۔ اے اور بی کمپریسر باری باری کام کرتے تھے اور ہر شفٹ کے بعد کمپریسر بھی بدل جاتا تھا۔ اگر کسی کمپریسر کا والو بدلا جاتا تو وہ پورے ایک دن کے لیے بیکار ہو جاتا۔ بارہ گھنٹے گیس بند ہونے کا مطلب تھا کمپنی کو ایک ملین پاؤنڈز کا نقصان ہوتا اس لیے والو فوری بدلنے کی بجائے یہ کام چند دن بعد ہونے والے مرمت کے وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جب مرمت کی وجہ سے گیس کمپریسر بند کرنا پڑتا مگر حیرت انگیز طور پر گیس کمپریسر بند کرنے کا فیصلہ ہوا اور ایک طرف مرمت کا کام جاری تھا تو دوسری طرف گیس کمپریسر کام کر رہے تھے۔ یہ حادثے کی بنیادی وجہ تھی لیکن پلیٹ فارم کی مکمل تباہی میں اور بھی بہت سے عوامل کارفرما تھے۔ بعد میں تفتیش کرنے والے ماہرین نے بچ جانے والے کارکنوں اور عینی شاہدین کے حوالے سے جو رپورٹ مرتب کی اس میں حادثے کی ٹائم لائن بھی شامل تھی۔

دوپہر بارہ بجے۔ پلیٹ فارم کے دونوں کمپریسر پمپ اے اور بی جنہیں کھول کر اوور ہالنگ کے لیے ساحل پر لے جایا گیا تھا۔ وہ واپس آگئے تھے نگران میں سے پمپ اے کا پریشر سیفٹی والو نمبر پانچ سو چار خراب پایا گیا۔ پلان تھا کہ اسے اوور ہال کر کے دوبارہ لگایا جائے گا مگر اس کے لیے اسے دوبارہ ساحل پر لے جانا لازمی تھا۔ جب والو کی خرابی پکڑی گئی تو اس کا والو نکال کر اس کی دھات سے بنی ڈسک لگا کر سیل کر دیا گیا کیونکہ پمپ بروقت اوور ہال ہو کر آنا لازمی تھا اس لیے خراب والو بدلا نہیں جاسکا اور اس کی جگہ بدستور سیل ڈسک لگی ہوئی تھی۔ مزید یہ سیل صرف ہاتھ کی مدد سے لگائی گئی تھی اور یہ مشین سے لگائی جانے والے سیل کی طرح محفوظ اور مضبوط نہیں تھی کیونکہ پمپ اے تیار نہیں تھا اس لیے اسے استعمال میں لانا ممکن نہیں تھا دوسرے لفظوں میں اس کا سوئچ کسی صورت آن نہیں کیا جانا تھا۔ یہ ڈیوٹی متعلقہ انجینئر کی تھی۔

شام چھ بجے۔ شفٹ تبدیل ہوئی اور اگلی شفٹ کا عملہ ڈیوٹی پر آگیا۔ یہ نائٹ شفٹ تھی جس میں باسٹھ افراد کا عملہ پورے آئل پلیٹ فارم کے تمام کاموں کو سنبھالتا تھا اور آپریشنز کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس وقت جب کی پمپ ماسٹر مصروف تھا اس لیے جونیئر شفٹ انجینئر نے اس سے پوچھنے کی بجائے کہ پمپ اے تیار ہے یا نہیں، کنٹرول روم کو اپنے وقت پر آپریٹ کرنے کی اجازت دے دی حالانکہ اسے یہ اجازت (تحریر) غائب ہوئی کیونکہ کنٹرول روم ہی تباہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح پمپ کی مرمت کا اجازت نامہ بھی نہیں مل سکا۔ انجینئر نے صرف احتیاط نہیں کیا بلکہ وہ اجازت کے بعد کنٹرول روم چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بھی اس حادثے میں مارے جانے والوں میں شامل تھا۔

شام سات بجے۔ پمپ بی کام کر رہا تھا اور گیس کو کمپریس کر کے آگے بھیج رہا تھا۔ ہر آئل رگ پلیٹ فارم کی طرح پائپر الفا میں بھی ایک خودکار آگ پر قابو پانے والا

نظام تھا۔ یہ جدید ترین نظام کہیں بھی آگ لگنے کی صورت میں خود بہ خود حرکت میں آ جاتا تھا۔ یہ خودکار نظام بیک وقت ڈیزل اور بجلی سے چلنے والے پمپوں سے لیس تھا۔ ڈیزل پمپ کا کام سمندر سے پانی کی بہت بڑی مقدار اوپر کھینچنا اور بجلی سے چلنے والے پمپ اسے آگ والے حصوں تک اسپرے کرتے۔ (بدقسمتی سے ابتدائی دھماکے نے یہ نظام تباہ کر دیا)۔ اس نظام میں یہ خوبی تھی کہ یہ خودکار طریقے سے حرکت میں آتا تھا اور یہ خرابی تھی کہ ہنگامی صورت حال میں اسے کنٹرول روم سے مینول طریقے سے چلایا جا سکتا تھا۔ جب تک اس کو خودکار موڈ آف نہ کیا جاتا اسے مینول کرنا ممکن نہیں تھا۔

چھ جولائی کے دن آگ بجھانے کا نظام مینول موڈ پر تھا کیونکہ مرمت کی ایمرجنسی لگ چکی تھی۔ اس دوران میں غوطہ خور پلیٹ فارم کے نیچے سمندر میں تھے۔ وہ موسم گرما میں اوسطاً بارہ گھنٹے روز سمندر میں گزارتے ہیں اور ان کا کام ایک سو بیس فٹ کی گہرائی میں جانے والے انجیکشن کی نگرانی کرنا ہے۔ یہ انجکشن سمندر کے نیچے زمین سے آئل اور گیس کھینچ رہے تھے اور ان میں معمولی سی خرابی بھی کسی بڑے حادثے کو جنم دے سکتی تھی اس لیے ان کی مسلسل نگرانی لازمی تھی۔ اس سے پہلے کے سو پلیٹ فارم کے ایک انجکشن کی خرابی کی تفتیش کے دوران میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ جب غوطہ خور سمندر میں ہوں تو فائر فائٹنگ سسٹم کو خودکار موڈ پر رکھا جائے مگر بدقسمتی سے اس تجویز پر عمل نہیں ہو سکا۔

رات نو بج کر پچپن منٹ۔ اس وقت خرابی کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ خرابی کمپریسر سسٹم میں آئی تھی۔ یہاں ہائیڈریٹس (پانی اور گیس کا مکسچر ہوتا ہے اگر اس پر بہت زیادہ دباؤ آئے تو یہ ٹھوس کرسٹل کی شکل اختیار کر لیتا ہے اسے ایک طرح کی برف بھی کہہ سکتے ہیں۔ پائپوں سے گزرنے کے دوران میں یہ کرسٹل رکاوٹ پیدا کرتے ہیں جس سے بائی پریشر کمپریسر کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور اگر یہ رکاوٹ پمپوں تک پہنچ جائے تو اس کے نہایت سنگین نتائج نکل سکتے ہیں۔ شام چھ بجے تک اے اور بی پمپ واپس آئے اور انہیں واپس انسٹال کر دیا گیا۔ اس کے بعد بی کمپریسر کام کرنے لگا مگر جیسے ہی اس تک کرسٹل آئے اس نے کام چھوڑ دیا۔ گیس نہ صرف کمپریس کی جا رہی تھی بلکہ پلیٹ فارم پر مرمت اور دوسرے کاموں کے لیے ساری بجلی اسی پمپ سے پیدا ہو رہی تھی۔ اگر یہ بند ہو جاتا تو پلیٹ فارم پر بجلی کی فراہمی بند ہو جاتی۔

رات نو بج کر باون منٹ۔ بعد میں جو دستاویزات ملیں ان کے مطابق پمپ اے میں نکالا جانے والا سیفٹی والو لگایا نہیں جا سکا تھا۔ اگر پمپ بی کام چھوڑ دیتا تب بھی پمپ اے کو کسی صورت اسٹارٹ نہیں کرنا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ پمپ اے کو نہ چلانے کا حکم پہلی شفٹ والوں کو دیا گیا تھا اور دوسری شفٹ والے اس سے بے خبر تھے۔ نکالا ہوا والو ایسی جگہ تھا جہاں اسے چیک نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کے بارے میں حکم نامہ ایک بکس میں تھا اس لیے کوئی نہیں دیکھ سکا یا جان سکا کہ والو نہیں ہے۔ اس والو کی جگہ لگائی جانے والے حفاظتی ڈسک ہاتھ سے لگائی گئی تھی اور یہ کسی صورت دباؤ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ساحل پر مرمت کرنے والے اگر ہاتھ کی بجائے مشین سے یہ ڈسک لگاتے تب بھی شاید یہ حادثہ رونما نہ ہوتا مگر انہوں نے اس کی زحمت نہیں کی تھی۔

شفٹ انجینئر پہلے ہی پمپ اے استعمال کرنے کی اجازت دے چکا تھا۔ اس لیے کنٹرول روم سے پمپ اے کا سوئچ آن کر دیا گیا اور جیسے ہی پمپ اے میں گیس داخل ہوئی تو بے پناہ دباؤ نے غائب والو کی جگہ لگنے والی ڈسک کو اڑا دیا اور گیس تیزی کے ساتھ خارج ہوئی۔ فوراً ہی نصف درجن کے قریب گیس الارم بج اٹھے تھے۔ ان میں اعلیٰ خطرے کا الارم بھی شامل تھا۔ متعدد کارکنوں نے گیس کا اخراج دیکھا لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کر سکتے گیس نے آگ پکڑ لی اور خوفناک دھماکا ہوا تھا۔ اس دھماکے نے نہ صرف پمپ بلکہ اس کے آس پاس کی تمام تنصیبات کو تباہ کر دیا۔ گیس متواتر خارج ہو رہی تھی۔ بجلی غائب ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی پلیٹ فارم پر تمام کام بند ہو گیا۔ اس میں آئل اور گیس کی سپلائی کا کام بھی تھا مگر انجکشن کام کر رہے تھے اور زیر زمین سوت آئل اور گیس نکال رہے تھے۔

بدقسمتی سے سب سے پہلے نزدیک ہی موجود کنٹرول روم نشانہ بنا اور اس کی تنصیبات تباہ ہو گئیں۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ کمرے میں موجود مشینیں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس میں موجود افراد کا حشر صرف سوچا جا سکتا ہے کہ ان کے ساتھ اس دھماکے میں کیا ہوا ہو گا۔ اگر کنٹرول روم کام کر رہا ہوتا تو ایمرجنسی بٹن دبا کر گیس کے اخراج کو روکا جا سکتا تھا مگر آنے والی تباہی کو روکنے کا واحد ذریعہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ پھر بجلی کی عدم فراہمی نے آگ روکنے کی امید بھی ختم کر دی تھی کیونکہ پانی اسپرے کرنے والے پمپ بجلی سے کام کرتے تھے۔ جیسے ہی گیس کی مخصوص مقدار تک خارج ہوتی اس میں ہلکا دھماکا ہو جاتا تھا۔ کارکن

بدحواس تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان دھماکوں کو کیسے روکیں۔ دھماکا پلیٹ فارم کے درمیانی حصے میں ڈیک دو میں ہوا تھا اور آگ بتدریج اوپری اور نچلے حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

یہاں پلیٹ فارم کی یہ خامی کھل کر سامنے آئی کہ اسے خاص طور سے آئل رگنگ کے لیے بنایا گیا تھا اور اس کے حفاظتی انتظامات بھی اسی لحاظ سے تھے۔ یعنی یہ آگ کا مقابلہ کر سکتا تھا مگر گیس سے ہونے والے دھماکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے فائر وال ہیٹ پروف تھے بلاسٹ پروف نہیں تھے اس لیے بکھر رہے تھے۔ ایک دھماکے نے نزدیک موجود چینل کو توڑ دیا اور اس کا ایک بڑا ٹکڑا اڑ کر ماڈیول بی کو لگا اور اس کی آئل لائن ٹوٹ گئی یہاں سے آگ کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس وقت دو تہائی کارکنان اپنے کمروں میں تھے وہ سو رہے تھے یا کامن روم میں گپیں مار رہے تھے۔ پہلے دھماکے نے انہیں باہر آنے پر مجبور کیا اور اس کے بعد ہونے والے لگاتار دھماکوں نے انہیں بدحواس کر دیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کنٹرول روم تباہ ہو گیا تھا اور اب ان لوگوں کو لاؤڈ اسپیکر پر گائیڈ کرنا اور حفاظتی اقدامات کے بارے میں بتانا ممکن نہیں رہا تھا۔ جگہ جگہ آگ لگنے سے مختلف جگہوں پر جانے کے راستے بند ہو گئے تھے۔ لوگ بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

آگ لگنے کی صورت میں جو ڈرل ہوتی رہی تھیں ان میں انہیں یہی بتایا گیا تھا کہ وہ فوری طور پر لائف بوٹس والے پلیٹ فارم تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس لیے کارکنوں نے فوری طور پر اس پلیٹ فارم کا رخ شروع کر دیا۔ یہاں ہوا سے بھرنے والی امدادی بوٹس تھیں ان کو سمندر میں پھینک کر ان کی مدد سے یہاں سے نکلا جا سکتا تھا مگر جلد یہ اندوہناک حقیقت سامنے آئی کہ آگ نے نہ صرف اس طرف کا راستہ بند کر دیا تھا بلکہ اس پلیٹ فارم کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کارکنوں کو دوسری ہدایت یہ تھی کہ اس صورت میں وہ ہیلی کاپٹر کے عرشے تلے موجود فائر پروف کمرے میں پناہ لیں اور وہاں اگلی ہدایت یا مدد آنے کا انتظار کریں۔ اس لیے تقریباً سو کارکنوں نے اس طرف کا رخ کیا۔ پہلے دھماکے سے بچنے والے سو کے قریب کارکن یا تو نچلے ڈیک پر تھے یا سمندر میں کود چکے تھے۔ درحقیقت یہی زندہ بچے تھے۔ اوپر حفاظتی کمرے میں جانے والوں میں سے کوئی اپنی جان نہیں بچا سکا تھا۔ تیز ہوا، آگ اور دھویں کی وجہ سے پلیٹ فارم پر ہیلی کاپٹر لینڈنگ ممکن نہیں رہی تھی۔ پھر مدد بھی نہیں آئی اور گاڑھا زہریلا دھواں وہاں تک بھی آ پہنچا تھا۔

پائپر آئل رگ پلیٹ فارم میں عملے کی تعداد دو سو چھبیس تھی۔ ان میں سے ایک سو پینسٹھ افراد ہلاک اور صرف اکسٹھ زندہ بچ سکے۔ مارے جانے والوں میں ایک امدادی کشتی کے دو ارکان بھی شامل تھے۔ ابتدائی دھماکوں میں کتنے افراد ہلاک ہوئے تھے۔ یہ کہنا دشوار تھا مگر اس وقت بچ جانے والوں کی تعداد دو سو سے زائد تھی۔ یہ سب اوپر اور نیچے آگ سے محفوظ ڈیکس میں جمع تھے اور آگ جتنی تیزی سے بھڑک رہی تھی صاف لگ رہا تھا کہ اسے اوپر سے نیچے آتے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اگر آگ ان ڈیکس تک آ جاتی اور مدد نہ آتی تو ان کے بچنے کا امکان نہیں تھا۔ وہ سمندر میں بھی چھلانگ نہیں لگا سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں وہ نچلے ڈیک پر گرتے یا باہر نکلے حصوں سے ٹکراتے اور دونوں صورتوں میں ان کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ آگ لگنے سے زیادہ خوفناک بات یہ تھی کہ آگ بجھانے کا نظام حرکت میں نہیں آیا تھا اس لیے بھی آگ پھیل رہی تھی ورنہ اس پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ نیچے کے ڈیک پر موجود اسٹیشن سیفٹی سپروائزر جان کورڈ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

"میں آگ بجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"میں پانی پھینکنے والے پمپوں تک جاتا ہوں۔"

مگر جہاں پانی پھینکنے والے پمپ نصب تھے وہاں تک جانا آسان کام نہیں تھا۔ درمیان میں جگہ جگہ خوفناک آگ بھڑک رہی تھی اور اب وہ دوسرے ڈیک تک آ چکی تھی۔ آگ کی شدت سے لوہا پگھل رہا تھا اور پلیٹ فارم کے مختلف حصے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔ ان کے ٹوٹنے سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے پلیٹ فارم کوئی زندہ مخلوق ہو اور وہ انہیں کھانے کے لیے بے تاب ہو۔ یہ مشن سچ مچ آگ کا دریا پار کرنے کے مترادف تھا۔ کورڈ نے اپنے ساتھی اسٹیو سے کہا۔ "ہمارے پاس حفاظتی لباس ہیں۔"

"وہ لباس ایک حد تک ہماری حفاظت کر سکتے ہیں۔" اسٹیو نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ آگ دیکھ رہے ہو یہ تو لوہا پگھلا رہی ہے ان لباسوں کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے اس کے سامنے۔"

"ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔" کورڈ نے کہا۔ "یہاں دو سو لوگوں کی جان خطرے میں ہے انہیں بچانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

جب کورڈ نے لباس پہننا شروع کیا تو مجبوراً اسٹیو بھی حرکت میں آیا۔ اس نے کہا۔ "میں تمہیں اکیلے جانے نہیں دوں گا۔"

یہ لباس بچ بچاؤ آگ سے محفوظ رکھنے کے لیے تھا۔ پانچ سو ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت تک پر کام کرتا تھا مگر جہاں جو آگ لگی ہوئی تھی اس کا درجۂ حرارت یقیناً کہیں زیادہ تھا۔ اس کے باوجود کورڈ اور اسٹیو ہمت کر کے اپنے ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے روانہ ہوئے۔ بچ جانے والے کارکنوں کا بیان ہے کہ انہوں نے انہیں درمیانی ڈیک تک صحیح سلامت دیکھا تھا اس کے بعد وہ نظر نہیں آئے۔ اس کے بعد کورڈ اور اسٹیو پھر کبھی نظر نہیں آئے اور نہ ہی ان کی لاشیں ملی تھیں۔ شاید آگ نے انہیں واپسی کی راہ بھی نہیں دی تھی اور آگ کی شدت نے ان کی لاشیں بھی راکھ کر دی تھیں۔ پائپر آئل رگ کی بدقسمتی کا سفر ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ کنٹرول روم کی تباہی نے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ کلیمور اور ٹارٹان کو اس سانحے سے خبردار کر سکتے۔ اگرچہ وہاں خطرے کے الارم بج چکے تھے مگر ان دونوں پلیٹ فارمز کا عملہ بے خبر تھا کہ پائپر الفا پر کس نوعیت کا حادثہ پیش آیا ہے اور ان دونوں پلیٹ فارمز سے پائپ لائن میں آئل کی آمد بدستور جاری تھی۔ دوسری طرف پائپر سے آگے سپلائی رک گئی تھی اور اس کے نتیجے میں پائپ لائن پر پریشر بڑھنے لگا۔

پہلے دھماکے کے بعد تینوں پلیٹ فارمز کو آپس میں ملانے والا فائر الارم بج اٹھا۔ کلیمور اور ٹارٹان کی انتظامیہ جان گئی کہ پائپر میں کچھ ہوا ہے مگر انہیں ہنگامی کنٹرول سینٹر کی طرف سے آئل لائن شٹ ڈاؤن کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ٹارٹان لائن جہاں سے مین لائن سے مل رہی تھی وہاں سے اسے با آسانی بند کیا جا سکتا تھا مگر اعلیٰ حکام کی طرف سے اس کی اجازت نہیں تھی۔ ایک بار شٹ ڈاؤن ہونے اور دوبارہ سپلائی بحال ہونے تک کے عرصے بہت بڑا نقصان ہو چکا ہوتا جو دسیوں ملین پاؤنڈز میں چلا جاتا کیونکہ ایک بار سپلائی روک دینے کے بعد اسے دوبارہ سے شروع کرنے میں کئی دن لگ سکتے تھے۔ یوں مالی نقصان سے بچنے کے لیے زمین پر موجود ہنگامی حالات میں کام کرنے والے سینٹر نے سپلائی جاری رکھنے کا حکم دیا اور نتیجے میں پائپر پر بھڑکی آگ کو نیا ایندھن مل گیا۔ اس کے ساتھ پائپر کی سول اور اٹھارہ انچ کی گیس لائنوں میں گیس کی فراہمی بدستور جاری تھی۔

دو برس پہلے ایک حفاظتی مطالعے میں نشان دہی کی گئی کہ یہ گیس لائنیں بہت خطرناک ہیں۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک ان کا قطر جو بہت بڑا تھا اور دوسرے ان کی لمبائی۔ کسی بھی حادثے کی صورت میں ان سے دنوں تک بہت دباؤ کے ساتھ گیس نکل سکتی تھیں کیونکہ ان میں گیس کمپریس صورت میں اور بہت زیادہ دباؤ کے ساتھ موجود ہوتی تھی۔ جہاں گیس پہنچتی وہاں یقیناً آگ بجھانا ناممکن ہو جاتا مگر اس رپورٹ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ برطانوی حکومت کی سستی گیس حاصل کرنے کی پالیسی میں بہت سے حفاظتی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا بعد میں یہ بھی اس حادثے کی وجوہات میں شامل ہوئے تھے۔ اگر ان گیس لائنوں کو شٹ ڈاؤن کر دیا جاتا تو حادثہ رونما ہی نہ ہوتا۔ مگر برطانیہ کو گیس کی فراہمی جاری رکھنے کے لیے مرمت کے دوران بھی گیس کی فراہمی جاری رکھی گئی تھی۔

رات دس بج کر بیس منٹ۔ ٹارٹان سے آنے والی گیس لائن بے پناہ حرارت اور دباؤ کی وجہ سے پگھل گئی۔ ایک دھماکے سے پائپ لائن پھٹی اور گیس نے فضا میں آتے ہی آگ پکڑ لی۔ اس وقت پائپ لائن میں دباؤ عام فضائی دباؤ سے ایک سو بیس گنا زیادہ تھا۔ اٹھارہ انچ کی اس پائپ لائن سے ایک سیکنڈ میں پندرہ سے تیس ٹن گیس ہوا میں خارج ہو رہی تھی۔ اس لائن کے تباہ ہوتے ہی ایک بہت بڑا شعلہ بلند ہوا اور یہ اتنا بڑا تھا کہ آرکنے جزیرے پر بھی دیکھا گیا جو ایک سو بیس کلومیٹرز کے فاصلے پر ہے۔ اب پائپر پلیٹ فارم رگ کی تباہی لازمی ہو گئی تھی۔ اس دھماکے نے نچلے اور اوپری ڈیک پر موجود بے شمار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ تباہی براہ راست ٹارٹان اور کلیمور کی آئل فیلڈز کو شٹ ڈاؤن نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اگر انہیں شٹ ڈاؤن کر دیا جاتا تو دوسرا دھماکا نہیں ہوتا۔ جس نے پائپر پلیٹ فارم کی تباہی پر مہر ثبت کر دی۔ اگرچہ آئل بھی آگ کو ایندھن دے رہا تھا مگر اصل نقصان گیس نے پہنچایا تھا۔

رات دس بج کر تیس منٹ۔ پہلے دھماکے کے ساتھ ہی ساحل پر موجود حکام کو اطلاع مل چکی تھی اور انہوں نے فوری طور پر پہلے سے پائپر پلیٹ فارم کے قریب موجود ایک امدادی کشتی تھاروز پائپر کی طرف روانہ کر دی تھی۔ تھاروز پائپر کے ساتھ رکی اور اس نے آگ بجھانے کے لیے اپنی طاقتور پانی کی توپوں کا استعمال شروع کر دیا مگر اس میں ایک مسئلہ تھا۔ تھاروز کے عملے کو قطعی علم نہیں تھا کہ پائپر کا عملہ کہاں

موجود ہے اور اس کی پانی کی تو پیں اتنی طاقتور تھیں کہ ان کی دھار کی زد میں آکر کوئی انسان ہلاک یا زخمی ہوسکتا تھا۔ اس کے باوجود تھاروز کے عملے میں اکیلی جھجوں پر پانی پھینکنا شروع کردیا جہاں کسی زندہ انسان کی موجودگی کا امکان نہیں تھا مگر ان کی کوششیں بول بار آور ثابت نہیں ہورہی تھیں کہ درمیان میں پلیٹ فارم کی تنصیبات بھی آرہی تھیں اور ان کی وجہ سے درمیان میں بھڑکنے والے شعلوں تک پانی پھینکنا ممکن نہیں تھا۔ دوسرے آگ کو جس قدر ایندھن مل رہا تھا۔ دو سو گیلن فی سیکنڈ کے حساب سے پھینکا جانے والا پانی بھی اسے بجھانے سے قاصر تھا۔ بلکہ بجھانا تو ایک طرف زیادہ آگ کی شدت اور پلیٹ فارم کے ایک جانے والے حصوں کی حدت کم کرنے میں بھی ناکام رہے تھے۔

رات دس بج کر پچاس منٹ۔ آگ نے بالآخر پائپر کی گیس لائن کو بھی پگھلا دیا اور ایک دھماکے سے لائن تباہ ہوتے ہی ہوا میں بہت بڑا شعلہ اٹھا تھا اس کا قطر تین سو فٹ تھا اور یہ ہوا میں پانچ سو فٹ کی بلندی تک گیا تھا۔ اس موقع پر ایک سانحہ پیش آیا۔ ایک اور امدادی کشتی سنڈھاون سے آنے والی ایک تیز رفتار کشتی جس میں دو افراد تھے انہوں نے پانی میں کود جانے والے چھ افراد کو پانی سے نکال لیا تھا مگر اس سے پہلے کہ یہ بدنسمت کشتی اور اس کے بچ جانے والے افراد پلیٹ فارم سے دور جاتے دوسرے دھماکے نے کشتی کو تباہ کر دیا اور اس میں موجود آٹھوں افراد مارے گئے تھے۔ تھاروز کا عملہ یہ اندوہناک منظر دیکھ رہا تھا۔ دھماکے نے کشتی کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ لیکن ان آٹھ افراد کی لاشیں بعد میں سمندر سے مل گئی تھیں مگر وہ بہت بری حالت میں تھیں۔

دھماکے نے صرف امدادی کشتی کو تباہ نہیں کیا بلکہ اس نے پلیٹ فارم کے اسٹرکچر کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ نتیجے میں پائپ اور دوسری تنصیبات ٹوٹ کر سمندر میں گرنے لگیں اور تھاروز کا عملہ سخت خوفزدگی کے عالم میں کشتی کو پلیٹ فارم سے دور لے جانے پر مجبور ہوا تھا۔ شدید آگ نے پلیٹ فارم کے آس پاس کا درجۂ حرارت کئی سو ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچا رہا تھا اور بہت سے افراد اس تپش کی وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اس وقت تک آگ تقریباً تمبوں ڈیک تک پھیل چکی تھی اور اب پھنسے افراد موت کو سامنے دیکھ رہے تھے۔ آگ سے پھیلا زہریلا اور گاڑھا دھواں ان کی جان کا دشمن بن رہا تھا مگر اس سے بچ کر جانے کا چارہ نہیں تھا۔ دوسرے دھماکے نے گلف کے پلیٹ فارم سے آنے والی آئل لائن کو تباہ کر دیا تھا اور اس سے تیل کی

آپ اٹلی کے پیسا ٹاور کو دیکھیں۔ وہ ایک طرف سے اس طرح جھکا ہوا ہے کہ جیسے ابھی گر جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ اسے اس کے ڈیزائن کی خوبی سمجھتے ہوں۔ لیکن دراصل یہ ڈیزائن بنانے والے کی غلطی ہے۔

مرسلہ: نصیر جوکھیو حیدرآباد

****

کبھی کبھی فلموں میں اور ادبی شاہ پاروں میں بھی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ آئیے کچھ ادبی غلطیوں کو دیکھتے ہیں۔

جان کیٹس، بلاشبہ انگریزی زبان کا بہت بڑا شاعر تھا اس کو نہ صرف مغرب میں بلکہ مشرق میں بھی پذیرائی حاصل ہے۔ اس نے بہت لکھا اور بہت اچھا لکھا۔

اس کی ایک مشہور نظم ہے۔ On First looking into اس نظم میں اس نے کارٹز کے لیے لکھا ہے کہ اس نے پیسفک اوشین دریافت کیا تھا۔ جبکہ پیسفک اوشین کو بالبوا نے دریافت کیا تھا۔

شیکسپیئر نے اپنے مشہور ڈرامے جولیس سیزر کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس وقت کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک ہو رہی تھی۔

یاد رہے کہ جولیس سیزر رومی عہد سے تھا۔ اور اس وقت گھڑی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ پھر یہ کون سی گھڑی تھی جو ٹک ٹک ہو رہی تھی۔

مشہور کردار شرلاک ہومز کی ایک کہانی میں ڈاکٹر واٹسن کی بیوی کئی بار اپنے شوہر کا نام جیمز پکارتی ہے۔

ڈینیل ڈی فو کے مشہور ناول رابن سن کروسو کا ایک منظر بہت دلچسپ ہے۔

ہیرو (مرکزی کردار) ننگے بدن ہے۔ وہ اس حال میں تیرتا ہوا کشتی تک جاتا ہے اور جیب میں کھانے کے لیے کچھ چیزیں رکھ لیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب ننگے بدن تھا تو جیب کہاں سے آگئی۔

مرسلہ: احمد سلمان، لاہور

فراہمی رک گئی تھی۔ مگر اس سے آگ کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا وہ اس سے پہلے ہی اتنا ایندھن حاصل کر چکی تھی جو اس پورے پلیٹ فارم کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ تھارووز کے کپتان سیمور ہنٹر نے ساحل پر پیغام بھیجا کہ اب پائپر پر موجود افراد کا بچاؤ دشوار تھا۔

اس وقت تک کئی امدادی بحری جہاز، برٹش نیوی کے کئی جہاز اور کشتیاں اور کم سے کم ایک درجن ہیلی کاپٹر پائپر تک پہنچ گئے تھے مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس پر موجود افراد کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ پلیٹ فارم پر کوئی زندہ بھی ہے یا نہیں۔ شعلوں کے علاوہ وہاں صرف دھواں تھا اور اس کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسٹرکچر دوہرہ کر پگھل رہا تھا اور اس کے مختلف حصے ٹوٹ کر سمندر میں گر رہے تھے۔ تپش اتنی زیادہ تھی کہ پلیٹ فارم کے نیچے کا پانی کھولنے لگا تھا اور اس سے باقاعدہ بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کشتیاں اور ہیلی کاپٹر پلیٹ فارم سے محفوظ فاصلے پر سمندر میں کود جانے والے افراد کو اٹھا رہے تھے۔ نصف رات سے پہلے وہ سمندر سے تمام افراد کو نکال چکے تھے ان کی تعداد اکسٹھ تھی اور وہ اس لیے بچے تھے کہ انہوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی جو ایسا نہیں کر سکے تھے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ پلیٹ فارم پر رہ جانے والا کوئی ایک فرد بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

رات گیارہ بج کر بیس منٹ۔ کلے مور سے آنے والی لائن کا دوسرا حصہ ایک دھماکے سے پھٹا۔ اگرچہ اس میں آئل کی فراہمی روک دی گئی تھی مگر اس میں اس وقت بھی کئی ٹن خام تیل موجود تھا۔ لائن سلامت رہی تھی کیونکہ وہ آگ کے مقام سے دور تھی مگر دور سے آنے والی تپش نے اندر موجود تیل کو آگ پکڑنے پر مجبور کیا اور لائن ایک دھماکے سے تباہ ہوئی تھی۔ اگرچہ اس دھماکے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ پائپر کی تباہی یقینی تھی اور اس پر موجود کسی فرد کے بچنے کا امکان ختم ہو چکا تھا۔ البتہ اس دھماکے نے پائپر پلیٹ فارم کے لائف بوٹ والوز کو نقصان کیا تھا۔ شعلے اتنے بلند تھے کہ پائپر کے آس پاس سو فٹ کے دائرے میں درجہ حرارت دو سو ڈگری سینٹی گریڈ تک جا پہنچا تھا۔ بغیر حفاظتی لباس کے اس درجہ حرارت میں کسی فرد کا محفوظ رہنا ممکن نہیں تھا۔

رات گیارہ بج کر پچاس منٹ۔ آگ نے پلیٹ فارم کے فولادی پلرز کو پگھلا دیا تھا اور اس کا ماڈیول ڈی معہ حفاظتی بلاک کے سمندر میں جا گرا۔ اسی بلاک میں بچ جانے والے افراد کے موجود ہونے کا امکان تھا اور اس کے سمندر میں گرنے سے ان کی زندگی کا رہا سہا امکان ختم ہو گیا۔ یہ پائپر کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ اس میں دو ہیلی پیڈ اور کرینیں بھی شامل تھیں۔ اب صرف رہائشی اور تفریح کے لیے مخصوص حصہ ماڈیول اے بچا ہوا تھا۔ اس کے بھی ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر سمندر میں گر رہے تھے۔ یہ سارا ملبہ ایکنگ پر جا رہا تھا اور اگر اس کا اوپری حصہ ٹوٹ جاتا تو نیچے سے نکلنے والا خام تیل سمندر کی سطح پر پھیلنا شروع ہو جاتا۔ یہ سمندری ماحول اور حیاتیات کے لیے بڑا نقصان ہوتا۔

رات بارہ بج کر پینتالیس منٹ۔ صرف پونے تین گھنٹے کے مختصر وقت میں برسوں کی محنت کے بعد بنایا جانے والا پائپر پلیٹ فارم مکمل طور پر غائب ہو گیا تھا اور اس حادثے کی باقیات سطح پر جلتے شعلے اور پانی پر تیرتی چیزیں تھیں۔ عملے کے ایک سو چھیاسٹھ افراد زندگی ہار چکے تھے اور مارے جانے والوں میں امدادی کشتی کے دو افراد بھی شامل تھے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ خام تیل پیدا کرنے والے سمندری پلیٹ فارمز پر آج تک اس سے بڑا سانحہ پیش نہیں آیا تھا۔ دیگر حادثات ہوتے رہے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا جب ایک آئل رگ پلیٹ فارم مکمل طور پر غائب ہو گیا ہو۔ اس کی بنیاد تک تباہ ہو گئی تھی۔ تباہی اتنی شدید تھی کہ اب پائپر پلیٹ فارم کو دوبارہ تعمیر کرنے اور یہاں سے تیل اور گیس حاصل کرنے میں اس سے بھی زیادہ عرصہ لگتا جتنے عرصے میں یہ پلیٹ فارم پہلی بار مکمل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس سارے حادثے میں جو واحد چیز اچھی ہوئی وہ پائپر کے ایکنگ کا کام روک دینا تھا دوسری صورت میں خام تیل سمندر کی سطح پر پھیل کر مزید آلودگی اور ماحولیاتی تباہی کا باعث بنتا۔

حادثے کے بعد تفتیش کے دوران میں یہ بات سامنے آئی اور اس پر بحث بھی ہوئی کہ کسی بھی حادثے کی صورت میں ہنگامی حالات کا اعلان کتنی دیر میں کیا جائے۔ ہنگامی حالات کا مطلب ہے کہ آئل رگ کا تمام کام روک دیا جائے۔ اسے مکمل طور پر شٹ ڈاؤن کر دیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ پلیٹ فارم سے منسلک دوسری تمام تنصیبات اور لائنیں بھی بند کر دی جائیں۔ اگر پائپر پلیٹ فارم رگ میں ایسا ہی ہوتا تو تباہی اتنی شدید نہ ہوتی اور اگر پلیٹ فارم تباہ ہوتا تب بھی کارکنوں کو بچانے کا بہت امکان تھا مگر تیل اور گیس کی مسلسل فراہمی نے تباہی کو شدید اور بہت تیز کر دیا تھا۔ پائپر میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ افراد جو ہنگامی حالت نافذ کر سکتے تھے وہ اولین دھماکے میں کنٹرول روم میں ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ اس لیے بچ جانے والے کارکنوں

میں اول تو فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا دوسرے اگر فیصلہ کرنے والا ہوتا تو اسے عملی طور پر نافذ کرنے کا کوئی طریقہ کار باقی نہیں بچا تھا۔ درحقیقت کنٹرول روم کی تباہی نے ہی پائپر کی تباہی میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔

یہ پلیٹ فارم کی تعمیر میں بنیادی خامی تھی کہ کنٹرول روم ایسی جگہ تھا جو خود خطرناک تھی پھر پلیٹ فارم پر دھماکے سے محفوظ رہنے والی دیواریں بھی نہیں تھیں۔ اس لیے اولین دھماکے نے ہی بہت بڑی تباہی پھیلائی تھی۔ اگر کنٹرول روم کے گرد دھماکے سے بچانے والی دیواریں ہوتیں تب بھی شاید تباہی سے بچا جا سکتا تھا۔ ایک اور بڑی خامی جس نے پلیٹ فارم کی مکمل تباہی میں اہم کردار ادا کیا وہ پڑوسی پلیٹ فارمز سے آنے والی گیس اور تیل کی لائنیں تھیں۔ یہ پائپر پر آکر مین لائن سے مل رہی تھیں اور شدید گرمی نے جب ان لائنوں کو پگھلا دیا تو دوسرا دھماکا ہوا تھا جس نے پلیٹ فارم کو مرکزی ڈھانچا تباہ کر دیا اور اس کا بڑا حصہ سمندر میں جا گرا۔ تفتیش کرنے والوں کو یقین ہے کہ مارے جانے والے کارکنوں کی بڑی تعداد اسی دوسرے دھماکے کا شکار ہوئی تھی۔ مزید بدقسمتی کہ ٹکے سو اور تارتان کے عملے نے جب پائپر کی آگ دیکھ لی تب بھی انہوں نے آئل اور گیس پمپنگ نہیں روکی کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ انہیں اس کی اجازت حاصل ہے۔ وہ بدستور مین لائنوں میں تیل اور گیس پمپ کرتے رہے۔ نہ ہی ساحل پر قائم کنٹرول سینٹر سے انہیں کوئی ہدایت دی گئی۔

حادثے کے وقت قریب ہی موجود غوطہ خوری کی سہولت رکھنے والی کشتی لولینڈ کیولر کے کپتان نے بتایا کہ پہلا دھماکا رات دس بجے سے ذرا پہلے ہوا اور دوسرا دھماکا اس کے تقریباً بائیس منٹ بعد ہوا تھا۔ اس وقت تک سولین اور فوجی امدادی ہیلی کاپٹرز وہاں پہنچ گئے تھے اور انہوں نے بھی ہوا میں بلند ہوتے تقریباً ڈیڑھ سو میٹر اونچا شعلہ دیکھا تھا مگر وہ کارکنوں کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ کارکنوں کی اکثریت کو (انسٹھ میں سے سینتیس) ایک تیز رفتار امدادی کشتی ایم وی سلور پٹ نے سمندر سے نکالا اور بعض اوقات وہ خطرہ مول لے کر پلیٹ فارم کے نزدیک بھی گئے کیونکہ کچھ کارکن نچلے حصے میں پائپوں اور تاروں سے لٹکے ہوئے تھے۔ کشتی کے ماسٹر جیمس کلارک کو اس کی کاوشوں پر بعد میں جارج میڈل سے نوازا گیا۔ تین دیگر افراد چارلس ہفرے، جیمس مک نیل اور اینڈریو گلو کو بھی جارج میڈل دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے کارکنوں کی جانیں بچانے کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈال دی تھیں۔

پلیٹ فارم کے بچ جانے والے پائپوں سے اگلے تین ہفتے تک گیس کے شعلے لپکتے رہے۔ یہ گیس ٹکے سو اور تارتان سے آنے والی لائنوں میں موجود تھی۔ بالآخر ایک فائر فائٹرز ٹیم نے ریڈ ایڈائر کی قیادت میں ان شعلوں کو بجھا دیا۔ اگرچہ اس کام میں انہیں شدید مشکل پیش آئی تھی کیونکہ ہوا اسی میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھی اور موجیں ستر فٹ تک بلند تھیں۔ 1988ء کے آخر میں ایک بہت بڑے آپریشن کے بعد سمندر سے پلیٹ فارم کا وہ حصہ نکال لیا گیا جس میں وہ ریل کنٹینر تھا جس میں سو کے قریب افراد نے آگ سے بچنے کے لیے پناہ لی تھی۔ وہ آگ سے بچ گئے تھے مگر ان کی بدقسمتی کہ یہ کنٹینر سمندر میں جا گرا اور وہ ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ کنٹینر سے ستاسی لاشیں ملیں۔ وہ سب آگ یا ڈوبنے کی وجہ سے دم گھٹ کر ہلاک ہوئے تھے۔

برطانوی حکومت نے نومبر 1988ء میں انکوائری کمیشن ایک اسکاٹش جج ولیم کولن کی سربراہی میں قائم کیا۔ اس نے ایک سو اسی دن تک تحقیقات کیں اور اس کے بعد رپورٹ مرتب کی۔ نومبر 1990ء میں یہ رپورٹ پائپر الفا تباہی کے نام سے عوام کے سامنے پیش کی گئی۔ رپورٹ کے مطابق حادثے کی بنیادی وجہ پمپ اے کا خراب سیفٹی والو تھا جس کی جگہ سیل ڈسک لگائی گئی تھی۔ عملے اور کنٹرول روم کے کرتا دھرتا افراد نے غفلت کا مظاہرہ کیا اور یہ جانے بغیر پمپ اے چلا دیا کہ اس کا ایک والو سرے سے لگا ہی نہیں ہے۔ جب کہ انہیں اس کی لازمی اطلاع ہونے چاہیے تھی۔ رپورٹ میں پائپر الفا کے سپروائزر کو ذمے دار قرار دیا انہوں نے مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا مگر خاص بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی فرد زندہ نہیں بچا تھا وہ سب مارے جا چکے تھے۔

ولیم کولن کی اس رپورٹ میں سمندری آئل اینڈ گیس پلیٹ فارم کے حفاظتی معیار کے بارے میں ایک سو چھ تجاویز دی گئیں۔ ان میں سے سینتیس تجاویز چھپے جاری آپریشن کے آلات کی سیفٹی کے بارے میں تھیں۔ بتیس پلیٹ فارم پر کام کرنے والے کارکنوں کی حفاظتی معلومات میں اضافے کی تھیں۔ چھبیس پلیٹ فارم کے ڈیزائن کے بارے میں تھیں اور بارہ ایمرجنسی سروس کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے تھیں۔ رپورٹ میں جن ستاون خامیوں کی نشان دہی کی گئی ان میں سے چالیس پلیٹ فارم آپریٹرز کے بارے میں تھیں۔ آٹھ پلیٹ فارم ڈیزائن، تین حفاظتی نقص کی اور ایک امدادی کشتیوں کے بارے میں تھی۔ اس رپورٹ کی روشنی میں صرف برطانیہ

ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں بحری آئل پلیٹ فارمز کے ڈیزائن اور حفاظتی انتظامات میں تبدیلیاں کی گئیں۔

اگر چہ اس سے حادثات نہیں رکے۔ پائپر الفا کے واقعے کے بعد مزید پندرہ ایسے حادثات ہوئے جس میں کوئی نہ کوئی فرد ہلاک ہوا جب کہ ایسے حادثات کی تعداد کئی گنا زیادہ ہے جن میں کوئی انسانی جان ضائع نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سب سے جان لیوا حادثہ خلیج تھائی لینڈ میں ایک آئل رگ میں پیش آیا جس میں نوے افراد کی جان گئی تھی۔ آئل سے متعلق سب سے اندوہناک واقعہ نائیجیریا میں پیش آیا جہاں پائپ لائن سے تیل چرائے جانے کے دوران میں دھماکے اور آگ لگنے سے ساڑھے چار سو سے پانچ سو افراد ہلاک ہوئے تھے۔ مگر یہ واقعہ سمندر میں نہیں بلکہ خشکی پر پیش آیا تھا۔ جب ایک آئل لائن جس سے بندرگاہ تک خام تیل پہنچایا جاتا تھا اس میں سوراخ کر کے تیل چوری کرتے ہوئے کسی وجہ سے دھماکہ ہوا اور آگ لگ گئی تھی۔

آئل پلیٹ فارم پر آگ کا پہلا واقعہ عربین گلف میں قطر کے ایک آئل پلیٹ فارم پر پیش آیا۔ اس میں پلیٹ فارم سمندر میں ڈوب گیا اور تین افراد مارے گئے تھے۔ پائپر الفا کے علاوہ صرف ایک حادثہ ایسا ہے۔ یہ ناروے کا الیگزینڈر یا ایل کیلنڈ پلیٹ فارم تھا۔ یہ بھی تنہائی اوقیانوس میں ہے اور اس حادثے میں ایک سو تیئس افراد مارے گئے تھے جب پلیٹ فارم سمندر میں گر گیا۔ ایسے حادثات کی تعداد اکثر زیادہ درجن ہے جن میں دس یا زیادہ افراد ہلاک ہوئے ہوں جب کہ ایسے حادثات جن میں جانی نقصان ہوا ہو ان کی تعداد کئی سینتالیس تھی۔ اب تک بحری پلیٹ فارم آئل رگز پر پیش آنے والے حادثات کی کل تعداد ایک سو چوراسی ہے اور یہ تمام حادثے انسانی خطا کی وجہ سے رونما ہوئے۔

گزشتہ ساٹھ سالوں میں حادثات کا تناسب فی سال تین حادثوں کا بنتا ہے جو بہت زیادہ نہیں۔ ان کے مقابلے میں زمینی آئل فیلڈز پر پیش آنے والے حادثوں کی تعداد اگر چہ فی سال اس سے کہیں زیادہ ہے لیکن بحری آئل رگز کے مقابلے میں زمینی آئل فیلڈز کی تعداد بھی یقیناً بہت زیادہ ہے۔

پائپر الفا کے حادثے کے بعد حفاظتی ماہرین نے آئندہ بننے والے آئل پلیٹ فارمز کے بارے میں کچھ نئی حفاظتی تدابیر وضع کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم کارکنوں کے رہائشی یونٹس کو آئل پلیٹ فارم سے دور رکھنا ہے۔ اب تک یہ ہوتا آیا ہے کہ کارکنوں کی رہائش اسی پلیٹ فارم پر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ آئل پلیٹ فارمز کا دیوہیکل سائز ہے۔

یہ اتنے بڑے ہوتے ہیں اور ان کی مختلف منزلوں کے درمیان اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ ان میں کئی سو افراد کی رہائش کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ مگر اسی وجہ سے یہ پلیٹ فارم کسی حادثے کی صورت میں بے پناہ جانی نقصان کا سبب بن جاتے ہیں۔ عام طور سے ایک آئل رگ پلیٹ فارم پر کارکنوں کی تعداد ڈھائی سے تین سو تک ہوتی ہے۔ ایک وقت میں آپریٹ کرنے والے کارکنوں کی تعداد عموماً ایک تہائی سے بھی کم ہوتی ہے کیونکہ دس سے پندرہ فیصد کارکن یا افسران آٹھ سے چھ تک ڈیوٹی کرتے ہیں اور ان کی شفٹنگ کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ پلیٹ فارم کے آپریشن سے ان کا براہ راست تعلق نہیں ہوتا ہے۔

گویا کسی بھی آئل رگ پلیٹ فارم پر ستر فیصد عملہ چھٹی پر ہوتا ہے اور دن کے اوقات میں بھی ساٹھ فیصد عملہ چھٹی پر ہوتا ہے وہ اپنے کمروں میں آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ جس میں کھانے پینے میں مصروف ہوتے ہیں یا پھر تفریحات میں لگے ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ ڈیوٹی سے آف ہوتے ہیں۔ وہ ان تمام خطرات کے بہت نزدیک ہوتے ہیں جن سے ڈیوٹی پر موجود کارکن دوچار ہوتے ہیں۔ اس لیے حفاظتی ماہرین نے تجویز پیش کی ہے کہ ان کارکنوں کی رہائش کے لیے الگ پلیٹ فارم بنایا جائے۔ جو آئل پلیٹ فارم سے اتنے فاصلے پر ہو کہ کوئی بھی حادثہ اسے متاثر نہ کر سکے اور کسی حادثے کی صورت میں کم سے کم آف ڈیوٹی کارکنان محفوظ رہیں کیونکہ عام طور سے سمندر میں پلیٹ فارم بنانا نہایت مہنگا پڑتا ہے۔ اس لیے اگر کارکنوں کے لیے الگ سے پلیٹ فارم بنایا جائے تو اس سے آئل رگ پلیٹ فارمز کی لاگت بہت بڑھ جائے گی اور اس شعبے میں مستقل سرمایہ کاری رک جائے گی۔

اس لیے ماہرین نے اس مقصد کے لیے پلیٹ فارم کی بجائے چھوٹی بحری پلیٹ فارمز کی تجویز دی ہے جو یقیناً مستقل پلیٹ فارم کے مقابلے میں بہت سستے پڑیں گے اور کسی ہنگامی صورت حال میں انہیں آئل پلیٹ فارم سے مزید دور بھی لے جایا جا سکے گا۔ اس طرح کسی شدید سمندری طوفان کی موجودگی میں کارکن پلیٹ فارم پر پناہ لے سکیں گے جو یقیناً بحری جہاز کے مقابلے میں کہیں محفوظ ہوگا لیکن اس سے یہ کہنا مشکل ہے کہ مستقبل میں حادثات رک جائیں گے۔ خطا کرنا حضرت انسان کا شیوہ ہے اور جہاں کہیں انسان ہوگا خطا کا امکان تو ہوگا۔

خطائے کپتان

کہرے کا قہر

صائمہ اقبال

اس کپتان کو یہ زعم تھا کہ وہ اپنے کام کا ماہر ہے اور یہی زعم اسے لے ڈوبا۔ دو جہاز آمنے سامنے تھے مگر اسے یہ غرور تھا کہ میں اپنے جہاز کو بہ آسانی نکال لے جائوں گا لیکن ہوا الٹا، اس کا جہاز سمندر میں ہی وادیٔ موت کی آبیاری کا سبب بن گیا۔

ایک معمولی سی خطا نے بڑے حادثے کو جنم دے دیا

اسے سمندر سے عشق تھا۔ جوار بھاٹا اس کی دھڑکن تیز کر دیتا۔ لہروں کا شور سن کر دل میں جل ترنگ بجنے لگتے۔

وہ پیدائشی جہاز راں تھا۔ عرشے پر کھڑے ہو کر ڈوبتے سورج کا نظارہ کرنا اس کے لیے ایک مسحور کن عمل تھا۔ صبح صادق جب سمندری پنچھی اڑان بھرتے، جب وہ مچھلیوں کا شکار کرتے تب وہ ریلنگ پر ہاتھ ٹکا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کے سامنے بے کراں سمندر ہوتا جس کی خوشبو بندرگاہوں کی مہکتی بو سے یکسر مختلف تھی۔ اس میں لطافت اور مسرت کا احساس

گنوا بیٹھے۔

ہنری جارج کینڈل ان برطانوی جہاز رانوں میں سے تھا جو اپنی قسمت میں شہرت لکھوا کر لاتے ہیں۔ کیسے کیسے کارنامے انجام دیے اس شخص نے۔ مگر اس کا تذکرہ فقط کارناموں تک محدود نہیں۔ کچھ بے حد عجیب و غریب اور پُراسرار واقعات بھی اس کی زندگی کا حصہ ہیں۔

چیلسی اس کا آبائی وطن تھا۔ وہ 1874ء میں ایک بڑے بھرے قصبے میں پیدا ہوا۔ باپ کسان، ماں آیا تھی۔ گھر کے نزدیک جھرنا بہتا تھا۔ جھرنے کا پانی کچھ میل کا فاصلہ طے کر کے دریا میں جا گرتا اور دریا بہتا ہوا سمندر کی آغوش میں چلا جاتا۔

اسی جھرنے کا تعاقب کرتے ہوئے وہ جہاز رانی کی دنیا میں آیا۔ فقط 14 برس کی عمر میں ہنری نے کشتی رانی کا آغاز کر دیا۔ وہ ایک پھرتیلا نوجوان تھا۔ کام کے معاملے میں بھی غفلت نہیں برتتا۔ اسی سفر میں اس کی ملاقات جینی سے ہوئی۔ وہ چنچل سی حسینہ تھی۔ اس کی باتوں میں لہروں کی موسیقی سنائی دیتی اور اس کی چپ میں دریاؤں کا سکون تھا۔ جلد ہی انہوں نے شادی کر لی۔

زندگی اپنی ڈگر پر جاری تھی کہ سن 1900ء کا آغاز ہوا۔ وہ سال ہنری کی خوشیوں بھری زندگی میں پہلا طوفان لے کر آیا۔

اگست کی اس تیرہ و تاریک رات وہ لوسیٹانیا میں ایک بحری جہاز میں نائب افسر تھا۔ جہاز کینیڈین جزیرے نیوفاؤنڈلینڈ کے نزدیک سے گزر رہا تھا کہ اچانک آسمان چنگھاڑا۔ کسی پیشگوئی کے بغیر طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ ہواؤں کے تیز جھکڑ نے بلند لہروں کو جنم دیا۔ اس کا جہاز توازن کھو بیٹھا۔ نچلے حصے میں پانی بھرنے لگا۔ مسافروں اور عملے کو جہاز خالی کرنا پڑا۔ بپھرے ہوئے سمندر میں تیرتی حفاظتی کشتیاں بہ مشکل ساحل تک پہنچیں۔ ہنری جہاز سے اترنے والا آخری شخص تھا۔ اس رات اس نے پہلی بار موت کی سرگوشیاں سنیں۔

ان دنوں بحری حادثے معمول تھے۔ اموات کی شرح جتنی کم ہوتی، اخبارات میں حادثے کا تذکرہ بھی اتنا ہی مختصر ہوتا۔ نیوفاؤنڈلینڈ کے نزدیک رونما ہونے والے واقعے میں چند ہی ہلاکتیں ہوئیں۔ ہنری کا نام اخبارات کے کونوں کھدروں ہی میں جگہ پا سکا۔ ہاں، اس واقعے کے دو برس بعد حالات یکسر مختلف تھے۔ چیلسی کا یہ نوجوان ایک مشہور آدمی بن چکا تھا۔

ہوا کچھ یوں کہ سانحہ نیوفاؤنڈلینڈ کے اگلے ہی ماہ اس کی ملاقات ممتاز اطالوی موجد مارکونی سے ہوئی۔ مارکونی کا ستارہ ان دنوں عروج پر تھا۔ جناب ریڈیو ایجاد کر چکے تھے، اور اب ریڈیو ٹیلی گراف نامی منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ اس کے ذریعے بحری جہاز سے بندرگاہ بروقت اور درست پیغام پہنچایا جا سکتا تھا۔

اس اہم ترین منصوبے کو مکمل کرنے میں جہاں مارکونی کی خداداد صلاحیت نے کردار ادا کیا، وہیں ہنری کی کوششوں کا بھی بڑا دخل رہا۔ تمام تجربات میں وہ اس عظیم موجد کے قدموں سے قدم ملا کر چلا۔ یہ ہنری ہی تھا جس نے بیچ سمندر سے بندرگاہ پر موجود مارکونی کو پہلا ریڈیو ٹیلی گراف روانہ کیا۔

1908ء میں اس دراز قد اور خوش مزاج نوجوان کا نام اخبارات میں جلی حروف میں شائع ہوا تو کینڈل گھرانے کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ آج سے قبل اس خاندان کا کوئی فرد اس مقام پر نہیں پہنچا تھا۔ بیوی بھی مسرور تھی۔ بچے بھی خوش۔ خود ہنری کا یہ حال تھا کہ جہاں جاتا، اخبار کی کاپی جیب میں ہوتی۔ شاید یہ شہرت ہی کا اثر تھا کہ اسی برس اسے ایک مسافر بردار جہاز کی کپتانی سونپ دی گئی۔

بالاخر ریڈیو ٹیلی گراف والے معاملے کا خاصا چرچا رہا۔ اس ایجاد نے بحری سفر کو ایک نئی جہت عطا کر دی تھی۔ جہاز راں برادری اس کی گرویدہ ہو گئی۔ مارکونی کے توسط سے دیگر سائنس دانوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ تاہم ہنری کی شہرت کا سفر ابھی تمام نہیں ہوا۔

1910ء میں جب اسے مونٹروز نامی جہاز کا کپتان مقرر کیا گیا، ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔ ایک الجھی تھی سلجھنے لگی۔

سچ تو یہ ہے کہ 1910ء ہی وہ سال تھا جس نے کسان کے بیٹے کو پورے خطے میں مشہور کر دیا۔

جس برس ہنری نے پہلی بار مونٹروز کی کمان سنبھالی، اسی برس ماہ جنوری میں لندن کے علاقے کیمڈن میں ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا۔

دعوت رات گئے تک جاری رہی۔ خوب ہلا گلا ہوا۔ شوبز کی کئی ہستیاں اور اعلیٰ عہدے دار اس میں شریک تھے۔

اہتمام خاموش طبع ڈاکٹر ہاولے کرپن اور اس کی شوخ و چنچل بیوی کورا نے کیا تھا۔ خیر بردکورا اصل میزبان تھی۔ زیادہ تر مہمان اسی کی دعوت پر یہاں آئے تھے۔ وہ ایک اداکارہ تھی اور لندن کے سماجی حلقوں میں خاصی مقبول بھی جانی تھی۔

یہ امریکی جوڑا 1897ء میں برطانیہ آ کر آباد ہوا۔ کریپن دراصل ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھا۔ امریکا میں تو وہ چار پیسے کما لیتا، مگر برطانیہ میں اس طرز علاج کی پریکٹس غیر قانونی تصور کی جاتی تھی۔ سو وہ ادویہ کی خرید و فروخت کے دھندے میں آ گیا۔ ساتھ ہی ادویہ سازی کے میدان میں نئی نئی اختراع کرنے لگا۔ اس نے کئی گھر بدلے اور آخر کار 1905ء میں ہولووے کے علاقے میں اپنا مکان خرید لیا۔ اسی اثنا میں اس کی بیوی کورا نے بااثر افراد سے دوستی گانٹھ لی۔ تھیٹر شروع کر دیا۔ کچھ معاشقے بھی چلے۔ آج کی دعوت کا آئیڈیا اسی کا تھا۔ اس کے کئی عاشق جام ہاتھ میں لیے گپیں لگا رہے تھے۔

اگلی صبح جب مہمانوں نے فون کر کے اپنی پیاری میزبان کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرنا چاہا تو اس کے نخفی شوہر نے یہ کہہ کر انہیں حیران کر دیا کہ کورا تو آج صبح امریکا چلی گئی۔

بات کسی کو ہضم نہیں ہوئی۔ اس کے دوست اور عاشق باقاعدگی سے کیمڈن روڈ کا چکر لگاتے رہے، جہاں انہیں کورا کا شوہر اپنی کمپنی کی 27 سالہ ٹائپسٹ اتھل کے ساتھ بیٹھا ملتا۔

خوبرو اتھل کی وہاں موجودگی پر تو کسی کو حیرت نہیں ہوئی، مگر پریشان کن امر یہ تھا کہ وہ کورا کے نفیس لباس پہنے ہوئے ہوتی۔ کورا کے زیور بھی اسی کے استعمال میں تھے۔

کورا کئی روز تک نہیں لوٹی۔ ڈاکٹر کریپن نے ملاقاتیوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کی بیوی کیلیفورنیا میں پھیلنے والی ایک وبا میں ہلاک ہو گئی ہے۔ لوگوں کو شک گزرا کہ خاموش طبع ڈاکٹر نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے اور اب اپنی محبوب کے ساتھ گل چھرے اڑا رہا ہے۔

پولیس نے اس معاملے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ بالآخر ایک بااثر گھرانے کی درخواست پر اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سپرنٹنڈنٹ فرینک فورسٹ نے اس کیس پر توجہ مرکوز کی۔ چیف انسپکٹر والٹر ڈیو کو تفتیش کی ذمے داری سونپی گئی۔

وہ چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر ہولووے پہنچ گیا۔ اس نے کریپن کے گھر کی تلاشی لی مگر وہاں اسے کچھ نہیں ملا۔ ڈاکٹر اور اس کی محبوبہ سے بھی پوچھ گچھ ہوئی۔

انسپکٹر ڈیو کا خیال تھا کہ اس کیس میں دم نہیں۔ اس نے ڈاکٹر کریپن کو شک کے دائرے سے خارج کر دیا تھا مگر وہ کچھے ہیں ناں، چور کی داڑھی میں تنکا۔

کریپن اس پورے عمل سے بوکھلا گیا۔ اس کی محبوبہ بھی حواس باختہ ہو گئی۔ انہیں لگنے لگا کہ قانون کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ دونوں نے راتوں رات لندن چھوڑ دیا۔ انہوں نے بندرگاہ کے نزدیک واقع ایک سرائے میں رات گزاری۔

رات بھر دونوں جاگتے رہے۔ جب سورج طلوع ہوا، وہ تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔

دوسری طرف ان کی گمشدگی نے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں کھلبلی مچا دی۔ سینئر افسران انسپکٹر ڈیو کو کوسنے لگے کہ اس نے بروقت اس بدمعاش کو گرفتار کیوں نہیں کیا۔ اب نہ جانے وہ کہاں ہوگا۔

مزید شواہد کی تلاش میں اگلی ہی صبح ڈاکٹر کے گھر چھاپہ مارا گیا۔ باریک بینی سے جائزہ لیا گیا مگر اس بار بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اسی شام چند ماہرین نے گھر کی تلاشی لی۔ پھر ایک بار ناکامی کے عفریت نے قہقہہ لگایا۔

آخر کار انسپکٹر ڈیو یہ کہتے ہوئے گھر میں داخل ہوا کہ یا تو وہ شواہد ڈھونڈ نکالے گا ورنہ خودکشی کر لے گا۔

اسے خودکشی نہیں کرنی پڑی۔ تہ خانے کے فرش کے نیچے انہیں انسانی جسم کی کچھ باقیات ملیں۔ وہ انسانی جسم کا درمیانی حصہ تھا۔ اس میں ایک ممنوعہ دوا کے اثرات بھی پائے گئے۔ کورا کا سر، بازو یا اس کا ڈھانچا کبھی نہیں ملا مگر جتنے بھی شواہد ہاتھ آئے، وہ ڈاکٹر کریپن کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔

البتہ ایک مسئلہ تھا... وہ بدمعاش گدھے کے سر سینگ کی طرح غائب ہو گیا تھا اور لندن کے اخبارات اسکاٹ لینڈ یارڈ پر پھبتیاں کس رہے تھے۔

☆☆☆

کپتان جیری ایک خوش مزاج آدمی تھا۔ قصہ گوئی کی عادت کے طفیل وہ مسافروں میں جلد گھل مل جاتا۔ سائنس اور ادب دونوں ہی موضوعات پر خوب گرفت تھی۔ اکثر عشائیے کے بعد کپتان امرا کے جھمگٹے میں نظر آتا۔

اس کی مقبولیت بے سبب نہیں تھی۔ وہ لوگوں کی نفسیات جانتا تھا مگر اس خشک مزاج بوڑھے روبنسن کے ذہن میں جھانکنے میں وہ یکسر ناکام رہا۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ مسٹر روبنسن ہمہ وقت عینک کے پیچھے سے اپنے خوش شکل بیٹے جیری کو گھورتے رہتے۔ مسٹر روبنسن کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ ہمیشہ وہ نوجوان کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے۔ اگر وہ کسی سے گھلنے ملنے کی کوشش

کرتے تو فوراً ٹوک دیتے۔

ان کی مانند ان کا بیٹا بھی عجیب تھا۔ نفیس کپڑے پہننے والا وہ نوجوان اتنا خوش شکل تھا کہ اس پر کسی عورت کا گمان ہوتا۔ اس کا لہجہ بھی زنانہ تھا۔

فرسٹ کلاس کے ان عجیب و غریب مسافروں کی بابت کپتان ہنری کئی روز متذبذب رہا۔ اسے یقین تھا کہ باپ بیٹا کچھ چھپا رہے ہیں۔ پھر ایک روز... یہ عقدہ کھل گیا۔

انٹیورپ بندرگاہ چھوڑے تیسرا دن تھا۔ کپتان اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، جو ابھی ابھی ایک اسٹیمر کے ذریعے جہاز پر پہنچا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک خبر پر ٹک گئی۔ خبر مفرور ڈاکٹر کریپن اور اس کی محبوبہ ایتھل سے متعلق تھی۔

وہ اچھل پڑا۔ ملزمان بھیس بدل کر اسی کے جہاز میں تو سفر کر رہے تھے۔

اس نے کریپن اور ایتھل کو شناخت تو کر لیا مگر سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ وہ خود کوئی کارروائی کرنے کا مجاز نہیں تھا، تاآنکہ کسی سفری اصول کی خلاف ورزی نہ کی گئی ہو۔ پریشان کن امر یہ تھا کہ اگلے چند روز میں جہاز برطانیہ کی حدود عبور کر کے کینیڈا میں داخل ہونے والا تھا جس کے بعد اسکاٹ لینڈ یارڈ کے اہل کار انہیں گرفتار کرنے کا موقع کھو دیتے۔

اس دوپہر وہ مضطرب اپنے کیبن میں ٹہلتا رہا۔ شام میں جب اس کے نائب نے آکر مطلع کیا کہ کمپنی کی جانب سے ریڈیو ٹیلی پیغام موصول ہوا ہے، وہ بری طرح چونکا۔ اگلے ہی لمحے وہ ریڈیو روم کی سمت دوڑا جا رہا تھا۔

لندن میں بیٹھا ریڈیو آپریٹر کپتان ہنری کا پیغام سن کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ٹیکنالوجی کو کسی مجرم تک پہنچنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جب یہ پیغام انسپکٹر ڈیو تک پہنچا تو وہ مسکرایا۔ وہ ہنری کو جانتا تھا۔

افسر چہکا۔ ”تو مارکونی کا ہاتھ بٹانے کے بعد اب یہ صاحب جرائم کی گتھیاں بھی سلجھائیں گے۔ انہیں اسکاٹ لینڈ یارڈ ہی میں رکھ لو۔“

23 جولائی کی رات ایک تیز رفتار اسٹیمر بحری جہاز کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اس میں بحری عملہ سوار تھا۔ انسپکٹر ڈیو نے ایک جہاز راں کا روپ دھار رکھا تھا۔

اگلی صبح بحری جہاز سینٹ لارنس نہر میں داخل ہو گیا۔ جب وہ فادر پوائنٹ کے علاقے سے گزر رہا تھا، مسافر ناشتے میں مصروف تھے۔ انسپکٹر ڈیو جہاز راں کے روپ میں ہال میں موجود تھا۔ کچھ دیر بعد باپ بیٹا ہال میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور خود کو روبنسن کے طور پر متعارف کروانے والے اس شخص کے نزدیک پہنچ گیا۔

”ہیلو ڈاکٹر کریپن۔ اور آپ شاید مس ایتھل ہیں۔ درست کہا ناں؟“

وہ دونوں بری طرح چونکے۔ جہاز راں نے اپنی ٹوپی اور میک اپ اتار دیا۔ ”انسپکٹر ڈیو۔ آپ کو یاد ہوگا، ہم پہلے بھی مل چکے ہیں جناب۔“

آدمی نے گہرا سانس لیا۔ ”بالآخر یہ قصہ تمام ہوا۔ سچ کہوں تو اب میں تھکنے لگا تھا۔“

ایتھل نے ٹوپی اتار کر بال کھول دیے۔ ڈاکٹر نے ایک نظر اپنی محبوبہ کو دیکھا، پھر اچانک چونکا۔ ”آپ مجھ تک پہنچے کیسے؟“

”مشہور اور معروف کپتان ہنری کینڈل کے طفیل۔“ انسپکٹر نے کسی منجھے ہوئے اداکار کی مانند کہا۔ اس کے پیچھے سے کپتان مسکراتے ہوئے برآمد ہوا۔

”اوہ، تو یہ آپ تھے۔“ آدمی نے دھیرے سے کہا۔ ”آپ کو اس کی قیمت چکانی پڑے گی جناب۔ بہت جلد۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“

”فی الحال تو آپ اپنے لیے دعا کریں۔“ کپتان ہنسا۔ ”آپ شدید مشکل میں ہیں۔“

انسپکٹر ڈیو اور اس کے ساتھیوں نے ڈاکٹر اور اس کی محبوبہ کو اسٹیمر میں سوار کیا اور قریبی بندرگاہ کی سمت روانہ ہو گئے۔

جاتے ہوئے ڈاکٹر نے جہاز کی طرف منہ کر کے تین بار تھوکا۔ ریلنگ کے نزدیک کھڑا نائب کپتان پریشان ہو گیا۔ ”اس نے ہمیں بددعا دی ہے۔ ہمیں... اس کا کچھ توڑ کرنا ہوگا۔“

کپتان ایک عقلیت پسند آدمی تھا۔ وہ تو اس روایت کا بھی قائل نہیں تھا کہ بحری سفر کے دوران میں ایک پالتو بلی لازماً جہاز پر ہونی چاہیے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں بلی کو سمندری سفر کے دوران میں خوش قسمتی کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ سب توہم پرستی ہے۔ اگر بددعائیں اثر کرتیں میرے عزیز، تو دنیا کی آدھی آبادی مٹ چکی ہوتی۔“

اکتوبر میں ڈاکٹر کرپین پر مقدمہ چلا۔ وہ الزامات سے مسلسل انکار کرتا رہا۔ اس کے وکیل نے بھی بہت زور مارا۔ چند اخباری نمائندے بھی اُس کے قائل ہو گئے تھے مگر جیوری نے اسے مجرم ٹھہرا دیا۔

نومبر میں اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اس کی محبوبہ بے گناہ قرار پائی۔ اس کی درخواست پر کرپین کے تابوت میں اُس کی تصویر رکھ دی گئی۔ چند روز بعد قبر پر عجیب الخلقت جنگلی پودا اُگ آیا۔ بعد کے برسوں میں چند لوگوں نے وہاں سسکیاں سننے کا دعویٰ کیا۔

وہ مستقل امریکا چلی گئی۔ جانے سے قبل اس نے برطانیہ کی زمین پر تین بار تھوکا۔ ”مجھے میرے محبوب سے الگ کرنے والوں کو اپنی محبت سے محرومی کا کرب سہنا پڑے گا۔“

تو ہم کہہ رہے تھے کہ کپتان ہنری توہم پرست نہیں تھا... بددعاؤں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ اور وہ جہاز کے عملے پر یقین رکھتا تھا۔ مگر 29 مئی 1914ء کی وحشت ناک رات... اُس کا یقین بری طرح ڈگمگا گیا۔

☆☆☆

پہلی جنگ عظیم سے ٹھیک دو ماہ قبل... کپتان ہنری کی زندگی میں ایک قاتل رات کا ظہور ہوا۔ مگر اس کہانی کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے ”ایمپریس آف آئرلینڈ“ کی بابت کچھ جاننا ہوگا۔ یہ بحری جہاز آج بھی پُراسرار بنا ہوا ہے۔

ایمپریس ایک پُرقوت اور جاذب نظر بحری جہاز تھا۔ اسے فرانسس الگر نامی شخص نے بڑی محنت سے ڈیزائن کیا۔ وہ اسے اپنی شہزادی کہا کرتا تھا۔

1905ء میں اسکاٹ لینڈ میں واقع جہاز سازی کی مشہور کمپنی فیئر فیلڈ شپ بلڈنگ اینڈ انجینئرنگ کو... دو جدید اور تیز رفتار جہازوں کا آرڈر موصول ہوا۔

آرڈر کینیڈین پیسفک اسٹیم شپ کمپنی کی جانب سے دیا گیا تھا جو تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی۔ دونوں جہاز 18 ماہ میں تیار ہو گئے۔

اس 14 ہزار ٹن وزنی جہاز کے لیے کینیڈین کمپنی نے 3 لاکھ پونڈز کی خطیر رقم خرچ کی۔ یہ خوب صورت جہاز لمبائی میں 570 اور چوڑائی میں 66 فٹ تھا۔ صارف کی خواہش پر اس میں طاقتور انجن نصب کیے گئے۔ وہ 18 ناٹ کی رفتار کو آسانی چھو سکتا تھا۔ اس میں 1580 مسافروں کی گنجائش تھی۔ عرشے کا وسطی حصہ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے مختص تھا۔ تھرڈ کلاس والوں کے لیے جہاز کے نچلے حصے میں

گتھی سلجھانے کی ایک اور کوشش

سن 2005ء میں یہ پیچیدہ گتھی سلجھانے کی ایک اور کوشش کی گئی۔ The Last Voyage کے زیرِ عنوان اس موضوع پر ایک ڈاکومینٹری فلم تیار کی گئی۔ پروڈکشن ٹیم نے فلم کی تیاری میں خاصی سنجیدگی برتی۔ تاریخی حوالوں کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ مرسی کمیشن رپورٹ کی اصل کاپی اور دیگر دستاویزات حاصل کی گئیں۔ انہوں نے غوطہ خوروں اور جدید آلات کی مدد سے دریا کی تہ میں پڑے ایمپریس کے ڈھانچے کا بھی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے مدد لی گئی۔

اس فلم میں حادثے کی بنیادی وجہ تو اُس پریشان کن دھند کو قرار دیا ہے جو اچانک ظاہر ہوئی اور پورے منظر پر چھا گئی مگر ساتھ ہی اس میں کپتان ہنری کے فیصلوں پر بھی انگلیاں اٹھائی گئیں۔ ڈاکومینٹری میں موقف اختیار کیا گیا کہ ایمپریس اور اسٹورسٹڈ دونوں ہی کے کپتانوں نے اپنے بیانات میں سچائی بیان کی مگر کپتان ہنری نے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ ان کی تیز رفتاری کا آخر سبب کیا تھا۔ دراصل ایمپریس کا کپتان یہ علاقہ جلد از جلد عبور کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی کمپنی ٹیکس بچا سکے۔ اسی وجہ سے جہاز کی رفتار کم نہیں کی گئی۔ دھند چھٹنے کے بعد بھی دونوں کپتانوں نے غفلت کا ثبوت دیا۔ گو اس وقت تصادم ٹالا تو نہیں جا سکتا تھا مگر نقصانات کی شدت کم ضرور کی جا سکتی تھی۔

اس پروگرام میں جہاز کے برسوں پرانے ڈھانچے کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ پروڈکشن ٹیم نے موقف اختیار کیا کہ کپتان ہنری کا یہ بیان کہ اس نے تصادم کے فوراً بعد روشن دان بند کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا، جھوٹ پر مبنی تھا۔ ماہرین نے تو اس کاوش کو بہت پسند کیا، البتہ توہم پرست حضرات کو مایوسی ہوئی۔ کیونکہ اس میں ڈاکٹر کرپین کی بددعا کا قطعی ذکر نہیں تھا۔

انتظام کیا گیا تھا۔ بعد میں ضرورت کے پیش نظر مسافروں کی گنجائش بڑھا دی گئی۔ جب وہ 26 جنوری 1906ء کو اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوا تو اس میں کل 1915 افراد بہ آسانی سما سکتے تھے۔

جہاز میں ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے ٹھیک ٹھاک انتظامات کیے گئے تھے۔ اس میں 108 لائف بوٹس تھیں۔ ایمپریس کے مالکان نے حفاظتی انتظامات کی جانب بھرپور توجہ دی تھی۔ وقتاً فوقتاً جہاز کی جانچ بھی کی جاتی تھی۔

تین برس تک جہاز کسی الجھن میں پڑے بغیر دریاؤں، سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ اس پر جتنے پیسے خرچ کیے گئے تھے وہ اس سے زیادہ مالکان کما چکے تھے۔ وہ خاصے مسرور تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا کہ 14 اکتوبر 1909ء کی پریشان کن شام آ گئی۔

اس روز جہاز شمالی امریکا کی 2350 میل طویل آبی گزرگاہ دریائے سینٹ لارنس سے گزر رہا تھا۔ دسمبر سے اپریل تک منجمد رہنے والا یہ دریا کینیڈا کے صوبے اونٹاریو اور امریکی ریاست نیویارک کے درمیان سرحد کا بھی کام دیتا ہے۔

اس پرسکون دریا سے گزرتے ہوئے جہاز پر ایک پریشانی اتری۔ کپتان کو زوردار جھٹکا سنائی دیا۔ عملے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جہاز کسی شے سے ٹکرایا تھا۔

"کیا ہو سکتا ہے؟" فرانسیسی کپتان بڑبڑایا۔

خوف زدہ مسافر عرشے پر اکٹھے ہو گئے۔ عملہ دوربین اور آلات لیے اپنے کام میں لگ گیا۔ اگلے ہی لمحے حیرت کی ایک بلند لہر ان سے ٹکرائی۔ جہاز کے اردگرد کسی حادثے کی باقیات نہیں تھیں۔

کسی نے خیال ظاہر کیا کہ شاید جہاز ایک چھوٹی کشتی سے ٹکرایا ہو، جو فوراً ہی پاش پاش ہو گئی۔

کپتان نے یہ نظریہ رد کر دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا ملبہ سطح سمندر پر ضرور نظر آتا۔ پھر کسی نے کہا، شاید جہاز کسی زیرِآب چٹان سے ٹکرا گیا ہو۔

خیال تو یہ بھی ناقص ہی تھا۔ دریائے سینٹ لارنس کے اس حصے میں ایسی کسی چٹان کی موجودگی یکسر غیرامکانی تھی مگر عملے کو کوئی اور مفروضہ نہیں ملا سو انہوں نے اسی بات پر یقین کر لیا۔

چند مورخین کا اصرار ہے کہ جہاز کے ساتھ یہ عجیب واقعہ اسی جگہ پیش آیا، جہاں ٹھیک ایک برس بعد... ایمپریس آف

ڈاکٹر کریپن کو گرفتار کرنے والا تھا۔ درحقیقت وہ جگہ ہی منحوس تھی۔ البتہ اس مفروضے کے حامی کبھی اسے سچ ثابت نہیں کر سکے۔ بہت جلد اس معمولی واقعے کو بھلا دیا گیا۔

مئی 1914ء میں موصول ہونے والی اطلاع کینڈل فیملی کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری تھی۔

کپتان ہنری کینڈل کو ایمپریس آف آئرلینڈ کا کپتان مقرر کر دیا گیا۔ اب وہ ایک مضبوط اور تیز رفتار جہاز کی کمان سنبھالنے والا تھا۔

یہ ہنری کے لیے ایک شان دار موقع تھا۔ جہاز جس کمپنی کی ملکیت تھی، وہ تیزی سے ان گزرگاہوں پر اپنا اثر جما رہی تھی۔ اس کا مستقبل روشن تھا۔

تو کپتان ہنری خوش تھا... مگر یہ خوشی فقط چند ہفتے قائم رہی۔

☆☆☆

28 مئی 1914ء، جمعرات کی شام:

کیوبک کی بندرگاہ پر خاموشی تھی۔ آج زیادہ رش نہیں تھا۔ جبھی معمولی کی رفتار سے گزر رہے تھے۔ لہروں میں خوشگوار دھیما پن تھا۔ مچھلیاں پکڑنے والے شور مچانے کی بجائے بنچ پر بیٹھے انگڑائیاں لے رہے تھے۔

ایمپریس آف آئرلینڈ کی تیز بینی بھی ماحول کا حسن متاثر نہیں کر سکی۔ لنگر اٹھا لیا گیا۔ آہستگی سے جہاز نے بندرگاہ چھوڑ دی۔ گہرے پانی میں آتے ہی اس نے 18 ناٹ کی رفتار حاصل کر لی۔

کپتان ہنری اپنے اندر نئی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ آج سے قبل اس نے کبھی اتنا بڑا اور تیز رفتار جہاز نہیں چلایا تھا۔ یوں تو وہ اس راستے سے کئی بار گزر چکا تھا مگر ایمپریس آف آئرلینڈ کے کپتان کی حیثیت سے یہ اس کا پہلا موقع تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی قسم کی گڑبڑ ہو۔ اسے اپنے مسافروں کا بڑا خیال تھا اور وہ بڑی شدت سے عشائیے کا انتظار کر رہا تھا۔

سمندر کا جائزہ لینے کے بعد وہ کاک پٹ میں داخل ہوا۔ نائب کپتان چارٹ آلات پر جھکا ہوا تھا۔

"ایلی نظر نہیں آ رہی؟" اس نے لاتعلقی سے سوال کیا۔

نائب کا چہرہ اتر گیا۔ ایلی ایک خوبصورت بالنو بلی تھی۔ یہ جہاز ہی اس کا گھر تھا۔ وہ ونی پیگ سے پانیوں کا سفر کر رہی تھی۔ اسے خوش قسمتی کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔

"وہ جہاز پر سوار نہیں ہوئی۔ حالاں کہ ہم نے بہت کوشش کی نہ جانے کون سی مصیبت آنے والی ہے۔" نائب

نے منہ بنایا۔

کپتان نے قہقہہ لگایا۔ "ممکن ہے اسے کسی بلے سے محبت ہوگئی ہو۔"

لیورپول جانے والے اس جہاز پر عملے سمیت 1477 مسافر سوار تھے۔ بڑی تعداد تھرڈ کلاس میں تھی۔ فرسٹ کلاس میں فقط 87 آدمی سفر کررہے تھے اور ان میں دو آدمی انتہائی اہم تھے۔

ایک تو انگریز ڈراما نویس اور ناول نگار لورنس ارونگ تھا۔ انتہائی نفیس اور خوش لباس آدمی۔ رئیسوں سے ٹھاٹ باٹ۔ گفتگو پر خوب گرفت رکھتا تھا۔ دوسرے صاحب ممتاز مہم جو ہنری اسٹون تھے۔ کسرتی بدن۔ تیز نگاہ۔ وسیع تجربے کے حامل اس شخص کے پاس سنانے کے لیے کئی داستانیں تھیں۔ خصوصاً شکار کے قصے بیان کرتا تو سماں باندھ دیتا۔

اس رات کپتان ہنری ان ہی کی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ بعد میں کچھ اور شرفا بھی وہیں چلے آئے۔ شاندار گفتگو ہوئی۔ لورنس صاحب نے عصری ادب پر خیالات کا اظہار کیا۔ اسٹون نے افریقی شیروں کی عادات میں بدلاؤ کی نشان دہی کی۔ ہنری نے اچھے سامع کا کردار ادا کیا۔

وہ دونوں ہنری کو بھی جانتے تھے بلکہ اگر کہا جائے کہ مقبولیت کے معاملہ میں ہنری ان سے کچھ آگے ہی تھا تو کچھ ایسا غلط نہیں ہوگا۔

پہلے میز پر بیٹھے شرفا کے درمیان اس کی سمندری مہمات زیر بحث آگئیں۔ پھر ریڈیو ٹیلی گراف کے استعمال پر بات نکلی۔ آخر میں ڈاکٹر کریپن کا موضوع چھڑ گیا۔

اسٹون نے ان افواہوں سے متعلق بتایا جو ڈاکٹر کی موت کے بعد گردونواح میں پھیل گئی تھیں۔ وہ عجیب و غریب پھول۔ قبرستان میں سنائی دینے والی سسکیاں۔ اچھل کی گوشت خوری اور پھر اس کی بدعا۔

اس نے یہ سب بہت ہی سنسنی خیز انداز میں بیان کیا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی میز پر سناٹا چھا گیا۔ سب کی نظریں کپتان ہنری پر ٹکی تھیں مگر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموشی لورنس ارونگ نے توڑی۔ "میاں اس قصے کی بنیاد پر تو اچھا خاصا پراسرار ناول لکھا جاسکتا ہے۔"

میز پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ تاہم مہم جو بالکل سنجیدہ رہا۔

"کیا آپ بدروحوں پر یقین رکھتے ہیں جناب؟" اس نے میز پر موجود لوگوں سے سوال کیا۔ سب ٹھٹکا گئے۔ وہ متذبذب معلوم ہوتے تھے۔ اقرار تو کسی نے نہیں کیا البتہ جنھوں نے انکار کیا، ان کے لہجے میں زور نہیں تھا۔ آخر میں مہم جو نے کپتان کی سمت دیکھا۔

"نہیں۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں ان خرافات پر یقین نہیں رکھتا۔"

"میں بھی نہیں رکھتا۔" اسٹون نے گردن ہلائی۔ "مگر صاحبو میرے حالیہ تجربات نے میرے یقین پر ایک سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ میں افریقا کے گھنے تاریک جنگلات میں کچھ بے حد عجیب واقعات دیکھ چکا ہوں اتنا عجیب کہ بیان کرنے بیٹھوں تو آپ دوستوں کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔"

"میرے خیال میں اس کے لیے کل کا دن مناسب رہے گا۔" لورنس صاحب مسکرائے۔ "رات خاصی ہوچکی ہے۔"

مہمان ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ کپتان عرشے پر جا کھڑا ہوا۔

آسمان صاف تھا۔ چاند چمک رہا تھا۔ پانی پر جھلملاتی چاندنی آنکھوں کو بھلی معلوم ہورہی تھی۔ ایمپریس آف آئرلینڈ شان سے سمندر کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ کسی جنگ جو کی مانند تھا۔ انتہائی پرقوت اور تیز۔ اس کی کپتانی ہنری اپنے لیے ایک اعزاز تصور کرتا تھا۔ خوشی کے احساس سے وہ گنگنانے لگا۔

جب وہ اپنے کیبن میں پہنچا، اوس پڑنے لگی تھی۔ کپڑے بدل کر وہ بستر پر گر گیا۔ کچھ ہی دیر میں غنودگی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

29 مئی 1914ء، جمعے کی صبح

سردی ایک لخت بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد بادل گرجے۔ کھڑکی سے ہوتی ہوئی نیلی روشنی دیواروں پر پڑی۔ بارش شروع ہوگئی تھی۔ جلد ہی اس میں شدت آگئی۔ اس کا شور ہیبت ناک تھا۔ پانی کمرے میں داخل ہوگیا اور پھر سناٹے میں ایک چیخ گونجی۔

ہنری ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ سر چکرا رہا تھا۔

بستر سے اٹھ کر اس نے بتی روشن کی۔ ایک گلاس پانی پیا۔ آئینہ دیکھتے ہی وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے ایک کپڑے سے ناک پونچھی۔ بے چینی اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔

کپتان نے گھڑی دیکھی۔ ابھی اندھیرا تھا۔ سورج

طلوع ہونے میں بہت وقت تھا۔ وہ کیبن سے نکل آیا۔ عرشہ خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مسافر اپنے بستروں پر تھے۔

جہاز تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ دائیں بائیں گھنے جنگلات تھے۔ طویل قامت درخت ساکت کھڑے تھے۔ رات کے اس پہر ان کی چپ میں عجیب پُراسراریت محسوس ہوئی۔ کپتان ہنری کو یوں لگا، جیسے وہ ان خاموش درختوں کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ مگر کب؟

شاید اسی رات جب اسکیٹر زیو ایک جہاز راں کے بھیس میں اس کے جہاز پر وارد ہوا تھا۔

وہ بھاری قدموں سے کاک پٹ میں داخل ہوا۔ وہاں ایک حیرت اس کی منتظر تھی۔

کاک پٹ خالی تھا۔ وہیل از خود گھوم رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور وہیل سنبھال لیا۔ اسی اثنا میں اس کی نظر آلات پر پڑی۔

وہ بالکل خاموش تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ آج سے قبل اس نے کبھی آلات کو اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ ایسے واقعات تو برمودا ٹرائی اینگل سے منسوب تھے۔

اچانک ایک کھٹکا ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ نائب کپتان جارج اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لیے اسے تک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ تھا۔

''سر آپ اس گھڑی؟'' اس نے سوال کیا۔

کپتان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آلات پر نظر ڈالی۔ وہ معمول کے مطابق کام کر رہے تھے۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ کیا اس کی نظریں دھوکا کھا رہی تھیں۔

''ہم اس وقت کہاں ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

نائب کے چہرے پر الجھن دکھائی دی۔ ''ہم فادر پوائنٹ کے مقام پر پہنچ چکے ہیں سر۔ قصبہ رموسکی کے نزدیک۔ ہمارے دو جہاز راں یہاں اتر جائیں گے۔''

''ہوں۔ ٹھیک ہے۔'' اس نے گردن ہلائی، جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ دل نے سرگوشی کی۔ ''یہاں سے نکل چلو۔ تیزی سے۔''

کچھ ہی منٹوں میں رموسکی کے لائٹ ٹاور کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ ساحل کے نزدیک پہنچ کر جہاز رک گیا۔ عملے کے دو ارکان اسٹیمر میں سوار ہو کر خشکی کی سمت روانہ ہو گئے۔ اس لیے ان دونوں کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنے خوش نصیب ہیں۔

جہاز نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ کپتان کاک پٹ ہی میں رہا۔ اسسٹنٹ کے اصرار کے باوجود وہ اپنے کیبن میں نہیں لوٹا۔ اسے عجیب سی الجھن محسوس ہو رہی تھی اور وہ اس کا سبب نہیں جانتا تھا۔ وہ جلد از جلد فادر پوائنٹ کا علاقہ عبور کر لینا چاہتا تھا۔

وہ عرشے پر آ گیا۔ اس نے مستول پر نظر ڈالی۔ اس کا نوجوان ساتھی دوربین لیے مستعد کھڑا تھا۔ کپتان نے جمائی لی۔ گھڑی کی سوئیاں دو کے ہندسے کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ وہ آرام کرنے کے بارے میں اب سنجیدگی سے سوچنے لگا مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

اُسے کچھ دور ہوا میں تیرتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ کپتان نے توجہ مرکوز کی۔ اچانک اس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

''وہاں کچھ دکھائی دے رہا ہے؟'' اس نے مستول پر کھڑے شخص کو پکارا۔

آدمی نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ کچھ دیر بعد اس کی متذبذب آواز سنائی دی۔ ''شاید کوئی دخانی ہے...''

''شاید سے کیا مراد ہے تمہاری؟'' کپتان جھنجھلایا تھا۔

''دخانی ہی ہے۔'' اس نے تصدیق کی۔ ''پانچ یا چھ میل دور۔''

آدمی درست تھا۔ وہ ناروے کا کوئلہ بردار جہاز اسٹور سٹیڈ تھا۔ اس کی کمان تھامس اینڈرسن نامی ایک جنگلی آدمی نے سنبھالی ہوئی تھی، تاہم اس وقت وہ خواب خرگوش کے مزے اڑا رہا تھا۔ کاک پٹ الفریڈ ٹوفٹنس نامی افسر کے ہاتھ میں تھا۔ کیوبک جانے والے جہاز پر 11 ہزار ٹن کوئلہ لدا ہوا تھا۔

الفریڈ ٹوفٹنس سگار انگلیوں میں دابے عرشے ہی پر کھڑا تھا۔ اس نے ایمپریس آف آئرلینڈ کی روشنیاں دیکھ لیں۔ البتہ اس نے کسی نوع کی پریشانی محسوس نہیں کی۔ موسم اچھا تھا۔ ہوا کی رفتار معمول کے مطابق تھی۔ دریا کے چوڑے پاٹ کے باعث دو جہاز با آسانی ایک دوسرے کے پہلو سے گزر سکتے تھے۔

کپتان ہنری نے بھی اپنے واہمے کو پرے دھکیل دیا۔ اس نے اپنے نائب کو روٹین کی ہدایات جاری کیں۔ ''وہ ہمارے دائیں جانب سے گزریں گے۔ اشارہ دے دو۔''

پھر وہ چائے خانے چلا گیا۔ اس وقت کوئلہ بردار جہاز ساڑھے 4 میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے مستول کی روشنی

صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

جونہی کپتان ہنری نے عرشہ عبور کیا... کچھ عجیب واقعہ رونما ہوا۔ مشرق سے ہوا کا ایک پُراسرار جھکڑ آیا۔ میلوں پھیلے جنگلوں سے دھواں اٹھنے لگا اور وہ ہوا پر سوار وہاں کی سمت بڑھا۔

کچھ ہی منٹوں بعد کہرے کی ایک دیوار ایمپریس آف آئرلینڈ کے سامنے کھڑی تھی۔

☆☆☆

چائے خانے کی کھڑکی سے داخل ہونے والا کہرا تو کپتان کو بہت بعد میں دکھائی دیا، پہلے اسے ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اسی اثنا میں اس نے چائے خانے میں ایک عورت کی سسکی سنی۔

تب وہ پلٹا اور کھڑکی کے باہر چھائے کہرے پر اس کی نظر پڑی۔ چائے کا کپ ہاتھ سے گر گیا۔ وہ دوڑتا ہوا عرشے پر آیا۔

وہ دبیز دھند تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کاک پٹ میں اس کا نائب باہر پھیلے اس عجیب سے دھویں کو دیکھ رہا تھا۔ کپتان کو دیکھ کر وہ بڑبڑایا۔ ”عجیب اس موسم میں کہرا۔ عجیب ہے۔ کیا پتا، کچھ دیر بعد برف باری بھی شروع ہوجائے۔“

کپتان نے اس کے جملے کی جانب توجہ نہیں دی۔ اسے ایک فکر کھائے جارہی تھی۔ ایک جہاز اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اس نے مستول پر کھڑے شخص کو پکارا۔ ”کچھ دکھائی دیتا ہے۔“

”نہیں۔“ اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ ”کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حدِ نگاہ صفر ہے۔“

”سب خیریت تو ہے؟“ یہ غیر متوقع آواز مسٹر لورنس کی تھی، جو کہرے کے درمیان شب خوابی کے لباس میں کھڑے آنکھیں مل رہے تھے۔

”جی ہاں، سب خیریت ہے۔“ کپتان خوش دلی سے مسکرایا۔ ”آپ کو تو اس وقت بستر میں ہونا چاہیے تھا۔“

”ہاں۔“ آدمی نے جمائی لی۔ ”نیند ٹوٹ گئی تھی تو چہل قدمی کے لیے نکل آیا۔ صبح ملتے ہیں۔“

آدمی جانے کے لیے مڑا، مگر اچانک ٹھٹکا۔ اس نے پلٹ کر کپتان کی سمت دیکھا۔ ”آپ نے کچھ کہا جناب؟“

”میں نے؟“ وہ چونکا۔ ”نہیں جناب۔“

”اچھا...“ وہ حیران نظر آتا تھا۔ پھر کاندھے اچکائے۔

”خیر عزیز اجازت۔ اوہ... بہت کہرا ہے۔“

اور سیدھا اپنے کیبن کی سمت چلا گیا۔ کپتان نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ اسے دور کہرے میں ایک ہیولا دکھائی دیا، مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ ہیولا کسی جہاز کا ہے یا فقط اس کا وہم ہے۔

وہ متذبذب تھا۔ کیا اسے جہاز روک دینا چاہیے؟ یا اسی رفتار سے آگے بڑھتے رہنا چاہیے؟

اچانک وہم ٹوٹا۔ اسے کوئلہ بردار جہاز کی تیز سیٹی سنائی دی۔ شاید وہ نزدیک پہنچ چکا تھا۔

جہاز کے عملے میں ہلچل مچ گئی۔ کپتان نے انجن بند کرنے کا حکم جاری کردیا۔ البتہ اس نے ہدایت کی کہ جہاز کے پچھلے پنکھوں کی رفتار بڑھا دی جائے۔

نائب کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس عجیب و غریب حکم کا مطلب پوچھے۔ سوال کرے کہ انجن بند کرنے اور پنکھوں کی رفتار بڑھانے سے کیا حاصل ہوگا، مگر اضطراب ایسا تھا کہ سوال کرنے کی بجائے وہ انجن روم کی طرف دوڑ پڑا۔

کچھ دیر بعد ایمپریس آف آئرلینڈ کی سیٹی تین بار کہرے میں گونجی۔ یہ ایک سگنل تھا، جس کا مطلب تھا کہ جہاز اپنا انجن بند کرچکا ہے۔

جواب میں سنائی دینے والی سیٹی نے اضطراب بڑھا دیا۔ وہ اسٹاربورڈ دائیں جانب سے سنائی دی تھی اور... وہ بے معنی تھی۔ اس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔

کیا وہاں کوئی اور جہاز بھی تھا؟

کپتان گہری سوچ میں تھا۔ اگلے ہی پل دائیں جانب سے پھر سیٹی کی آواز سنائی دی۔

اس نے پھر دوربین اپنی آنکھوں سے لگائی۔ اچانک دھند چھٹنے لگی۔ منظر کچھ صاف ہوا... اور تب عملے کی چیخیں نکل گئیں۔ کوئلہ بردار جہاز ان سے فقط 100 میٹر دور تھا۔ اس کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں اور وہ پوری رفتار سے ان کی سمت بڑھ رہا تھا۔

کپتان ہنری میگا فون پر چلایا۔ ”اپنا جہاز پیچھے لے جاؤ۔ جہاز پیچھے لے جاؤ۔“

وہ نائب کی سمت مڑا۔ ”انجن چالو کردو۔ پوری رفتار سے۔“

”مگر وہ...“ وہ گھبرا رہا تھا۔

”جو میں کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔“ وہ دہاڑا۔ ”وقت کم ہے۔“

اس نے پھر کونلہ بردار جہاز کے کپتان کو مخاطب کیا۔

"اپنا جہاز پیچھے ہٹاؤ۔"

دوسری جانب اسٹور سٹینڈ میں سراسیمگی پھیلی تھی۔ انچارج دوڑتا ہوا کپتان اینڈرسن کے کیبن میں گیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا عرشے پر آ گیا۔ سمندر پر چھائی دھند دیکھ کر اس کی نیند ہوا ہو گئی۔

"لعنت ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"ایمپریس کے انجن بند ہیں۔" انچارج افسر بڈ نے اسے بتایا۔

"انہیں جوابی سگنل دو۔" کپتان نے کہا۔

"جوابی سگنل بھی دے دیا، مگر دقت یہ ہے کہ دھند کے باعث کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔"

کپتان اینڈرسن نے اپنے تجربے کے مطابق ہدایات جاری کیں۔ اسے یقین تھا کہ دونوں جہاز بحفاظت ایک دوسرے کے پہلو سے گزر جائیں گے۔

مگر دھند چھٹنے کے بعد اسٹور سٹینڈ کے عملے نے جو کچھ دیکھا، اس نے ان کے اوسان خطا کر دیے۔

ایمپریس کے اگلے اور پچھلے دونوں مستولوں کی روشنیاں ان کے سامنے تھیں۔ یعنی وہ عین راستے میں آڑا کھڑا تھا۔ کونلہ بردار جہاز کا کپتان چلایا۔ "جہاز کا رخ موڑو۔ جہاز کا رخ موڑو۔"

لیکن بہت دیر ہو چکی تھی... حادثہ قریب آ گیا تھا۔

☆☆☆

خوفناک دھماکا ہوا۔

مسافر گہری نیند سے جاگ گئے۔ عورتیں چلانے لگیں۔ کیبن سے بچوں کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ کچھ آدمی حالات کا اندازہ لگانے کے لیے گاؤن پہنے باہر آ گئے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

کونلہ بردار جہاز ایمپریس کی دائیں جانب ٹکرایا تھا۔ تصادم شدید تھا۔ ٹکر سے 25 فٹ اونچا اور 14 فٹ گہرا شگاف پڑ گیا۔ برفیلا پانی تیزی سے اندر داخل ہونے لگا۔

عرشے کی سمت جانے والے راستے اکتائے ہوئے مسافروں کو قطعی علم نہیں تھا کہ ان کے پاس اب کتنا کم وقت بچا ہے۔

ٹکراؤ کے وقت کپتان ریلنگ کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔ ہنری نے اوپر سے دیکھا، کونلہ بردار جہاز کی ناک ایمپریس کے دائیں حصے میں دھنسی ہوئی تھی۔ اب وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے اگلے حصے کو شدید نقصان پہنچا تھا۔

اس نے جھک کر اپنے جہاز کا جائزہ لیا۔ ایک ہیبت ناک شگاف اسے دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔ نچلے حصے سے آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔ تھرڈ کلاس کے کئی مسافر کٹ کر مر گئے تھے۔

اس نے میگافون پر اسٹور سٹینڈ کے عملے کو مخاطب کیا۔ "رک جاؤ۔ پیچھے مت ہٹو۔ شگاف بھر دو ورنہ پانی اندر داخل ہو جائے گا وہاں آ گئے آؤ۔"

ایمپریس کا کپتان جو کچھ کہہ رہا تھا وہ کونلہ بردار جہاز کی کمان سنبھالے تھامس اینڈرسن کے لیے ناقابل فہم تھا۔ ماضی میں دو تین بار یہ نسخہ آزمایا گیا تھا۔ تصادم کے بعد جہاز ایک دوسرے سے دور ہٹنے کی بجائے جڑے کے جڑے کھڑے رہے، اس طرح پانی کو اندر داخل ہونے کی جگہ نہیں ملی۔ مگر اس وقت... معاملہ دیگر تھا۔

ایمپریس ایک بہت بڑا جہاز تھا۔ اور تھامس اینڈرسن کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ وہ نحوست کی لپیٹ میں ہے۔ شاید وہ ڈاکٹر کرپن کی بددعا کی کہانی سن چکا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر وہ اس سے دور نہیں ہٹا تو ایمپریس کی بدبختی اس کے جہاز کو بھی لے ڈوبے گی۔

تو کیا کونلہ بردار جہاز پیچھے ہٹ رہا تھا۔ پانی شور مچاتا ہوا ایمپریس میں داخل ہو رہا تھا۔ اور کپتان ہنری کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ توجہ مرکوز کی۔ خود سے کہا، جس رفتار سے پانی داخل ہو رہا ہے، نچلے درجے غرقاب ہونے میں کم از کم 45 منٹ لگیں گے۔ اگر جہاز کا ڈوبنا طے ہے تو یہ عمل دو گھنٹے ہی میں مکمل ہوگا۔ جہاز پر کل 1477 مسافر سوار ہیں اور ان کے پاس 108 لائف بوٹس ہیں۔

اسے فوراً اطمینان ہوا۔ وہ اپنے مسافروں کی زندگی بچا سکتا تھا۔ "نچلے حصے سے لوگوں کو نکالا جائے۔ تمام مسافروں کو عرشے پر اکٹھا کرو۔ لائف بوٹس تیار کرو۔ ایک بوٹ میرے سیف میں رکھی..."

ابھی اس نے یہ جملہ ادا کیا ہی تھا کہ جہاز نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ فوراً دائیں جانب جھک گیا۔

"یہ اتنی جلدی نہیں ڈوب سکتا۔" اس نے خود سے کہا۔

اس کے نائب نے مسافروں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ لائف بوٹس کی رسیاں کھولی جانے لگیں۔ ایسے میں ایک سراسیمہ شخص دوڑتے ہوئے آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں

اتر رہی تھیں۔

"زہ... وہ نچلا حصہ..."

جہاز کو ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ مزید دائیں جانب جھک گیا۔ کپتان اپنا توازن کھو بیٹھا۔ آرتی نے اسے سنبھالا۔

"حضور، غضب ہو گیا۔ تھرڈ کلاس میں... پانی بھر گیا ہے... کئی مسافر ڈوب..."

"کیا؟" لہجے میں غیر یقینی تھی۔ "مگر یہ کیسے ممکن ہے؟"

اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ صدمے سے سیاہ ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ بدبختی نے انہیں پوری طرح گھیر لیا ہے۔

"روشن دان۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "او خدایا۔"

بحری جہازوں کے نچلے حصے میں ہوا کی آمد و رفت کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا۔ جب گرمی اور حبس ستاتا ہے تو مسافر روشن دان کھول لیتے ہیں۔ جہاز جب بندرگاہ پر ہوتا ہے تو یہ روشن دان کھلے ہی ہوتے ہیں، البتہ گہرے پانیوں کے اصول مختلف ہیں۔ سمندر میں اترنے کے بعد انہیں بند کر دیا جاتا ہے۔ خصوصاً رات میں انہیں کھولنے کی سختی سے ممانعت ہوتی ہے۔ حادثے کی صورت میں ان روشن دان سے داخل ہونے والا پانی جہاز کے لیے سم قاتل ثابت ہو سکتا ہے۔

بدقسمتی سے... ایمپریس آف آئرلینڈ کے ساتھ یہ حادثہ رونما ہو چکا تھا۔ سیکڑوں کھلے ہوئے روشن دانوں سے ہزاروں گیلن برفیلا پانی اندر داخل ہو گیا اور یہ پانی کسی عفریت کی طرح جہاز کے نچلے اور نچلے حصے میں پھیل گیا۔

سانحے کے ٹلنے کا امکان اب تک ختم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ابھی چند ہی لائف بوٹس پانی میں اتری تھیں کہ جہاز تیزی سے دائیں جانب جھکا۔ ڈیک پر کھڑے کئی لوگ دریا میں جا گرے۔ ایک لائف بوٹ ہوا ہی میں الٹ گئی۔ درجنوں عورتیں اور بچے سیاہ پانی کے چنگل میں آ گئے۔ موت کے عفریت نے پل بھر میں انہیں نگل لیا۔

"جلدی کرو، مسافروں کو نکالو۔" کپتان چلایا۔

عملے نے رفتار بڑھا دی، مگر اجل کی رفتار ان سے تیز تھی۔ بائیں جانب والا حصہ اس قدر اٹھ چکا تھا کہ وہاں بندھی لائف بوٹس ناکارہ ہو گئیں۔

کوئلہ بردار جہاز کا عملہ دور کھڑا اس ہیبت ناک منظر کو دیکھ رہا تھا۔

جہاز مزید جھک گیا۔ کئی اور افراد اڑتے ہوئے پانی میں جا گرے۔ دو اور حفاظتی کشتیاں الٹ گئیں۔ اب تک فقط

سانحہ ایمپریس کے اثرات

بلاشبہ اس بدقسمت جہاز نے اس نوع کی توجہ حاصل نہیں کی جو دو برس قبل غرقاب ہونے والے ٹائی ٹینک کے حصے میں آئی مگر اس نے جہاز رانی کی دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

تفتیشی کمیشن کی رپورٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے بحری جہازوں کے اگلے حصے میں چند نمایاں تبدیلیاں کی گئیں۔ یاد رہے کہ یہ کم جثے کے حامل اسٹور سٹیڈ کی ناک تھی جس نے ایمپریس کو ادھیڑ ڈالا، اس میں گہرا شگاف ڈال دیا۔

ماہرین کا خیال تھا کہ اگر جہاز کا اگلا حصہ اوپر سے نیچے تک ایک جیسا ہو (جیسے اسٹور سٹیڈ کا تھا) تو تصادم کی صورت میں دوسرے جہاز کو زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے اسے نوکیلا بنانے کا فیصلہ کیا جو اوپر سے آگے کو نکلا ہوتا ہے۔ بالکل انسانی ناک کی صورت۔ ابتدا میں فقط کینیڈا نے ان تبدیلیوں کا اطلاق کیا مگر بعد میں دیگر ممالک نے بھی اس کی پیروی کی۔

ماہرین نے جہاز کے اس قدر تیزی سے ڈوبنے اور ایک جانب جھک جانے کے معاملے پر بھی تحقیق کی۔ جرمن ریڈ اور ولیم ہوگرو نے اسے تحقیق کا موضوع بنائے رکھا۔ ان کی تجویز کردہ ان میں ایسی ترامیم کی گئیں، جو جہاز میں پانی بھرنے کے عمل کو سست کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔

تین کشتیوں کو بہ حفاظت پانی میں اتارا گیا تھا۔

کپتان ریلنگ پکڑے کھڑا تھا۔ نائب نے چلاتے ہوئے اطلاع دی کہ نچلا حصہ پوری طرح بھر چکا ہے اور وہاں لاشیں تیر رہی ہیں۔

"لائف بوٹس اتارنا ناممکن ہے۔" وہ چلایا۔ "سب ختم ہو گیا۔"

"وہ... سیف..." کپتان کے ذہن میں مسافروں کے زیورات اور رقوم تھیں، جو حفاظت کی غرض سے رکھوائی گئی تھیں۔

ایک دھماکا سنائی دیا۔ لوہا ٹوٹنے کی ہیبت ناک آواز نے دریا نے سینٹ لارنس کو اپنے حصار میں لے لیا۔ سیکڑوں

چیخیں بلند ہوئیں۔ جہاز پوری طرح دائیں جانب جھک گیا۔

اب وہ ڈوب رہا تھا اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا... چند ساعت جہاز یونہی گزار رہا تھا... بائیں حصے کے روشن دانوں سے بہت سے مسافر باہر نکل کر اس کی سطح پر توازن بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فضا میں چیخیں گردش کر رہی تھیں۔ سمندر انہیں نگلنے لگا۔

تصادم کے ٹھیک 14 منٹ بعد وہ منظر سے غائب ہو چکا تھا۔ سطح سمندر پر ملبا تیر رہا تھا۔ سیکڑوں بدقسمت انسان لگ بھگ منجمد پانی میں زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ٹھنڈ ان کی ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔

وہ ایک ہیبت ناک منظر تھا۔ موت کے قہقہے چار سو گونجتے محسوس ہو رہے تھے۔

کپتان ہنری ایک جھٹکے سے پانی میں گرا تھا۔ کاٹ دار ٹھنڈ اس کی رگوں میں داخل ہونے لگی۔ اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ پانی میں گرنے کے بعد وہ پرسکون رہا۔ دھڑکن بڑھنے کی صورت میں اس کا جسم تیزی سے آکسیجن استعمال کرتا اور ڈوبنے کا خطرہ بڑھ جاتا۔ وہ تیرتا ہوا سطح پر آ گیا۔ اس نے ایک بڑے سے تختے کے سہارے خود کو سنبھالا۔ قریب ہی ایک لائف بوٹ تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اس تک پہنچا۔ لوگوں نے اسے اوپر کھینچ لیا۔ کپتان نے ارد گرد پھیلی تباہی پر نظر ڈالی۔ اس نے فوراً ہی اس چھوٹی سی کشتی کی کمان سنبھال لی اور امدادی آپریشن کا آغاز کر دیا۔

انہیں چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ کئی افراد زندہ تھے۔

انہوں نے ڈوبتے ہوئے مسافروں کی جان بچائی۔ لائف بوٹ بھر گئی۔ اسے کوئلہ بردار جہاز کا خیال آیا۔ وہ کچھ فاصلے پر تھا۔ روشنی پھینک کر اس کے عملے کو اپنی جانب متوجہ کیا گیا۔ زندہ بچنے والوں کو بحفاظت وہاں پہنچانے کے بعد ہنری نے مڑ کر دریا کی سمت دیکھا۔

خوف تیزی سے زندگیوں کو نگل رہا تھا۔ ان کے پاس وقت کم تھا۔

لائف بوٹ نے جائے وقوعہ کا رخ کیا۔ بے قسمت مسافر امداد کے منتظر تھے۔ اگلے آدھے گھنٹے میں لائف بوٹ نے کوئلہ بردار جہاز کے کئی چکر لگائے۔

لاشوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کپتان کی نظر لارنس اور گک کے اکڑے ہوئے جسم پر پڑی۔ اس نے ایک سسکی لی۔ مشرقی حصے میں اسے ہنری اسٹون کی لاش بھی مل گئی۔

"اگر بڑ توم اپنے دو بیٹوں سے محروم ہو گئی۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

اچانک اسے روشنی کے دائرے دکھائی دیے۔

امدادی کشتیاں تیزی سے اس سمت آرہی تھیں۔

وہ ریڈیو ٹیلی گراف کی تاریخ کا خوف ناک ترین پیغام تھا۔

ایمپریس سے موصول ہونے والے پیغام نے کنٹرول روم میں کھلبلی مچا دی۔ نیند میں ڈوبا ہوا آپریٹر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کئی فون بجے۔ کینیڈین کوسٹ گارڈز کی جانب سے مدد امدادی کشتیاں روانہ کی گئیں۔

ایوریکا نامی کشتی بجلی کی رفتار سے فادر پوائنٹ پہنچی۔ وہاں تباہی پھیلی ہوئی تھی۔ سانحہ رونما ہوئے آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ برفیلے پانی نے لائف جیکٹیں پہنے بہت سے لوگوں کی جان لے لی تھی۔ کچھ افراد ہنوز سانس لے رہے تھے۔

امدادی کارکن 32 انسانوں کی جان بچانے میں کامیاب رہے مگر کشتی میں فقط زندہ بچے افراد سوار نہیں تھے۔ ان میں کئی لاشیں بھی تھیں۔

لوٹنے کے بعد انہوں نے انکشاف کیا کہ کپتان ہنری زندہ ہے اور وہ ان بدترین حالات کا مقابلہ کر رہا ہے۔

اوریانا نامی کشتی قصبے رموسکی کے ساحل سے روانہ ہوئی۔ وہ لگ بھگ چار بجے لوٹی۔ کشتی لاشوں سے اٹی ہوئی تھی۔ البتہ اس میں کچھ خوش قسمت بھی سوار تھے جو اس پل بھی موت کے خوف سے تھرتھر رہے تھے۔

ہنری کینڈل اور اس کے ساتھی کئی قیمتی جانیں بچا چکے تھے۔ انہوں نے چند لاشیں بھی سمندر سے نکال لیں۔ لاشیں اور زندہ بچ جانے والے افراد ایوریکا کو سونپ کر کوئلہ بردار جہاز کیوبک کی سمت روانہ ہو گیا۔ نقصان کے باوجود وہ سفر کے قابل تھا۔

ایمپریس کے ہولناک سانحے میں فقط 465 افراد ہی زندہ بچ سکے۔ تصادم کے وقت بہت سے لوگ گہری نیند میں تھے۔ ابھی خواب ٹوٹا نہیں تھا کہ اجل نے انہیں دبوچ لیا۔ دائیں اور نچلے حصے میں مقیم مسافر تو پلوں میں موت کی تاریکی میں اتر گئے۔

اصل شکار معصوم بچے تھے۔ جہاز میں کل 138 بچے سوار تھے، جن میں فقط چار ہی کو بچایا جا سکا۔ لگ بھگ ڈھائی سو عورتیں اپنی جان سے گئیں۔ صرف 41 بحفاظت ساحل پر پہنچیں۔

کپتان ہنری نے جہاز ڈوبنے کے ایک گھنٹے بعد اپنی کوششیں ترک کر دیں۔ یخ بستہ پانی میں کسی شخص کا اتنی دیر زندہ رہنا ممکن نہیں تھا۔

اس بدقسمت جہاز میں ایک مسیحی تنظیم The Salvation Army کے ارکان کی بڑی تعداد سوار تھی۔ ان میں سے بھی بہت سوں کی جانیں گئیں۔ اس رات سمندری عفریت نے ایک ہزار افراد کو نگل لیا تھا۔

☆☆☆

چند مورخین ایمپریس کی غرقابی کو ٹائی ٹینک کے سانحے سے بڑا سانحہ گردانتے ہیں، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ٹائی ٹینک کی برعکس اس واقعے کو میڈیا نے زیادہ کوریج نہیں دی۔

مگر کیوں؟ اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں مشہور ہستیاں سوار نہیں تھیں، جب کہ ٹائی ٹینک میں اپنے وقت کے امرا سفر کر رہے تھے۔ پھر ٹائی ٹینک اپنے پہلے ہی سفر میں حادثے کا شکار ہو گیا تھا، جب کہ ایمپریس کئی برسوں سے سمندر میں سفر کر رہا تھا۔

امریکی مورخ جارج گرین کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ ٹائی ٹینک سے جڑی شہرت تھی۔ وہ ایک قوی الجثہ جہاز تھا۔ اپنے عہد کا سب سے بڑا، سب سے جدید اور سب سے تیز جہاز۔ اس کی بابت کئی طرح کے دعوے کیے گئے تھے۔ وہ میڈیا کی توجہ کا مرکز تھا۔ شاید یہی سبب رہا کہ ٹائی ٹینک کا واقعہ تاریخ کا حصہ بن گیا، جب کہ ایمپریس کو لوگوں نے بھلا دیا۔

برطانوی مصنف ایم جے ہیگرڈ کی رائے مختلف ہے اور یہ حقیقت کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ ہیگرڈ کے بہ قول، اس سانحے کو بھلا دینے کا سبب یہ نہیں تھا کہ اس میں معروف ہستیاں سوار نہیں تھیں، نہ ہی یہ وجہ تھی کہ وہ آٹھ برس پرانا تھا... معاملہ بہت سادہ تھا۔

اس سانحے کے فقط دو ماہ بعد آسٹریا کے شہزادے فرڈی نینڈ کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ 28 جولائی کو آسٹریا نے سربیا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

پہلی جنگ عظیم چھڑتے ہی عالمی قوتیں دو حصوں میں منقسم ہو گئیں۔ تصادم اگلے چار برس جاری رہا۔ موت کے عفریت نے ایک کروڑ فوجیوں کو نگل لیا۔ یہ ایک پریشان کن تعداد تھی۔ دو کروڑ آدمی اس جنگ میں زخمی ہوئے۔ بلاکتوں کے درمیان وبائیں پھیلیں۔ انتشار نے جنم لیا۔ کئی حکومتیں عدم استحکام کا شکار ہوئیں۔ کئی ریاستیں اپنا اقتدار کھو بیٹھیں۔

جنگ کے اختتام تک دنیا یکسر بدل چکی تھی۔ ایسے میں یہ توقع رکھنا کہ دنیا ایمپریس آف آئرلینڈ کے سانحے کو یاد رکھے گی، خلافِ عقل ہی ہوگا۔

البتہ ایسا نہیں تھا کہ اس واقعے کو یکسر بھلا دیا گیا۔ کینیڈین حکومت نے اسے سنجیدگی سے لیا۔ جون 1914ء میں قابلِ احترام ماہرین پر مشتمل ایک تفتیشی ٹیم تشکیل دی گئی۔ ممتاز برطانوی قانون داں لارڈ مرسی اس کا سربراہ تھا۔ وہ بحری حادثات کی تفتیش کا ماہر تصور کیا جاتا تھا اور ٹائی ٹینک پر بننے والے کمیشن سمیت اس نوع کی کئی کمیٹیوں کی سربراہی کا تجربہ رکھتا تھا۔

اس کمیشن کو ایک بڑا چیلنج درپیش تھا۔ دونوں بحری جہازوں کے کپتان ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھیرا رہے تھے۔ ایمپریس والوں کا کہنا تھا کہ وہ مخالف جہاز کے دائیں جانب سے گزرنا چاہتے تھے اور اس ضمن میں انہوں نے مروجہ اصولوں کی پاس داری کی۔ کوئلہ بردار جہاز کے عملے کا موقف تھا کہ ہم نے اشارہ دیا تھا کہ ہم ایمپریس کے بائیں جانب سے گزر رہے ہیں اور ہمیں ایمپریس کی جانب سے گرین سگنل بھی دیا گیا۔

بیانات پر انحصار کرنا سم قاتل ثابت ہوتا۔ کمیشن نے تین سوالات پر مشتمل ایک سوال نامہ تیار کیا۔ سوالات یوں تو بہت سادہ تھے، مگر ان کے جواب مسئلے کی جڑ تک پہنچنے میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔

قصوروار کے تعین سے قبل جہاز ڈوبنے کے اسباب کا جائزہ لیا گیا۔ یہ کام نسبتاً آسان تھا۔ تصادم سے ایمپریس کا سب سے کمزور حصہ متاثر ہوا تھا۔ کوئی اور حصہ ہوتا تو شاید اتنا بڑا شگاف نہ پڑتا۔ چند منٹوں میں ہزاروں گیلن پانی اندر داخل ہو گیا۔ روشن دان کھلے رہے۔ عام حالات میں جس جہاز کو ڈوبنے میں ایک گھنٹا لگتا، وہ فقط چودہ منٹ میں دریا کی تہ میں چلا گیا۔

کمیشن کے سامنے 61 گواہ پیش ہوئے۔ ان میں سے 24 افراد کا تعلق ایمپریس کے عملے سے تھا۔ کپتان ہنری بھی گواہوں کی فہرست میں شامل تھا۔ کوئلہ بردار جہاز کے کپتان اینڈرسن سمیت بارہ افراد نے کمیشن کے سامنے گواہی دی۔ مسافروں کے علاوہ سانحے کے وقت قریبی بندرگاہ پر موجود افراد نے بھی اپنے بیانات قلم بند کروائے۔

دورانِ تفتیش جب کپتان ہنری کا کپتان اینڈرسن سے سامنا ہوا، اس نے باآوازِ بلند کہا۔ ”تم نے میرا جہاز ڈبو دیا۔ تم سیکڑوں افراد کی موت کے ذمے دار ہو۔“

☆☆☆

گواہوں کے بیانات سننے اور شواہد کا جائزہ لینے کے بعد بھی کمیشن قصوروار کا تعین نہیں کر سکا۔

تب عزت مآب ارکان نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ دھند چھانے کے بعد کس جہاز نے اپنا رخ تبدیل کیا۔ اُن کے نزدیک اسی فعل نے تصادم کی راہ ہموار کی۔ اور اس کا ذمے دار کوئی ایک کپتان تھا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ کسی ایک شخص نے بھی اس بات پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس رات دھند نازل کہاں سے ہوئی۔

خیر، بڑی سوچ بچار ہوئی۔ مباحثے ہوئے۔ دلائل دیے گئے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کوئلہ بردار جہاز تھا جس نے کہرا چھانے کے بعد اپنا رخ تبدیل کیا۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا۔ ”جب دونوں جہاز روبرو آئے، تو وہ ایک ایسی پوزیشن میں تھے، جہاں وہ بغیر کسی الجھن بہ آسانی ایک دوسرے کے پہلو سے نکل جاتے... مگر دھند چھانے کے بعد اسٹورسٹیڈ نے اپنا رخ بدل لیا۔ یہی سبب ہے کہ دھند چھٹنے کے بعد ایمپریس نے اسے اپنے روبرو پایا۔“

اصل ذمے داری کوئلہ بردار جہاز کے چیف آفیسر الفریڈ پر عائد کی گئی۔ کمیشن کا الزام تھا کہ وہ نہ صرف حالات کو سنبھالنے میں ناکام رہا بلکہ بروقت اپنے کپتان کو مطلع نہ کر کے بھی ایک بڑی غفلت کا مرتکب ہوا۔

اس فیصلے نے اسٹورسٹیڈ کے کپتان اینڈرسن کو آگ بگولا کر دیا۔ اس نے فیصلہ سننے کے بعد واشگاف الفاظ میں کمیشن کے سربراہ لارڈ مرسی کو نرا احمق قرار دیا اور کہا کہ وہ جلد ایمپریس کے مالکان کے خلاف مقدمہ دائر کرے گا۔

کینیڈا کے ساتھ ساتھ ناروے میں بھی اس کیس سے متعلق ایک کمیشن بنا تھا۔ وہاں بھی بیانات قلم بند ہوئے، تفتیش ہوئی۔ ان کی رپورٹ مرسی کمیشن کی تحقیقات سے یکسر مختلف تھی۔ ناروے والوں نے اسٹورسٹیڈ کے عملے کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے سارا الزام کپتان ہنری کے سر تھوپ دیا۔ دونوں ہی ممالک اپنے جہاز راں کو بچانے میں لگے ہوئے تھے۔

ایمپریس کے مالکان ناروے والوں کی رپورٹ خاطر میں نہیں لائے۔ مرسی رپورٹ ہاتھ میں لیے وہ عدالت چلے گئے۔ انہوں نے اسٹورسٹیڈ کی کمپنی اے ایف کیلوفنس کے خلاف کیس دائر کر دیا۔ مقدمے میں انہیں کامیابی ملی۔ الف اے کیلوفنس والوں کو بیس لاکھ ڈالر کا ہرجانہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ جواب میں انہوں نے ایمپریس کے مالکان کو پچاس ہزار ڈالر کا نوٹس بھجوا دیا۔ ان کا موقف تھا کہ ایمپریس کے کپتان کی غفلت کی وجہ سے انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

واضح رہے کہ اس وقت تک اسٹورسٹیڈ کی مرمت ہو چکی تھی اور اسے سمندر میں اتار دیا گیا تھا۔

الف اے کیلوفنس کے موقف کو عدالت نے درخوراعتنا نہ جانا۔ مقدمہ خارج کر دیا گیا۔ کمپنی نے اعلان کر دیا کہ وہ ہرجانہ کی بھاری رقم ادا کرنے کے قابل نہیں۔ انہوں نے ایک معاہدے کے تحت اسٹورسٹیڈ کو کینیڈین حکام کے حوالے کر دیا جنہوں نے اسے ایک لاکھ 75 ہزار ڈالر میں فروخت کر دیا۔

خریدنے والی کمپنی نے اس جہاز کو جنگ عظیم اول کی بھٹی میں جھونک دیا۔ دوران جنگ 8 مارچ 1917ء کو اٹلانٹک سمندر میں یہ دشمن کی توپوں کی زد میں آ گیا۔ کہتے ہیں اسے غرق ہونے میں بھی کل 14 منٹ ہی لگے تھے۔

اس حادثے نے اسٹورسٹیڈ کے چیف آفیسر الفریڈ کا کیریر تباہ کر دیا۔ وہ گمنامی میں چلا گیا۔ 1918ء میں نیویارک سے اس کی موت کی خبر موصول ہوئی۔

اس کے رشتے داروں کا بیان تھا کہ وہ آخری وقت میں بھی نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھا۔

☆☆☆

کیا اس سانحے کا ذمے دار اسٹورسٹیڈ کا عملہ تھا؟ کپتان ہنری کینڈل یکسر بے قصور تھا؟ اس کی کوئی خطا نہیں تھی؟

ایک بڑا طبقہ ان سوالوں کے جواب نفی میں دیتا ہے۔ انہیں کپتان ہنری سے کئی شکایات ہیں۔ پہلا اعتراض تو یہی ہے کہ اس نے روشن دان بند نہ کر کے ایک بھیانک غلطی کی۔ اگر وہ یہ غفلت نہ برتتا تو جہاز میں موجود 108 لائف بوٹس شاید تمام جانیں بچا لیتیں۔

ایک مسئلہ جہاز کی رفتار بھی رہا۔ مگر اس معاملے پر جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد ہی توجہ دی گئی۔ یاد رہے کہ اس رات ایمپریس پوری رفتار سے تیر رہا تھا۔ عام حالات میں تو ٹھیک ہے مگر رات کے اوقات میں احتیاطاً رفتار گھٹا دی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کپتان ہنری کو کس بات کی جلدی تھی۔ کچھ محققین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ایمپریس ہی نے اپنا رخ تبدیل کیا تھا اور کپتان ہنری اسٹورسٹیڈ کی جانب سے دیے جانے والے سگنلز کو یکسر نہیں سمجھ سکا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کئی شواہد کپتان ہنری

کے خلاف جا رہے تھے تو اسے بے قصور ٹھہرانے میں اتنی جلدی کیوں کی گئی؟ اس شخص سے جرح کیوں نہیں ہوئی۔ اس کی کارکردگی کا دوبارہ باریک بینی سے جائزہ کیوں نہیں لیا گیا۔

اس کا ایک سبب تھا... اور یہ روانی سبب ہے، جس کے باعث امپریس آف آئرلینڈ کو اتنی جلدی بھلا دیا گیا۔

یہ سارا کھیل جنگ عظیم کا تھا۔ کپتان ہنری کینڈل ایک تجربہ کار جہاز راں تھا اور جنگ چھڑ چکی تھی۔ بحری بیڑوں ہی کو فاتح کا فیصلہ کرنا تھا۔

کینیڈین حکومت کی نظر میں وہ ایک اہم شخص تھا اور پھر... ماضی کی شہرت اس کے ساتھ تھی۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ کپتان کو تمام الزامات سے بری الذمہ قرار دیتے ہوئے جنگ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی وہ خبروں کی زینت بنا رہا۔ دراصل ان ہی دنوں جرمن فوجی بیلجیم میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے 600 افراد کو یرغمال بنا لیا۔ انہیں چھڑانے کے لیے جو آپریشن کیا گیا تھا، کپتان ہنری اس کی کمان سنبھالے ہوئے تھا۔ کامیابی نے اس بار بھی اس کے قدم چومے۔ خوب واہ واہ ہوئی۔

چند ماہ بعد اسے رائل نیوی کے جنگی جہاز کیلی گرین کی ذمے داری سونپی گئی، جس کی تیز رفتاری نے جرمن کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ کئی جہازوں کو غرقاب کر چکا تھا۔ مارچ 1918ء میں جرمن جہازوں نے اس پر ایک زبردست حملہ کیا۔ اس مضبوط جہاز کو ڈبونے کے لیے انہیں خاصی محنت کرنی پڑی۔ حادثے میں 149 افراد کی جان گئی۔ آپ حیران ہوں گے... ہنری کینڈل اس بار بھی بچ نکلنے میں کامیاب رہا۔

یاد رہے کہ جنگ کے دوران میں اس نے بادشاہ کے پیغام رساں کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کا صلہ تو ملنا تھا۔ جنگ کے بعد جہاں حکومت کی جانب سے کئی اعزازات سے نوازا گیا وہیں اس کی کمپنی کینیڈین پیسفک نے اسے میرین سپرنٹنڈنٹ لگا دیا۔ 1924ء تک وہاں رہا۔ پھر لندن میں تبادلہ کروا لیا۔

اس نے طویل عمر پائی۔ 91 برس کی عمر میں جہان فانی سے کوچ کیا۔ اس کی موت کے بعد جو تم میگزین نے اسے شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا... مگر حیرت انگیز امر یہ تھا کہ رپورٹ میں اس کے کارناموں اور زندگی کے دیگر واقعات کا تذکرہ تھا، مگر امپریس آف آئرلینڈ کے بارے میں ایک لفظ

جاپانی پہاڑ اور کوریائی شہر عالمی ورثے میں شامل

اقوام متحدہ نے جاپان کے بلند ترین پہاڑ اور مشہور یادگار ماؤنٹ فیوجی کو عالمی ورثے کا درجہ دے دیا۔ ٹوکیو کے جنوب مغرب میں اس آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی برفباری کی وجہ سے سفید ٹوپی کی مانند لگتی ہے جبکہ اس پہاڑ کی تصویر جاپانی فن مصوری کا خاص پہلو ہے اور اسی وجہ سے اسے دنیا بھر میں شہرت بھی حاصل ہے۔ یونیسکو کا کہنا ہے کہ اس پہاڑ کو عالمی سطح پر ثقافتی اہمیت حاصل ہے اور یہ سیاحوں اور شعرا کو متاثر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں یونیسکو نے شمالی کوریا کے شہر کائی سونگ کو بھی عالمی ورثے کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں قائم کیے گئے اس شہر میں محل، اسکول اور روحانی مزار ہیں اہم مقامات ہیں۔

چینی کا زیادہ استعمال دل کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے: ماہرین

امریکی ماہرین نے کہا ہے کہ چینی کا زیادہ استعمال دل کی صحت کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ ماہرین کے مطابق میٹھے مشروبات اور مٹھائیوں سمیت میٹھی اشیا کا کسی بھی صورت میں زیادہ استعمال دل کی صحت کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے اور دل صحیح طریقے سے اپنا کام سرانجام نہیں دے پاتا جس سے ہارٹ اٹیک کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو بلند فشار خون کی شکایت ہو ان کے لیے چینی کا زیادہ استعمال اور بھی زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔

مرسلہ: یاسمین خان، کرٹ اردو

بھی نہیں تھا۔

جانتم میگزین اس پورے معاملے کو گول کر گیا... مگر کیوں؟

اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

☆☆☆

اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ 1965ء میں کپتان ہنری کینڈل کی موت کے ساتھ یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تو آپ یکسر غلط ہیں۔

دنیا کے دیگر حصوں میں رونما ہونے والے سانحات کے مانند ایمپریس کی غرقابی پر بھی کئی پہلوؤں سے تحقیق ہوئی۔ جنگ عظیم اول کے بعد ایک برطانوی یونیورسٹی کے طلبا نے اس علاقے میں خاصا وقت گزارا۔ وہ اچانک ظاہر ہونے والی دھند کا سبب تلاش کر رہے تھے۔ کئی ہفتوں کی سرتوڑ کوشش کے باوجود کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ وہ مایوس لوٹ آئے۔

پریشان کن امر یہ ہے کہ ان کی واپسی کی اگلی ہی رات... دریائے سینٹ لارنس کا وہ حصہ دھند سے بھرا ہوا تھا۔

اس زمانے میں توہم پرستی عروج پر تھی۔ فادر پوائنٹ سے گزرنے والے کئی بحری جہازوں نے بعد کے برسوں میں ہوائی روشنیاں دیکھنے کا دعویٰ کیا، کچھ نے سطح آب پر مدد کے لیے پکارتے ہوئے انسان بھی دیکھے، جو قریب آنے پر غائب ہو جاتے۔

60 کی دہائی میں سوار آلات کے ذریعے زیر آب آوازیں سننے کی بھی کوششیں کی گئیں۔ ایسی ہی ایک کوشش تین امریکیوں نے کی۔ انہوں نے جو ریکارڈنگ حاصل کی، وہ کسی بچے کے رونے سے انتہائی حد تک مشابہ تھی۔ ماہرین نے اسے جعلی قرار دیتے ہوئے فوراً ہی رد کر دیا، مگر جلد ہی یہ بات مشہور ہو گئی کہ سانحۂ ایمپریس میں ڈوبنے والے بچوں کی روحیں آج بھی آنسو بہا رہی ہیں۔ یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں ہے کہ بہت سے لوگوں نے وہاں ڈاکٹر کرپن کی بدروح دیکھنے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔

تاہم مذکورہ واقعات قابل توجہ نہیں۔ ہر حادثے کے ساتھ اسرار جڑ جاتے ہیں مگر خزانے کے متلاشیوں کا معاملہ دلچسپ ہے۔

جہاز ڈوبنے کے کچھ ہی برس بعد یہ افواہ پھیل گئی کہ مسافروں نے کپتان کی تجوری میں ٹھیک ٹھاک زیورات رکھوائے تھے، جو حادثے کے وقت نکالے نہیں جا سکے۔ یعنی آج بھی سمندر میں ایک خزانہ دفن ہے۔

اس سے قبل کہ حکومت اس تجوری تک پہنچ جاتی، جرائم پیشہ گروہ اور کئی ٹیمیں اس معاملے میں کود گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ایک نواب نے غوطہ خوروں کو اس مقام پر بھیجا۔ زیر آب انہیں شدید مشکلات پیش آئیں۔ جوں جوں وہ جہاز کے نزدیک ہوتے گئے، حد نگاہ گھٹتی گئی۔ دریا کا اندرونی بہاؤ بھی ان کے لیے رکاوٹ بنا۔ انہوں نے جہاز سے چند لاشوں کے علاوہ کئی قیمتی اشیا بازیافت کیں۔ وہ تجوری کے بھی قریب پہنچ گئے تھے مگر جب انہیں اپنے ایک ساتھی کی زیر آب گم شدگی کی خبر ملی تو ان میں سراسیمگی پھیل گئی۔ وہ فوراً سطح آب کی سمت پلٹے۔ کچھ دیر بعد انہیں اپنا ساتھی ایڈورڈ کوسابو بے ہوشی کی حالت میں تیرتا ہوا ملا۔ وہ اسے خشکی پر لے گئے۔ طبی امداد دی مگر اس کی جان بچانے میں ناکام رہے۔

اس افسوس ناک واقعے کے بعد کینیڈین حکومت نے اس مقام پر غوطہ خوری پر پابندی لگا دی مگر خزانے کے متلاشی باز نہیں آئے۔

فرانسیسی غوطہ خوروں کا ایک گروہ فادر پوائنٹ کے علاقے سے ڈاک کے تھیلے اور دو لاکھ مالیت کے چاندی کے سکے حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ یہ ایک پُرخطر آپریشن تھا۔ غوطہ خوروں کی حفاظت کے لیے ڈھانچے میں ایک بڑا سوراخ کیا گیا، تاکہ وہ آسانی سے جہاز میں داخل ہو سکیں۔ بدقسمتی سے اس کوشش میں بھی غوطہ خور سیف تک نہیں پہنچ سکے۔ انہیں ایک طوفان نے آن لیا جس کی وجہ سے انہیں فوراً باہر آنا پڑا۔

1964ء میں کچھ کینیڈین غوطہ خوروں نے قسمت آزمائی۔ ماضی میں یہاں خزانے کی تلاش میں آنے والے افراد کے برعکس وہ جدید آلات سے لیس تھے۔ ان کے پاس وافر مقدار میں آکسیجن تھی۔ سونا تو انہیں نہیں ملا مگر قدیم طرز کی گھنٹیاں ضرور مل گئیں۔ ایک برطانوی میوزیم نے انہیں اچھے داموں خرید لیا۔

دس برس بعد کچھ اور متلاشیوں نے اس مقام کا رخ کیا۔ ان کے ہاتھ ہیرے موتی تو نہیں لگے البتہ ایک ایسی شے ضرور مل گئی جو کسی خزانے سے کم نہ تھی۔ ایمپریس آف آئرلینڈ میں نصب ریڈیو سسٹم مارکونی کا تیار کردہ تھا، جو اس نے اپنے دوست کپتان ہنری کو تحفے میں دیا تھا۔ اس گروہ نے وہ ریڈیو حاصل کر لیا۔ اس جہاز میں ایک نایاب قطب نما بھی نصب تھا، وہ بھی اکھاڑ لیا گیا۔

واپسی میں وہ بہت خوش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ اشیا ٹھیک ٹھاک قیمت پر فروخت ہو جائیں گی۔ جب کسی نے اس گروہ کے سربراہ سے پوچھا کہ جناب آپ تجوری تک کیوں نہیں گئے تو انہوں نے کاندھے اچکائے۔ ”وہاں دھند بہت تھی۔“

ممتاز امریکی ماہر البحر رابرٹ بالیرڈ اس بدقسمت جہاز کے ڈھانچے کا قریب سے جائزہ لینے والا اہم ترین آدمی تھا۔ وہ اس سے قبل ٹائی ٹینک کی باقیات اور مشہور جرمن جنگی جہاز بسمارک کی بھی جانچ کر چکا تھا۔

لوٹنے کے بعد اس نے میڈیا کو بتایا کہ جہاز کا ڈھانچا گارے سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس وقت بھی جہاز میں چند لاشیں ہیں، جنہیں اگر حکومت نے نہیں نکالا تو شاید مستقبل میں خزانے کے کھوجیوں کو یہ کام کرنا پڑے۔

جب پوچھا گیا کہ کیا آپ کو غوطہ خوری کے دوران میں تجوری دکھائی دی؟ تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”حضور میں محقق ہوں، کھوجی نہیں۔“

☆☆☆

”وہ ایک خوش گوار دن تھا۔ آسمان بالکل صاف۔ پانی ٹھہرا ہوا۔ خاصی روشنی تھی۔ ہر شے معمول کے مطابق تھی۔“

آدمی کھانسنے کے لیے رکا۔ بوڑھا ملاح رموگی کا باشندہ تھا۔ اس کے کانچ کے باہر دھوپ چمک رہی تھی۔

”میں اسٹیمر میں بیٹھا تھا۔ جارج پانی میں کودا۔ وہ ایک ماہر غوطہ خور تھا۔ ہم مسلسل رابطے میں تھے۔ دراصل ہم بہت عرصے سے امپریس کے ڈھانچے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہم نے تعین کر لیا تھا کہ تجوری کس جانب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جارج با آسانی تجوری تک پہنچ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کپتان کے کیبن میں ہے۔ وہ تیز دھار آلات لے کر گیا تھا۔ میں اپنے ایئرفون میں ان آلات کی آواز سن سکتا۔ وہ تجوری کا دروازہ کاٹ رہا تھا۔ تب ہی پس منظر میں نے ایک عجیب آواز سنائی۔ ایک عورت کی آواز۔ وہ بے حد صاف تھی... عورت نے میرا نام لیا تھا۔ تام...“

آدمی نے وقفہ لیا۔ رپورٹر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر تذبذب تھا۔ آدمی نے بات کا سرا پکڑا۔

”میں نے جارج کو متوجہ کرنا چاہا مگر اس نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ کچھ دیر تو سکون رہا پھر مجھے ایک دھماکا سنائی دیا... جارج زور سے چلایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے آلات کہیں پھنس گئے ہیں... اگلے ہی لمحے وہ اول فول بکنے لگا۔ اس نے کہا، دیواریں گر رہی ہیں... کیبن سکڑ رہا ہے اور پھر میں نے اس کی دلدوز چیخ سنی۔ میرا دوست کبھی سطح آب پر نہیں آیا۔ سمندری آسیب نے اسے نگل لیا... وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔“

رپورٹر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر تام۔ آپ کی کہانی تو دلچسپ ہے، مگر شواہد کی کمی ہے۔ میں نے بلدیہ اور محکمہ پولیس سے تمام ریکارڈ حاصل کر لیا۔ 1994ء میں ایسا کوئی واقعہ رپورٹ نہیں ہوا۔“

”رپورٹ کون کرواتا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”اس کا اپنا کوئی نہیں تھا۔ وہ تنہا رہتا تھا۔ چند ہی برس قبل امریکا سے یہاں آیا تھا، اسی خزانے کے لیے۔“

”آپ نے بتایا تھا کہ یہ خبر کسی اخبار میں بھی شائع ہوئی تھی۔“

”ہاں ہاں۔“ بوڑھے تام نے گردن ہلائی۔ ”وہاں میرا ایک دوست رپورٹر تھا۔ میں نے اسے پورا واقعہ سنا دیا۔ رپورٹ تو شائع ہوئی، مگر اگلے ہی روز اخبار نے خبر پر معذرت کر لی۔ اخبار کی تمام کاپیاں اٹھا لی گئیں۔“

”مگر کیوں؟“

”شاید حکومت اس خبر کو چھپانا چاہتی تھی۔“

برطانوی صحافی نے سامان سمیٹا اور ہوٹل لوٹ آیا۔ اسے تام کی کہانی میں جان نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ واپس جانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ اتفاق سے اسی شام صحافی کی ایک ریٹائرڈ لائبریرین سے ملاقات ہوئی جس نے یہ انکشاف کر کے اسے حیران کر دیا کہ اس نے جنوری 1994ء کے ایک اخبار میں غوطہ خور کی گم شدگی کی خبر پڑھی تھی۔ ”ہاں، وہ رپورٹ وہاں تھی، مگر اگلے ہی روز وہ اخبار ہمارے لائبریری سے واپس منگوا لیا گیا۔ وہ اب ہمارے ریکارڈ میں نہیں ہے۔“

صحافی کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ دوڑا دوڑا تام کے گھر پہنچا، مگر وہاں تو صف ماتم بچھی تھی۔ بوڑھا رات حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گیا تھا۔

صحافی نے اپنی یہ نامکمل رپورٹ ایک سماجی رابطے کی ویب سائٹ پر ڈال دی۔ وہاں وہ زیادہ توجہ حاصل نہیں کر سکی۔

شاید دنیا سو برس قبل رونما ہونے والے اس ہیبت ناک واقعے کو بھول چکی ہے۔

خطائے رہبر

تلاشِ منزل

ابنِ کبیر

وہ سب ایک نئے راستے کی تلاش میں نکلے تھے، ان کے خیال میں وہ راستہ مختصر ترین تھا مگر حقیقتاً وہ موت کی گود میں پہنچنے کا مختصر راستہ ثابت ہوا۔ اس قافلے کے شرکاء نے انسانی گوشت کھانے کے لیے اپنے ہی ساتھیوں پر ہاتھ صاف کیا۔

رہبر کی معمولی سی خطا نے سب کی موت کا سامان کر دیا

درختوں کے درمیان سناٹا منجمد تھا۔ وحشت ناک سناٹا۔ برف باری نے اُس اجاڑ مقام کی پُراسراریت بڑھا دی تھی کہ موت کے عفریت نے کروٹ لی۔

وہ الاؤ کے گرد بیٹھے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ بھوک اُن کے بدنوں میں رینگ رہی تھی۔ حواس معطل ہوگئے تھے۔ نقاہت نکلنے لگی تھی۔ اصولی طور پر انہیں ڈھے جانا چاہیے تھا مگر وہ تنے بیٹھے رہے۔ وہ گرنا نہیں چاہتے تھے۔ گرنے کا مقصد موت ہوتا۔

کہتے ہیں، بھوک بھیڑیوں کو دیوانہ بنا دیتی ہے، اور جوں جوں فاقے کی طوالت بڑھتی ہے، یہ دیوانگی وحشت میں بدلنے لگتی ہے، وحشت کے اس طوفان میں، موت انہیں غذا فراہم کرتی ہے۔

وہ دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ انگاروں جیسی نظریں ایک دوسرے پر ٹکی ہوتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے انتظار کرتے ہیں۔ انتظار کہ کسی ایک کی ہمت جواب دے جائے۔ کوئی گر جائے... اور جو بدقسمت گرتا، باقی اس پر جھپٹ پڑتے اس کی بوٹیاں نوچ لیتے۔ بھنبھوڑ ڈالتے۔ اور یوں ان کی وحشت اور بھوک مٹ جاتی۔

مگر وہ بھیڑیے نہیں تھے۔ اور یہی المیہ تھا کہ وہ انسان تھے۔ عام انسان۔ اور گذشتہ کئی روز سے بھوکے بھی تھے۔

بدقسمت مسافر ویران برفیلی وادی میں پھنس گئے تھے۔ انسانی آبادی میلوں دور تھی۔ راشن کب کا ختم ہو گیا۔ بار بردار مویشی غذا بن گئے۔ جو تھوڑا بہت شکار میسر تھا، وہ بھی شکم میں اتار لیا۔ اور اب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ بھوک نے انہیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور ایسے میں زندہ رہنے کا فقط ایک امکان تھا۔ فقط ایک کہ وہ ایک دوسرے کو کھانے لگیں!

☆☆☆

ان کی بدقسمتی کا آغاز 16 اپریل 1846ء کو ہوا۔

نو سایہ دار اور مضبوط چھکڑے الونائی سے روانہ ہوئے۔ ان کی منزل کیلیفورنیا کی ریاست تھی۔ 2500 میل کا سفر طے کرنا تھا۔ وہ یکسر لاعلم تھے کہ راستے میں بدبختی کے عفریت کا بسیرا ہے۔

اس سفر کا خیال سب سے پہلے جیمس ریڈ کو سوجھا۔ وہ ایک تاجر تھا۔ اس زمانے میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ کیلیفورنیا امکانات کی سرزمین ہے۔ ریڈ کی بیوی مارگریٹ گذشتہ چند برسوں سے بیمار تھی۔ اسے یقین تھا کہ ساحلی علاقے کی آب و ہوا اس کے لیے سودمند ہوگی۔

سفر سے چند روز قبل ریڈ نے ایک سفری کتابچہ پڑھا۔ اس کا مصنف معروف سیاح لینسفورڈ ہیسٹنگ تھا۔ یہ کتاب بحر اوقیانوس کی بنا پر موجود ریاست اوریگن اور کیلیفورنیا کا سفر اختیار کرنے والوں کی رہنمائی کرتی تھی۔ یوں تو اس نوع کی کئی کتب مارکیٹ میں دستیاب تھیں مگر اس کی ایک انفرادیت تھی۔

اس میں ایک نئے راستے کا تذکرہ تھا۔ ایسا مختصر راستہ جو مسافروں کا بہت سا وقت اور توانائی بچا سکتا تھا۔ جس راستے کی ہیسٹنگ نے نشان دہی کی تھی وہ مغربی صحرا الباسن سے ہو کر گزرتا تھا۔ مصنف کا دعویٰ تھا یہ راستہ کیلیفورنیا جانے والے روایتی راستے سے 400 میل مختصر ہے۔

اس انکشاف نے ریڈ کو مسرت سے بھر دیا۔ اس زمانے میں ذرائع آمد و رفت آج کی مانند ترقی یافتہ نہیں تھے۔ سفر ایک طویل اور اکتا دینے والا عمل ہوا کرتا تھا۔ مہینوں پر محیط ہوتا۔ مسافروں کو دشوار گزار راستے میں موسم کی شدت کا مقابلہ کرنا پڑتا۔

ریڈ روشن مستقبل کی تلاش میں تھا۔ ہیسٹنگ روڈ کے انکشاف کو اس نے خوش قسمتی کی علامت جانا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس پراسرار راستے کو کبھی پرکھا نہیں گیا۔ آج تک کسی انسان نے اسے اختیار نہیں کیا۔ مصنف نے دستیاب معلومات اور افواہوں کی بنیاد پر اس کا خاکہ کھینچا تھا۔ اور یہ خاکہ درجنوں انسانوں کے لیے جہنم کا راستہ ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

سیانے کہتے ہیں، بدقسمت انسان کبھی تنہا نہیں رہتا، وہ جلد ہی اپنے جیسے مزید بدبختوں کو ڈھونڈ لیتا ہے۔

45 سالہ جیمس ریڈ کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس کی مانند اور بھی کئی لوگ بہتر مستقبل کا سپنا آنکھوں میں سجائے مغرب کے لیے رخت سفر باندھ رہے تھے۔ ان ہی میں ڈونر خاندان بھی شامل تھا۔ چند چھڑے چھانٹ بھی تھے۔ کوچوانوں، عورتوں اور بچوں کو ملا کر یہ قافلہ مجموعی طور پر 32 افراد پر مشتمل تھا۔

ریڈ کا خاندان سات افراد پر مشتمل تھا۔ بیوی، چار بچوں اور دو ملازمین کے علاوہ 70 سالہ ساس بھی ہمراہ تھی۔ بوڑھی بے حد کمزور اور نحیف تھی۔ چلنا بھی دشوار تھا مگر وہ اکلوتی بیٹی سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔

ریڈ کو سفری دشواریوں کا اندازہ تھا۔ ان سے نمٹنے کے لیے اس نے اپنے تئیں خاصا انتظام کر رکھا تھا۔ بچیوں کو آرام دہ بنانے پر خصوصی توجہ دی تھی۔ اچھی خاصی چوڑی بگھیاں تھیں۔ ان میں جتے جانور توانا اور جوان تھے۔ پچھلے حصے پر دوہائی چھت، روشن دان، بستر، نشستیں، الغرض وہ شان دار سواری تھی۔ الونائی کے رئیس ہی ایسی بگھیاں رکھا کرتے تھے۔

راشن بھرپور تھا۔ آٹا، چاول، بسکٹ، تیل، پانی... سب ہی چیزیں اکٹھی کر لی گئی تھیں۔ کمبل، گرم کپڑے اور ادویہ بھی ساتھ تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ دریا، صحرا اور پہاڑ عبور کرنے کے علاوہ انہیں دوران سفر برفیلی ہواؤں کا بھی سامنا کرنا پڑے

گی۔

الونی سے روانہ ہونے والا یہ قافلہ نو مضبوط بگھیوں پر مشتمل تھا۔ ریڈ کے اندازے کے مطابق یہ سفر چار ماہ پر محیط تھا۔ پہلی منزل یہ بستی مسوری تھی۔ وہاں کچھ روز آرام کر کے زادِ راہ اکٹھا کرنے اور پھر مغرب کی سمت بڑھ جانے۔

وقت کا انتخاب خوب سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ موسم بہار کی بارشیں ہو چکی تھیں۔ وادی اور جنگلات سرسبز تھے۔ مویشیوں کے لیے وافر مقدار میں چارا موجود تھا۔ برف باری کے آغاز سے قبل ہی وہ اپنی منزل پر پہنچ جاتے۔

بے شک سفر کا خیال پہلے جیمس ریڈ کو سوجھا مگر اس قافلے میں ڈونر خاندان اکثریت میں تھا۔ اسی نسبت سے آنے والے دنوں میں اس قافلے کو ڈونر پارٹی کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔

جارج اور جیکب ڈونر، دونوں سگے بھائی تھے۔ پیشہ زراعت تھا۔ الونی میں سکونت اختیار کرنے سے قبل انہوں نے خاصا سفر کیا۔ کئی جگہ قسمت آزمائی۔ اور اب وہ ایک بار پھر اپنی قسمت آزمانے والے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ سفر ان کی جد و جہد کا اختتام ہوگا۔ وہ اپنی منزل پالیں گے۔

62 سالہ جارج کا گھرانا اس کی بیوی تھمزینی اور پانچ بچوں پر مشتمل تھا۔ 45 سالہ جیکب اپنی خوش شکل بیوی الزبتھ اور سات بچوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

جیکب سفر کا وسیع تجربہ رکھتا تھا۔ پھر اپنے بھائی کے مقابلے میں جوان بھی تھا۔ ان عوامل کے پیش نظر دیے نے ہسٹنگ کی گائیڈ بک اسے سونپ دی۔

یوں 16 اپریل 1846ء کو اس بدقسمت سفر کا آغاز ہوا۔

اور ٹھیک اسی روز... ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مختصر راستے کو انکشاف کرنے والے لینس فورڈ ہیسٹنگ نے کیلیفورنیا سے مشرق کی سمت سفر شروع کیا۔ وہ خود بھی اپنا بیان کردہ راستہ جانچنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک روشن صبح تھی۔ آسمان صاف تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

قافلے کو الونائی سے روانہ ہوئے چوتھا روز تھا۔ وہ ایک گاؤں کے نزدیک سے گزرے۔ دائیں جانب کھیت لہرا رہے تھے۔ مکانات کی چمنیاں کسیلا دھواں اگل رہی تھیں۔

بچے بیدار ہو گئے۔ ناشتے کی تیاری کے لیے درختوں کے ایک جھنڈ میں بگھیاں روک لی گئیں۔ دیگچی اور کیتلیاں چولھوں پر چڑھا دی گئیں۔ ناشتے کے بعد انہوں نے پھر سفر شروع کیا۔

اگلے روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جنگل سے گزرتے ہوئے انہوں نے زرد روشنیاں دیکھیں۔ درختوں کے درمیان کوئی حرکت کر رہا تھا۔ گیدڑ کے رونے کی آواز نے عورتوں کو خوف زدہ کر دیا۔ کوچبانوں نے اسے برا شگون ٹھہرایا۔ البتہ ڈونر بھائیوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔

”خانہ بدوش ہیں۔ اور کچھ نہیں۔“ جیکب نے کہا۔

تین ہفتے بعد وہ مسوری میں داخل ہوئے۔ یہ پہلا پڑاؤ تھا۔ انہوں نے ایک سرائے کرائے پر لے لی۔ مویشیوں کو چارا ڈال کر مرد بازاروں کی سمت چل دیے۔ انہوں نے حجامت بنوائی۔ عورتیں گلیوں میں گھومتی پھریں، نئے کپڑے خریدے۔

قافلے نے مسوری میں دو روز آرام کیا۔ یہیں ان کی ملاقات شکاگو سے تعلق رکھنے والے 35 سالہ چارلس اسٹین سے ہوئی۔ جوان کے ساتھ ہی ہو لیا۔

12 مئی کی صبح انہوں نے مغرب کی سمت سفر شروع کیا۔ اور تب... پہلی آفت ان پر نازل ہوئی۔

ابھی وہ شہر سے نکلے ہی تھے کہ تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ بادل امنڈ کر آئے۔ آسمان پر تاریکی چھا گئی۔ اگلے ہی پل بادل گرجے۔ بچے سہم گئے۔

”طوفان آنے والا ہے۔“ جیکب چلایا۔

انہوں نے رفتار تیز کر دی۔ وہ میدانی علاقے میں تھے۔ کچھ دور درختوں کے جھنڈ تھے مگر سائبان میسر آنے سے قبل ہی طوفان نے انہیں آلیا۔

تیز ہواؤں کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ عورتیں اور بچے بگھیوں کے اندر چلے گئے۔ مردوں نے برساتیاں پہن لیں۔ کوچبانوں نے مضبوطی سے باگیں سنبھال لیں۔

بارش نے ان کا خوب امتحان لیا۔ تیز ہوائیں چھت پر بندھی ٹوکریاں اور کپڑے لے اڑیں۔ جارج کی گاڑی کا ایک پہیہ گڑھے میں پھنس گیا۔ اسے بہ مشکل نکالا گیا۔

درختوں کی گھنی شاخوں نے کچھ سکون ضرور فراہم کیا، مگر اس وقت تک وہ بری طرح تھک چکے تھے۔ طوفان گزرنے تک وہ وہیں ٹھہرے رہے۔

ریڈ کی بیوی مارگریٹ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ اسے اپنی ماں کی فکر تھی۔ وہ بری طرح کھانس رہی تھی۔

آدمی نے اپنی بیوی کو حوصلہ دیا۔ ”طوفان گزر گیا ہے۔ اب کوئی مسئلہ نہیں۔“

ایک ہفتے بعد وہ انڈین کریک نامی قصبے پہنچے۔ وہ میسوری سے سو میل دور مغرب میں تھے۔ وہاں کرنل ولیم رسل اپنے قافلے کے ساتھ خیمہ زن تھا۔ یہ پچاس بگھیوں پر مشتمل ایک بڑا قافلہ تھا۔ کرنل نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ اس نے پیش کش کی کہ اگر ڈونر پارٹی چاہے تو ان کے ساتھ سفر کر سکتی ہے۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد ریڈ، جیکب اور جارج ڈونر نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

کرنل نے کمان سنبھال لی۔ اب جو سفر شروع ہوا تو قافلہ 187 افراد پر مشتمل تھا۔

☆☆☆

موت ابتدا سے ساتھ تھی۔ وہ بے آواز بگھیوں کے ساتھ چلتی تھی۔ اور اب... اس نے پہلا حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مئی کے اواخر میں وہ بگ بلیو نہر کے نزدیک پہنچے۔ 359 میل پر پھیلی یہ نہر موجودہ ریاست کنساس کے شہر میریسویل کے نزدیک بہتی ہے۔ نہر کا پاٹ زیادہ چوڑا نہ تھا۔ عام دنوں میں اسے بہ آسانی عبور کیا جا سکتا تھا مگر وہ عام دن نہیں تھے۔

اس برس بارش توقع سے زیادہ ہوئی تھی۔ پانی چڑھا ہوا تھا۔ گو ان کے پاس تختے تھے جو اسی مقصد کے لیے ساتھ لائے تھے مگر اس وقت نہر عبور کرنا جان لیوا ثابت ہوتا۔ انھوں نے نہر کے کنارے انتظار کا فیصلہ کیا اور یہ انتظار بوڑھی سارا کے لیے خطرناک ثابت ہوا۔

تپ دق میں مبتلا اس عورت پر کھانسی کے طویل دورے پڑ رہے تھے۔ اور یہ بے کار گئیں۔ ٹوٹکے کسی کام نہ آئے۔ 29 مئی کی تاریک رات، جب انھیں خیمہ زن ہوئے چوتھا روز تھا، نہر نے انسانی قربانی قبول کر لی۔ بوڑھی عورت زندگی کی بازی ہار گئی۔

ریڈ کی بیوی سے آہیں بلند ہونے لگیں۔ مارگریٹ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ جیکب اور جارج کی بیویوں نے بمشکل اسے سنبھالا۔

بوڑھی کو نہر کے کنارے ایک درخت تلے دفنا دیا گیا۔

اگلی صبح نہر کا پانی اتر چکا تھا۔ اوروں نے تو اس جانب توجہ نہیں دی مگر کرنل رسل گھبرا گیا۔ وہ ایک توہم پرست شخص تھا۔ اسے بدبختی کی ابتدائی چاپ سنائی دی۔ اس نے شکاگو سے تعلق رکھنے والے چارلس سے بھی اس کا تذکرہ کیا مگر نوجوان ہنس کر ٹال گیا۔

نہر عبور کرتے ہوئے کرنل کھویا کھویا تھا۔ اب اکثر بڑبڑاتا رہتا۔ جارج اور جیکب کو اس کی صلاحیتوں پر شک ہونے لگا تھا۔ کچھ روز بعد اس نے خود ہی قافلے کی کمان چھوڑ دی۔ کرنل کے ایک ساتھی ولیم بوگس کو کپتانی سونپ دی گئی۔

ڈیڑھ کے سفر میں جس چیز نے انھیں سب سے زیادہ ستایا، وہ برسات تھی جو بار بار ان کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی۔ بارشیں بیماریاں ساتھ لائیں۔ بچے اداس رہنے لگے۔ عورتوں کے چہروں سے تھکن عیاں تھی۔

16 جون تک الوانی سے نکلا قافلہ 450 میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ وہ اپنے اگلے پڑاؤ شہر فورٹ لیرمی سے دو سو میل دور تھے۔ خوش قسمتی سے آگے کا راستہ صاف تھا۔ انھوں نے تیزی سے سفر طے کیا۔ وہ 27 جون کو فورٹ لیرمی پہنچے۔ سرائے کے گرم بستروں پر لیٹنے کے بعد سب اپنے اپنے غم بھول گئے۔

جیکب نے حساب لگا کر بتایا، ہم اپنے مقررہ شیڈول سے فقط ایک ہفتے پیچھے ہیں۔

"ایک ہفتے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" جارج ڈونر کے ہاتھ میں جام تھا۔ "اہم بات یہ ہے کہ ہم زندہ ہیں۔"

"تو یہ جام۔" ریڈ نے اپنا گلاس بلند کیا۔ "زندگی کے نام!"

جب ڈونر پارٹی کے مرد شراب سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور عورتیں اپنی بہترین پوشاکیں پہنے گھوم رہی تھیں... سرائے کے ایک کمرے میں کرنل رسل بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔

☆☆☆

فورٹ لیرمی پر 27 جون کا سورج طلوع ہوا۔ پرندے چہچہائے، درخت لہرائے، شہر کے باسی اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

ریڈ جارج کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلا۔ وہ دونوں اپنے سفری تجربات بانٹ رہے تھے کہ ایسے میں کسی نے جیمس ریڈ کو پکارا۔ "جناب ریڈ۔ یہ آپ ہی ہیں ناں۔ تھوڑی حیرت کر گئی۔"

جیمس مڑا۔ اس کا ایک واقف کار کلیمین راجر سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ دونوں گرم جوشی سے ملے۔ ریڈ نے جارج ڈونر کا تعارف کروایا اور وہ ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھے۔ گپ شپ شروع ہوئی۔ جب ریڈ نے اسے بتایا کہ وہ کیلیفورنیا جانے کے لیے 'ہیسٹنگ روڈ' اختیار کرنے والے ہیں، تو اس کے ابرو تن گئے۔

"میں ایسا مشورہ نہیں دوں گا۔" اس نے تیوری کا گھونٹ بھرا۔ "میں مشرقی حصے میں لینڈز ہیسٹنگ کے ساتھ سفر کر چکا ہوں۔ میں نے اس راستے کے بارے میں سنا تھا۔ میرا یقین کریں، معمول کا راستہ ہی بہتر ہے۔ چاہے کچھ وقت لگے مگر تم زندہ سلامت کیلیفورنیا پہنچ جاؤ گے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" ریڈ متذبذب تھا۔

"اس راستے پر تم بگھیوں سے سفر نہیں کر سکتے دوست۔ اسے فقط پیدل عبور کیا جا سکتا ہے، اور یہ عمل بھی خاصا دشوار ہوگا۔ پھر وہاں جا بہ جا گھاٹیاں ہیں۔" اس نے پائپ جلا لیا تھا اور اب ہوا میں دھواں چھوڑ رہا تھا۔ "خدانہ کرے، اگر تم پھنس گئے تو سمجھو برف تمہاری قبر بن جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" جارج نے قہقہہ لگایا۔ "میں سفر کا وسیع تجربہ رکھتا ہوں جناب۔ میرا بھائی جیکب ساتھ ہے اور کچھ باہمت دوست بھی ہیں۔ ہم یہ روڈ عبور کر جائیں گے۔"

"میں دعا کروں گا کہ آپ کا سفر خوشگوار رہے۔" کلیمین کو اس کا یوں ہنسنا تھوڑا ناگوار گزرا۔ اس نے ریڈ سے رخصت لی اور اپنے راستے ہو لیا۔

ریڈ کو اپنے دوست کی کہی باتوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ڈونر برادران کے حوصلے کچھ زیادہ ہی بلند تھے۔ قافلے کا نیا کپتان ولیم بوگس بھی پُراعتماد تھا۔

الوہئی سے نکلا یہ قافلہ قریبی ریاستوں میں خاصا مشہور ہو گیا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ ریڈ اور اس کے ساتھی ہیسٹنگ روڈ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی ان سے آن ملے۔ سب ہی نے کیلیفورنیا کے بارے میں خوش کن قصے سن رکھے تھے۔ سب اپنی قسمت آزمانے کے متمنی تھے۔

سفر شروع ہوا۔ ایک ہفتہ سہولت سے گزر گیا۔ کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

11 جولائی کی صبح انھوں نے ایک گھڑ سوار اپنی سمت آتا دکھائی دیا۔ پہلے خیال گزرا کہ شاید کوئی مسافر ہے مگر پھر پتا چلا کہ وہ پیغام رساں ہے۔ اس کے پاس ڈونر پارٹی کے نام ہیسٹنگ کا ایک خط تھا۔

تجسس ریڈ نے بڑے تجسس سے لفافہ چاک کیا۔ ہیسٹنگ نے سفر کا احوال پوچھا۔ کیلیفورنیا کی چند خصوصیات بیان کیں۔ پورے قافلے کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ اور پھر... اس نے انتہائی انوکھی بات کی۔ "دوستو، کیلیفورنیا کی سمت پوری تیاری سے آئیں۔ جتھے کی صورت۔

آپ تعداد میں جتنے زیادہ ہوں گے، اتنا ہی بہتر ہے۔ میلی کن علاقے کے حکام آپ کو تھوڑا پریشان کر سکتے ہیں۔ بڑے پاجی ہیں۔ کیلیفورنیا سے مشرق کی سمت آتے ہوئے میں نے ایک اور راستہ دریافت کیا ہے۔ انتہائی مختصر۔ یہ گریٹ سالٹ لیک سے گزرتا ہے۔ آپ آگے بڑھتے رہیں۔ میں شہر فورٹ برجر میں آپ کا منتظر ہوں، تاکہ نئے اور مختصر راستے سے متعلق آپ کی رہنمائی کر سکوں۔ الوداع!"

خط پڑھنے کے بعد ریڈ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ متذبذب تھے۔

"ایک اور نیا راستہ؟" جارج نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں، ایسا راستہ جسے وہ خود عبور کر کے آیا ہے۔" ریڈ دھیرے سے مسکرایا۔ وہ ہیسٹنگ پر اعتبار کرتا تھا۔ "اور وہ کچھ میل اُدھر ہمارا منتظر ہے۔"

خط اور اس کے متن کی خبر پورے قافلے میں پھیل گئی۔ اس پر ملا جلا ردعمل آیا۔ جیکب کی بیوی تمر تی بہت دل گرفتہ تھی۔ وہ گزشتہ چند راتوں سے برے سپنے دیکھ رہی تھی۔ کچھ مارگریٹ کی ماں کی موت کا بھی صدمہ تھا۔ پھر آج ہی ملازم نے خبر دی تھی کہ کرنل سٹھیا گیا ہے۔

خورت ہیسٹنگ پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی مگر اسے اپنے شوہر کے فیصلے کو تسلیم کرنا پڑا۔ یہ قافلے کا اجتماعی فیصلہ تھا۔ وہ فورٹ برجر کی سمت بڑھتے رہے۔

☆☆☆

وہ صبح کہرے میں لپٹی تھی۔ بہت دیر بعد سورج ظاہر ہوا۔ ایک بے نام اداسی ہر شخص پر طاری تھی۔

20 جولائی کو وہ لٹل سینڈی ندی دریا کے کنارے خیمہ زن تھے۔ روشنی ہونے سے پہلے قافلے کے کپتان ولیم بوگس نے تین الٹیاں کیں۔ اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ بوڑھا کرنل اس کی عیادت کے لیے آیا۔ نہ جانے ان دونوں میں کیا کھچڑی پکی۔ ناشتے کی میز پر کپتان نے اعلان کر دیا کہ وہ کیلیفورنیا جانے کے لیے روایتی راستہ ہی اختیار کرے گا۔

ریڈ نے یہ سنا تو اس کی حالت یہ تھی کہ چائے کا کپ ہاتھ میں اور حیرت سے منہ کھلا ہوا۔ جب جیکب نے بحث کرنے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"صاحبان، اگر آپ کو اختلاف ہے تو راستہ سامنے ہے۔ آپ فورٹ برجر کی سمت جا سکتے ہیں۔ میں اور میرے ساتھی، جو اکثریت میں ہیں، فورٹ ہال کی سمت جا رہے ہیں۔"

وہ کچھ دیر کو چپ ہوا۔ کرنل اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ پھر سر اٹھایا۔ "میں ایک دوست کی حیثیت سے مشورہ دوں گا

کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ آگے آپ کی مرضی۔"

جیکب کی بیوی لیریلی کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ نقاہت کا شکار یہ شخص درست ہے۔ اسے غیب سے اشارہ ملا ہے۔ وہ سمجھ چکا ہے کہ آگے بدبختی ہے۔ وہ اپنے شوہر اور دیور کو اشارہ کر رہی تھی، مگر وہ دونوں گاؤدی میز پر سر جھکائے بیٹھے رہے۔

بالآخر ریڈ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"اگر ایسا ہے جناب تو..." اس نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ پھر ولیم بوگس کی سمت ہاتھ بڑھا دیا۔ "الوداع۔"

ولیم نے مصافحہ کرنے سے اجتناب برتا۔ "خدا آپ کی حفاظت کرے۔"

قافلہ سکڑ گیا۔ میسوری عبور کرنے کے بعد پچاس بگھیوں اور چھکڑوں پر مشتمل جو گروہ انہیں ملا تھا، وہ روایتی راستے کی سمت گامزن ہو گیا۔

اس نئے گروہ کو جس کی منزل فورٹ برجر کا علاقہ تھا، اب ایک لیڈر درکار تھا۔ بیشتر مرد یورپی امریکن وطن تھے جنھیں رہبر منتخب کرنا اچھا فیصلہ نہیں ہوتا۔ جیمس ریڈ کا خیال تھا کہ وہ کپتانی کا حق دار ہے۔ البتہ اس کے حمایتی کم نکلے۔ سبب اس کا متکبرانہ رویہ تھا۔ وہ ایک خود پسند آدمی تھا۔ دولت کا زعم تھا اسے۔ ڈونر برادران کو لوگ پسند کرتے تھے۔ وہ دھیمے مزاج کے صلح جو لوگ تھے۔ محنت کرنے پر یقین رکھتے۔ قرعہ فال جارج کے نام نکلا۔ ریڈ اس معاملے پر پیچ و تاب کھا کر چپ ہو گیا۔

سفر جاری رہا۔

جیسا کہ پہلے تذکرہ ہوا، اس قافلے، خصوصاً ہیسٹنگ کے شارٹ کٹ والے معاملے نے عوام کی خصوصی توجہ حاصل کر لی تھی۔ صحافی اس اسٹوری کا تعاقب کر رہے تھے۔ ان ہی میں ایڈون برینٹ بھی شامل تھا۔ وہ ڈونر پارٹی سے ایک ہفتے قبل ہی اس وادی کے داخلی حصے تک پہنچ گیا جسے ہیسٹنگ نے اپنا شارٹ کٹ کا پہلا پڑاؤ ٹھہرایا تھا۔ وہ ایک پرپیچ اور اجاڑ راستہ تھا۔ جگہ جگہ رکاوٹیں، نشیب و فراز۔

ایڈون کو فوری اندازہ ہو گیا کہ ڈونر پارٹی کے لیے جن کے ساتھ عورتیں اور بچے بھی ہیں، اسے عبور کرنا بے حد دشوار ثابت ہوگا۔ وہ فورٹ برجر لوٹ آیا۔ اس وقت ڈونر قافلہ وہاں نہیں پہنچا تھا۔ اس نے ریڈ، جارج اور جیکب کے نام خطوط لکھ کر مختلف سرائے کے مالکان کے حوالے کر دیے، جن میں انہیں متنبہ کیا گیا تھا کہ یہ راستہ اختیار کرنے کی غلطی نہ کریں۔

اس نے کچھ روز انتظار کیا، مگر جب کام کا حرج ہونے لگا تو 27 جولائی کو وہ واپس روانہ ہو گیا۔ اتفاق دیکھیے، جس روز اس نے فورٹ برجر چھوڑا، اسی روز ڈونر پارٹی مشرقی دروازے سے شہر میں داخل ہوئی۔

قافلے کا جوش و خروش اس وقت دم توڑ گیا، جب انہیں پتا چلا کہ ہیسٹنگ چالیس بگھیوں پر مشتمل ایک قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے فورٹ برجر سے اپنے شارٹ کٹ کی سمت بڑھ چکا ہے۔ اس نے ڈونر پارٹی کے نام ایک پیغام ضرور چھوڑا تھا۔

"کچھ روز آرام کریں، تازہ دم ہو کر میرے پیچھے ہو لیں۔ خوراک کا وافر مقدار میں انتظام ہونا چاہیے۔"

یہ پیغام انہیں جم برجر کے ذریعے ملا جو علاقے کا جانا مانا شخص تھا۔ اسے گوروں اور مقامی آبادی کے درمیان پل تصور کیا جاتا تھا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اس نے۔ ساری زندگی سفر میں گزری۔ اسے ایک تجربہ کار شخص کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔

صحافی ایڈون کے چھوڑے ہوئے خطوط ڈونر پارٹی تک نہیں پہنچ سکے اور اگر پہنچ بھی جاتے تو چنداں فرق نہیں پڑتا۔ جم جیسے جہاں دیدہ شخص کے دعووں کے سامنے ایک صحافی کے خط کی بھلا کیا اہمیت۔ اس نے پاٹ دار لہجے میں کہا۔

"یہ شارٹ کٹ کسی رحمت سے کم نہیں دوستو۔ لگ بھگ 350 میل مختصر۔ راستہ ہموار ہے۔ مقامی آبادی مہمان نواز۔ کوئی دقت نہیں ہوگی۔ پانی وافر مقدار میں دستیاب ہے۔"

ان معلومات نے ریڈ کا جوش بڑھا دیا۔ اس نے شارٹ کٹ کی حمایت میں ایک جذباتی تقریر کر کے اوروں کو بھی قائل کر لیا۔ انہیں یہ سکون بھی تھا کہ ہیسٹنگ کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ جلد وہ اس تک پہنچ جائیں گے۔ ریڈ کے اندازے کے مطابق ہیسٹنگ کا قافلہ ان سے گیارہ روز پرے تھا۔

انہوں نے چار روز شہر میں قیام کیا۔ اشیائے خورد و نوش خریدیں۔ چھکڑے ٹھیک کروائے۔ 31 جولائی کو وہ روانہ ہوئے۔ ایک اور خاندان ان سے آن ملا تھا۔

اب یہ گروہ 74 افراد پر مشتمل تھا۔ وہ یومیہ دس سے بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر رہے تھے۔

اور موت یومیہ... دس سے بارہ کلومیٹر قریب آتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ماحول میں اداسی تیرنے لگی۔ ہواؤں میں بوجھل پن در آیا۔

جنوب کی سمت بڑھتے ہوئے وہ ورداکو میں داخل ہوئے۔ وہ ایک تنگ اور گہری گھاٹی تھی جس میں چشمے بہتے تھے۔ ان کی مشکلات بڑھ گئی تھیں۔

ہیسٹنگ کے وعدوں کے برعکس یہ راستہ خاصا دشوار تھا۔ رکاوٹیں ظاہر ہونے لگیں۔ اونچے نیچے پہاڑی سلسلے تھے۔ کئی مقامات پر تو چھکڑا بانوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ آرام کرنے کو بھی مناسب جگہ میسر نہیں تھی۔

جیکب کی بیوی مرتھا اس صورت حال پر بہت ملول رہتی تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے شکوہ کیا۔ ”تم لوگ عجیب ہو۔ اوریگن ٹریل کا راستہ اختیار کیوں نہیں کرتے۔ بے شک وہ طویل ہے مگر محفوظ بھی تو ہے۔“

جیکب ہنسنے لگا۔ ”مہارانی صاحبہ، تھوڑی اذیت برداشت کر لیں، کیلیفورنیا پہنچتے ہی آپ کے لیے ایک تخت لے دوں گا، وہاں بیٹھ کر راج کیجیے گا۔“

پھر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”چند ہی روز میں ہم ہیسٹنگ سے جا ملیں گے۔ پھر یہ دقت ختم ہو جائے گی۔“

6 اگست کو وہ دریا کے ویبر پہنچے۔ انہیں دور درختوں کے تنوں پر سفید دھبے نظر آئے۔ قریب جانے پر پتا چلا کہ یہ ہیسٹنگ کے چھوڑے ہوئے خط تھے۔

ہیسٹنگ نے لکھا، وہ اپنے قافلے کے ساتھ ویبر وادی کی سمت بڑھ گیا ہے، ڈونر پارٹی دریا کنارے ٹھہر جائے، وہ جلد متوازی راستے کی نشان دہی کرے گا۔ اس نے لکھا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ سالٹ باسن کا شمالی راستہ اختیار کریں۔“

ریڈ خط پا کر پھولے نہ سمایا۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم صحیح راستے پر ہیں۔“

باقی لوگ نہر کنارے ہی ٹھہرے۔ ریڈ، چارلس اور ولیم کے ساتھ تیز رفتار گھوڑوں پر آگے بڑھا، تاکہ ہیسٹنگ سے مل سکے مگر کچھ ہی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے خود کو انتہائی دشوار وادی میں پایا۔ جگہ جگہ چشمے، سنگلاخ چٹانیں اور بڑے کھابڑ راستے۔ وہاں بگھیوں کا گزرنا محال تھا۔

چارلس کا خیال تھا کہ ہیسٹنگ بھی راستے کی دشواریوں کے باعث واپس لوٹ گیا ہوگا اور اب اس کی کمان میں سفر کرنے والا قافلہ اوریگن ٹریل کے روایتی راستہ پر گامزن ہوگا۔

ریڈ نے اختلاف کیا۔ ”نہیں، وہ آگے بڑھ گیا ہے۔ وہ دیکھو بگھیوں کے نشانات۔“

چند مورخین کا خیال ہے کہ اس مقام سے گھڑسوار چکر بڑھے۔ چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گریٹ سالٹ لیک کے جنوبی کگر پر انہیں قافلہ مل گیا۔ ہیسٹنگ گرم جوشی سے ملا۔ وہ تینوں صاحبان کے ساتھ دریا کے کنارے آیا اور سالٹ باسن کے متوازی راستے کی نشان دہی کی۔ البتہ اکثریت اس واقعے کی صحت پر شک کا اظہار کرتی ہے۔

عام رائے ہے کہ تینوں گھڑسوار واپس نہر کے کنارے لوٹ آئے۔ انہیں کوئی رہبر میسر نہیں تھا۔ اب مستقبل کا انحصار ان کے فیصلے پر تھا۔ شام ڈھلے مردوں کے درمیان اس موضوع پر مذاکرہ ہوا۔ ان کے پاس تین راستے تھے۔ وہ فورٹ برجر لوٹ جائیں اور روایتی راستہ اختیار کریں۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ وہ ہیلین یونگ پارٹی (وہ قافلہ جس کی کمان ہیسٹنگ کے پاس تھی) کے نقوش پا کا تعاقب کرتے ہوئے دشوار گزار ویبر گھاٹی میں اتر جائیں۔ یا پھر ہیسٹنگ کے بتائے ہوئے سالٹ باسن کا روٹ اختیار کریں۔

عورتیں، خصوصاً مرتھا کا تو یہی خیال تھا کہ انہیں لوٹ جانا چاہیے۔ مگر عورتوں کی کون سنتا ہے۔ چارلس اور ولیم نے ویبر وادی کے راستے کی پرزور مذمت کی۔

”وہ تو ناممکن ہے۔“ انہوں نے یک آواز ہو کر کہا۔

سالٹ باسن کا راستہ پُراسرایت کی دھند میں لپٹا تھا مگر جیمس ریڈ کے اصرار پر متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ یہی راستہ اختیار کیا جائے۔

یہ راستہ بھی کم دشوار نہیں تھا۔ وہ تنگ اور گہرا تھا۔ جھاڑیاں، درخت، پتھر ان کے راستے میں دیوار بنے کھڑے تھے۔ کہاں وہ یومیہ دس میل کا فاصلہ طے کر رہے تھے، مگر اب بمشکل ڈیڑھ میل ہی عبور کر پاتے۔ اس کے لیے بھی مردوں کو شدید محنت کرنی پڑتی۔ وہ بار بار بگھیوں سے اترتے، جھاڑیاں کاٹتے، پتھر لڑھکاتے، راستہ بناتے۔

کوہ ہیسٹنگ سے گزرتے ہوئے ایک اور خاندان ان سے آن ملا۔ یہ 57 سالہ مسز فرینکلن گریوس کا گھرانا تھا جو ایک ملازم سمیت نو افراد پر مشتمل تھا۔ وہ تین بگھیوں پر سوار تھے۔

دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے 20 اگست کو ایک ایسی چوٹی پر پہنچ گئے، جہاں سے نیچے جھانک کر وہ گریٹ سالٹ لیک کو دیکھ سکتے تھے۔ وہ ماجرا اور ہیبت ناک تھی۔

☆☆☆

کو وہ سینچ عبور کرنے میں مزید دو ہفتے لگے۔

اس دوران چند چھکڑے بے کار ہو گئے۔ انہیں چھوڑنا پڑا۔ عورتیں تو پہلے ہی تھک چکی تھیں، اب مرد بھی اس راستے کے انتخاب پر شبہات کا اظہار کرنے لگے۔ خوراک کا ذخیرہ گھٹ رہا تھا۔ متوسط گھرانوں کے پاس تو راشن الگ بھگ ختم ہو چکا تھا۔ دو گھڑ سوار بھٹک کر قافلے سے الگ ہو گئے تھے۔ کئی روز بعد جب وہ ملے تو فاقوں نے انہیں ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا تھا۔

25 اگست کو موت کے عفریت نے اس قافلے پر دوسرا حملہ کیا۔

اس وقت وہ موجودہ ریاست اتا کے علاقے کریسنٹ سلو میں تھے۔ ان کے ایک ساتھی لیوک ہلوران نے سینہ جکڑنے کی شکایت کی۔ پھر اس نے چھکڑے سے جھک کر خون کی الٹی کی۔ کچھ پلوں بعد جسم تپنے لگا۔ رات میں اس پر ہذیان کا دورہ پڑا۔ اس کی چیخوں نے قافلے میں سراسیمگی پھیلا دی۔ صبح کی پہلی روشنی میں اس نے آخری سانس لیا۔ اسے پہاڑوں میں ایک درخت تلے دفنا دیا گیا۔

اس واقعے نے لوگوں کو یکدم خوف زدہ کر دیا۔ وہ اب ڈرے ڈرے رہنے لگے۔

ایک روز ٹیمرینی چلا اٹھی۔ ''خدا کی پناہ! اکیس دنوں میں ہم نے فقط 36 میل کا فاصلہ طے کیا ہے۔ میں کہتی ہوں واپس چلو۔''

عورت کی چیخ و پکار سن کر ریڈ خیمے سے باہر آ گیا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مسز جیکب۔ ہمیں یہاں پہنچنے میں تین ہفتے لگے ہیں، ایسے میں لوٹے تو شاید موت ہمیں آ لے۔ پانی اور راشن ختم ہو چکا ہے۔''

اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ اس کے باریش چہرے پر الاؤ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ''صحرا ہمارے سامنے ہے۔ مسٹر ہیسٹنگ کے بیان پر اعتبار کیا جائے، تو یہ فقط دو دن اور دو راتوں کا سفر ہے۔ بے شک دشوار ہے، مگر مختصر۔ میرا یقین کریں، ہم اسے عبور کر لیں گے۔''

پھر ٹیمرینی چپ ہو گئی۔ وہ کہتی بھی تو کیا۔

30 اگست کو یہ کرب ناک سفر دوبارہ شروع ہوا۔

ہیسٹنگ ایک بار پھر غلط ثابت ہوا۔ یہ ایک دوزخی راستہ تھا۔ دن گرم اور راتیں حبس زدہ تھیں۔ ریت توقع سے زیادہ گیلی اور بھربھری تھی۔ کہیں کہیں دلدل کا گمان ہوتا۔ بگھیوں کے پہیے دھنس دھنس جاتے۔ انہیں نکالنے میں خاصا وقت لگتا۔

بیلوں کو جیسے مصیبت کا ادراک ہو گیا تھا۔ وہ بیل بھوک سے بلبلاتے ہوئے رسی تڑوا کر بھاگ گئے اور کچھ دور جا کر زمین میں دھنس گئے۔ خود ریڈ کا ایک بیل رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اگلے روز بھوک سے تین مویشی مر گئے۔ کچھ چھکڑے دلدلی حصے میں اس بری طرح پھنس گئے کہ انہیں چھوڑنا پڑا۔

تیسرے روز، جب سورج کی تپش ان کے سروں کو پگھلا رہی تھی، قافلے کا پانی ختم ہو گیا۔ پیاس سے ان کے گلے چٹخنے لگے۔ بچوں کے رونے کی آواز مستقل ہو گئی۔ لوگوں کو واہموں نے گھیر لیا۔ انہیں عجیب و غریب مناظر نظر آنے لگے۔ بعض کو جھیلیں دور دور تک نظر آتے۔ کبھی کوئی سبزہ دیکھنے کا دعویٰ کرتا۔ کسی کو سیاہ پوش گھڑ سوار نظر آتے، جن کے ہاتھوں میں تلواریں ہوتیں۔

4 اگست کو سورج اُمید لیے طلوع ہوا۔ ریت کی نمی اب کم ہو گئی تھی۔ چھکڑے اب تیزی سے آگے بڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے تیزی سے سفر طے کیا۔ اب بدقسمت قافلہ صحرا کے کنارے پر تھا۔

پہاڑ سامنے تھے جن میں سبزے اور پانی کی موجودگی سے تمام تر امیدیں جڑی تھیں۔ وہ اپنی بدبختی اور خستہ حالی پر ماتم کناں تھے۔ صحرا کے آٹھ میل کے سفر میں وہ 32 مویشیوں سے محروم ہو گئے۔ ریڈ اور ڈونر برادران کو اپنے دو چھکڑے ریت میں چھوڑنے پڑے۔ مسافروں کی حالت بھی بری تھی۔ اسے معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس منحوس سفر میں کوئی ہلاکت نہیں ہوئی۔

موسم بہار انہیں صحرا کے کنارے گزارنا پڑا۔ انہوں نے اپنی غذا گھٹا دی۔ زیادہ وقت آرام کرنے میں گزارا۔ مردوں کی صحت سنبھلی تو بگھیوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان کی مرمت کی۔

ہیسٹنگ کے دعوے کھوکھلے ثابت ہوئے تھے۔ منزل میلوں دور تھی اور اب اس قافلے کو آپ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا۔

ریڈ کے مشورے پر پورے قافلے نے اپنا راشن اسے سونپ دیا۔ اس عمل کا مقصد غذا کو منظم طریقے سے استعمال کرنا تھا۔ ایک فہرست مرتب کی گئی اور ہر خاندان کا حصہ مقرر کر دیا گیا۔

ریڈ نے کیلیفورنیا کے کنارے واقع قلعہ شوٹر کے باسیوں سے رابطہ کیا ہوا تھا۔ یہ قلعہ سوئزرلینڈ کے نواب جان شوٹر کی ملکیت تھا، جسے سونے کی تلاش کیلیفورنیا لے آئی۔ اور اس

میدان میں اسے کامیابی بھی ہوئی۔ سیاحت کا شوقین یہ نواب بھٹکے ہوئے قافلوں کی مدد کے لیے مشہور تھا۔

ریڈ کو یقین تھا کہ اگر کسی ذریعے اس تک اطلاع پہنچ گئی تو وہ امدادی ٹیم روانہ کر دے گی، جو انہیں اس جہنم سے بہ حفاظت نکال لے گی۔ البتہ ایک مسئلہ تھا۔ کیلیفورنیا ہنوز میلوں دور تھا۔ قلعہ شوٹر تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ کچھ نوجوان گھڑسوار آگے کے علاقے کا جائزہ لے چکے تھے۔ 40 میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی انہیں زندگی کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔

اس پُرخطر مہم کی ذمے داری ولیم مکلچن اور چارلس اسٹین نے اٹھائی۔ ان کے لیے بہترین گھوڑے تیار کیے گئے۔ غذا کی اچھی خاصی مقدار ان کے تھیلوں میں بھر دی گئی۔

قافلے نے انہیں اپنی دعاؤں میں رخصت کیا۔

☆☆☆

خنداز آئی۔ صبح کہرا چھایا رہتا۔ روشنی مدھم پڑ گئی۔

ستمبر شروع ہو گیا تھا۔ چارلس اور ولیم کی روانگی کے چند روز بعد قافلے نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ وہ کوہ روبی میں داخل ہوئے۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ نسبتاً کم دشوار تھا۔ گو سرما شروع ہو گیا تھا، مگر نہ تو گھاس سوکھی تھی، نہ ہی چشمے منجمد تھے۔ 26 ستمبر کو وہ بہ حفاظت دریائے ہمبولٹ پہنچ گئے۔

بالآخر ریڈ نے سکون کا سانس لیا۔ یہ وہی دریا تھا جس کی بابت ہیسٹنگ نے اپنی کتاب میں تذکرہ کیا تھا۔ یعنی آخرکار وہ اس راستے پر پہنچ گئے تھے۔ بدقسمتی سے مختصر راستے کی خواہش میں انہیں 125 میل کا اضافی سفر کرنا پڑا۔ اس دوران انہوں نے تھکن اور گہری گھاٹیاں، تند و تیز دریا اور سنگلاخ چٹانیں عبور کیں۔ انہوں نے فاقوں کا کرب سہا، پیاس برداشت کی اور اپنے مویشیوں سے محروم ہونا پڑا۔

وہ دریا کنارے خیمہ زن ہو گئے۔ ریڈ نے سب کو شراب کی پیشکش کی اور بڑی خوشی کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ کامیابی کے بے حد نزدیک ہیں۔

"کیلیفورنیا پاس آ گیا ہے۔ ہم ایک روشن مستقبل تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ بلاشبہ راشن کم ہے مگر ہمارے بہادر ساتھی ولیم اور چارلس جلد مدد لے کر لوٹیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

چند جام اور چڑھانے کے بعد وہ بہک گیا۔ اس نے ہیسٹنگ کی تعریف شروع کر دی اور ان لوگوں کو بے طرح سنائی جو اس پر لعن طعن کیا کرتے تھے۔

اس پر کچھ لوگ بپھر گئے۔ ممکن تھا کہ شاید ہاتھاپائی میں بدل جاتی کہ صلح جو جیکب اور جارج ڈونر درمیان میں آ گئے اور یوں بات آئی گئی ہو گئی۔

اس واقعے سے ثابت ہو گیا کہ قافلے والے اب ہیسٹنگ کے بیان کردہ راستے پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ ان کا اکلوتا مقصد اس پُرفریب سفر سے نجات ہے۔

اگلی صبح انہیں ایک گھڑسوار اپنی سمت آتا دکھائی دیا۔ وہ مقامی امریکی باشندہ تھا۔ اس نے اپنا تعلق پلوٹ قبیلے سے بتایا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ قافلے کے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہے۔

لوگ اجنبی پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کے پاس رائفل بھی تھی۔ البتہ ریڈ نے اس کی حمایت کی۔ دو روز بعد اُسے اندازہ ہوا کہ مقامی کی حمایت کرنا ایک بھیانک حماقت تھی۔

اس رات وادی گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ صفوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں چیخنے چلانے لگیں۔ مرد گھبرائے ہوئے خیموں سے باہر آئے۔

ایسے میں مزید فائر ہوئے۔ پھر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ تب یہ عقدہ کھلا کہ اس کھلبلی کا ذمے دار کوئی اور نہیں، پلوٹ قبیلے کا باشندہ تھا۔ اس نے چند مویشیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ وہ راشن اور کچھ قیمتی اشیاء بھی چرا لے گیا۔

اس واقعے نے لوگوں کو ریڈ سے مزید متنفر کر دیا۔ وہ اگلے دو ہفتے غصے کے ساتھ سفر کرتے رہے۔ اکتوبر شروع ہوتے ہی سردی بڑھ گئی۔ مرد اب اوورکوٹ میں نظر آتے۔ عورتوں کے کاندھوں پر بھاری چادریں ہوتیں۔

اس وقت وہ موجودہ امریکی ریاست نیواڈا کے علاقے میں تھے۔ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ غیر یقینی بڑھ رہی تھی۔ جون سینڈ نامی نوجوان تو شدید غصے میں تھا۔ اس نے ریڈ کا قائدانہ سے انکار کر دیا اور اپنی بیل گاڑی دوڑاتا ہوا قافلے سے آگے نکل گیا۔

ریڈ آگ بگولا ہو گیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور پلوں میں جون کو جا لیا۔ اس نے چاقو اس کی گردن پر رکھ دیا۔ اس کی کھال کٹنے لگی۔

"اگلی بار ایسا ہوا تو..." اس نے دباؤ بڑھایا۔ جون کی ہوائی چلا ئی۔ ریڈ پیچھے ہٹ گیا۔

اس واقعے سے قافلے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ سب لوگ اکٹھے ہوئے۔ ان کا اصرار تھا کہ ریڈ ایک جرم کا مرتکب ہوا ہے اور اسے امریکی قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔

جون نے چلاتے ہوئے کہا۔ "اسی پاجی کی وجہ سے ہم

یا زمین چھوڑ کے جا چکا ہو کہ تباہ رہے ہیں ہم۔

ایسے میں ایک شخص نے کہا۔ "صاحبو، اس علاقے میں امریکی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ ریڈ انڈین کا علاقہ ہے۔ اور ان کے قوانین سے استفادہ کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے لیے اصولوں کا تعین کر لیں۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ دور پہاڑوں پر برف کی ابتدائی نشانیاں ظاہر ہونے لگی تھیں۔

"جارج ڈونر اس قافلے کا کپتان ہے۔ فیصلے کا حق اسے حاصل ہے۔ بدقسمتی سے وہ اس وقت ہم سے تھوڑا آگے ہے۔ میرے نزدیک فی الحال یہ معاملہ ملتوی کر دینا بہتر ہے۔"

باقی تو اس بات پر متفق ہو گئے مگر جان ایک پُرجوش اور غصہ ور نوجوان تھا۔ وہ خاموش بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔

اگلی صبح طلوع آفتاب سے کچھ پہلے جب ریڈ اپنے چھکڑے سے نیچے آیا تو کسی نے اس کے سر پر وار کیا۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ غنودگی کی وادی میں اترنے سے پہلے اس نے حملہ آور کے جوتے دیکھے۔

حملہ خطرناک نہیں تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد ریڈ نے جون کو قصوروار ٹھہرایا اور مطالبہ کیا کہ قافلے کے وسیع تر مفاد میں اسے فی الفور سزا دی جائے۔ جون کھڑا مسکراتا رہا۔

"جناب والا، ہم ریڈ انڈین باشندوں کے علاقے سے گزر رہے ہیں..." اس کے چہرے پر شرارت تھی۔ "یہاں امریکی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور ہمارا اصل کپتان کچھ فاصلے پر ہے۔ فی الحال معاملے کو ملتوی سمجھیں۔"

ریڈ غصے میں آ گیا۔ چیخنے چلانے لگا مگر کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ سب اس شخص سے نالاں تھے۔

اس واقعے سے بدقسمتی کے عفریت نے جنم لیا۔ شام ڈھلے فائر کی آواز گونجی۔

لوگ دوڑے دوڑے اس سمت گئے۔ دو چٹانوں کے درمیان جون کی لاش پڑی تھی۔ اس کے زخم سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ قاتل تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ جیمس ریڈ تھا۔ اس کی رائفل ہنوز گرم تھی۔ اسے باندھ کر اس کا ہتھیار قبضے میں لے لیا گیا۔

اسی رات جرگہ ہوا۔ جیمس ریڈ مجرم ٹھہرا۔ ایک شخص لوئس کیسبرگ قانون کی اچھی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ ریڈ کو سولی پر چڑھا دیا جائے۔ البتہ بحث مباحثے کے بعد اسے قافلہ بدر کرنے کی سزا سنائی گئی۔

کیسبرگ نے فیصلہ پڑھ کر سنایا۔ "آپ کو قافلے سے خارج کیا جا رہا ہے۔ اپنے ہتھیار ضبط سمجھیں۔ آپ کے بیوی بچے اب قافلے کی ذمے داری ہیں۔"

ریڈ نے درخواست کی کہ سزا پر عمل درآمد ڈونر برادران سے ملاقات تک موخر کر دیا جائے۔ "وہ ہم سے فقط چند میل آگے ہیں۔ ہم تیزی سے سفر کرتے ہوئے ان تک پہنچ جائیں گے۔ پھر جیسا وہ کہیں۔"

"نہیں۔" آدمی نے گردن ہلائی۔ "فیصلہ ہو چکا ہے۔"

اگلی صبح ریڈ گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے پاس خوراک کے دو تھیلے اور پانی کا مشکیزہ تھا۔ اس نے مڑ کر قافلے پر ایک اداس نظر ڈالی۔ وہ دن یاد آیا، جب وہ الونائی سے روانہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ کتنا خوش تھا۔ آنکھوں میں سپنے تھے اور اب... کرب نے اُسے جکڑ رکھا تھا۔

اس نے گھوڑے کی باگیں سنبھالیں اور آگے بڑھ گیا۔

وہ ایک اداس اور بدقسمت شخص تھا۔ قافلے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا اس کی سمت گیا۔ یہ اس کا ملازم والٹر تھا۔ کچھ دیر بعد دونوں چٹانوں میں غائب ہو گئے۔

☆☆☆

مویشی وزن ڈھونے کی صلاحیت کھونے لگے۔ مرد اکتا گئے۔ عورتیں یاسیت کا شکار ہو گئیں۔ راشن کم ہو گیا تھا اور خشکی کچھ بڑھ گئی۔

قافلہ بڑی مشکل کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ زیادہ تر پیدل سفر کرنے لگے تاکہ گھوڑوں اور ویگنوں پر کم سے کم بوجھ پڑے۔ یہ عمل ضعیف اور بیمار افراد کے لیے اذیت ناک ثابت ہوا۔ تھکن نے ان پر حملہ کیا۔ بیماریوں نے آن لیا۔ لوئس کیسبرگ کے ساتھ ایک بوڑھا شخص ہارڈ کوپ سفر کر رہا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے اس کے چھکڑے میں تھا، مگر 7 اکتوبر کو کیسبرگ نے اُسے اپنے چھکڑے سے باہر نکال دیا۔

کچھ دیر وہ گرتا پڑتا آگے بڑھتا رہا۔ پھر اوروں سے درخواست کرنے لگا کہ وہ اسے اپنے چھکڑے میں بٹھا لیں۔ عام حالات میں تو اس کی درخواست قبول کر لی جاتی مگر ہر گاڑی بھری ہوئی تھی۔ کوئی مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

آخر بوڑھے کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ سوچ کے وہ ایک پیڑ کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔ قافلہ خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ 7 اکتوبر کے بعد بوڑھا ہارڈ کوپ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ وہ موت کا اگلا نوالا بنا۔

اگلی صبح ولیم ایڈی نامی ایک مسافر نے اصرار کیا کہ انہیں لوٹ کر بوڑھے کو تلاش کرنا چاہیے مگر کسی نے ساتھ نہیں دیا۔

28 سالہ ولیم ایڈی ہم متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک محنت کش تھا۔ وہ الونائی سے قافلے کے ساتھ تھا۔ سفر میں بیوی بچے بھی ہمراہ تھے۔ کچھ عرصے بعد یہ شخص کہانی میں کلیدی حیثیت حاصل کرنے والا تھا۔

اس اثنا میں جیمس ریڈ، جسے قافلے سے نکالا جا چکا تھا، اپنے ملازم والٹر کے ساتھ تیزی سے سفر کرتا ہوا زور برادران کی بگھیوں تک پہنچ گیا۔

شاطر ریڈ نے دونوں بھائیوں کے سامنے اپنی داستان اس انداز میں بیان کی کہ ان کے دل پسیج گئے۔ جارج نے، جو قافلے کا حقیقی کپتان تھا، وعدہ کیا کہ وہ دیگر مسافروں کو اس کی سزا معاف کرنے کے لیے قائل کرلے گا۔

ریڈ نے شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ زور بھائیوں نے وہیں خیمے گاڑ لیے۔ کچھ روز بعد دیگر چھکڑے بھی ان سے آن ملے۔ جب لوگوں کو ریڈ کی آمد کا پتا چلا تو وہ بہت سٹپٹائے۔ اس سے قبل کہ احتجاج ہوتا، صلح جو جارج نے آگے بڑھ کر معاملات سنبھال لیے۔ اس نے کاروان سے درخواست کی کہ اس بدقسمت شخص کو معاف کردیا جائے۔ ساتھ ہی وعدہ کیا کہ ریڈ کیلیفورنیا پہنچ کر مقتول جون کے اہل خانہ کو خون بہا ادا کردے گا۔ جارج نے یہ امید بھی دلائی کہ چارلس اور ولیم، جو مدد کے لیے قلعہ شوٹر کی سمت گئے ہیں، جلد لوٹ آئیں گے اور اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ان امید افزا باتوں سے لوگوں کا غم کچھ کم ہوا مگر 12 اکتوبر کو ان خستہ حال انسانوں پر ایک افتاد ٹوٹ پڑی۔ پلوٹ قبیلے کے باشندوں نے ان پر حملہ کردیا۔ اس وقت قافلہ اپنی یکجہتی کھو چکا تھا۔ وہ ٹکڑوں کی صورت آگے پیچھے سفر کر رہے تھے، اس لیے ڈھنگ سے مقابلہ نہیں کرسکے۔ مقامی باشندے کئی مویشی اپنے ساتھ لے گئے۔ چند جانوروں کی ان کے زہریلے نشتروں نے جان لے لی۔ قافلے والوں نے جوابی حملہ کیا۔ رائفل سے فائر داغے، مگر پہاڑوں میں چھپے ریڈ انڈینز بآسانی فرار ہوگئے۔

مجموعی طور پر یہ قافلہ سو سے زیادہ مویشیوں سے محروم ہو چکا تھا۔ کئی چھکڑے بے کار ہوگئے۔ ان پر لدے سامان کو الوداع کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا۔ ماسوائے راشن اور گرم کپڑوں کے، ہر شے پیچھے چھوڑ دی گئی۔

پہاڑی علاقہ عبور کرنے کے بعد انہوں نے خود کو ایک صحرا کے روبرو پایا، جو خاموش اور پراسرار تھا۔ مسافروں کے چہروں پر موت کا خوف تھا۔ ولیم ایڈی اپنے چھکڑے سے محروم ہو چکا تھا۔ راشن بھی ختم ہوگیا اور اب وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بھوکا پیاسا پیدل سفر کرنے پر مجبور تھا۔

مارگریٹ ریڈ، جس نے کیلیفورنیا کے حسین سپنے سجائے یہ سفر شروع کیا تھا، اس وقت شدید اذیت میں تھی۔ یہ خاندان اپنے سربراہ کے بعد اپنے مضبوط چھکڑے سے محروم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے پیدل چل رہی تھی۔

صحرا زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ کچھ روز بعد انہوں نے خود کو دریائے ٹرکی کی سرسبز وادی میں پایا۔ انہوں نے جنگلی پھلوں سے بھوک مٹائی۔ چشموں کا پانی پیا۔

16 اکتوبر کو وہ وادی میں اترے۔ قافلے نے چند روز وادی میں آرام کیا۔ انہیں فوراً آگے بڑھنا تھا کیونکہ اگر برف باری شروع ہو جاتی تو ان کی موت یقینی تھی۔

☆☆☆

انہیں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

مرد سمجھے کہ وہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ عورتیں واہمہ کہہ کر سوئی رہیں۔ کچھ دیر بعد آوازیں واضح ہوگئیں۔ کچھ لوگ بات کرتے سنائی دیے۔

19 اکتوبر کی صبح لوگ ٹھٹھرتے ہوئے اپنے خیمے سے باہر آئے۔ جو منظر ان کے سامنے تھا، اس نے انہیں خوشی سے دیوانہ کردیا۔

چارلس اسٹین گھوڑے پر سوار مسکرا رہا تھا۔ قلعہ شوٹر کی تلاش میں روانہ ہونے والے روز کے مقابلے میں وہ توانا معلوم ہوتا۔ اس کے ساتھ دو مقامی باشندے لوئس اور سلوڈور تھے۔ سات خچر راشن سے لدے تھے۔ آٹے، چاول اور خشک گوشت کے تھیلے دیکھ کر لوگ آبدیدہ ہوگئے۔ وہ اپنے گھٹنوں پر بیٹھ گئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

چارلس کا استقبال کسی شاہی مہمان کی طرح کیا گیا۔ اس نے قلعہ شوٹر تک کے سفر کی روداد سنائی۔

”یہ ناقابلِ یقین قصہ ہے دوستو۔ ہم دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرے۔ کئی بار موت کو شکست دی... اگر ایک روز اور قلعے کے مینار نظر نہ آتے تو شاید ہم اپنے گھوڑوں کو ذبح کرکے کھا جاتے... نواب صاحب بہت شفقت سے پیش آئے۔ انہوں نے فوراً خچروں اور راشن کا انتظام کیا اور دو ملازم میرے ساتھ کردیے... ولیم بیمار پڑ گیا ہے... اس کے لیے واپسی ممکن نہیں تھی۔ اور ہاں... میری روانگی سے فقط ایک روز قبل مسٹر ریڈ اپنے ملازم والٹر کے

ساتھ وہاں پہنچے... ان کی حالت بہت ہی بری تھی... انہوں نے آپ سب کو سلام کہا ہے۔"

ریڈ کا تذکرہ سن کر کچھ لوگوں کے چہرے تن گئے، البتہ مارگریٹ ریڈ اور ڈونر برادران کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی۔

"اچھا حضرات۔ یہاں سے نکلنے کا طریقہ میں نے سمجھ لیا ہے۔ نیواڈا کے پہاڑوں میں ایک راستہ ہے۔"

اس نے مغربی چوٹی کی سمت اشارہ کیا۔ "راستہ مشکل ضرور ہے، مگر دریا اور گھنے جنگلات ہماری راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ جبکہ ہم اپنی منزل سے 50 میل دور ہیں۔ اس لیے مویشیوں اور بگھیوں کو تیار کریں۔"

قافلے کو لگا کہ برا وقت بیت چکا ہے... مدد آ گئی۔ مقامی باشندے راستہ جانتے ہیں۔ وہ سب جلد اس عذاب سے نکل جائیں گے۔ تو ایسے میں کیوں نہ تھوڑا آرام کیا جائے۔

انہوں نے پیٹ بھر کر کھایا، شراب پی۔ ایک دوسرے کو لطیفے سنائے اور بستروں میں گھس گئے۔

آرام کرنے کا فیصلہ مہلک ثابت ہوا کیونکہ بدبختی اب بھی ان کے تعاقب میں تھی۔

☆☆☆

نحوست نے عجیب انداز میں حملہ کیا۔

ایک شام وہ سفر کی تیاری میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ بگھیوں کی مرمت کر رہے تھے، کچھ سامان اکٹھا کر رہے تھے کہ اچانک وادی دھماکے سے گونج اٹھی۔

وہ بوکھلا گئے۔ آواز دائیں خیموں سے آئی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے اس سمت گئے۔ ایک خیمے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہاں ولیم پیک نامی شخص خون سے لت پت زمین پر پڑا تھا۔ اس کی گردن میں سوراخ ہو گیا تھا۔ رائفل ولیم کو سفر نامی اس کے دوست کے ہاتھ میں تھی، جس کے چہرے پر تعجب اور تاسف کا امتزاج تھا۔

"یہ کیا غضب کر دیا؟" جارج چلایا۔

"نہیں... میں نے نہیں..." وہ گھبرا کر بولا۔ "میں تو بندوق لوڈ کر رہا تھا کہ اچانک... فائر ہو گیا۔"

ایک چیخ گونجی۔ یہ پیک کی بیوی کی چیخ تھی۔ وہ اپنے شوہر سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

فضا سوگوار ہو گئی۔ پیک کو نہر کے نزدیک دفنایا گیا۔ کئی گھنٹوں بعد عورت کی حالت سنبھلی تو اس نے گواہی دی کہ فوسٹر بے قصور ہے۔ اس کا شوہر بدقسمتی کا شکار ہوا تھا۔

اسی روز ایڈی نے مشورہ دیا کہ انہیں سفر شروع کر دینا چاہیے۔ "اگر برف باری شروع ہو گئی، تو سب کی موت یقینی ہے۔"

چارلس نے یہ خیال رد کر دیا۔ "برف باری نومبر کے وسط میں شروع ہوگی۔ آگے کا سفر دشوار ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ہم چند روز یہیں ٹھہر کر اچھی طرح تیاری کریں۔"

چارلس کے دلائل کام نہیں آئے۔ پیک کی ناگہانی موت کے بعد یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ یہ علاقہ آسیب زدہ ہے۔ کچھ لوگوں نے اس بوڑھے کی روح دیکھنے کا دعویٰ کیا جسے وہ میلوں پیچھے تنہا چھوڑ آئے تھے۔ کچھ نے پیک کی لاش نہر پر تیرتے دیکھی۔

اگلی صبح لوگ ٹکڑوں کی صورت آگے بڑھنے لگے۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے۔ ڈونر برادران سب سے آخر میں روانہ ہوئے۔ اس وقت دیگر چھکڑے چٹانوں میں غائب ہو چکے تھے۔

ابھی 22 افراد پر مشتمل اس ٹکڑی نے کچھ ہی میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک خوفناک آواز سنائی دی۔ ایک چھکڑے کی دھری ٹوٹ گئی تھی۔ جیکب اور جارج اپنے ملازموں کو پیچھے چھوڑ کر کلہاڑی لیے جنگل میں چلے گئے۔

لکڑیاں کاٹتے ہوئے بڑا بھائی خود کو زخمی کر بیٹھا۔ اس کے ہاتھ سے خون کا فوارہ بہنے لگا۔ دوسرا فوراً اس کی مدد کو آیا۔

یہ پہلا موقع تھا، جب ان راسخ العقیدہ مسیحی بھائیوں کو بدبختی کی بو محسوس ہوئی۔ جنگل کی فضا اس رات تعفن سے اٹی تھی۔

جب تک وہ سفر شروع کرتے، دیگر لوگ کئی میل آگے نکل چکے تھے۔

اسی رات ریڈ اور ولیم کے توانا گھوڑوں نے قلعہ سٹر کا دروازہ عبور کیا۔ وہ اپنے اہلِ خانہ سے ملنے کے لیے برف سے ڈھکی زمینوں کی سمت بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

قافلے نے ایک جھیل کے نزدیک پڑاؤ ڈالا۔ رات انہوں نے جھیل کے پانی سے پیاس بجھائی، لیکن صبح تک... وہ جم چکی تھی۔

رات کے تیسرے پہر برف باری شروع ہوئی۔ اچانک درجۂ حرارت گرنے لگے۔ لوگ حیرت کے زیرِ اثر ٹھٹھرتے رہے۔ سب سے زیادہ پریشان چارلس تھا، جس نے دعویٰ کیا تھا کہ برف باری اکتوبر کے وسط میں کہیں جا کر شروع ہوگی مگر ستمبر کے آخر ہی میں سفید اقتدار آسمان سے اترنے لگی تھی۔

سخ برف کی موٹی تہ ان کی منتظر تھی۔ چارلس کا گھوڑا جھیلوں سے چند میل آگے تھا۔ دونوں مقامی باشندے اس کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ اس نے چوٹی تک پہنچنے کی کوشش کی مگر برف باری کی وجہ سے پھسلن بڑھ گئی تھی۔ کوششیں ناکام گئیں۔ دوپہر میں پھر برف گری۔ جب وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ لوٹا زمین پر پانچ فٹ برف جمع ہو چکی تھی۔ گھوڑوں کی ٹانگیں ان میں دھنس دھنس جاتی تھیں۔

بدبختی سے خوف زدہ قافلے نے بھاری برف باری میں بھی سفر جاری رکھنے کی کوشش کی مگر ناکامی ان کے ہاتھ آئی۔ جو راستہ انہیں اختیار کرنا تھا وہ فقط 12 میل پرے تھا لیکن کسی آسیب نے راستے میں دیوار کھڑی کر دی۔ وہ مشکل جھیل کے مشرقی حصے تک پہنچ سکے۔ (ٹرکی کہلانے والی اس جھیل کو آج ڈونر جھیل کہہ کر پکارا جاتا ہے۔)

وہاں انہیں لکڑی کا ایک پراسرار کیبن دکھائی دیا۔ ویرانی میں اس سائبان کی موجودگی اوروں کے لیے تو حیران کن تھی البتہ چارلس خوش تھا۔

”بھائیو اور بہنو، یہ کیبن ثبوت ہے کہ ماضی میں ایک قافلہ یہاں سے گزرا تھا۔ اگر انہوں نے راستہ عبور کر لیا تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔“

”کیا ہی اچھا ہو کہ ہم چند کیبن اور بنا لیں۔ یہ جگہ نسبتاً اونچی اور محفوظ ہے۔“ کسی نے مشورہ دیا۔

مرد کام میں لگ گئے۔ انہوں نے لکڑیاں کاٹیں۔ انہیں رسیوں سے جوڑا۔ اگلی صبح تک وہاں تین کیبن کھڑے تھے۔ گو 59 افراد کے لیے وہ ذرا تنگ تھے مگر انہیں امید تھی کہ جلد برف باری ختم جائے گی۔ موسم بہتر ہو جائے گا اور پھر وہ اس جہنمی سفر سے جان چھڑا لیں گے۔

22 افراد پر مشتمل ڈونر برادران کا قافلہ ان نو تعمیر شدہ کیبنوں سے چھ میل دور تھا۔ برف باری کی وجہ سے ان کے لیے آگے بڑھنا دشوار ہو گیا۔ وہ جنگلی علاقے میں تھے۔ انہیں ذرا اونچائی پر دھواں نظر آتا تو کچھ ڈھارس بندھتی۔ وہ ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے۔

”دیکھو ذرا۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کھانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ ضرور سبزی اور گوشت کا شوربا تیار ہو رہا ہوگا۔“ جیکب کہتا۔

”ہاں بھئی۔“ جارج دھیرے سے مسکراتا۔ ”چارلس کا لایا ہوا راشن تو انہی کے پاس ہے۔ مگر اب وہ بھی ختم ہو رہا ہوگا۔“

ڈونر بھائیوں نے خیمے گاڑ کر ان پر شاخیں ڈال دی تھیں۔ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کر لیں، تاکہ موسم کی شدت کا مقابلہ کر سکیں۔

ابتدا میں تو مرکزی قافلے کو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ غذا وافر مقدار میں تھی۔ سر پر چھت تھی۔ انہوں نے سوچا، جتنا وقت میسر ہے، اسے آرام کرنے میں صرف کیا جائے۔ مگر کچھ ہی روز بعد انہیں یہ احساس ستانے لگا کہ برف باری کے عفریت نے انہیں بری طرح گھیر لیا ہے۔ راستہ مسدود ہو گیا۔ اب انہیں سرما کی سختیاں اسی مقام پر برداشت کرنی ہوں گی۔ سرما کی طوالت کے مقابلے میں راشن کم تھا۔ اور یہ امر ان کی پریشانی بڑھا رہا تھا۔

انہوں نے تیزی سے برف باری میں آگے بڑھنے کی بھرپور کوششیں کیں، مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ایک غیر مرئی دیوار راستہ روکے کھڑی تھی۔

انہیں چند مزید کیبن بنانے پڑے۔ بڑے کیبن میں چار چار خاندان ٹھہرے۔ چھوٹے کیبنوں میں دو خاندانوں کو گزارا کرنا تھا۔

وقت سست روی سے گزر رہا تھا۔ موسم بد سے بدتر ہوتا گیا۔ راشن گھٹ گیا۔ سردی نے انہیں اکتاہٹ اور یاسیت میں دھکیل دیا۔ بچے بیمار پڑ گئے تھے۔ عورتیں آرائش کی فطری خواہش سے بے پروا ہو گئیں۔ اور مرد اپنے تہذیبی اطوار کھونے لگے۔

☆☆☆

انجانے تیزی سے ہلاکتوں نے آلیا۔

پہلے گرد آلود ہوائیں چلیں۔ پھر تھن گرج کے ساتھ مینہ برسا۔ برسات کے اگلے روز پھر برف باری شروع ہو گئی تھی۔ ریڈ اور ولیم موسم کی اس حملے کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ تیز رفتار گھوڑوں کے ساتھ جلد اپنے اہل خانہ تک پہنچ جائیں گے۔ مگر انہیں قلعے سے روانہ ہوئے تیسرا ہی روز تھا کہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور برسات شروع ہو گئی۔

وہ رات انہوں نے ایک تنگ غار میں گزاری۔ اگلی صبح زمین پر کیچڑ کھڑا تھا۔ پھسلن بڑھ چکی تھی۔ شاید وہ ہمت کے سہارے اسے عبور کر جاتے کہ شام تک برف باری پھر شروع ہو گئی۔ راستے مسدود ہو گئے تھے۔

گو وہ قافلے سے کچھ ہی میل دور تھے۔ عام حالات میں یہ سفر ڈھائی تین دن میں طے کر لیتے مگر اب وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ موسم کا بدلاؤ بیماری ساتھ لایا۔ ولیم جو بہ مشکل صحت یاب ہوا تھا، پھر بیمار پڑ گیا۔ اسے کھانسی کے دورے پڑ رہے تھے۔ جسم تپنے لگا۔ بالآخر انہوں نے قلعے

کی طرف لوٹنے کا فیصلہ کیا۔

اگرچہ سفر بھی دشوار تھا، مگر کسی نہ کسی طرح وہ نواب شوڈر کی رہائش گاہ پہنچ گئے۔ انہوں نے نواب صاحب سے درخواست کی کہ جدید آلات سے لیس ایک امدادی ٹیم ان کے ساتھ کر دی جائے، تاکہ وہ بدقسمت قافلے تک پہنچ سکیں۔

نواب صاحب نے تھوڑی کھجائی۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ قندیلوں کی روشنیاں ان کے باوقار چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

''مجھے افسوس ہے دوستو!'' بالآخر ان کی بات دار آواز کمرے میں گونجی۔ ''وادی برف سے ڈھکی ہے، مگر مجھے اس کی پروا نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیلیفورنیا حکام اور میکسیکن لوگوں میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ ابھی گورنر صاحب آئے تھے۔ انہوں نے مدد کی درخواست کی ہے۔ میرے آدمی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے ہیں۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔''

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ریڈ کے چہرے پر کرب تھا۔

''کیا ہم انتظامیہ سے رجوع کریں؟'' ولیم کہہ رہا تھا۔ اس کی حالت بری تھی۔

''میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔'' نواب نے دھیرے سے کہا۔ ''البتہ مجھے کامیابی کا امکان نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ میں نے کہا، یہ جنگ کا زمانہ ہے۔''

ریڈ نے گہرا سانس لیا۔ ''میرے خیال میں ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ پھر ان کے پاس وافر مقدار میں مویشی ہیں۔ اگر راشن ختم ہو گیا، تو وہ ان کے گوشت پر گزارہ کر سکتے ہیں۔''

ولیم اور نواب نے اثبات میں گردن ہلائی۔

انہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ قافلے کے درجنوں مویشی مقامی باشندوں کی کارروائی کا نشانہ بن چکے ہیں۔

☆☆☆

برف پگھلنے کا انتظار کرتے مسافروں پر ایک اور افتاد ٹوٹی۔

امریکا میں ہر نومبر کی چوتھی جمعرات کو شکر گزاری کا تہوار منایا جاتا ہے۔ یہ خوشیوں کا تہوار ہے، مگر جمعرات والے روز پھر برف باری شروع ہو گئی۔ اور یہ حملہ پہلے حملوں سے زیادہ خطرناک تھا۔ جھیل جم چکی تھی۔ کیبن ٹھنڈ کو روکنے میں ناکام تھے۔ زندگی پوری طرح منحوسیت کی لپیٹ میں آ گئی۔ کچھ جانور پُراسرار طور پر غائب ہو گئے۔ کچھ روز بعد برف تلے ان کی لاشیں ملیں۔

راشن ختم ہو چکا تھا۔ جنگلی پھل بھی کچھ ہی روز کام آئے۔ اب ان کا گزارہ مویشیوں پر تھا۔ ایک ایک کر کے تمام مویشی ذبح ہو گئے۔ 29 نومبر کو انہوں نے آخری جانور ذبح کیا۔ اب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔

جمعرات کو شروع ہونے والی برف باری کئی روز جاری رہی۔ راستے پر سفیدی کی موٹی تہہ جم گئی۔ چارلس باہر نکلا تو وہ گھٹنوں تک دھنس گیا۔ شکار تلاش کرتے مقامی باشندوں میں سے ایک گڑھے میں گر گیا، جسے بہ مشکل نکالا گیا۔ شکار کی بہت کم کوششیں کامیاب ہوئیں۔ شاید بدبختی نے اس برف زار کے جانوروں کو بھی نگل لیا تھا۔ لوگ گوشت کھا کر ہڈیاں بچا لیتے اور بعد میں انہیں چوستے رہتے۔ دسمبر شروع ہوتے ہی بیماریاں عود کر آئیں۔ کئی لوگ بیمار پڑ گئے۔ ان کے دن کا بڑا حصہ بستروں پر گزرتا۔ اب وہ پودوں کی جڑیں کھانے لگے۔ ان کا ذائقہ ترش ہوتا، مگر یہ ضرور تھا کہ وہ انہیں تھوڑی توانائی فراہم کر دیتیں۔

جب ایک جواں سال شخص رات بھر کھانستے رہنے کے بعد اچانک انتقال کر گیا، تب لوگوں کے دلوں میں یہ خوف بیٹھ گیا کہ اگر وہ فوراً حرکت میں نہیں آئے، تو برف کا یہ میدان ان کا قبرستان بن جائے گا۔ اسی روز ایک گھڑ سوار مشرق سے دوڑتا ہوا آیا۔ وہ ڈونر برادران کا ملازم تھا۔ اس نے بتایا کہ دونوں بھائی بیماری کے ہاتھوں شکست کھا گئے ہیں اور اب ان کے بیوی بچے موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ چند لوگوں کو ہمت مجتمع کر کے مدد کی تلاش میں نکلنا ہو گا۔ یہ گروہ دس آدمیوں اور پانچ عورتوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے لکڑی کے ہلکے مگر چوڑے تختے پیروں میں باندھ لیے تاکہ وہ برف میں دھنسنے سے محفوظ رہیں۔ خوش قسمتی سے یہ نسخہ کارگر رہا۔ ان کے پاس ایک رائفل اور چھ روز کی غذا تھی۔ ہر ایک کے پاس ایک کمبل تھا۔

قلعہ شوٹران کی منزل تھا۔ یہ اندازے کے مطابق 70 میل دور تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اگر وہ وہاں پہنچ گئے، تو باقی لوگوں کے لیے مدد حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔ دونوں ریڈ انڈین باشندے بھی اس سفر میں شامل تھے۔

ولیم ایڈی اس سفر پر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے بارے میں فکر مند تھا، مگر باقی لوگوں کے اصرار پر اس نے ہامی بھر لی۔ جب وہ کیبن سے رخصت ہوا، اس کی بیوی کی آنکھوں میں اندیشے تھے۔ اس نے

دھیرے سے اپنے شوہر کے کان میں کہا۔ ”ان پر اعتبار مت کرنا۔ میں نے تمہارے تھیلے میں ایک چاقو اور گوشت کے چند پارچے رکھ دیے ہیں۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔“

چارلس نے اس خستہ حال، مگر اُمید پرست گروہ کو Forlorn hope کا نام دیا۔ یہ اصطلاح اس فوجی دستے کے لیے استعمال ہوتی ہے، جو شکست کے روبرو آخری اُمید ہوتا ہے۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر جرأت اور دلیری کے ساتھ دشمن پر جھپٹ پڑتا ہے۔

یہ گروہ بھی جرأت اور دلیری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس بات سے لاعلم کہ جلد یہ سفر... انھیں آدم خوری پر مجبور کر دے گا۔

☆☆☆

کمزوری ان کی ہڈیوں میں بس گئی۔ بھوک جسم میں پھیل گئی، اور غصہ بھی کچھ بڑھ گیا۔

وہ بہت کم خوراک لے رہے تھے۔ فقط وہ لمحات، جب وہ الاؤ کے گرد بیٹھ کر خود کو کمبل میں لپیٹ لیتے، کچھ راحت فراہم کرتے، ورنہ یہ سفر مسلسل اذیت تھا۔

چارلس کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ تیسرے ہی روز اس کے حواس جواب دے گئے۔ اسے درختوں کے درمیان پُراسرار سائے نظر آنے لگے۔ ابتدا میں لوگوں نے اس کی خبر گیری کی مگر جب وہ خود مشکل میں پھنس گئے، تو اس سے بے پروا ہو گئے۔ فقط ایڈی اور مقامی باشندے اُسے سنبھالتے۔

چھ روز بعد راشن پوری طرح ختم ہو گیا۔ اب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اگلے دو روز وہ بھوکے پیاسے آگے بڑھتے رہے۔ موسم کچھ اور شدید ہو گیا۔

ایک شام چارلس اسٹین چلتے چلتے گر گیا۔ ایڈی نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی حالت دوسروں سے نسبتاً بہتر تھی اور اس کا سبب اس کے تھیلے میں موجود گوشت کے پارچے تھے۔

چارلس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ ”تم آگے بڑھو، میں آتا ہوں۔“

ایڈی ٹھہرنا چاہتا تھا، مگر چارلس کے اصرار پر اسے جانا پڑا۔ مقامی باشندوں کو بھی اس نے ساتھ روانہ کر دیا۔

”یہ راستہ جانتے ہیں ایڈی۔“ اس نے بہ مشکل کہا۔ ”تم ان کے ساتھ رہنا۔“

جب وہ آگے بڑھ رہے تھے، تو چارلس اسٹین گرتی برف کے درمیان درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

21 دسمبر کی اس سہ پہر ایڈی نے اس پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ چارلس دھیرے سے مسکرایا۔ وہ آخری موقع تھا جب کسی نے چارلس کو مسکراتے دیکھا۔ وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

آگے بحران کا منتظر تھا۔ حالات اتنے دگرگوں ہو گئے کہ نمی کے باعث رات کو آگ جلانا دشوار ہو جاتا۔ شدید سردی، اوپر سے بھوک۔ وہ اپنے حواس کھو چکے تھے۔ بھوک انھیں اندھا کیے دے رہی تھی۔ وہ سوچنے، سمجھنے اور فیصلے لینے سے قاصر تھے۔

جب بھوک سے بلبلاتے تین روز گزر گئے، تو ایک نوجوان پیٹرک ڈولن نے عجیب مشورہ دیا۔ ”ہم میں سے ایک کو قربانی دینی ہو گی۔“

سب نے اس کی سمت حیرت سے دیکھا۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ ”انسانی گوشت۔ اس ویرانے میں زندہ رہنے کا یہی اکلوتا امکان ہے۔ ہم میں سے کسی ایک مرد کو رضاکارانہ طور پر آگے آنا ہو گا۔“

بھلا کون آگے آتا۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ مگر پھر ظالم بھوک غالب آنے لگی۔ کسی نے مشورہ دیا۔

”کیوں نہ قرعہ اندازی کروائی جائے۔ جو مر گیا، اسے ہم...“ کہنے والے نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”احمقانہ مشورہ ہے۔“ ایک جانب سے آواز آئی۔ ”ہم مردوں میں سے ہر ایک تو بندوق چلانا نہیں جانتا۔ کچھ اور سوچا جائے۔ لاری کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”بکواس بند کرو۔“ ویرانے میں ایک دہاڑ سنائی دی۔ یہ ولیم ایڈی تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔“

”ہاں ہم پاگل ہو گئے ہیں۔“ پیٹرک ڈولن نے گردن ہلائی۔ ”اور اس کا سبب بھوک ہے۔ کیا تمہارے پاس اس سے بہتر حل ہے؟“

کچھ دیر وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے گہرا سانس لیا۔ ”ہاں۔ ہم سب بیمار ہیں۔ آج نہیں تو کل ہم سے کوئی ایک ضرور مر جائے گا۔ بہتر ہے کہ قربانی دینے کی بجائے کسی کے مرنے کا انتظار کریں۔“

بھوک انسان کو پستی کی گہری کھائی میں دھکیل دیتی ہے۔ وہ اسے جانور بنا دیتی ہے۔ ایڈی کے اس مشورے پر بہت سوں نے تالیاں بجائیں۔ خصوصاً وہ بہت خوش تھے، جن کی صحت نسبتاً بہتر تھی۔ کئی لوگوں نے تو یہ دعا بھی کی کہ آج رات فلاں فلاں شخص ہلاک ہو جائے۔

ان بدنصیبوں کی دعائیں جلد قبول ہوئیں۔ اگلی دوپہر جانوروں کا رکھوالا ایٹونیو بیٹھے بیٹھے خاموشی سے موت کی وادی میں اتر گیا۔ اس اچانک رونما ہونے والے واقعے سے قافلے کو گہرا صدمہ پہنچا۔ کچھ دیر کے لیے بھول ہی گئے کہ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ مرنے والے کے گوشت سے اپنی بھوک مٹائیں گے۔

ایٹونیو کی موت کی وجہ سے انہوں نے سفر موخر کر دیا۔ اسی شام فرینکلن گریوز کی ایک شخص بھی نیند کے سناٹے میں زندگی کی بازی ہار گیا۔ وہ کئی روز سے بیمار تھا مگر اس نے اپنی بیماری کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا تھا۔

یہ فرینکلن کی موت تھی جس کے بعد گروہ کے چند لوگوں میں انسانی گوشت کھانے کی مکروہ خواہش نے پہلی انگڑائی لی۔ ابھی وہ اس بابت کوئی فیصلہ لینے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ جواں سال پیٹرک ڈولن پر ہذیان کا دورہ پڑ گیا۔ وہ کپڑے اتار کر تاریک جنگل میں چلا گیا۔ دیر تک اس کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ کچھ گھنٹوں بعد وہ لوٹ کر آیا۔ لڑکا پوری قوت سے چلایا اور شہتیر کی مانند زمین پر گر گیا۔

بھوکے مسافروں کو اب اپنے ساتھیوں کی موت کی پروا نہیں تھی۔ انہیں تو بس اپنی فکر تھی۔ ایک تازہ انسان کی بریدہ لاش انہیں دعوت طعام دے رہی تھی۔ ولیم فوسٹر آگے بڑھا اور چھری سے اس کی ران کا گوشت کاٹ کر کھانے لگا۔ پہلے تو اس نے قے کر دی، آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر بھوک نے اسے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ اس نے گوشت کو چبانے کی ایک اور کوشش کی۔ بالآخر اس نے اسے نگل لیا۔

اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی آگے بڑھے۔ بدقسمت پیٹرک ڈولن کی لاش کے ٹکڑے ہونے میں وقت نہیں لگا۔ گوشت تقسیم ہونے لگا۔ ایڈی اور دونوں مقامی باشندوں لوئس اور سیلوز و رنے گوشت کھانے سے انکار کر دیا۔

اس گروہ میں ایک 12 سالہ نوجوان لیمؤئل مرفی بھی تھا، جو اپنی بہن کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ بھوک نے اسے توڑ ڈالا تھا۔ وہ خاصا بیمار تھا۔ اس کی بہن نے اسے تھوڑا گوشت کھلانے کی کوشش کی مگر اس نے الٹی کر دیا۔ اگلے چند گھنٹوں بعد وہ مر گیا۔

معدے میں کچھ گیا، تو آگے بڑھنے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ زندہ رہنے کی آرزو سانس لینے لگی۔ مگر آگے بڑھنے سے قبل انہوں نے کچھ ایسا کیا، جسے عام انسان دیکھ لے تو ہیبت سے مر جائے۔

انہوں نے چاقو کی مدد سے مرنے والے چاروں آدمیوں کے جسم کا گوشت اتار لیا۔ اس مکروہ عمل نے انہیں عجیب طمانیت دی۔ وہ اس دوران ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے رہے۔ بارہ سالہ لیمؤئل مرفی کی بہن اس منظر کو دور بیٹھی دیکھتی رہی۔ جب انہوں نے اس کے بھائی کی گردن پر چھری پھیری تو پوری قوت سے چلائی اور بے ہوش ہو گئی۔

ایڈی دور کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے تھیلے میں موجود پارچے کب کے ختم ہو چکے تھے اور اب بھوک اس کے معدے میں رینگ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ چلتے چلتے گر گیا۔ سانس اکھڑنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

وہ زمین پر پڑا تھا۔ ایسے میں کوئی اس پر جھکا۔ ایک ہاتھ منہ کے سامنے آیا۔ اس میں گوشت کے کچھ ٹکڑے تھے۔ بدنصیبی میں گھرا ولیم ایڈی ان پر جھپٹ پڑا۔

گوشت کا ذائقہ کڑوا تھا۔ وہ سخت ہو گیا تھا۔ پہلے تو اس نے قے کر دی، مگر پھر دھیرے دھیرے وہ ان ٹکڑوں کو نگلنے لگا۔ وہ بھی دیگر لوگوں کی طرح آدم خور بن چکا تھا۔ قوت مجتمع ہوئی، تو وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھا، مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسے اپنے بیوی بچوں کی فکر تھی۔ یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں کیمپ میں مقیم لوگ بھی آدم خور نہ بن گئے ہوں... کہیں وہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرنے لگے ہوں... کہیں انہوں نے اس کے بیوی بچوں کو اپنی خوراک... بس وہ اس سے آگے نہیں سوچ پاتا۔

چند روز تو وہ انسانی گوشت پر گزارہ کرتے رہے، مگر جلد وہ بھی ختم ہو گیا۔ بھوک پھر انہیں تڑپانے لگی۔ اس بار کوئی بیمار نہیں تھا۔ ہر شخص صحت مند تھا۔

وہ دائرے کی صورت بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے پر نظریں گاڑ لیں۔ وہ بھیڑیوں کی طرح منتظر تھے کہ کوئی گرے اور وہ اس پر جھپٹ پڑیں، مگر کوئی نہیں گرا۔

ایسے میں یہ سرگوشیاں ہونے لگیں کہ کیوں نہ مقامی باشندوں کو قتل کر کے کھا لیا جائے۔

ایڈی کے کانوں میں بھی یہ آوازیں پڑیں۔ چارلس کے مرنے کے بعد سے دونوں مقامی باشندے اس کے ساتھ تھے۔ ان کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ایڈی جانتا تھا کہ دیگر لوگوں کے پاس چھریاں ہیں، جب کہ لوئس اور سلوز و ر خالی ہاتھ تھے۔

"یہاں سے بھاگ جاؤ..." رات کے اندھیرے میں ایڈی نے لوئس کے کان میں سرگوشی کی۔ "ورنہ تم کل تک ان کی

تنہا ہی جاؤ گے۔"

وہ دونوں رات کے اندھیرے میں نکل گئے۔ ان کے فرار کی خبر نے باقی سات افراد کو آگ بگولا کر دیا۔ وہ ایڈی کو بے طرح سنانے لگے۔

وہ جھنجلا اٹھا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر میں قصوروار ہوں تو غذا کا انتظام بھی میں ہی کروں گا۔"

وہ رائفل لے کر شکار کی تلاش میں نکل گیا۔ ایک عورت میری اس کے ساتھ ہو لی۔ وہ بہت دیر تک شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ بالآخر ایڈی کی نظر ایک پہاڑی ہرن پر پڑی۔ وہ اور میری جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

پانچ سیکنڈ بعد وادی میں فائر کی آواز گونجی۔ ہرن خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ جب ایڈی اس کی لاش کاندھے پر ڈالے لوٹا تو ایک کریہہ منظر اس کا منتظر تھا۔

پانچ افراد ایک لاش ادھیڑ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ خون سے سنے تھے۔ منہ سے جانوروں جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔

مرنے والا بدنصیب بے فوزڈک نامی شخص تھا۔

"یہ کیسے مر گیا؟" وہ چلایا۔

"یہ بیمار تھا۔" فوسٹر نے کہا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "جب وہ یہاں سے روانہ ہوا تھا، بے فوزڈک بھلا چنگا تھا۔" "تم نے ...اسے قتل کیا ہے۔"

دو عورتوں نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے سے ہرن کی لاش اتار لی۔ "تم تھک گئے ہو گے ایڈی۔ کچھ آرام کر لو۔"

عورت کے ہاتھوں سے خون کی بو آ رہی تھی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ "آخر تم کیوں نہیں مر گئیں؟"

"کیا مطلب!" عورت کی آنکھوں میں خوف تھا۔

"موت مردوں ہی کا تعاقب کیوں کر رہی ہے۔ تم عورتیں کیوں زندہ ہو....." اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ "کیوں نہ ہم تمہیں کاٹ کر کھا جائیں۔"

فوسٹر نے آگے بڑھ کر اسے روکا۔ "خود کو سنبھالو۔"

اس نے فوسٹر کو پرے دھکیل دیا۔ "میں یہ گوشت نہیں کھاؤں گا۔ میں ہرن میں سے اپنا حصہ الگ کر رہا ہوں۔"

اس سہ پہر تو ایڈی نے انسانی گوشت سے اجتناب برتا مگر آنے والے دنوں کی سختیوں نے اسے توڑ ڈالا۔ وہ برف سے ڈھکی زمینوں پر سفر کرتے رہے۔ چٹانوں اور جنگلوں کے درمیان سے گزرے مگر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی۔ شاید وہ بھٹک گئے تھے۔

انسانی گوشت ختم ہو چکا تھا۔ شکار کا کوئی امکان نہیں تھا۔ انہوں نے پودوں کی جڑیں کھانے کی کوشش کی، مگر وہ بدذائقہ اور سخت تھیں۔

وہ 25 روز سے بھٹک رہے تھے۔ اس سفر میں وہ اپنی انسانیت کھو چکے تھے۔ خاموش پہاڑوں اور سرد موسم نے بھوک سے ساز باز کر رکھا تھا۔ اس ظالم تکون نے انہیں آدم خور بنا دیا۔

چار روز بعد جب ایڈی چلتے چلتے گر گیا تو میری نے اپنی پوشاک میں چھپائے انسانی گوشت کے چند ٹکڑے اس کے منہ میں ڈال دیے۔ وہ انہیں دھیرے دھیرے چبانے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب وہ انسانی گوشت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بھوک مٹنے سے پہلے ہی گوشت ختم ہو گیا۔

وہ رینگتے ہوئے، سسکتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

ایک سہ پہر انہیں اپنے نزدیک سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ چوکنے ہو گئے۔ ایڈی نے رائفل تھام لی۔ شاید کوئی جانور ہو۔

فوسٹر آگے بڑھا۔ میری اس کے ساتھ تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ چلایا۔ "یہ مقامی باشندے ہیں۔ رائفل لے آؤ۔"

ایڈی دوڑتے دوڑتے ٹھٹک گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انڈین اور [illegible] زمین پر پڑے رینگ رہے تھے۔ نقاہت چہروں سے عیاں۔ بھوک نے انہیں بے جان کر دیا تھا۔

"نہیں۔" ایڈی نے دھیرے سے کہا۔

"پاگل مت بنو۔" فوسٹر چلایا۔ "ان کا گوشت ہی ہمارے زندہ رہنے کا اکلوتا امکان ہے۔"

ایڈی خاموش کھڑا رہا۔ میری نے آگے بڑھ کر رائفل اس سے چھین لی اور فوسٹر کو تھما دی۔ دونوں مقامی باشندے رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

ایڈی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ درختوں کی سمت چلا گیا۔ اسے فائر کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی انسانی چیخیں بلند ہوئیں۔

وہ بہت دیر تک درختوں میں رہا۔ جب وہ لوٹا، دونوں لاشوں کے ٹکڑے کیے جا چکے تھے۔

☆☆☆

وہ فرشتہ تھا یا دھوپ کی ایک لکیر تھی۔

پہلے تو ایڈی اسے اپنا واہمہ سمجھا، مگر وہ اور آگے بڑھتے

پر انہیں انسانی آبادی کے ابتدائی نشانات ملے۔ ٹوٹی ہوئی شاخیں۔ پیروں کے نشان۔ کاٹے ہوئے درخت۔ راکھ۔

درختوں کے درمیان چند چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں۔ گندمی رنگت والی عورتیں آجا رہی تھیں۔ بچے کھیل رہے تھے۔

جب وہ سات انسان درختوں کے درمیان ظاہر ہوئے تو اتنے خستہ حال تھے کہ عورتیں دہشت زدہ رہ گئیں۔ بچے ماؤں سے لپٹ گئے تھے۔ پست قد مرد دوڑے آئے ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے۔

وہ بھی ان بدقسمت انسانوں کو دیکھ کر ہیبت زدہ رہ گئے۔ پھر ایک آگے بڑھا۔ اس نے ایڈی کو سنبھالا۔

یہ نیوڈا کے پہاڑی سلسلے میں بسنے والا میوک قبیلہ تھا۔ جو صدیوں سے یہاں آباد تھا۔

ساتوں افراد کو گرم جھونپڑیوں میں پہنچا دیا گیا۔ زخم دھوئے گئے۔

انہوں نے پانی سے اپنے خشک گلے تر کیے۔ بھوک انہیں پاگل کیے دے رہی تھی۔ قبیلے والوں کے پاس گوشت تو نہیں تھا۔ اس موسم میں ان کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ موٹی پھلی، بلوط کے پھل اور گھاس کھا کر گزارہ کر رہے تھے۔

بدقسمت مہمانوں کے سامنے بھی یہی چیزیں رکھی گئیں۔ انہوں نے بڑی رغبت سے انہیں پیٹ میں اتارا۔ ایڈی کو وہ انسانی گوشت سے زیادہ خوش ذائقہ معلوم ہوئیں۔

”آبادی کتنی دور ہے؟“ حالت سنبھلی، تو فوسٹر نے پوچھا۔

وہ ان کی زبان نہیں سمجھتے تھے، مگر اشاروں کی آفاقی زبان جانتے تھے۔ قبیلے کے سردار نے ہاتھ کے اشارہ سے بتایا۔ ”تین روز کے فاصلے پر۔“

فوسٹر نے ایڈی کی سمت دیکھا۔ ایڈی نے گردن ہلا دی۔ ”میں جاؤں گا۔“

ایڈی کے ساتھ میوک قبیلے کا ایک تجربہ کار آدمی تھا۔ انہوں نے بلوط کے پھل اور سوکھی پھلیاں پوٹلی میں بھر لیں۔ دونوں نے تیزی سے سفر طے کیا۔ دوروز بعد انہیں برف سے ڈھکے کھیت نظر آئے۔

وہ وادی سیکرامینٹو کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس کے باسی موسم کی شدت کی وجہ سے کچھ اکتائے ہوئے تھے مگر وہ ایڈی کی مدد کو فوراً آگے آئے۔ ان تک خبر پہنچ چکی تھی کہ الونائی سے نکلا ایک بدقسمت قافلہ برف باری میں پھنس گیا ہے۔

فوراً ایک امدادی ٹیم تشکیل دی گئی۔ پانچ جوان میوک قبیلے کی جھونپڑیوں کی سمت بڑھے۔ 17 جنوری کو وہ غذا اور ادویہ لیے وہاں پہنچ گئے۔

امدادی ٹیم کو دیکھ کر فوسٹر نے گہرا سانس لیا۔ ”تو ایڈی پہنچ گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہت سخت جان ہے۔“

ٹرکی جھیل سے روانہ ہونے کے 33 روز بعد... بالآخر وہ محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔ سفر کے آغاز میں یہ گروہ دس مردوں پر مشتمل تھا، جن میں سے فقط دو ہی زندہ بچے۔ حیرت انگیز طور پر کوئی عورت اس سفر میں ہلاک نہیں ہوئی۔ ہلاک ہونے والے آٹھ میں سات افراد اپنے ساتھیوں کی غذا بنے۔ فقط چارلس اسٹین کا جسم، جو بالکل ابتدا ہی میں قافلے سے پیچھے رہ گیا تھا، چھریوں کے واروں سے محفوظ رہا۔

سات بدقسمت انسانوں کی کہانی جھونپڑے سے گاؤں سے نکل کر پوری وادی میں پھیل گئی۔ کیلیفورنیا حکام تک بھی اس کی بازگشت پہنچی۔ ڈونر پارٹی کے بچاؤ کے لیے ٹیمیں تشکیل دی جانے لگیں، جو ہنوز جھیل کے نزدیک کیبنوں میں پھنسی ہوئی تھی۔

فوسٹر کو اندیشہ تھا کہ اب تک بہت سے لوگ مارے جا چکے ہوں گے۔ وہ بڑبڑایا۔ ”کیا تمہیں یاد نہیں، جب ہم وہاں تھے، تب بھی ساری ساری رات وادی موت کے قہقہوں سے گونجا کرتی تھی۔ نہ جانے اب تک کتنی قیامتیں گزر چکی ہوں۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، مگر ایڈی کو موہوم سی اُمید تھی کہ شاید اس کے بیوی بچے زندہ ہوں۔

5 فروری کی صبح سات افراد پر مشتمل پہلی امدادی ٹیم رینگو جانسن کے علاقے سے روانہ ہوئی۔ وہ کٹھن حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تمام آلات سے لیس تھی۔ آخر انہیں 60 بدقسمت انسانوں کی زندگی بچانی تھی۔ اسی اثناء میں قلعہ سٹر میں مقیم جیمس ریڈ نے کرنل جون چارلس کے ساتھ ایک ٹیم تشکیل دی، جو 7 فروری کو نیوڈا کے پہاڑوں کی سمت بڑھنے لگی۔

19 فروری کی سہ پہر پہلی ٹیم ٹرکی جھیل کے کنارے واقع کیبنوں تک پہنچی۔ وہ تیزی سے ایک کیبن میں داخل ہوئے۔ وہاں ہُو کا عالم تھا۔

اب انہوں نے دوسرے کیبن کا رخ کیا۔ وہ بھی خالی تھا۔ اندیشے بڑھتے گئے۔ ابھی امدادی کارکن باہر نکلے ہی تھے کہ ان کا سامنا ایک چڑیل سے ہوا۔ ناخن بڑھے ہوئے، بال بکھرے ہوئے۔ ان کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ایک دو نے

کباڑ سے سنبھال لیے۔

اچانک انہیں ادراک ہوا کہ وہ کوئی چڑیل نہیں، ایک مفلوک الحال عورت ہے، جس کے جسم کا گوشت بھوک نے نوچ لیا ہے۔

وہ عورت... مارگریٹ ریڈ تھی۔

بڑے کیبن میں انہیں ایسے انسان ملے، جن کی حالت جانوروں سے بدتر تھی۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان سات آدمیوں کو دیکھ رہے تھے، جو ان کی مدد کو آئے تھے۔

بارہ بدنصیب بھوک اور بیماری کے ہاتھوں شکست کھا چکے تھے۔ باقی 48 کی حالت بھی بے حد خراب تھی۔ کئی تو ہلنے جلنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے بہ مشکل گوشت کے ٹکڑے حلق سے نیچے اتارے۔

ایسا ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔ امدادی ٹیم کے پاس سواری کے لیے فقط چند ہی خچر تھے۔ وہ ایک ساتھ تمام لوگوں کو وہاں سے نہیں نکال سکتے تھے۔ باقی بدنصیبوں کو ان کی واپسی کا انتظار کرنا پڑتا۔

ہر شخص چاہتا تھا کہ وہ فوراً اس جہنم سے نکل جائے۔ انہیں خوف تھا کہ شاید امدادی ٹیم بھی لوٹ نہ سکے۔ شاید موسم پھر راستے کی دیوار بن جائے۔ وہ پہلے جانے کے لیے لڑ پڑے۔ ایک دوسرے کو گالیاں بکنے لگے۔

امدادی ٹیم کے سربراہ نے بہ مشکل صورت حال کو سنبھالا۔ انہوں نے بیماروں کو ترجیح دی۔ وہ 23 افراد کے ساتھ ٹرکی جھیل کے اس آسیبی کیمپ سے روانہ ہوئے۔ مارگریٹ ریڈ بھی اس قافلے میں شامل تھی۔ راستے میں مزید دو ہلاکتیں ہوگئیں۔ یہ دو بچے تھے، جو موسم کی شدت جھیلنے میں ناکام رہے۔

سنگلاخ اور ویران پہاڑیوں سے نیچے اترتے ہوئے ان کا سامنا اپنے جیسے انسانوں سے ہوا۔ یہ دوسری امدادی ٹیم تھی، جس کی قیادت جیمس ریڈ کررہا تھا۔

وہ بہ مشکل مارگریٹ اور اپنے بچوں کو پہچان سکا۔ پانچ ماہ بعد ان کا سامنا ہوا تھا۔ بھوک نے عورت اور بچوں کی جلد جلا ڈالی اور ان کا گوشت نوچ لیا۔ وہ گلے لگ کر بہت دیر تک روتے رہے۔

یکم مارچ کی شام جیمس ریڈ کی امدادی ٹیم جھیل کے نزدیک پہنچی۔ جس ہول ناک لمحے وہ کیمپ میں داخل ہوئے، وہاں موجود بدقسمت انسان ایک مرنے والے شخص کی تازہ لاش پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ بھی آدم خور بن چکے تھے۔

ریڈ کو جی متلانے لگا۔ وہ کیبن سے باہر آگیا۔ کئی گھنٹوں بعد اس کی حالت سنبھلی۔ تیسرے روز وہ 17 آدمیوں کے ساتھ واپسی کے لیے روانہ ہوا۔ بدقسمتی اب بھی جیمس ریڈ کے تعاقب میں تھی۔ دو روز بعد ایک شیبی گھاٹی میں انہیں شدید برفانی طوفان نے آلیا۔ آگے بڑھنا ناممکن ہوگیا۔ انہوں نے خیمے گاڑ دیے۔

راشن ختم ہونے لگا تھا اور ظالم بھوک پھر انہیں ستانے لگی۔

ایک پناہ گزین چلایا۔ ”ہم سب یہیں مر جائیں گے۔“

”نہیں۔“ ریڈ کے لہجے میں عزم تھا۔ ”کوئی نہیں مرے گا۔“

وہ پہاڑوں کی سمت آنے سے پہلے ایک درخت تلے کچھ راشن کے تھیلے چھوڑ آئے تھے۔ ریڈ اپنے ساتھی بریم فر اور چند پناہ گزینوں کے ساتھ اس سمت روانہ ہوگیا، تاکہ وہ تھیلے لے کر لوٹ سکے۔ جاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم ایک دوسرے کو کھانے سے باز رہو گے۔“

بھوک سے تڑپتے انسانوں نے اس کی سمت دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایک بھیانک جواب تھا۔ وہ لرز گیا۔

جب ریڈ راشن حاصل کرنے نکلا، ٹھیک اسی وقت تیسری امدادی ٹیم بھی جھیل کی سمت روانہ ہوچکی تھی۔ اس کی قیادت ایڈی اور فوسٹر کررہے تھے۔ اس مہم کے پیچھے ایڈی کی بے چینی تھی، جسے اپنے بیوی بچوں کی فکر کھائے جارہی تھی۔ گو فوسٹر زیادہ پُرامید نہیں تھا، مگر وہ اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔

جھیل سے قبل وہ شیبی گھاٹی کے ان خیموں تک پہنچے، جو جیمس ریڈ اور اس کے ساتھیوں نے گاڑے تھے۔

وہاں موت کی بو پھیلی تھی۔ جیکب ڈونر کی بیٹی سمیت تین ہلاکتیں ہوچکی تھیں۔ تینوں لاشوں کا گوشت نوچا جاچکا تھا۔ بھوک سے بلکتے انسان انہیں اپنے شکم میں اتار چکے تھے۔

ایڈی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فوسٹر نے اس کا کاندھا تھپکا۔ ”موت ایک تلخ حقیقت ہے دوست۔“

”اور زندگی اس سے زیادہ تلخ ہے۔“ ایڈی نے کہا۔

وہ اس شیبی گھاٹی کو چھوڑ کر جھیل کی سمت بڑھ گئے۔ وہاں ان کی چند مزید ڈھانچوں سے ملاقات ہوئی، جو آخری سانسیں لے رہے تھے۔ اس وقت ایڈی گہرے صدمے سے دوچار ہوگیا، جب اسے پتا چلا کہ اس کے بیوی بچے مر چکے تھے۔ وہ ڈھانچوں کے درمیان اپنے اہل خانہ کی باقیات تلاش کرتا رہا۔ اگر فوسٹر نہ ہوتا تو شاید وہ دیوانہ ہوجاتا۔

گو انہیں اطلاع مل چکی تھی کہ ڈونر خاندان ہلاک ہو چکا تھا، مگر اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب انہوں نے مشرقی حصے میں دھوئیں کی باریک لکیر دیکھی۔ انہوں نے گھوڑے اسی راستے پر ڈال دیے۔

جارج ڈونر زندہ تھا۔ البتہ اس کی حالت بہت بری تھی۔ اس کا زخمی ہاتھ سوج چکا تھا۔ جارج کے لیے اس حالت میں سفر ناممکن تھا۔ اس کی بیوی تمسن، جو شروع ہی سے ہیسٹنگ روڈ کی شدید ناقد تھی، ہنوز اچھی حالت میں تھی، مگر اس نے اپنے شوہر کو چھوڑنے سے انکار کر دیا اور اپنی تین لڑکیوں کو ایڈی اور فوسٹر کے ساتھ روانہ کر دیا۔

یہ امدادی ٹیم چند صحت مند افراد کے ساتھ وادی کی سمت روانہ ہوئی۔ وہ بیماروں کی دیکھ ریکھ کے لیے دو ساتھی پیچھے چھوڑ آئے، مگر چند روز بعد انہوں نے ان دونوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا۔ ان کے چہروں پر خوف تھا۔ کوئی شخص موت کی وادی میں رکنے کو تیار نہیں تھا۔

چوتھی امدادی ٹیم کو مارچ کے وسط میں روانہ ہونا تھا، مگر برفانی طوفان ان کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ اس ٹیم نے کہیں اپریل کے وسط میں جا کر جھیل کی سمت پیش قدمی شروع کی۔

جب وہ جھیل پہنچے، تو کیبن میں انہیں فقط ایک زندہ شخص ملا۔ یہ لوئس کیسبرگ تھا۔ وہی آدمی، جس نے جیمس ریڈ کو سولی پر چڑھانے کا مطالبہ کیا تھا۔

وہ انسانی لاشوں اور ڈھانچوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ منہ پر خون لگا تھا اور آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں۔ وہ قافلہ شوز پہنچنے والا آخری پناہ گزین تھا۔

ڈونر پارٹی کی بچاؤ مہم میں چار ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ اس مہم کا دورانیہ دو ماہ پر محیط تھا۔ الونئی سے روانہ ہونے والے قافلے کے آدھے سے زیادہ مرد انتہائی کٹھن حالات کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے گئے۔ فقط دو تہائی عورتیں اور بچے ہی بدقسمتی کا مقابلہ کر سکے۔ ان میں سے بھی کئی معذور ہو گئے۔ کسی کی بینائی چلی گئی۔ کسی کی ٹانگ ضائع ہوئی۔ کسی کا ہاتھ بے کار ہو گیا۔ کئی کے پیروں کی انگلیاں کاٹنی پڑیں۔ انہیں اپنے دوستوں، رشتے داروں کا گوشت کھانا پڑا۔

ریڈ اور بریِن خوش قسمت ترین گھرانے تھے۔ اس لیے میں ان کا کوئی فرد ہلاک نہیں ہوا تھا۔ جیمس ریڈ نے کیلی فورنیا کے علاقے میں رہائش اختیار کی۔ جیکب براوران کے بے سہارا بچوں کی کفالت کا ذمہ اس نے اپنے سر لے لیا۔

☆☆☆

ڈونر پارٹی کی بدقسمت کہانی جلد ہی پورے ملک میں پھیل گئی۔

اخبارات میں ان مسافروں کے لکھے کرب ناک خطوط اور روزنامچے شائع ہونے لگے، جن میں انہیں درپیش کٹھن حالات کے ساتھ ساتھ اس گروہ صورتِ حال کا ذکر بھی تھا، جس نے نہ صرف انہیں آدم خور، بلکہ قاتل بنا دیا۔ حالاں کہ وہ تہذیب یافتہ اور شریف لوگ تھے۔

بچنے والوں نے الگ الگ انداز میں اپنے تاثرات بیان کیے۔ البتہ ان میں ایک شے یکساں تھی۔ موت کا خوف۔

چیش تر نے ہیسٹنگ کو قصور وار ٹھہرایا، جس نے انہیں ایک ایسا راستہ اختیار کرنے کی تحریک دی، جو اس نے بھی خود نہیں پرکھا تھا۔ چند کا خیال تھا، جیمس ریڈ کی ہٹ دھرمی تھی، جس نے اپنے ساتھیوں کی رائے نظرانداز کرتے ہوئے پُرخطر راستے پر سفر جاری رکھا۔ کیسبرگ کا اب بھی یہی خیال تھا کہ اسے پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے۔ جس کی ایک چھوٹی سی خطا نے اس المیے کو جنم دیا۔

قصوروار جو بھی ہو، اس امر پر سب متفق تھے کہ ڈونر پارٹی کا یہ سفر کیلی فورنیا کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

ہیسٹنگ کے مختصر راستے کو شاید ایک لعنت سمجھ کر بھلا دیا جاتا، کوئی اسے اختیار کرنے کی جرأت نہیں کرتا، مگر جنوری 1848ء میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔

نواب شوز اور اس کے ساتھیوں نے ان زمینوں تک رسائی حاصل کر لی، جہاں بہت سا سونا تھا۔ سونا نکلنے کی اطلاع جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ دیوانہ وار اس ریاست کا رخ کرنے لگے۔ یہ قافلے ان راستوں سے بھی گزرے، جہاں سے کبھی بدقسمت ڈونر پارٹی کا گزر ہوا تھا۔ انہوں نے ان کیبن میں قیام کیا، جہاں کچھ عرصے قبل انسان، انسان کو کھا رہا تھا۔ ان درختوں کے آرام کیا، جہاں گذشتہ برس لوگ بھیڑیوں کی طرح تن کر بیٹھے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے کہ جیسے ہی کوئی گرے، اس پر جھپٹ پڑیں۔

آج وہ کیمپ، وہ جھیل، وہ مقامات آثار قدیمہ اور سیاحتی اہمیت حاصل کر گئے ہیں۔ سینکڑوں افراد ہر سال وہاں آتے ہیں اور حیرت کے زیر اثر ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

کچھ کا دعویٰ ہے کہ ان کیبنوں میں آج بھی موت کی بو کا بسیرا ہے۔

خطائے جلد باز

عجلت کی سزا

محمد ایاز راہی

بعض اوقات انسان نا سمجھی، کم فہمی اور عجلت میں ایسی باتیں کر جاتا ہے جو تا عمر آنکھیں بھگوتا رہتا ہے۔ اسے بھی کہاں معلوم تھا کہ جس اینگیٹھی کو وہ سلگا کر جا رہا ہے وہ پورے کنبہ کی موت کا سبب بن جائے گی یا موڑ مڑتے ہوئے رفتار پر قابو نہ رہے گا تو بڑے حادثے کا سبب بن جائے گی۔

ماسحرو سے ایک دلچسپ واقعہ

یورپ کے صنعتی انقلاب نے پوری دنیا پر انقلابی دوررس اور مختلف اثرات مرتب کیے۔ پرانے جاگیردارانہ نظام پر کاری ضرب لگی اور دنیا ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ انسان اپنے دو ادوار گزار کر تیسرے دور میں جلوہ گر

ہوا۔ پہلا پتھر کا دور تھا جسے حجری عہد کہا جاتا ہے جب پتھر کے آلات و اوزار انسان کے معاون تھے۔ دوسرا دور دھات کا زمانہ جب انسان نے مختلف نرم دھاتوں سے اپنے لیے آلات و اوزار اور برتنے کی اشیاء بنائیں۔ ارتقاء کے عمل

کو آگے بڑھایا۔ تیسرا موجودہ دور ہے جب لوہے کے بھرپور استعمال نے صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی اور مشینی دور کا آغاز ہوا لیکن یہ انقلاب یوں ہی اچانک یا ناگہانی طور پر نہیں آیا تھا بلکہ اس کا محرک نسیم الطبع، روشن دماغ اور ترقی پسند حکماء و علمائے یورپ کی طویل عملی قربانیاں تھیں۔ یورپی معاشرے پر اہل کلیسا، (پوپ اور پادری حضرات) کا مکمل قبضہ تھا۔ جن کی محدود سوچ اور لامحدود سکن ہاتھوں نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ ایسے میں اہل علم اور صاحب عرفان نفوس کے ابھار نے اس کلیسائی اندھیر کے مقابلے سنہری باب رقم کیے۔ فطرت کے عین مطابق سوچنے اور عمل کرنے والے ترقی پسند علماء و حکماء کو ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ دار و رسن، سولی اور پھانسی کے بے رحم حربے اختیار کیے گئے۔ حتیٰ کہ یورپی علماء و حکماء کو زندہ آگ میں جلایا گیا۔ بعض حکماء (گلیلیو گلیلی) کو اندھی کلیسائی عدالت میں زبانی اور تحریری معافی مانگنے پر مجبور کیا گیا۔ مگر بالآخر یورپ نے اندھے اور متعصب کلیسا سے بروقت جان چھڑائی۔ اور تسخیر کائنات کی راہ پر قدم رکھ دیا (کہ یہی اسلام کی اصل روح بھی ہے) صنعتی انقلاب نے قدم جمائے تو پارچہ بافی کی مضبوط صنعت بھی وجود میں آئی اور تیزی سے چھا گئی۔ پاکستان بننے کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ صنعتی ڈھانچہ بڑی سرعت سے ابھرا اور بیسویں صدی کے آخر تک اس نے بے حد عروج حاصل کیا جہاں نہ صرف عام آدمی کو روزگار ملا بلکہ جسمانی طور پر معذور لوگ بھی کام دھندے سے لگ گئے۔ وہیں دوسری طرف ان حیوان نما مزدوروں سے کام لینے والے مخصوص ذہن و صلاحیت کے حامل افراد بھی سامنے آئے۔

انہی افراد میں سے ایک چچا اللہ دسایا اور دوسرے چچا الطاف حسین مرحوم تھے جو مزدوروں کے نگران تھے اور انہیں کارخانے میں مختلف کاموں پر لگانے کے ذمہ دار (Jobber) بھی تھے۔ کارخانے خصوصاً پارچہ بافی کا اپنا ایک ماحول اور الگ فضا ہوتی ہے۔ اسے باہر سے محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ آدمی خود اس میں کچھ ماہ و سال نہ گزار لے۔ میرے ذہن میں چچا الطاف حسین مرحوم کی دو مختلف متحرک تصویریں بنی ہیں۔ ایک حادثے میں ٹانگ کٹنے سے پہلے کی تصویر۔ دوسری حادثے کے بعد معذوری کے ساتھ جیون بتانے کی لیکن..... ہر دو حالتوں میں چچا کی چستی، پھرتی اور زندہ دلی برقرار رہی۔ حادثے سے پہلے چچا الطاف حسین مرحوم 'ماسٹر طافا' مندرے والا کہلاتے تھے۔ ان کا گاؤں مندرہ، ضلع گوجر خان راولپنڈی تھا۔ زیادہ بے تکلف اور قریبی لوگ انہیں۔ ملکا (توم ملک) کہہ کر مخاطب کرتے تھے جن میں والد صاحب مرحوم بھی شامل تھے۔ چچا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہمارے ہی پڑوس میں بائیں طرف دس بارہ مکان چھوڑ کر رہتے تھے۔ ان کا بڑا لڑکا جس کا نام میں بھول چکا ہوں مگر سبھی اسے شادا۔ شادا۔ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس وقت آٹھ نو برس کا بچہ تھا۔ شادا اکثر بائیں کان پہ ہاتھ رکھتا اور آنکھیں بند کر کے بڑے سریلے پوٹھوہاری لہجے میں باپ کو مخاطب کر کے یہ ماہیا گاتا:

ملکا وے گل سن ملکا
ویڑے لوا دے ملکا
ملکا وے گل سنا ملکا

یہ مشہور مقامی گلوکار شوکت علی کی نقل ہوتی۔ لے کی جان لفظ۔ ملکا۔ سے شروع ہو کر ملکا پر ہی آ کر ٹوٹتی جسے آخر میں شادا لمبا کر کے الاپتا اور پوٹھوہاری ماہیا مکمل کرتا۔ سارے ہی خوش ہوتے۔ کچھ دیر تک بیٹے کو پیار بھری نظروں سے تکتے اور خوش ہو کر مسلسل ہنستے رہتے۔ کبھی کبھی ترنگ میں آ کر بیٹے سے بار بار ماہیا گواتے اور لطف اٹھاتے۔ ننھا شادا خود بھی گلوکار ہوتا۔ چچا الطاف حسین مرحوم کی حادثے سے پہلے کی جو تصویر بنتی ہے وہ اس طرح سے بنتی ہے کہ مناسب چھریرا بدن۔ نکلتا ہوا قد۔ ابھری اور تنی ہوئی چھاتی۔ پیچھے کی طرف الٹے ہوئے قدرے گھنگریالے بال سر پر سجے ہوئے۔ گھنی داڑھی۔ ہلکی مستطیل مونچھیں۔ گہرے ابروؤں کے نیچے تیز چمکدار آنکھیں۔ سیدھی گردن۔ سرافراز (سر اٹھا کر) بڑی تیزی اور چستی سے چلتے پھرتے۔ چہرے پر عزم اور جوش۔ عموماً گردن پر رنگین گلوبند لپیٹ کر رکھتے جس کا دایاں پلو اکثر گر پڑتا اور چچا اسے بار بار گردن کے گرد لپیٹتے رہتے۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے انگلیوں میں پکڑے سگریٹ کو لمبا کش لگاتے۔ ہر بار کش لگا کر ساتھ ہی چٹکی مار کے یا بجا کے راکھ جھاڑتے۔ کاریگروں پر بڑا رعب تھا اور اس رعب کو برقرار رکھنے کے لیے بے جا سختی بھی کرتے۔ اس جبر کی کئی وجوہات تھیں۔ کارخانے کا ماحول اور اس کے تقاضے۔ عام مزدوروں کی کم ذہنی۔ تربیت و ترتیب سے محرومی۔ کام کا بے تحاشا دباؤ۔ دوران کار مزدوروں کو چست اور متحرک رکھنا۔ پیداوار کا تسلسل نہ ٹوٹنے دینا۔ اس پر چچا کی اپنی فطرت، جبلت اور عادت، کام لینے کی صلاحیت۔ یہ سب عوامل چچا کو سخت گیری کی خو اپنائے رکھنے

پر مجبور کیے رکھتے۔ کچھ جوانی اور من مانے اختیار کا نشہ بھی شامل حال تھا۔ وفادار مزدوروں کا ایک بڑا گروہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ لہٰذا کم ہی کسی کو خاطر میں لاتے تھے۔ ہمارا ایک ہمجولی جاوید نام کا ہوتا تھا۔ سانولے چہرے پر ماتا (چیچک) کے بڑے بڑے داغ۔ گہرے دھبے کہ پاؤ بھر قیمہ جن میں سما جائے۔ جاوید چچا عثمان چوکیدار کا لڑکا تھا۔ یہ خاندان بھی آدمی وہتہ لہ نامی گاؤں ضلع گوجر خان راولپنڈی..... سے متعلق تھا۔ چچا عثمان سابق فوجی تھا۔ جاوید مدرسہ چھوڑ کر چچا الطاف کے پاس کارخانے میں بھرتی ہو گیا تھا۔ وہ چچا سے بہت ڈرتا تھا۔ اکثر کہتا۔ "اوئے۔ ماشٹر ہا نے وی ہتی تے کاری گراں دے آندرے نے۔" چچا الطاف چائے کے وقفے میں چائے خانہ (کینٹین) پر گئے ہوئے مزدوروں کو واپس کام پر بلاتے تو منہ میں دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اور شہادت کی انگلی دائرے کی صورت ملا کر رکھتے۔ باقی تین انگلیاں رخسار کے نیچے چہرے پر جما لیتے۔ ایک لمبا سانس لے کر پھیپھڑوں میں ہوا بھرتے اور اپنے گال پھلا کر ہونٹوں کے بل کھڑے ہو کر زوردار سیٹی بجاتے۔ جو دور چائے خانہ پر بیٹھے مزدوروں کو جھنجوڑ ڈالتی اور وہ یک لخت اٹھ کر کام کے لیے دوڑ پڑتے۔ مزدوروں کی سستی یا کاہلی پر چچا تشدد سے بھی کام لیتے کہ انہیں بہرحال اپنا رعب قائم رکھنا ہوتا تھا۔ اسی دوران میں یادوں کی بستی میں فالتو وقت گزارنے یا پھر مزدوروں کی سہولت کے لیے چچا نے ایک اور کام بھی شروع کر دیا۔ شہر سے مختلف معیار اور رنگ کا کپڑا لاتے۔ مزدوروں میں نقد یا ادھار فروخت کرتے مگر زیادہ دیر یہ سلسلہ نہ چل سکا اور چچا نے اسے چھوڑ دیا۔ والد صاحب اکثر فاضل وقت (اوور ٹائم) میں چچا کے پاس کام کرتے۔ والد صاحب کے نگران (Jobber) چچا یعقوب تھے جو شہر میں رہتے تھے اور وہاں سے کام پر اپنی دو پہیوں کی سواری (سائیکل) لے کر آتے جاتے تھے۔ بہر کیف انتہائی کوشش کے باوجود حافظہ یہاں پھر اندھیرے ہی میں ہے۔ کہ چچا الطاف حسین کب، کیوں اور کیسے بچوں سمیت یادوں کی بستی چھوڑ گئے۔ حافظے کے تسلسل کا یہ اندھا دور اپنے لکھنے کے دوران میں بہت بیزار کرتا ہے مگر کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ سوئے بسی کے تلخ گھونٹ پینے ہی پڑتے ہیں۔ خیر، کچھ عرصہ گزرا تو ایک دن میں نے چچا الطاف حسین مرحوم کو دفتر میں کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ پیر خورشید شاہ مرحوم اور دیگر لوگ بھی موجود تھے۔ چچا حسب معمول قہقہے اور گپ شپ لگا رہے تھے۔ ایک دو روز بعد چچا کو

چاندی کا استعمال اینٹی بائیوٹک
ادویات کو مزید موثر بناتا ہے: ماہرین

امریکی ماہرین نے کہا ہے کہ متعدد امراض کے لیے استعمال ہونے والی اینٹی بائیوٹک ادویات میں چاندی کا استعمال انہیں ایک ہزار گنا زیادہ موثر بنا دیتا ہے۔ ماہرین کے مطابق چاندی کو صدیوں سے اینٹی مائیکروبیل کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے جس کا چٹکی بھر استعمال بھی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ چاندی سنگل بیکٹیریا کے خلاف بھی کام کرتی ہے اور پھیلے ہوئے وبائی امراض کی پیدائش کو روکتی ہے اور انہیں جلد ٹھیک کرنے میں موثر ثابت ہوتی ہے۔

مرسلہ: احمد توحید سیو، بہاولپور

سید جمال الدین اسدی

سید جمال الدین اسد آبادی جو کہ انیسویں صدی کی دنیائے اسلام کی پُراسرار شخصیت ہیں۔ کابل کے نواحی قصبے اسد آباد میں 1838ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل اور پھر ہندوستان اور حجاز کے سفر کے بعد امیر دوست محمد خان، والیٔ افغانستان کی ملازمت کر لی لیکن امیر کی وفات کے بعد جب جانشینی کا قضیہ کھڑا ہوا تو وہ قسطنطنیہ آ گئے۔ لیکن شیخ اسلام کی مخالفت کی وجہ سے یہاں بھی وہ نہ رک سکے۔ وہ اسلامی ممالک کی اندرونی اصلاح اور "پان اسلام ازم" کے زبردست حامی تھے اور یورپی حکومتوں کی مسلسل سازشوں اور ان کی مشرقی ملکوں پر اقتدار قائم رکھنے کے شدید مخالف تھے۔ اس قصد سے انہوں نے جلاوطنی کے ایام میں پیرس سے اپنا مشہور اخبار "عروۃ الوثقیٰ" نکالا جس کے ایڈیٹر ان کے شاگرد محمد عبدہ مصری تھے۔ سب سے آخر میں وہ قسطنطنیہ میں نظر بند کر دیے گئے۔ یہاں وہ قصر یلدیز کے جوار میں نشانتاش میں پانچ برس مقیم رہے اور یہیں 9 مارچ 1897ء کو عارضہ سرطان انتقال ہوا اور یہیں دفن ہوئے۔ دسمبر 1944ء میں نعش کابل لائی گئی اور 6 جنوری 1945ء کو اس مقبرے میں دفن ہوئے جو اب کابل یونیورسٹی کے احاطے میں واقع ہے۔

مرسلہ: محسن علی سوم "بالاکوٹ"

بے ساکھیوں پر یادوں کی بستی سے کارخانے کی طرف جاتے دیکھا۔ یہ چچا کا دوسرا جنم یا روپ تھا۔ جو بہت ہی تلخ تھا۔ وہ معذوری کا شکار بے ساختہ وجود کو بے ساکھیوں پر اٹھائے، سر جھکائے، نظریں جھکائے، خاموش اور سوچ و فکر میں گم جا رہے تھے۔ بالآخر کارخانے کے ذمہ دار عہدیداروں نے چچا کی بھرپور معاونت کی اور ان کے لیے روزگار کا بندوبست کر دیا۔ حتیٰ کہ وہی پرانا مکان بھی خالی کروا کے انہیں دے دیا۔ یادوں کی بستی میں نئی مزدور تفریح گاہ (ورکرز کلب) چچا کے حوالے کر دی گئی۔ انہوں نے کوشش کر کے مختلف دلچسپیاں۔ تاش، کیرم، لڈو اور پھر ٹیلی ویژن کا بندوبست کیا۔ خصوصاً ان کی زندہ دلی نے تفریح گاہ میں جان ڈال دی۔ دن بھر اور شام۔ رات گئے تک خوب رونق رہتی۔ کہاں بھرپور سلامت جسم کے ساتھ اقتدار و اختیار کا نشہ اور کہاں ادھورے بدن کے ہمراہ بے بس، بے رنگ اور تنہا جیون لیکن حقیقت پسند چچا نے خود کو اور اپنے ذہن و مزاج کو موجودہ حالات کے مطابق جلد ہی ڈھال لیا اور مسکرا کر تقدیر کو ٹھینگا دکھا دیا۔ زندگی زندہ دلی کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئی۔ خوش مزاجی معذوری کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اکثر چچا جب حادثے سے پہلے کی کوئی بات کرتے تو یوں ہنس کر وضاحت کرتے۔ ''اوس ویلے ای دو واں لتاں تے ہوندے سان۔'' اکثر پرانے بے تکلف دوست ترنگ میں آ کر ان سے ہاتھا پائی کرتے تو چچا بے ساکھی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے اور شرارت پر آمادہ دوستوں کو خود سے دور رکھتے۔ دھمکی آمیز لہجے میں گالیاں دے کر جان بچاتے۔ چچا اللہ وسایا (جابر) کے ساتھ اکثر تاش کی بازی جمتی اور خوب نوک جھونک ہوتی۔ دوران کھیل چچا اللہ وسایا جب الجھ کر بے بس ہوتے تو چچا الطاف اشعار کے لب و لہجے میں بھرپور طنز کرتے۔ بار بار یہ فقرہ کہتے۔ ''اللہ وسایا۔ لکھ تینوں کی وی پھسایا۔'' اور پھر جب چچا الطاف مشکل میں گھرتے تو چچا اللہ وسایا کی باری آتی وہ بھرپور جوابی وار کرتے۔ چچا الطاف کو ان کی ولدیت کے حوالے سے نشانہ بناتے اور کہتے۔ ''دے بچہ پانچ تیں دیا۔ بن تیرا ہاسا کد گیا؟'' دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ چچا اللہ وسایا کچھ کم گو سے آدمی تھے۔ کسی حد تک کم آمیز بھی تھے۔ مگر جب موج میں آتے تو پیرا اکثر احمد رشدی مرحوم کا یہ گانا ان کے لبوں پر ہوتا۔

تو اک چاند میری راہوں میں ہے
بڑی مٹھاس تیری باتوں میں ہے

ہر مصرع کے آخر میں لفظ۔ ہو، کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیتے۔ یہ لفظ۔ ہو۔ خالصتاً سرائیکی لب و لہجے میں ڈوبا ہوا ہوتا جو بڑا بھلا لگتا۔ چچا اللہ وسایا کے ساتھ ایسا کچھ ہو جائے گا کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک معمولی سی خطا کی اتنی بڑی سزا ملے گی۔ بات معمولی سی تھی۔ ٹھنڈ کے موسم میں کمرا گرم رکھنے کے لیے ہر گھر میں کوئلہ جلایا جاتا ہے۔ ان کے گھر والوں نے بھی جلایا تھا۔ یہی ان کی خطا تھی۔ انہوں نے کمرا اس طرح بند کیا تھا کہ باہر کی ہوا اندر بالکل نہیں آ رہی تھی۔ چچا وسایا رات کے اوقات کار میں (رات دس بجے سے صبح چھ بجے تک کے لیے) کام پر کارخانے چلے گئے۔ گھر میں بھی افراد کمرا بند کیے بستر رات میں ایسا گرم کمرا کہ سب بے خبر ہو گئے۔ کمرے میں کوئلے کا زہریلا دھواں بھرتا رہا۔ صبح چچا کام سے واپس آئے تو گھر میں سوئے ہوئے ہمیشہ کے لیے سو چکے تھے۔ زہریلی ہوا کام کر چکی تھی۔ یعنی کہ ایک معمولی سی خطا نے ہوا کی نکاسی نہ دینے کی خطا نے سب کی جان لے لی۔

چچا الطاف اگر خوشگوار کیفیت میں ہوتے تو گنگناتے۔

اساں جان کے میچ لئی اکھ وے
جھوٹی موٹی دا پا لیا ای ککھ وے
تو ساڈے دل تک پہنچا

ساتھ ساتھ وہ دائیں طرف کی کٹی ہوئی ران کو بھی رو دھم میں مسلسل حرکت دیتے جاتے۔ جس پر ہنسی بھی دیتے۔ یہ کٹی ہوئی ران ان کی کسی بیماری کا نشان نہیں تھی بلکہ ان کی ایک بڑی خطا کا نشان تھا۔ ہوا یہ تھا کہ وہ خوشگوار موڈ میں تھے اور بلند آواز میں سر بکھیر رہے تھے اسٹیئرنگ ہاتھ میں تھا۔ وہ جھوم جھوم کر گا رہے تھے۔ جیپ بل کھاتی سڑک پر بل کھاتی ہوئی اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ انہیں اوپر والی بستی میں جانا تھا۔ ان کے ساتھ بیٹھے ساتھی انہیں آہستہ ڈرائیو کرنے کا کہہ رہے تھے مگر الطاف چچا ترنگ میں تھے اس حالت میں وہ کب کسی کی سنتے تھے۔ اندھی گھاٹیوں والی سڑک پر تیز چلانے کی سزا انہیں فوراً مل گئی۔ آگے اندھا موڑ تھا۔ انہوں نے تیز رفتار جیپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر یہ اندھی تقریباً ذرا سی خطا پر خفا ہو جاتی ہے۔ بریک دب نہیں پایا اور جیپ گہری کھائی میں جا گری۔ یہ تو ان کی قسمت اچھی تھی وہ اچھل کر سڑک پر جا گرے زندگی بچ گئی۔ مگر ایک ٹانگ قربان ہو گئی۔

ستمبر

منظر امام

عیسوی کلینڈر کے اس نویں مہینے کا ذکر خاص جو خود میں اہمیت کا حامل ہے۔ خاص تمبر کی مناسبت سے انتہائی خاص باتوں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شوقینوں کو مایوسی نہ ہو۔

علم کے متلاشیوں کی مدارات

جولین اور بارجین کیلنڈر کے مطابق سال کا نواں مہینا، زمین کے شمالی حصے میں خزاں اور جنوبی حصوں میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔
ابتدا میں یہ رومن کلینڈر کے مطابق دس میں سے نواں مہینا تھا جبکہ مارچ کو پہلا مہینا شمار کیا جاتا تھا۔ B.C153 میں جنوری اور فروری بھی اس فہرست میں شامل کر دیے گئے تھے۔
14 ستمبر کو فرانسس اسکاٹ کی نے مشہور نغمہ The

star spangled banner لکھا گیا۔

آسٹریلیا میں مشہور کھیل رگبی کا آغاز ہوا۔

7 ستمبر برازیل کی آزادی کی تاریخ ہے۔

اس مہینے کینیڈا اور امریکا میں مزدوروں کا دن منایا جاتا ہے۔

ستمبر 1931ء میں جاپان نے چین پر حملہ کیا تھا۔

16 ستمبر کو ملائشیا کا دن منایا جاتا ہے اور اسی تاریخ کو میکسیکو کا دن بھی ہوتا ہے۔

اب آئیں تاریخ وار جائزہ لیتے ہیں۔

1 ستمبر 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کی ابتدا ہوئی ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا تھا۔

پہلی ستمبر 1486ء میں وینس میں پہلی بار کاپی رائٹ ایکٹ منظور ہوا۔

2 ستمبر، امریکا میں محکمہ خزانہ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ یہ واقعہ 1789ء کا ہے۔

پہلی ڈور جا گیس کمپنی نے اپنی مشینیں گیس پر چلانے کا آغاز کیا۔

3 ستمبر، میں بلند و بالا عمارت کا دن۔ جیسے مشہور زمانہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ، برج العرب، ٹوئن ٹاور، شنگھائی ٹاور وغیرہ۔

انکل سام کی برتھ ڈے بھی اسی تاریخ کو ہوتی ہے۔

4 ستمبر 1888ء کو جارج ایسٹ مین نے مشہور زمانہ فلم کیمرا ایسٹ مین کیمرا (فلم) متعارف کروایا۔ اسی تاریخ کو مشہور سرچ انجن گوگل سامنے آیا۔ یہ واقعہ 1998ء کا ہے۔

5 ستمبر 1620ء میں پہلے مے فلاور انگلینڈ سے سیاحوں کا بہت بڑا قافلہ زندگی اور نئی زمین کی تلاش میں روانہ ہوا تھا۔

7- ستمبر 1948ء میں LOWIS PARKER نے ایک مکمل وائرلیس ریسیور متعارف کروایا تھا۔ اس ریسیور کے بغیر آج بھی پوری دنیا میں کوئی ٹی وی سیٹ کام نہیں کر سکتا۔

8 ستمبر۔ پوری دنیا میں خواندگی کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ یہ تاریخ اس بات کو اجاگر کرتی ہے کہ علم بہت بڑی طاقت ہے۔

8 ستمبر 1157ء میں مشہور جرنیل اور بادشاہ رچرڈ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس کو تاریخ شیر دل رچرڈ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ غازی صلاح الدین ایوبی کے ساتھ اس کے

مصر کے تاریخ کا روشن حصہ ہیں۔

8 ستمبر 95 میں مائیکروسافٹ ونڈوز متعارف ہوا تھا۔

9 ستمبر 1850ء میں کیلی فورنیا امریکا کی مقبوضہ ریاست قرار پایا۔

10- ستمبر ELIAS HOWER نے کپڑے سینے کی مشین متعارف کروائی۔

اسی تاریخ کو 1977ء میں تیونس سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون حمیدہ کو گلوٹین کی سزا دی گئی۔ یہ آخری مجرم تھی جس کو یہ سزا دی گئی تھی۔ اس سزا کے بعد گلوٹین کا رواج ختم کر دیا گیا۔

11- ستمبر 2001ء ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ ہوا۔

اسی تاریخ کو مشہور ادیب او ہنری کی 1862ء میں پیدائش ہوئی تھی۔

12 ستمبر امریکا میں نیشنل چاکلیٹ ملک ڈے منایا جاتا ہے۔

اسی تاریخ کو 1913ء میں ایک مشہور اولمپک چیمپئن اووینز کی پیدائش ہوئی تھی۔

13 ستمبر اس تاریخ کو بھی کئی دن منائے جاتے ہیں۔ جیسے نیشنل پیانو ڈے۔

بازو جھٹکنے ڈے (یعنی مثبت سوچ کا دن)

کارٹون فلموں کا مشہور کردار اسکوبی ڈو کی برتھ ڈے۔

14 ستمبر جان اسٹیپ زکی پیدائش 1950ء میں۔

1814ء میں مشہور نغمہ STAR SPANGLED لکھا گیا۔

اسی تاریخ کو مشہور ٹی وی شو SINPSON پیش کیا گیا تھا۔

15- ستمبر اسپین میں اسپین کے ثقافتی ورثے کا ہفتہ منایا جاتا ہے۔

16- ستمبر اس تاریخ کو بھی کئی انوکھے سے دن منائے جاتے ہیں۔ اس تاریخ کو 1857ء میں اولیور ڈسن نے کرسمس کا مشہور نغمہ JINGLE BELL متعارف کروایا تھا۔

1918ء میں ایلمر اسپیرے نے جدید بحری جہازوں میں استعمال ہونے والا آلہ Syro compass متعارف کروایا تھا۔

18- ستمبر 1851ء میں دنیا کے مشہور اخبار

نیو یارک ٹائمز کی پہلی اشاعت سامنے آئی تھی۔

1876ء میں MELVILLE نامی ایک شخص نے قالینوں کی صفائی کی مشین متعارف کروائی۔ جس سے یہ مشکل کام بہت آسان ہو گیا۔

1514ء میں میگلن نے گم شدہ جزیروں پر ریسرچ کے کام کا آغاز کیا۔

1938ء میں رجلس نے THE SYN TICFIBRE متعارف کروایا۔

21- ستمبر مشہور ادیب ایچ جی ویلز کی پیدائش کی تاریخ ہے۔

22 ستمبر 1920ء میں Band aid ایجاد ہوا۔ اسی تاریخ کو 1903ء میں آئس کریم کون متعارف ہوا اور 1789ء میں امریکا میں پہلا پوسٹ آفس قائم کیا گیا۔

اس تاریخ کو مائیکل فیراڈے کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے الیکٹرک کے شعبے میں بہت کام کیا۔ اس کا قابل ذکر ایجاد الیکٹرک موٹر ہے۔

23- ستمبر خزاں کا پہلا دن۔

1889ء میں NIN TENDO کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

جو ہانز نے فوٹو گرافی میں استعمال ہونے والا بلب ایجاد کیا۔

26- ستمبر 1961ء میں میکسم فاگٹ اور ان کی ٹیم نے خلائی جہاز کے لیے ایسا کیپسول بنایا جو ایمرجنسی کی صورت میں جہاز سے علیحدہ ہو جائے۔

27- ستمبر 1825ء میں دنیا کا پہلا انجن چلنا شروع ہوا۔

1977ء میں بائیوڈرک سرنج متعارف ہوا۔

28- ستمبر 1909ء میں پہلا ائیرپورٹ کھولا گیا۔

1066ء میں ولیم (فاتح) نے برطانیہ پر فتح حاصل کی تھی۔

1925ء میں سپر کمپیوٹر کے موجد سیمور کرے کی پیدائش ہوئی۔

29- ستمبر 1789ء میں امریکا کی آرمی کا قیام عمل میں آیا۔

سیمی کے ایک کردار نیلی مونسٹر کی پیدائش کی تاریخ۔

30 ستمبر 1849ء میں سیفٹی پن کی ایجاد ہوئی۔

1452ء میں بائبل کے نسخوں کی پہلی اشاعت۔

دماغی قوت میں اضافے کیلئے سیب مفید ہے: ماہرین

سیب ذائقے سے بھرپور پھل تو ہے لیکن یہ دماغ کے لیے بھی بہترین غذا ہے۔ طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ سیب میں دوسرے پھلوں کی نسبت فاسفورس اور فولاد زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے اس لیے سیب کھانے سے دماغی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ سیب گردے اور دانتوں کے لیے بھی فائدے مند ہوتا ہے جبکہ یہ جگر کے فعل کو درست کر کے بھوک بڑھاتا ہے۔ ماہرین کے نزدیک روزانہ صبح کے وقت نہار منہ سیب کھانے سے انسان صحت مند و تندرست رہ سکتا ہے۔

آم دل اور معدے کے امراض میں فائدہ مند ہے: انسانی صحت کے لیے انتہائی مفید ہے اور یہ دل اور معدے کے امراض کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ماہرین کے مطابق آم کھانے سے خون بننے میں مدد ملتی ہے اور یہ جسم کو موٹا کرتا ہے جبکہ اس سے پیٹ کی بیماریاں ختم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ آم کا جوس پینے سے جسم میں طاقت آتی ہے اور یہ دل، دماغ، معدے اور پھیپھڑوں کو طاقت پہنچاتا ہے۔

دنیا کی بہترین ملازمت برطانوی شہری کو مل گئی

ایک 34 سالہ برطانوی شہری رچ کیم کو آخر کار ایسی ملازمت مل گئی ہے جسے بلاشبہ دنیا کی لذیذ ترین اور بہترین نوکری قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک برطانوی اخبار کے مطابق رچ کیم کا تقرر چھ ماہ کے لیے کیا گیا ہے۔ اس مدت کے لیے اسے 61 ہزار پاؤنڈ ادا کیے جائیں گے جو انتہائی قابل رشک رقم ہے۔ یہ ملازمت اسے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ملی ہے اور اس کے فرائض ہوں گے کھانا، پینا اور موج اڑانا۔ رچ کیم کو بس یہ کرنا ہوگا کہ ہوٹل میں گاہکوں کو پیش کرنے کے لیے جو کھانے اور مشروبات تیار ہوں ان کو چکھ کر ان کے ذائقے کے بارے میں اعلیٰ افسران کو فوری رپورٹ پیش کرے۔ لیکن یہ پرلطف ملازمت رچ کیم کو آسانی سے نہیں ملی بلکہ اسے بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس ملازمت کے لیے باقاعدہ مقابلہ ہوا تھا جس میں دنیا بھر سے 3 لاکھ 33 ہزار افراد نے حصہ لیا۔ رچ کیم بھی اس مقابلے میں شریک ہوا اور اول رہا۔ جس کے بعد ایک بڑی تقریب میں اس کی کامیابی کا اعلان کیا گیا۔ صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے رچ کیم نے کہا کہ یہ ملازمت عیاشی نہیں بلکہ اہم کام ہے۔ کھانا پینا فرائض کا حصہ بن جائے تو یہ شوق نہیں بلکہ ذمہ داری بن جاتا ہے۔

مرسلہ: زینب توحید، سیالکوٹ

سراب

راوی : شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

ح:89

وہ ایک مہم جو تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے۔ جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ دوستی میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف منیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے سویرا کو اغوا کر لیا اور مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ایک میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوا لیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "ہیرے... بکسے" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے۔ پھر مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ ایبا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں نکل آیا۔ پھر عبداللہ کی کوٹھی پر۔ وہیں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے کسی نے بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے کرنل کی تحویل میں پایا۔ مگر میں ان کو ان کی اوقات دکھا کر نکل بھاگا۔ جب تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زوراسنگھ نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے بھارت انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بیٹا اپنے حق میں کر لیا۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی۔ کسی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کرتے کہ ہم یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس گھر سے نکل کر باسمرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں ہم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی اسیر تھی۔ وہ بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زوراسنگھ بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زوراسنگھ ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ منیر کو دبئی بھیجا تھا۔ اسے ایئرپورٹ سے پک کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست دان کی بیٹی کی تھی۔ ہم نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ کھو گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر دو نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بہ حالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چال کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کر کے بانو کو اپنے بیڈ روم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزاری تو بانو رہا ہو جائے گی۔ میں نے روشن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتے کہ شنی دل آ گیا اور اس نے روشن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ ماتنگ اور روشن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پا لیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہاتھ مارا، پستول نکل کر دور جا گرا۔ پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ سنگاری جب ہیلی کاپٹر واپس اتار رہا تھا کہ میزائل چھوٹ گیا اور سارا ماحول تاریک ہو گیا۔ دھماکے سے ہیلی کاپٹر پانی پر گرا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے۔ میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہو کر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک ملٹری جیپ لے کر بڑے سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکہ بندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں جیسے سڑک پر تو کیلیں بچھادی گئیں۔ گاڑی نزدیک

پہنچنے ہی والا تھا کہ ایسا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو جیتو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم گلی کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں جیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر اروند اسے ہراساں کر رہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا۔ پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس نے ڈیوڈ شاہ کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شاہ کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور چیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا دی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے شکتی دل جی کی آواز سنائی دی۔ "شانتی شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائیک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی ختم اور لگا دی گئی۔ ہمیں ایک دوسری نوکرانی دی گئی۔ ہم حملے کی ریہرسل بھی کر رہے تھے کہ خبر آئی کہ فوراً کہیں اور منتقل ہو جاؤ۔ ہم فتح خان کے ساتھ ایک دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ وہاں سے ٹہلنے کے لیے نکلا اور ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کرنے لگا کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا۔ ہوش آیا تو میں کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ دامن سامنے تھا۔ وہ تفتیش کر رہا تھا۔ کنور چیلس پر حملہ ہوا اور دھماکے سے میرے ہوش حواس گم ہو گئے جب ہوش آیا تو ٹائیگر کو الیکٹرک شاک لگ کر ٹھکانے لگایا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ جیتو بھی مل گیا پتا چلا ساوری بڑے کنور کے ساتھ ہے۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکا فون لگا ہوا ہے۔ کسی نے فائرنگ شروع کی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" ساوری کو لے کر جیمپ..... مگر حملہ آور جو مارا گیا اور ساوری کی چیخ سنائی دی پھر شکتی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ پر شکتی جن غنڈوں کو لے کر آیا تھا انہوں نے بغاوت کر دی۔ ان سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آ کر مجھے اور ساوری کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کر دیا اور جیتو کی طرف لپکا۔ جیتو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے سرحد تک پہنچے۔ میں نے ایک ایپ کے ذریعے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دے دی اور ان کے مشورے پر ندی پار کر کے پاکستانی حدود میں آ گیا۔ کچھ ہی دور چلا تھا کہ میرا پیر ایک بارودی سرنگ پر پڑ گیا۔

(اب آگے پڑھیں)

ساوری نے بھی آواز سنی تھی۔ "شوبی یہ آواز کیسی ہے؟"

میرے کان کلک کی آواز کے بعد دھماکے کے منتظر تھے۔ مگر دھماکا نہیں ہوا تو میرا رکا ہوا دل پھر چل پڑا تھا۔ وسیم نے ساوری کی آواز سن لی تھی۔ اس نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"ساوری تم آگے جاؤ میرے پیچھے آؤ اور بالکل سیدھ میں آگے جاؤ۔"

"شوبی...."

"ساوری۔" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ "ناؤ گو اِٹ از آرڈر۔"

ساوری حرکت میں آئی اور میرے نقش قدم پر چلتی میرے پاس آئی اور پھر سائیڈ سے ہو کر آگے بڑھ گئی تھی میں اس کے قدموں سے آگے زمین پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وسیم نے پھر پوچھا تو میں نے اسے شٹ اپ کال دی۔ میری ساری توجہ ساوری پر مرکوز تھی۔ اس موسم میں بھی دریا میں برائے نام پانی تھا۔ ایک زمانے میں اپنے قیامت خیز سیلابوں کی وجہ سے مشہور یہ دریا اب خشک تھا اس کا سارا پانی انڈیا پی گیا تھا۔ اب ساوری دریا کی ریتیلی زمین پر تھی۔

میں نے وسیم سے کہا۔ "میرا خیال ہے میرا پاؤں کسی بارودی سرنگ پر آ گیا ہے۔"

وہ مضطرب ہو گیا۔ "میرے خدا۔"

"تم ساوری کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔"

"میں آ رہا ہوں۔" وسیم نے کہا اور موبائل عبداللہ کے سپرد کر دیا وہ اس کے ساتھ تھا۔ اسی لمحے انڈیا کی طرف سے کسی گاڑی کی روشنیاں لہرائیں اور میں تیزی سے ممکنہ حد تک نیچے جھک گیا۔ ساوری وہیں ریت پر لیٹ گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ آنے والی جیپ تھی۔ میں نے دایاں پاؤں جو بارودی سرنگ پر تھا اسے سیدھا رکھا اور بایاں پاؤں موڑتے ہوئے سر جھکا کر پیروں کے پاس لے آیا اور گول مول ہو گیا۔ آسمان پر بادل تھے اس لیے تاریکی تھی لیکن اگر روشنی پڑتی تو میں نظر آ جاتا اور میں چاہتا تھا کہ دیکھنے والے مجھے پتھر یا مٹی کا ڈھیر سمجھیں میں انہیں انسان نہ لگوں۔ یہ خاصا مشکل پوز تھا۔ اگر ساوری یہ پوز بنانا چاہتی تو آرام سے بنا لیتی کیونکہ اس کا جسم نازک اور لچکدار تھا۔ میرا سخت اور غیر لچکدار جسم آسانی سے مڑنے تڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اپنی بغل سے عقب میں دیکھ رہا تھا۔ جیپ آ کر مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر رک گئی۔ اس سے دو آدمی

اترے اور ایک ہزار کی ٹارچ کی روشنی آس پاس مارنے لگے۔ عبداللہ نے میرے کان میں کہا۔

"آپ فکر نہ کریں ہمارے پاس اسٹین گن ہے اگر انہوں نے آپ کو دیکھ بھی لیا تو انہیں اڑا دیں گے۔ میرا آدمی انہیں نشانے پر لیے ہوئے ہے۔"

"فائرنگ کی آواز سے دوسرے ہوشیار ہو جائیں گے۔"

"گنیں بے آواز ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔

"آس پاس دیکھو۔" جیپ سے اترنے والے انڈین فوجی نے چلا کر کہا۔ "دو شخص نظر آئے تھے۔"

"لگ رہا ہے یہ بھی انفرا ریڈ سے معائنہ کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہم تو روشنی کے بغیر آئے تھے۔"

"ہو سکتا ہے، اب ایسے آلات عام ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔ "وسیم روانہ ہو گیا ہے۔"

"جیپ میں کتنے لوگ ہیں؟"

"تین ایک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہے۔"

باقی دو آس پاس روشنی ڈال رہے تھے اور کئی بار روشنی میرے پاس سے گزری تھی لیکن مجھ پر نہیں آئی تھی۔ "اگر شوٹ کرنے کا فیصلہ کیا تو پہلے ڈرائیور کو نشانہ بنانا۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اس کے پاس ریڈیو ہوگا وہ دوسروں کو خبردار کر سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ پٹی کے دوسری طرف نہیں آ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ یہاں بارودی سرنگوں کی موجودگی سے باخبر تھے۔ اب پتا نہیں یہ سرنگیں دونوں طرف سے کس نے بچھائی تھیں کیونکہ یہ علاقہ بہرحال پاکستانی تھا مگر اس کی نوعیت ایسی تھی کہ پاکستانی سیکیورٹی والے اس طرف نہیں آ سکتے تھے، انہیں دریا پار کرنا پڑتا اس لیے عملاً اس حصے کی نگرانی انڈین سیکیورٹی ہی کر سکتی تھی۔ وہ سرحد پار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہم پاکستانی حد میں تھے لیکن ان کی نظر میں آ جاتے تو وہ فائرنگ کر سکتے تھے۔ ساوی نشیب میں ہونے کی وجہ سے ان کی نظروں اور ٹارچ کی روشنی سے محفوظ تھی۔ مگر وہ میری خاطر ساکت تھی۔ میں سرحدی پٹی کے تقریباً سو گز اندر تھا۔ ساوی دو سو گز آگے اور نشیب میں تھی۔ دریا کے پاس پاکستانی کنارہ اونچا تھا اور وہیں کہیں عبداللہ اور دوسرے موجود تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وسیم کیسے اس طرف آئے گا۔

"یہاں کوئی نہیں ہے... ان کو خواب آئے ہیں۔" ایک فوجی نے گندی گالی کے ساتھ کہا۔ "اس وقت جنیں دوڑا تے ہیں۔"

"ٹھیک سے دیکھ لے ورنہ وہ تیری ماں..." دوسرے نے مزید گندی گالی۔ وہ نچلے درجے کے اہلکار لگ رہے تھے۔ جن کی زبان اور لہجہ دونوں ہی گندہ تھا۔ وہ بس ٹارچ گھما رہے تھے اور انہوں نے ایک بار بھی سکون سے ٹارچ کا استعمال نہیں کیا تھا۔ اسی تیزی میں ایک بار روشنی مجھ پر سے گزری تھی۔ مگر وہ مجھے دیکھ نہیں سکے تھے۔ انہیں آئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے مگر مجھے لگ رہا تھا کہ میں نہ جانے کب سے اس پوز میں تھا اور اب میری کمر درد کرنے لگی تھی۔ میری اس وقت خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد دفع ہو جائیں۔ بالآخر انہوں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔

"چل واپس..." پہلے والے نے پھر گالیوں کا ڈھیر اگلا اور مڑا تھا کہ اچانک ہی ٹارچ کی روشنی میری طرف آئی اور اس بار اس نے دیکھ لیا۔

"یہ... کیا ہے؟"

"کہاں کدھر؟" دوسرے نے کہا۔

"انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہے۔" میں نے عبداللہ کو مطلع کیا۔ وہ دونوں پاگلوں کی طرح ٹارچ کی روشنی اس طرف ڈال رہے تھے مگر خوش قسمتی سے دوبارہ روشنی مجھ پر نہیں آئی تھی۔ اگر میرا پاؤں بارودی سرنگ پر نہ ہوتا تو میں اس وقت ان کی طرف سے فائرنگ کی پروا کیے بغیر بھاگ کھڑا ہوتا۔ مگر میں ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا پاؤں ہٹتا اور سیکنڈ سے بھی پہلے میرا جسم ٹکڑوں میں بٹ جاتا۔ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلا والا چلایا۔ "وہ دیکھ دریا کے ساتھ۔"

میں گول مول ہوا تھا ان کی بات نے چونکایا اور میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ساوی کو دریا کی طرف بھاگتے دیکھا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بچانے کے لیے یہ حماقت کی تھی۔ وہ خودکار رائفل کی حد میں تھی۔ میں نے بولٹ کھنچنے کی آواز سنی اور عبداللہ کو حکم دیا۔ "شوٹ ہم... جلدی۔"

عبداللہ کا شوٹر ساتھی پہلے ہی حرکت میں آ گیا تھا۔ میں نے سائیں کی آواز سنی پھر گولی لگنے کی آواز آئی۔ جیسے کسی سخت لکڑی پر پتھر مارا ہو۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک گر گیا تھا اور دوسرا جیپ کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ابھی وہ جیپ سے کچھ دور تھا اور چلا چلا کر ڈرائیور کو خبردار کر رہا تھا۔

دوسری سائیں کی آواز آئی اور اس بار ڈرائیور جو جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ بچ جانے والا جیپ تک پہنچا تھا مگر اسے اس میں سوار ہونا نصیب نہیں ہوا اور تیسری گولی اس کی پشت میں اتر گئی۔ وہ اچھل کر جیپ کے جنگلے سے ٹکرایا اور پھر نیچے گر گیا۔ تب میں نے دیکھا سامنے پانی سے دو ہیولے برآمد ہو رہے تھے۔ سادی ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ان میں سے ایک سادی کے پاس رکا اور اسے لائف جیکٹ پہنانے لگا اور دوسرا میری طرف آیا۔

میں نے قامت اور چال سے اندازہ لگا لیا کہ وہ وسیم تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آلہ تھا جس کی ہلکی سی روشنی یہاں سے دکھائی دے رہی تھی۔ بھارتی فوجی مارے گئے تھے یا شدید زخمی تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خطرہ ٹل گیا تھا۔ اگر سینٹرل کمانڈ سے جیپ سے رابطہ نہیں ہوتا تو جلد کوئی نہ کوئی ان کی خبر گیری کے لیے آتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مشکل سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے۔ مگر میں پوز کی مشکل سے نکل آیا تھا اور احتیاط سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کمر کو بہت سکون ملا تھا۔ وسیم سیدھا نہیں آ رہا تھا بلکہ وہ اس آلے سے زمین کو چیک کرتا آ رہا تھا۔ یہاں یقیناً مزید بارودی سرنگیں تھیں اور وہ ان سے بچتا آ رہا تھا۔ بالآخر وہ میرے پاس پہنچ گیا۔ اس نے خوشدلی سے کہا۔ "کیسے ہیں شہباز صاحب آپ کو دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔"

"اس حال میں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے میں اسے ابھی فکس کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور جھک کر میرے پاؤں کے آس پاس سے مٹی ہٹانے لگا۔ اس نے بھی نائٹ ویژن عینک رکھی تھی اور چاقو سے مٹی کرید رہا تھا۔ اس دوران میں اس کے ساتھ آنے والا سادی کو لائف جیکٹ پہنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جب وہ دوسرے کنارے پر پہنچے تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ سادی محفوظ ہو گئی تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔

"ٹھیک ہے کوشش کرو لیکن اگر یہاں مزید انڈین آئے تو تم فوراً واپس چلے جاؤ گے۔"

وسیم نے جواب نہیں دیا اور اپنا کام کرتا رہا۔ ایک منٹ میں اس نے بارودی سرنگ کے آس پاس سے مٹی ہٹا دی تھی اور دریا کنارے ہونے کی وجہ سے اس پر مٹی کی تہہ چھ انچ سے زیادہ آ گئی تھی اور شاید اسی وجہ سے یہ نائٹ ویژن میں نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا اوپری حصہ چھوٹا تھا لیکن نیچے سے یہ خاصی بڑی تھی اور اپنی ساخت سے یہ بکتر شکن بارودی سرنگ لگ رہی تھی۔ چاقو سے مٹی کریدتے ہوئے وسیم نے اس کا وہ حصہ نکال لیا جو میرے پاؤں تلے دبا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "وسیم احتیاط سے۔"

"آپ فکر نہ کریں میں نے ان کا کورس کیا ہوا ہے، مجھے معلوم ہے یہ کیسے ناکارہ ہوتی ہیں۔" اس نے کہا اور اب وہ چاقو کی نوک سے اس کی نچلی پلیٹ کے اسکرو کھول رہا تھا۔ "یہ روسی ساخت بارودی سرنگ ہے اور شکر ہے کہ روسی ہے کیونکہ میں اس کی ساخت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یورپی اور امریکی بارودی سرنگیں پوری طرح سیل ہوتی ہیں اور ان کی پلیٹ کھولی نہیں جا سکتی ہے۔"

"اسے کھول کر کیا کرو گے۔"

"اس کا ڈیٹونیٹر ایک گراری سے منسلک ہوتا ہے۔ ایک بار دباؤ آنے سے گراری گھوم کر تن جاتی ہے اور جیسے ہی اس پر سے دباؤ ختم ہوتا ہے گراری واپس اپنی جگہ آ کر ڈیٹونیٹر کو چلا دیتی ہے اور وہ بارودی مواد اڑا دیتا ہے۔" بولنے کے ساتھ ساتھ وہ نہایت پھرتی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے دو منٹ میں سارے اسکرو کھول دیے اور اس کی بات سے مجھے اطمینان ہوا تھا کہ وہ اسے ناکارہ بنا سکتا ہے یقیناً وہ یہ کام کر سکتا تھا تب ہی کر رہا تھا۔ اس نے بہت احتیاط سے چاقو کی نوک سے پلیٹ کے کنارے کو کرید کر واضح کرنا شروع کیا جو مٹی جم جانے سے تقریباً غائب ہو گیا تھا۔ یہ گول پلیٹ اس گول پائپ کے گرد تھی جس پر میرا پاؤں ٹکا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ اوپر کیسے آئے گی میرا پاؤں ہٹائے بغیر؟"

"اسے پورا نہیں نکالنا ہے صرف سرکانا ہے گراری اس کے نیچے ہوتی ہے۔" وسیم نے اپنا کام کرتے ہوئے کہا۔ اب اس نے نائٹ ویژن آف کر کے ایک چھوٹی پنسل ٹارچ نکال کر آن کی اور اسے منہ میں دبا کر نیچے جھک گیا۔ روشنی ہم دونوں کے درمیان تھی اس لیے امید تھی کہ دور سے نظر نہیں آئے گی۔ وسیم نے مجھے سیدھے کھڑے ہونے کو کہا تا کہ اسے کام کے لیے زیادہ جگہ مل سکے تو میں سیدھا کھڑا ہو گیا اس دوران میں میرا پاؤں سختی سے بارودی سرنگ پر جما ہوا تھا۔ میں نے دریا کے پار دیکھا۔ جہاں عبداللہ اور اب سادی بھی تھے۔ عبداللہ رابطے پر لیکن خاموش تھا۔ میں نے پلٹ کر جیپ اور زمین پر پڑے بھارتی فوجیوں کی طرف دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کل دونوں ملکوں میں گرما گرم بیانات اور دھمکیوں کا تبادلہ ہو گا۔ چند دن بعد بھارتیوں کی طرف سے ہماری کسی پوسٹ پر فائرنگ

کی جائے گی۔ یہ دیکھنا ضروری تھا۔

اب وسیم خاموش تھا کیونکہ اس کام کا اہم ترین مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسے کراری کو اپنا کام کرنے سے روکنا تھا اور اس معاملے میں ذرا سی غلطی سرنگ کو اور اس کے ساتھ ہمیں بھی اڑا دیتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھ وسیم کی جان بھی خطرے میں تھی۔ میں نے کہا۔ ''وسیم ایک منٹ رک کر میری بات سنو۔''

وہ ساکت ہو گیا اور پھر اس نے ٹارچ بند کر دی۔ ''جی کہیے؟''

''تمہیں یقین ہے تم یہ کام سو فیصد کر لو گے۔''

''سو فیصد نہیں تو ننانوے فیصد یقین ہے۔''

''میں سو فیصد یقین چاہتا ہوں۔''

''آپ مجھے کرنے دیں اور اللہ سے دعا کریں۔''

اس نے نرم لہجے میں کہا اور دوبارہ ٹارچ روشن کرتے ہوئے نیچے جھک گیا۔ اس وقت میں نے سچے دل کی گہرائیوں سے اللہ سے دعا مانگی کہ اگر میرا وقت آ گیا ہے تو میرے دوست کو محفوظ رکھنا۔ میں تیری رضا میں راضی ہوں۔ میں نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وسیم پوری طرح جھکا ہوا تھا۔ اچانک دور اسی طرف سے پھر روشنی نمودار ہوئی اور اس طرف آنے لگی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''وسیم کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ گاڑی ہے۔''

''بس ایک منٹ اور۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر کہا اور پوری توجہ سے اپنا کام کر رہا تھا۔ گاڑی ابھی شاید ایک ڈیڑھ کلو میٹر دور تھی اور اسے یہاں آنے میں دو منٹ لگ سکتے تھے۔ یہ کچا علاقہ تھا اور یہاں کوئی گاڑی تیز رفتاری سے نہیں چل سکتی تھی۔ تقریباً ایک منٹ بعد بارودی سرنگ سے کٹ کی آواز آئی اور وسیم نے نہ جانے کب سے رکا سانس لیا۔ اس نے کہا۔ ''کراری کاٹ دی ہے، اب آپ اللہ کا نام لے کر پاؤں ہٹا لیں۔''

''وسیم تم دور چلے جاؤ کم سے کم بیس قدم۔''

''آپ.....''

''بحث مت کرو۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''گاڑی قریب آ گئی ہے۔''

وسیم نے اس بار تعمیل کی اور مجھ سے دس قدم دور چلا گیا۔ میں نے کلمہ شریف پڑھا اور پھر اللہ کا نام لے کر بارودی سرنگ سے پاؤں ہٹا لیا۔ ایک دھماکا ہوا، لیکن یہ بارودی سرنگ کا دھماکا نہیں تھا بلکہ آنے والی گاڑی کی طرف سے فائر کیا گیا تھا اور گولی مجھ سے ذرا فاصلے سے گزری تھی۔ میں نیچے جھکا اور جھکے جھکے ہی تیزی سے دریا کی ریت کی طرف بڑھنے لگا۔ میری نظر زمین پر مرکوز تھی۔ میں ایک بار پھر کسی سرنگ سے بچ کر دوسری کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اب عقب سے خود کار رائفل گرج رہی تھی مگر اس کا نشانہ میں نہیں تھا۔ آنے والی گاڑی پہلی جیپ کے ساتھ رکی اور اس کے ساتھ ہی عبداللہ کا ساتھی اسنائپر حرکت میں آ گیا۔ پہلے اس نے والا جھٹکے سے واپس گاڑی میں گرا تھا اور اس کی رائفل جو شعلے اگل رہی تھی خاموش ہو گئی۔ وسیم دریا کے کنارے پہنچ گیا تھا اور میں ریت تک پہنچتے ہی تیز رفتاری سے جھکے جھکے بھاگا تھا۔

اب عقب سے دو گنیں بیکسار رہ رہ کر گولیاں برسا رہے تھے۔ پھر ایک اور اسنائپر کا نشانہ بنا تو ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ فائرنگ بھول کر تیزی سے واپسی کی راہ پکڑ چکے تھے۔ عبداللہ کی مضطرب آواز سنائی دی۔

''جلدی کرو یہاں کچھ لوگ آ رہے ہیں۔''

''ادھر کی خیر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جان کا خطرہ تو نہیں ہوگا۔''

''جلدی آئیں۔'' وسیم نے کہا اور پانی میں اتر گیا۔ میں نے دیکھا کہ حسین والا بارڈر روڈ کی طرف سے روشنیاں اس طرف آ رہی تھیں اور میں پانی میں اتر گیا۔ پانی تقریباً سوا گز کی پٹی میں بہہ رہا تھا اور رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ وسیم آگے جا رہا تھا اور میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

دو منٹ میں ہم دوسری طرف تھے اور اسی لمحے بھارتی سرحد کی طرف ایک گاڑی آ کر رکی تھی اس پر لگی سرچ لائٹ گھوم رہی تھی۔ اس کی روشنی سے بچنے کے لیے ہم جھکے جھکے بھاگنے لگے اور پھر اسنائپر نے کام دکھایا اس نے سرچ لائٹ ہی گل کر دی۔

''اچھا نشانہ۔'' میں نے ہانپتے ہوئے اسے داد دی۔

''ابھی آپ تماشا دیکھیے گا۔'' وسیم بولا۔ اس کا سانس ہموار تھا حالانکہ وہ تیر کر آیا بھی تھا۔ میری طرح وہ بھی سر تا پا سیاہ لباس میں تھا۔ میں نے پانی سے نکلتے ہی جیبیں موبائل پانی میں پھینک دیے تھے۔ اگر میں یہاں سیکیورٹی فورس کے ہتھے چڑھتا تو ایسی کوئی چیز میری مشکلات میں اضافہ کر سکتی تھی۔ عقب میں بھارتی فائرنگ کر رہے تھے مگر یہ اندھا دھند تھی کیونکہ انہیں کوئی نظر تو آ نہیں رہا تھا اس کے باوجود ہم خطرے کی حد میں تھے اس لیے تیز رفتاری سے دوڑ رہا

کے پشتے پر چڑھے اور یہاں زمین پر گر کر چاروں ہاتھوں پاؤں سے رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کچھ آگے ایک چھوٹا سا نالہ تھا۔ پشتہ جب نشیب کی طرف ہوا تو ہم کھڑے ہوگئے۔ اب خطرے کی حد سے باہر تھے۔ میں نے پلٹ کر بھارتی سرزمین کی طرف دیکھا جس سے بالآخر میں جان چھڑانے میں کامیاب رہا تھا اور جو بیرنسہ پا کی طرح میری پشت سے چمٹ گئی تھی۔ جب ہم گاڑی کے پاس پہنچے تو وہاں عبداللہ اور اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ خطرے سے نکلتے ہی وسیم مجھ سے یوں لپٹ گیا جیسے میرے وجود کا ایک حصہ بن جانا چاہتا ہو۔ وہ رو رہا تھا۔ میں بھی رو رہا تھا۔ ہم جنید کو یاد کر رہے تھے۔ مگر عبداللہ نے اپنے حواس برقرار رکھے تھے اس نے کہا۔

"یہاں سے نکلیں، میرا خیال ہے رینجرز کا کوئی پیدل دستہ اس طرف آرہا ہے وہ بے دریغ فائر کر رہے ہیں۔"

عبداللہ کے ساتھ وسیم کے ایک ساتھی نے ایک عجیب ساخت کی جدید گن اٹھا رکھی تھی اور پھر میں اسنائپر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ہانی تھا۔ اس نے شانے سے لیپ ٹاپ بیگ لٹکایا ہوا تھا۔ علیک سلیک کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس لیے ہم تیزی سے اس طرف موجود کھیتوں میں گھس گئے۔ سادی پہلے ہی جا چکی تھی۔ ہانی کے ہاتھ میں ایک آلہ تھا اور وہ اس پر دیکھتے ہوئے ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ سب نے نائٹ ویژن چڑھائے ہوئے تھے سوائے ہانی کے۔ کھیتوں میں مکئی کی فصل کاشت کی گئی تھی اور اس کے پودے تین فٹ تک اونچے ہوگئے تھے اور یہ اسی صورت میں ہمیں آڑ دے سکتے تھے کہ ہم جھک کر چاروں ہاتھوں پیروں سے چلتے مگر اس کی ضرورت نہیں آئی۔ میں نے ذرا آگے ہو کر ہانی کے ہاتھ کے آلے کو دیکھا۔ یہ ٹیب سائز کا تھا اور اس پر دو مختلف جگہوں پر چند سرخ نقطے حرکت کر رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے ہانی سے پوچھا۔

"مین ڈی ٹیکٹر۔" اس نے کہا۔ "ایک کلومیٹر کے علاقے میں موجود افراد کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ یہ ہم ہیں۔" اس نے سرخ نقطوں کے ایک گروپ کی طرف اشارہ کیا اور پھر دوسرے گروپ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ وہ ہیں جو اس طرف آرہے ہیں۔ یہ ہم سے کوئی نصف کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔"

"سادی کہاں ہے؟" میں نے عبداللہ سے پوچھا۔

"وہ کمال کھوکھر کی حویلی جا چکی ہے۔"

"یہ کمال کھوکھر کیسا آدمی ہے؟"

"اسمگلر اور رسا گیر ہے۔ ادھر کا مال ادھر کرنے کا ماہر ہے۔ وسیم سے اس کے تعلقات اسی وجہ سے ہیں۔"

"کیا اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

"وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کیا ہوں اس لیے کسی شرارت سے پہلے ہزار بار سوچے گا۔" وسیم نے جواب دیا۔ "ویسے آپ فکر نہ کریں، ہمارے ساتھ آٹھ بندے ہیں، میرے، عبداللہ اور ہانی کے علاوہ۔ دو گارڈز ہیں اور اسلحہ آپ دیکھ چکے ہیں۔"

"اسی گن سے فائرنگ کی جا رہی تھی؟" میں نے وسیم کے آدمی کی پشت پر ٹنگی گن کی طرف دیکھا۔ وہ آگے جا رہا تھا۔

"بالکل یہ مکمل طور پر خودکار ہے اور اس کی رینج پندرہ سو میٹرز ہے۔ سات آٹھ سو میٹرز تو اس کے لیے فاصلہ ہی نہیں ہے۔"

"اسے کون چلا رہا تھا یہی؟" میں نے گن اٹھانے والے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہانی۔" وسیم نے فخر سے کہا۔ "یہ کمپیوٹرائزڈ گن ہے اور بلیو ٹوتھ کی مدد سے کسی بھی لیپ ٹاپ سے کنٹرول کی جا سکتی تھی۔ ہم میں سے کمپیوٹر کا چیتا ہانی ہے اس لیے اسے ساتھ لایا اور اس نے کمال کر دیا، ایسے نشانے لیے کہ دوسری گولی چلانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔"

یہاں ہمیں کم فاصلہ طے کرنا پڑا تھا اور دو کلومیٹرز بعد ہی ٹھوہی والا میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ فیروز پور روڈ کے ساتھ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کمال کھوکھر کی حویلی گاؤں میں تھی۔ شروع میں اکا دکا گھر آئے جو کھیتوں کے ساتھ بنے ہوئے تھے اور پھر گاؤں کی خاص آبادی آئی جو غریب غربا پر مشتمل تھی ہم اس کے ساتھ ساتھ چلتے گاؤں اور اندرون سائیڈ کے درمیان واقع بڑے فارم ہاؤس جیسے قطعات کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک بڑے مکان تک آئے۔ چاروں طرف سے اونچی دیوار والے احاطے اور اندر گھنے درختوں کے درمیان ایک پرانے طرز کا سرخ اینٹوں اور اونچی چھت والا مکان تھا۔ اس پر پکی چھت تھی۔ گیٹ پر ہلکی سی دستک دی تو ایک چھوٹی کھڑکی سے کسی نے باہر جھانکا اور عبداللہ کو دیکھ کر چھوٹا دروازہ کھول دیا تھا۔ ہم اندر آئے تو وسیع صحن میں چارپائیاں پڑی تھیں اور ان پر درجن سے بھی اوپر لوگ لیٹے بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ وسیم کے آدمی تھے اور باقی کمال کھوکھر کے۔ سب نے اٹھ کر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

پھر ہم اندر آئے جہاں ایک دیہاتی اسٹائل کی نشست گاہ میں ایک بھاری بھرکم شخص دھوتی اور پگڑ باندھے بیٹھا تھا۔ یہ کبھی نیشن میرے لیے نیا نہیں تھا خود اپنے گاؤں میں کئی بزرگوں کو اسی حلیے میں دیکھ چکا تھا۔ وہ تقریباً پچاس سال کا کھچڑی ہو جانے والے بالوں اور متورم آنکھوں والا شخص تھا۔ اس نے اٹھ کر مجھے اپنی توند سے لگایا۔ "اوہ جی شہباز صاحب.... خوش قسمتی کہ آپ کا دیدار ہوا، خادم کو کمال کھوکھر کہتے ہیں۔ مجھے آپ اپنا ہی سمجھیں۔"

وسیم نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ کھوکھر صاحب آپ کو جانتے ہیں یہ تو صرف نام سن کر دل و جان سے راضی ہو گئے۔ اس طرف جو اتنا سکون تھا تو یہ کھوکھر صاحب کا ہی کمال تھا۔"

"میں کیا جی اور کیا میرا کمال۔" اس نے انکساری سے کہا۔ "آپ کیا جنس ہیں جی۔ آپ کے دونوں طرف اتنے چرچے ہیں کہ بس...."

"حالانکہ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

وہ اچھل پڑا۔ "کیسی بات کرتے ہیں جی، آپ نے تو دشمنوں کے چھکے لگا دیے، بھارتیوں کے، ہم سے زیادہ کون جان سکتا ہے آپ کو۔"

ہمارے بیٹھتے ہی ایک شخص لسی کا بڑا جگ لے آیا اور اس کی خنکی اور مٹھاس نے گرمی اور تھکن دور کر دی تھی۔ یہاں تین پنکھے چل رہے تھے اور گرمی دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اندر میرے ساتھ صرف وسیم اور عبداللہ آئے تھے۔ مانی اور دوسرا آدمی باہر رہ گئے تھے۔ کمال کھوکھر گپ شپ کے موڈ میں تھا لیکن وسیم نے سلیقے سے اسے جتایا کہ میں بہت مشکل مرحلے سے گزر کر آ رہا ہوں اور مجھے آرام کی اشد ضرورت ہے۔ اسی لیے اس نے جلدی سے کہا۔ "کیوں نہیں جی آپ آرام کریں کل صبح کل بات ہوگی۔"

ہمارے لیے اندر دو کمرے مخصوص تھے۔ ایک میں سادی موجود تھی۔ اس بے چاری نے پورے لباس پر چادر بھی تان ہوئی تھی کیونکہ لباس بہت چست تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ ہم آ گئے ہیں کیونکہ مانی وہاں موجود تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ اس نے کس طرح اکیلے ہی بھارتیوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیے تھے۔ عملی زندگی میں وہ پستول پکڑ بھی نہیں سکتا تھا مگر کمپیوٹر کی مدد سے اس نے دو جدید ترین گنیں پوری مہارت سے استعمال کی تھیں۔ سادی لپک کر میرے پاس آئی۔ "اللہ کا شکر ہے آپ ٹھیک ہیں۔"

"تم جیسی بہن دعا کرے گی تو اللہ کیوں نہیں سنے گا۔" میں نے کہا۔ "اس کا احسان ہے کہ میں تمہیں لانے میں کامیاب رہا۔ تم ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں ورنہ ایک بندہ ہوش و حواس کو خیرباد کہنے والا تھا۔" عبداللہ نے لقمہ دیا تو وسیم اور سادی جھینپ گئے۔ میں نے کہا۔

"سادی تم آرام کرو۔" وسیم ہمارے ساتھ آنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ "تم کہاں تم بھی آرام کرو۔"

میں، عبداللہ اور مانی دوسرے کمرے میں آئے۔ یہاں چار پائیاں تھیں اور ہر چارپائی کے سرہانے بڑا پیڈسٹل فین لگا ہوا تھا۔ یہ بیک وقت مچھروں اور گرمی کے لیے تھا۔ یہاں بڑے خوفناک قسم کے اور مکھی کے سائز کے مچھر تھے۔ جو نہ جانے کون سا راگ گاتے ہوئے ناک اور کان میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ٹوپی میں پہلے ہی اتار چکا تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی دیسی اسٹائل کا غسل خانہ اور لیٹرین تھا مگر صاف ستھرا تھا اور یہاں پانی کے ساتھ صابن اور تولیے بھی دستیاب تھا۔ میں نے خود کو صاف کیا۔ عقل مند عبداللہ آتے ہوئے میرے کپڑے لیتا آیا تھا۔ میں نے موسم کی مناسبت سے پینٹ اور ٹی شرٹ لی۔ میرا خیال تھا کہ عبداللہ روداد معلوم کرنا چاہے گا مگر اس نے کہا۔ "آپ سو جائیں صبح سویرے ہمیں یہاں سے نکلنا ہے خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ڈیوڈ شا نے رابطہ کیا تھا۔ اسے معلوم ہے آپ یہاں آ رہے ہیں اس نے کہا کہ وہ آپ کی واپسی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے گا لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ آپ نے اس سے ایک معاہدہ کیا تھا۔"

"معاہدہ۔" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔" اس نے احمقانہ انداز میں پلان بنایا اور بدبختی دل جی جیسے خبیث شخص پر بھروسا کیا۔ اس نے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ تو اسی کی وجہ سے مارا گیا اور وہ مجھے معاہدہ یاد دلا رہا ہے۔ حساب تو مجھے اس سے لینا ہے۔"

"اس نے اور باتیں بھی کی ہیں۔ مرشد کے حوالے سے بھی اور آپ کے دوسرے مسائل کے بارے میں بھی۔"

"کیا کمال کھوکھر کو علم ہے کہ ہم صبح سویرے جا رہے ہیں وہ تو مجھ سے گپ شپ کا پروگرام بنا رہا ہے۔"

"اسے وسیم بتا دے گا۔" عبداللہ نے کہا۔ "حساب کتاب بھی وہی کرے گا۔"

میں چونکا۔ "حساب کتاب...؟" وسیم نے اسے ادائیگی کی ہے؟"

عبداللہ مسکرایا۔ "شہباز صاحب، اس جیسے لوگ پیسے کے لیے اپنی ماں بیچ دیں اور باپ کا کام مفت میں نہ کریں۔ وسیم نے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔"

میں چارپائی پر گر گیا جس پر روئی کا گدا بچھا ہوا تھا۔ مائی خاموش تھا اس نے جیو کے بارے میں نہیں پوچھا۔ حالانکہ جیو سے اس کی ہم عمری والی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ سب سمجھ رہے تھے کہ میں ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا اور ٹوٹا ہوا تھا۔ فی الحال مجھے آرام کی ضرورت تھی۔ میرے لیٹتے ہی عبداللہ نے لائٹ بند کر دی تھی اور اب کھڑکی سے صحن کی جلنے والی روشنی اندر آرہی تھی۔ میرا ذہن انتشار یا اضطراب کی حالت میں نہیں تھا۔ بلکہ میں ایک سکون آمیز کیفیت میں تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ میں خطرے سے دور اپنی سرزمین پر آگیا تھا۔ میں سادی کو واپس لانے میں کامیاب رہا تھا۔ میں جو وعدہ کر کے گیا تھا اسے پورا کر دکھایا تھا۔ مگر میں نے اس کامیابی کی بہت بھاری قیمت ادا کی تھی۔ میں سادی کو لے آیا تھا اور جیو کو وہیں چھوڑ آیا تھا۔ جیو جو میرا کچھ نہیں تھا اور جو میرا سب کچھ تھا۔ اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے سویا تو خواب میں بھی جیو دکھائی دیا۔

وہ ایک چھوٹے سے کچے مکان میں اپنے جیسے چار پانچ لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور چہک کر بولا۔ "شوبی اب ہم اپنے گھر میں ہے.... یہ ہمارا بہن بھائی ہے.... ہمارا ماتا پتا بھی ادھر ہے۔"

"مبارک ہو جیو تم اپنے گھر میں آگئے۔" میں نے کہا۔

"پر ہم آپ کو بہت مس کرتا ہے، آپ سب کو.... ہمیشہ مس کرے گا۔"

"جیو ہم بھی تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا اور میرے ہاتھ پر رکھا اور اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا ہاتھ بے اختیار اسی جگہ گیا جہاں خواب میں جیو نے ہاتھ رکھا تھا۔ صبح ہو چکی تھی اور کھڑکی کے باہر روشنی جھلکنے لگی تھی۔ عبداللہ اپنی چارپائی پر نہیں تھا اور مائی خراٹے لے رہا تھا۔ چند منٹ بعد عبداللہ غسل خانے سے برآمد ہوا بولا۔ "صبح بخیر۔"

"صبح بخیر۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وسیم جاگ گیا ہے؟"

"ہاں اور اسے جگاتا ہے۔" عبداللہ نے مائی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مشکل کام ہوگا کیونکہ یہ بارہ ایک بجے سو کر اٹھنے والی مخلوق ہے۔"

جب میں غسل خانے جا رہا تھا تو عبداللہ مائی کی ناک میں تنکا گھمانے لگا تھا۔ ایک چھینک کی آواز آئی تھی اور مائی نے احتجاج کیا۔ "یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"ناک میں دم۔" عبداللہ نے جواب دیا۔ "تمہیں اٹھانے کا یہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا اب اٹھ جاؤ ورنہ یہیں رہ جاؤ گے۔ خود سے آنا پڑے گا۔"

میں واپس آیا تو مائی اٹھ گیا تھا اور اپنی عینک کے پیچھے آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ وسیم بھی آگیا تھا اور وہ تیار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "ناشتا آرہا ہے، بس کرتے ہی نکلتے ہیں۔ ایک گاڑی تو چلی گئی ہے۔"

کمال کھوکھر کا ایک ملازم ناشتے کا تھال لے آیا جس میں دیسی ساخت کا مقوی اور بھرپور ناشتا تھا۔ میں نے مائی، عبداللہ اور وسیم کے ساتھ مل کر اس سے بھرپور انصاف کیا اور سادی نے اسے کھانے سے صاف انکار کر دیا تھا اس لیے اسے جبراً دودھ کا بڑا گلاس پلایا گیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا تھا۔ مائی سادی کو اور عبداللہ وسیم کو چھیڑ رہا تھا۔ میں نے ناشتے کے دوران وسیم سے پوچھا۔ "تم نے کھوکھر کو کتنی ادائیگی کی ہے؟"

"دس لاکھ دیے ہیں، آپ کو واپس لانے کے لیے اگر ہمیں اپنے پاس موجود ایک ایک پائی خرچ کرنا پڑتی تو ہم اس کے لیے بھی تیار تھے۔"

"شہباز صاحب کو یا پھر...." عبداللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تم جو چاہے سمجھو۔" وسیم نے جھینپ کر کہا۔

"تم نے اچھا کیا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے کھوکھر جیسے بندے کا احسان لینا گوارہ نہیں ہے۔"

"جو چیز آپ کو گوارہ نہیں اسے ہم کیسے گوارہ کر سکتے ہیں۔" وسیم نے کہا۔ "اس لیے میں نے اسے منہ مانگا معاوضہ دیا۔ اپنے پرانے تعلق کا حوالہ بھی نہیں دیا۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم باہر آئے تو سورج طلوع ہو چکا تھا اور دن ابھی سے گرم تھا۔ کھوکھر غائب تھا مگر ہم نے کون سا اس سے صاحب سلامت کرنی تھی اس لیے ہم بلا تکلف وہاں سے نکل آئے۔ دوسری گاڑی بڑی نسان وین تھی۔ اس میں آگے پیچھے دو سیٹوں کے ساتھ عقب میں سامان رکھنے کا بڑا حصہ تھا جو ہموار تھا۔ اس میں وسیم کے دونوں

آدمی مع سامان کے آگئے تھے۔ ڈرائیونگ عبداللہ نے سنبھالی تھی اور میں اس کے ساتھ تھا۔ عقب میں سادی، وسیم اور مانی تھے۔ چودہ سو سی سی کے طاقتور انجن والی یہ وین مانی وے پر آتے ہی سو کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑنے لگی تھی۔ اس رفتار پر اندر پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔ میں نے تعریف کی تو عبداللہ نے فخر سے بتایا کہ حال ہی میں اس نے لی تھی۔ ایاز چھٹی پر گھر گیا ہوا تھا۔ باذو کو حویلی بھیج دیا تھا اور وہ وہاں بہت خوش تھی۔ حویلی کے نام پر مجھے یاد آیا کہ بہت سے لوگ میرے منتظر تھے۔ سادی نے رات میں ہی حویلی کال کر کے بات کر لی تھی۔ اب میں نے نمبر ملایا اور سب سے بات کی سوائے اس ایک ہستی کے جس سے میں سب کے سامنے بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے جب کال ختم ہوئی تو سادی نے کہا۔ "سویرا سے کیوں بات نہیں کی؟"

"سمجھا کرو۔" وسیم نے کہا۔ "شہباز صاحب پرانے زمانے کے وضع دار لوگ ہیں سب کے سامنے بات نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک کہا یار تم سب خوش قسمت ہو جن کی کشتیاں پار لگ چکی ہیں۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "ساتھ بیٹھے ہو اور ہم بات بھی نہیں کر سکتے۔"

اس بار سادی اور وسیم جھینپ گئے تھے۔ مانی جو ہنس رہا تھا یک دم چپ ہو گیا۔ اس کے اس طرح چپ ہونے سے سب ہی سمجھ گئے تھے کہ اسے جیتو کی یاد آگئی تھی۔ اسے دنیا سے گزرے آج تیسرا دن تھا۔ ہم جن حالات سے دوچار تھے وہاں کوئی بھی دن اور کوئی لمحہ آخری لمحہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود بہت سے مواقعوں پر ہم موت کے منہ سے نکل آئے تھے۔ مگر جیتو کا وقت آگیا تھا اور وہ چلا گیا۔ حالات نے ہمیں سخت جان بنا دیا تھا۔ ہم لاشوں کے سامنے بیٹھ کر بھی کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے رہے تھے اور یہ عادت بن گئی تھی اس لیے آج بھی ہم نے ڈٹ کر ناشتا کیا تھا اور اس وقت ہنسی مذاق کر رہے تھے مگر جیتو کی یاد اور بات آتے ہی سب کے دل بوجھل اور اداس ہو گئے تھے۔ میں نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ مانی اور وسیم کے چہرے اتر گئے تھے۔ سادی کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "جیتو بہادروں کی طرح جیا اور بہادروں کی طرح مر گیا۔ ہمیں دکھی ہونا چاہیے مگر سوگ نہیں منانا چاہیے۔ یہ اس کی توہین ہوگی۔"

پھر میں انہیں بتانے لگا کہ ہم پر کیا گزری تھی۔ آخری بار جب ان لوگوں سے بات ہوئی اور اس کے بعد رابطہ ہونے تک ہم کیا کرتے رہے۔ کیسے مراحل سے گزرے۔ ایک گھنٹے بعد جب میں نے اپنی روداد ختم کی تو لاہور آگیا تھا اور ہم لاہور کے مضافات سے ہوتے ہوئے جی ٹی روڈ پر آگئے تھے۔ جیتو کے آخری لمحات کا ذکر کرتے ہوئے میں دکھی ہو رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو سادی بتانے لگی کہ اس پر کیا گزری تھی۔ میں باہر گزرتے مناظر دیکھ رہا تھا۔ ہزاروں لوگ سیکڑوں گاڑیاں ہمارے آس پاس تھیں۔ یہ سب عام لوگ تھے۔ میں ان سے الگ تھا۔ میں ان کی طرح عام زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ دشمنوں نے اور ان کی دشمنی نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں عام زندگی سے ہٹ جاؤں۔ ابھی کچھ دشمنوں سے یوں نجات ملی کہ وہ زندگی سے نجات پا گئے۔ ساتھ ہی مجھے جیتو جیسے دوست سے محروم ہونا پڑا۔ لیکن ابھی زیوڈ شا اور مرشد جیسے دشمن باقی تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان سے نمٹنے کے لیے مجھے اپنے کسی اور دوست کی قربانی نہ دینی پڑے۔

"شہباز صاحب۔" اچانک عبداللہ نے زور سے کہا تو میں چونکا تھا۔

"سوری میں نے سنا نہیں۔"

"کہاں کھوئے ہیں، میں کہہ رہا ہوں کچھ دیر رک کر فریش نہ ہو جائیں؟"

نو بج رہے تھے اور ہم جہلم کے پاس تھے۔ یہاں جی ٹی روڈ کے ساتھ کئی اچھے ریستوران تھے۔ میں نے سر ہلایا تو عبداللہ نے گاڑی ایک ریستوران کی طرف موڑ دی۔ یہ اعلیٰ درجے کا اے سی ریستوران تھا اس لیے ہم لوگ کچھ دیر کے لیے گرمی برداشت کر کے اندر اے سی کی خنکی میں آگئے تھے۔ وسیم کے آدمی اصرار کر کے گاڑی میں رک گئے انہیں ہمارے ساتھ آنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ پھر گاڑی میں بہت سا قیمتی اور ممنوعہ سامان تھا اس کے ساتھ رہنا بھی ضروری تھا۔ پیٹ سب کے بھرے ہوئے تھے اس لیے ریفریشمنٹ چائے اور کافی کا آرڈر دیا۔ ان دونوں کے لیے چائے بھجوانے کو کہہ دیا تھا۔ ویٹر کے جانے کے بعد میں نے وسیم سے پوچھا۔ "یہاں کے حالات کیسے ہیں، تم لوگ مرشد کے خلاف کوئی کارروائی کرنے جا رہے تھے۔ بعد میں مجھے پوچھنے کا خیال نہیں رہا تھا۔"

وسیم مسکرایا۔ "ہم نے اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیا ہے..... نادر کے مرنے کے بعد وہ جامے سے باہر ہو رہا تھا اب اسے ذرا سکون ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میرے آدمیوں نے درگاہ مرشدیہ کی جاسوسی کی اور ہمیں پتا چلا کہ وہاں نہ صرف منشیات آتی اور آگے بھیجی جاتی ہے بلکہ تخریب کاروں کو اسلحہ بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ سارا غیر ملکی ساخت کا اسلحہ ہوتا ہے۔ ہم نے ایک کھیپ اڑا دی جب وہ درگاہ کے خفیہ تہ خانوں میں آف لوڈ ہو رہی تھی۔"

میں حیران ہوا۔ "یہ تو بڑی کارروائی ہے اس کا چرچا نہیں ہوا؟"

"کیوں نہیں ہوا۔ یہ چار دن پہلے کی بات ہے اور اب تک میڈیا اور اخبارات میں اس کا چرچا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ خفیہ اداروں نے وہاں کارروائی کی ہے اور درگاہ سے متعلق کئی اہم افراد کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"یہ اچھی خبر ہے اور مرشد کا کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں..... وہ سیاست دان ہے اور حکومت میں شامل نہیں ہے مگر فی الحال اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس کو کہنا ہے کہ یہ اس کے اور درگاہ کے خلاف سازش ہے۔"

"اسلام دشمنان، یہودی ایجنٹوں کی۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس پر دباؤ آیا ہے۔" عبداللہ بولا۔ "اس کارروائی میں اس کے درجن بھر اہم ترین کارندے مارے گئے جو اسلحے اور منشیات کی ہینڈلنگ کرتے تھے۔"

"فاضلی کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں وہ غائب ہے۔" وسیم بولا۔ "میرا خیال ہے مرشد نے اپنی اس ناجائز اولاد کو کہیں اور بھیج دیا ہے۔"

"وہ کہیں نہیں جائے گا۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے دماغ میں مرشد کی دولت اور جائیداد پر قبضے کا سودا سمایا ہوا ہے اور وہ مرشد سے بھی نفرت کرتا ہے جب سب اس کے ہاتھ میں آئے گا تو وہ اسے بھی ٹھکانے لگا دے گا۔"

"آخری اطلاعات کے مطابق وہ شدید زخمی تھا اور مرشد ہاؤس میں اس کا علاج جاری تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ منظر عام پر نہیں آیا حالانکہ مرشد سے ہمارے کئی ناکرے ہو چکے ہیں۔" وسیم نے کہا۔

"ممکن ہے اس کا زخم ٹھیک سے نہ بھرا ہو یا وہ مر گیا ہو اور مرشد نے اسے خاموشی سے دفنا دیا ہو۔ وہ اس کی جائز اولاد تو تھا نہیں جو وہ اسے دھوم دھام سے دفناتا۔" عبداللہ کی بات پر سب مسکرانے لگے تھے۔ اسی دوران میں وسیم

چائے کافی اور کھانے پینے کا ہلکا پھلکا سامان لے آیا تھا۔ وسیم کے آدمیوں کے لیے گاڑی میں ہی بھجوا دیا تھا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔" ساوی نے دل سے کہا۔ "ہمارے سارے دشمن ایسے ہی مر جائیں، ہماری جان چھوٹ جائے۔"

"اگر دشمن کوستوں سے مرنے والے ہوتے تو ہماری خواتین کافی ہیں۔" وسیم ہنسا۔

"نہیں یار دعاؤں کا بہت اثر ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ جو اللہ کا کرم ہوتا ہے اس میں ہمارے پیاروں کی دعائیں ہی تو شامل ہوتی ہیں ورنہ ہمارے ذاتی اعمال کیا ہیں؟" میں نے کہا تو عبداللہ نے سر ہلایا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"اس کے لیے بھی دعا کرنے والی آ گئی ہے۔" وسیم نے شرارت سے کہا تو میں انجان بن گیا۔

"اچھا مبارک ہو کیا رشتہ طے ہو گیا ہے تمہارا؟"

"شہباز صاحب کس کی باتوں میں آ رہے ہیں۔" عبداللہ نے جھینپ کر کہا۔

"اب شہباز صاحب خود آ گئے ہیں تو دیکھ لیں گے۔" وسیم نے کہا۔ "ویسے موصوف نے حویلی کا ایک ہی چکر لگایا تھا مگر جب سے بانو گئی ہے یہ دو بار تشریف لے جا چکے ہیں۔"

"کام کے سلسلے میں۔" عبداللہ نے صفائی پیش کی۔ "اور مشکل سے چند گھنٹے بعد واپس آ گیا۔"

"تو بانو سے ملاقات نہیں ہوئی؟" وسیم نے چیلنج کیا۔

"ہوئی...... سب سے ہوئی تو اس سے بھی ہو گئی۔" عبداللہ نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ "مجھ سے تو ماں جی اور سویرا جی بھی ملنے آئی تھیں۔"

"بانو کیسی ہے...... وہاں ایڈجسٹ ہو گئی؟"

"ایسی ویسی۔" وسیم نے کہا۔ "سنا ہے نفل پڑھے ہیں جان چھوٹنے پر۔"

آپس میں نوک جھونک کے دوران میں چائے اور دوسری چیزوں سے انصاف کیا گیا اور ہم تازہ دم ہو گئے۔ واش روم گئے اور دوبارہ سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ دس بجے ہم روانہ ہوئے اور بارہ بجے کے قریب پنڈی پہنچ گئے تھے۔ ایک بار پھر میں ان جانی پہچانی فضاؤں میں تھا جن کی خوشبو میری سانسوں میں بسی ہوئی ہے۔ اتفاق کی بات ہے جب ہم یہاں پہنچے تو گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور ہم خاصی سست رفتاری سے موسم سے لطف اندوز

ہوئے نیشن آباد والی کوٹھی تک پہنچے تھے۔ سنیر کہیں گیا ہوا تھا۔ اس نے عبداللہ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ ذرا دیر سے آئے گا۔ سادی تھکی ہوئی تھی اس لیے وہ فوراً اوپر چلی گئی۔ صوفی نے ہمارا استقبال کیا اور دوپہر کے کھانے کا پوچھا۔ اسے کھانے کا بتا کر ہم اوپر آئے۔ میرا کمرہ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ سامان بھی ویسا ہی رکھا تھا۔ وسیم نے کہا۔ "آپ نہالیں... جب تک کھانا لگ جائے گا۔"

"بالکل۔" عبداللہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور ایک نیا موبائل فون میری طرف بڑھایا۔ "یہ آپ کا موبائل ہے اس میں سارے نمبر معہ اس فون کے نمبر کے فیڈ ہیں۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" میں نے کہا اور ان کے جاتے ہی سویرا کا نمبر ملایا۔ اسے یقیناً میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ موبائل سے لگی بیٹھی تھی۔ اس نے پوری بیل جانے سے پہلے کال ریسیو کی اور مرتعش لہجے میں بولی۔

"ہیلو۔"

"سویرا۔" میں نے کہا تو وہ تڑپ گئی۔

"شہباز... کہاں تھے آپ... کیسے جی جی کر اور مر مر کر یہ وقت گزارا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کیونکہ خود میں نے بھی یہ وقت ایسے ہی گزارا ہے۔ جب موت کا یقین آجاتا تو جی اٹھتا تھا اور جب جینے کی آس بندھتی تو موت سامنے آجاتی تھی۔"

"جیجو کا سن کر بہت افسوس ہوا۔" اس کا لہجہ بھیگ گیا۔ "کل سے ہم اس کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔"

"اس کا وقت آگیا تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "وہ مجھ پر قرض چھوڑ گیا۔ میری جان بچانے کے لیے اپنی جان دے دی۔"

"وہ ہم سے بھی یہی کہتا تھا کہ آپ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ آپ پر اپنی جان قربان کر دے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔"

جیجو سے ہونی بات سادی تک پہنچی۔ سادی نے پہلے ہی ان سے بات کر لی تھی اور رونا دھونا بھی کر لیا تھا۔ ابھی اس کے واپس جانے یا نہ جانے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ سویرا نے بتایا کہ مونا بھی واپس آنا چاہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "ابھی ہم نے فیصلہ نہیں کیا ہے کہ خواتین کو یہاں بلانا ہے۔ ممکن ہے سادی کو بھی حویلی بھیج دیا جائے۔"

"ایک اطلاع اور ہے بلکہ خوشی کی خبر ہے۔ شاید اسی ہفتے رفیق بھائی حقیق کو رشتہ ثمینہ کے لیے مانگنے آئیں۔"

"حالانکہ وہ تو ان کی امانت ہے۔" میں نے بتایا۔ "فیصلہ اس کے والد نے کرنا ہے۔"

"ہاں مگر آپ کو پتا ہے دوسرے لوگ بھی ثمی کے امیدوار بن رہے ہیں۔ انہیں محبت میں نہیں صرف زمین کی خاطر۔ وہ مشتاق سے محبت کرتی ہے اور رفیق بھائی اسے باپ کی طرح چاہتے ہیں۔ اس کے لیے سب سے اچھا گھر ان کا ہی ہوگا۔ اس لیے اب طے ہوا کہ رشتہ آیا تو مانا جائے گا اور وہ ثمی کی ماں کی حیثیت سے فیصلہ کریں گی تو کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوگا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ایک بار میں نے ثمی پر اپنا حق کہا تو آپا نے ڈانٹ دیا تھا کہ اس کے اصل وارث اس کے ددھیال والے ہیں۔ وہی اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کے مجاز تھے۔"

"ہاں مگر اب گیند ہمارے کورٹ میں آگئی ہے۔" سویرا نے کہا۔ "اس سال ثمی بی اے فائنل کے پیپرز دے گی اور امکان ہے کہ آنے والے سرما کے فوراً بعد اسے رخصت کر دیا جائے گا۔"

"ایک رخصتی کا اور بھی تو امکان ہے۔" میں نے یاد دلایا۔

"کس کی رخصتی کا؟" وہ انجان بن کر بولی۔

"یہی ہے ایک رخصتی جس کا شدت سے انتظار ہے۔"

"کسے انتظار ہے؟"

"مجھے اور ایک شخص اور ہے۔" میں نے ذرا بے باکی سے کہا تو وہ شرما گئی۔

"پلیز شہباز ایسی باتیں نہ کریں۔"

"تم تو بات بھی نہیں کرنے دیتیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"میں نے آپ کی واپسی پر سو نفل کی منت مانگ رکھی ہے کل سے پڑھنا شروع کر دیے ہیں۔"

"سویرا تمہیں یقین تھا کہ میں واپس آؤں گا؟"

"یقین تھا اور اب بھی ہے لیکن دل خدشات سے خالی نہیں ہوتا ہے۔"

میری اور سویرا کی محبت اس پھول کی مانند تھی جو ابھی کھلا نہ ہو۔ جس کی خوب صورتی اور تازگی بند پنکھڑیوں میں ہو۔ جب ہم اکیلے میں بات کرتے تب بھی کھل کر نہیں کر

پاتے تھے۔ وہ عورت تھی جو باحیا ہوتی ہے لیکن میں مرد ہوتے ہوئے بھی اس سے یوں بات نہیں کر پاتا جیسے کرنا چاہتا تھا۔ اس پر یوں حق نہیں جتا پاتا تھا جیسے جتانا چاہتا تھا۔ قصہ مختصر کہ ہمیں رومانی گفتگو نہیں آتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم پھر دوسروں کی بات کر رہے تھے۔ سویرا نے شازیہ کے بارے میں بتایا کہ وہ ذہنی طور پر خاصی سنبھل گئی تھی اور اباجی نے ایک وکیل کے توسط سے اس کی جائیداد اور وراثت کا کیس بھی فائل کر دیا تھا کیونکہ اس کے گھر پر بھورے رشتے دار قابض ہو گئے تھے۔ البتہ اسے بینک اکاؤنٹس اور اپنے باپ کے بزنس کا قبضہ مل گیا تھا۔ وہ آٹو ورکشاپ چلاتا تھا۔ ورکشاپ فی الحال ایاز کے سپرد کر دی گئی تھی اور اس کے معاملات وہی دیکھ رہا تھا۔ سویرا سے بات کر کے میں واش روم میں آیا۔ شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

اب کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا تو سوچوں نے ذہن پر قبضہ کر لیا۔ مجھے سب سے پہلے زیوز شا کا خیال آیا۔ وہ واقعی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا شخص نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے میری مدد کا وعدہ کیا تھا وہ مکمل نہیں ہوا تھا اور یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میں پھر بھی ساری کو لانے میں کامیاب رہا اور بد قسمتی سے مجھے جیو کی قربانی دینا پڑی۔ اگر زیوز شا کا منصوبہ درست ہوتا تو آج جیو زندہ ہوتا۔ اگرچہ میرا ہمیشہ سے یہ ایمان رہا ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جیو کا وقت آ گیا تھا مگر یہ ایمان میرا تھا۔ زیوز شا جیسے لوگوں کا تقدیر پر ایمان ہوتا تو وہ انسانیت کے درجے سے کیوں گرتے۔ میں اس سے کھل کر کہہ سکتا تھا کہ جیو کا نقصان اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب میں اس کی مدد کا پابند نہیں رہا تھا۔

دوسرا فرد جس کا خیال مجھے اب آیا تھا وہ فتح خان تھا۔ اس کے بارے میں یہ تاثر برابر مستحکم ہوتا جا رہا تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ مکار اور عیار ہو گیا ہے لیکن اس بار اس نے جو کیا اس کا میرے ذہن میں دور دور تک شائبہ تک نہیں تھا۔ اس نے مکاری کی انتہا کرتے ہوئے شمشی دل جی سے ساز باز کر لی۔ وہ ہیروں کا دیوانہ تھا اور کنورٹس میں اس سے کہیں زیادہ ہیرے تھے جن کے پیچھے وہ گزشتہ ایک عشرے سے زیادہ وقت خوار ہوا تھا اور وہ ہیرے آج تک اس کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ مگر یہ ہیرے بھی اس کی قسمت میں نہیں تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح ناکام و نامراد واپس بھاگ گیا تھا۔ جن ہیروں کے پیچھے اس قدر قتل و غارت گری ہوئی۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے۔ کرنل جیمز ان سے بے خبر تھا اور میں نے بھی اسے باخبر کرنا مناسب نہیں

سمجھا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ بھی ہیروں کے چکر میں پڑ کر وقت نہ گنوا دے۔ میں جلد از جلد ساری کو لے کر وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ فتح خان نکل بھاگا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ بچ گیا ہو گا۔ وہ اس معاملے میں جنگل کے جانوروں جیسی فطرت رکھتا ہے جو اپنی واپسی کے راستے کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ ناکامی بھی ہو سکتی ہے اور اس نے پہلے ہی سوچ لیا ہو گا کہ ناکامی کی صورت میں اسے کیا کرنا ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونکا۔ ”آ رہا ہوں۔“

”آپ کا موبائل بیل دے رہا تھا۔“ باہر سے وسیم نے کہا۔ ”سفیر آ گیا ہے۔“

میں جلدی سے غسل مکمل کر کے اور کپڑے پہن کر باہر آیا۔ میرے بعد جیو سب سے زیادہ سفیر سے قریب تھا۔ دونوں میں نوک جھونک چلتی تھی مگر وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ سفیر میرے گلے لگ گیا اور ہم دونوں ہی خاموشی سے جیو کو یاد کرتے رہے۔ وہ رو رہا تھا اور میں شاید اپنے حصے کے آنسو بہا چکا تھا اس لیے اسے تھپکتا رہا۔ آخر سفیر کا دل ہلکا ہوا تو اس نے پوچھا۔ ”یہ سب کیسے ہوا یار؟“

میں اسے بتاتا رہا۔ یہ بھی بتایا کہ جیو نے آخری لمحات میں اسے یاد کیا تھا۔ وہ اس سے معافی چاہ رہا تھا۔ سفیر نے سرد آہ بھری۔ ”معافی تو مجھے مانگنی چاہیے تھی مگر وہ اتنی دور چلا گیا ہے کہ اب اس سے معافی بھی نہیں مانگ سکتا۔ میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی۔“

”ایسا نہیں یار، وہ سمجھتا تھا۔ جب ہی تو تمہیں یاد کر رہا تھا۔ تم نے اس سے کہا تھا کہ جیسے تم موٹا کے بغیر نہیں رہ سکتے اس طرح اس کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔“

”ہاں یار میں نے سوچا تھا کہ جب میں دبئی جاؤں گا تو اسے لے جاؤں گا۔ وسیم بھی ساتھ ہو گا۔ وہ ساری کو اپنی بہن سمجھتا تھا۔ ہم سب ساتھ رہیں گے۔ اگر تو شامل ہو گا تو تو بھی ہمارے ساتھ ہو گا۔ ہمارے دن زیادہ اچھے ہو کر لوٹ آئے مگر......“

”ہمارے دن آ گئے ہیں گے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”کیا ہوا جو جیو ساتھ نہیں ہے۔ اس کی یادیں تو ساتھ رہیں گی نا۔“

”ہاں وہ ہمیشہ ساتھ رہیں گی۔“ سفیر نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”چل مجھے کمرہ لگ گیا ہے۔ جیو کی پسند کی ساری

چڑیں بکی ہیں۔ آج ہم کھانا کھا کر اسے یاد کریں گے۔"

"جیسے گورے پی کر اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہیں۔"

"ہاں ایسا ہی سمجھ لے۔"

"تو کہاں گیا تھا؟"

"کھانے کے بعد بتاتا ہوں۔" اس نے کہا۔ ہم نیچے آئے جہاں ایک جوان العمر عورت کھانا لگا رہی تھی۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ جب وہ کچن کی طرف چلی گئی تو میں نے صوفی سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

"میری بیوی ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔

میں حیران ہوا تھا۔ "تم نے شادی کر لی؟"

"نہیں جی کرنی پڑی۔ یہ میرے چچا زاد بھائی کی بیوی تھی۔ دو سال پہلے شادی ہوئی تھی۔ وہ مر گیا تو چچا کے گھر والوں نے اس پر منحوس کا لیبل لگا دیا۔ بچہ بھی کوئی نہیں ہے۔ پیچھے میکا بھی نہیں ہے۔ بے چاری کہاں جاتی۔ دربدر ہو جاتی۔ میں نے اسے شادی کا کہا تو مان گئی اور میں سادگی سے شادی کر کے یہاں لے آیا۔"

"زبردست صوفی تم نے بہترین کام کیا ہے، اب ولیمہ کب کھلا رہے ہو۔" سفیر نے کہا۔ "مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ شادی اس طرح ہوئی ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ بالآخر تمہیں خیال آ گیا۔"

صوفی مسکرایا۔ "میں سمجھ رہا ہوں جی۔ پر بیوی بچوں کے بعد دل ہی مر گیا تھا۔ یہ تو زبیدہ نے آ کر مجھے تھوڑا تبدیل کیا ہے۔ عورت میں بہت طاقت ہوتی ہے جی مرد کو بدلنے کی۔"

میں نے غور کیا تو واقعی صوفی بدلا ہوا تھا۔ سر کے بال باقاعدہ تراشے ہوئے اور داڑھی بھی حد میں تھی، البتہ اس نے کلر نہیں کیا تھا اور اس پر سیاہ و سفید داڑھی اور بال اچھے لگ رہے تھے۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی اور زبیدہ میرے اندازے کے مطابق پچیس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ مگر ان دونوں کی جوڑی اچھی تھی۔ کھانا زبیدہ نے ہی بنایا تھا اور عبداللہ نے اسے آفیشل کک مقرر کر کے اس کی باقاعدہ تنخواہ بھی لگا دی تھی۔ پہلے صوفی کے پاس کوٹھی کے اوپری حصے میں ایک کمرا تھا۔ اسے دو کمرے دے دیئے گئے تھے۔ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔

"پچھلی کوٹھی والے ملازمین کہاں ہیں؟"

"وہ اصل میں راجا صاحب کے ملازم تھے۔ میں نے راجا صاحب کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔"

میں چونکا۔ "چھوڑ دی ہے لیکن کیوں؟"

"اصل میں اب یہاں کوئی کام تو تھا نہیں۔ راجا صاحب نے یہاں سے اپنا سب کچھ سمیٹ لیا ہے، باقی ملازمین کو فارغ کر دیا لیکن میں بلاوجہ کی تنخواہ لے رہا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا اس لیے استعفا دے دیا۔"

"عبداللہ نے اچھا کیا۔" وسیم نے کہا لیکن میں خاموش رہا۔ مجھے عبداللہ کا بغیر مشورے کے راجا صاحب کی ملازمت ترک کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اگر وہ عبداللہ کو تنخواہ دے رہے تھے تو یہ ان کا مسئلہ تھا۔ عبداللہ نے بھانپ لیا۔

"آپ کو اچھا نہیں لگا؟"

"اب تم استعفا دے چکے ہو۔" میں نے بات بدلتے میں کہا۔ "اس لیے اچھا یا برا لگنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"میں معذرت خواہ ہوں شہباز صاحب۔" عبداللہ نے شرمندگی سے کہا۔ "میں کیا اور میری اوقات کیا... راجا صاحب نے مجھے اور مجھ جیسے کتنوں کو آپ کی خاطر رکھا ہوا ہے۔ مجھے آپ سے اجازت لینی چاہیے تھی۔"

"نہیں میں تم سے بڑا نہیں ہوں لیکن راجا صاحب میرے اور ہم سب کے محسن ہیں، بہت سے مواقعوں پر وہ بے لوث ہمارے کام آئے۔ کیا تم نے ان سے اجازت لی تھی۔"

"نہیں۔" عبداللہ نے دبی زبان میں کہا۔ "میں نے بس استعفا بھیج دیا تھا، انہوں نے منظور کر لیا۔"

"یار اب اتنے بے لوث بھی نہیں ہیں۔" سفیر بولا۔

"میں نے جو دنیا اور اس کی خود غرضی دیکھی ہے خاص طور سے بڑے لوگوں کی تو اس لحاظ سے راجا صاحب بہت اچھے اور اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ ٹھیک ہے ان کی بھی غرض ہے مگر یہ غرض ذیوز شا کو بھی ہے۔ اب تم دونوں کے رویے کا موازنہ کرو تو تمہیں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ دولت اور اختیار میں مرشد راجا صاحب کا پاسنگ بھی نہیں ہے مگر ان کے رویے میں فرق دیکھو۔ اس سے تمہیں اندازہ ہوگا کہ راجا صاحب کیا ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وسیم نے تائید کی۔ "جب انہوں نے مجھے آپ کے لیے ہائر کیا تو ان کے الفاظ تھے کہ یوں سمجھوں کہ ان کا بیٹا خطرے میں ہے اور میں نے اسے بچانا ہے۔"

عبداللہ زیادہ شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اس

کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ''بس یار اب جو ہوا سو ہوا۔ میں خود راجا صاحب سے سوری کر لوں گا۔ وہ بڑے آدمی ہیں، تمہیں معاف کر دیں گے۔''

''اور ساتھ ہی تجھے ساتھ لے جانے کی کوشش بھی کریں گے۔'' سفیر بولا۔ ''ابھی آیا ہے، آرام سے بیٹھ کچھ دن..... ندیم بھی تیری جان کو رو رہا ہے۔''

''وہ منحوس ہمیشہ روتا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب کیا مسئلہ ہے اسے۔''

''کیسوں سے تیری جان چھوٹ گئی ہے مگر بعض معاملات میں اسے تیرے سائن چاہئیں۔ کچھ عدالتی چکر ہیں۔''

''جعلی سائن کر دیتا۔''

''ہم کہ تجھ پر جعلسازی کا نیو کیس بن جاتا۔''

''اس سے بھی بات کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مزید سنا یہاں کوئی اور ایکٹی وٹی ہوئی ہے۔ مہرو اور اس کے نام نہاد شوہر کی کوئی اطلاع؟''

''دونوں محاورے کے مطابق سینگ کی طرح غائب ہیں۔'' وسیم نے کہا۔

ہم کھانا ختم کر چکے تھے اس کے بعد ہم نشست گاہ میں آ گئے۔ مائی کھانے کے لیے آیا تھا اور جلدی جلدی کھا کر رخصت ہو گیا۔ اسے کسی کام کی عجلت تھی۔ ساوی آرام کر رہی تھی۔ وہ نہیں آئی تھی۔ عبداللہ نے غور سے مجھے دیکھا۔

''آپ زخمی ہیں کیا جسم پر بھی زخم ہیں؟''

''تھے اب تقریباً بھر چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''سفیر تو کہاں غائب تھا میری آمد کا سن کر۔''

''وسیم نے تجھے بتایا ہوگا کہ پچھلے دنوں مرشد کی درگاہ میں ایک دھماکا ہوا اور وہاں اتارا جانے والا اسلحہ تباہ ہوا تھا؟''

''ہاں بتایا ہے۔''

''اس معاملے میں ہم کچھ بے وقوف بنے۔ ہمارے آدمی اندر موجود تھے لیکن ان کو کائونٹ کیا گیا اور اس اسلحے کے بارے میں اس طرح معلومات دی گئیں کہ انہیں شبہ نہیں ہوا تھا۔''

میں چونکا۔ ''تیرا مطلب ہے جان بوجھ کر معلومات دی گئیں؟''

''بالکل اور ہمارے آدمی سمجھے کہ وہ اتفاق سے یہ سب جان گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا اور پھر ہم نے ان کی ہی مدد سے یہ اسلحہ تباہ کر دیا۔ درگاہ مرشدیہ کے عقب میں ایک عمارت کے تہ خانے میں یہ سب رکھا تھا۔ یہ اصل میں درگاہ کا سماع ہال تھا جو خستہ حالی کی وجہ سے متروک قرار دے دیا گیا تھا اور اس کی جگہ آگے ایک بڑا اور عالی شان سماع ہال بنایا گیا ہے۔ لیکن یہ کام جان بوجھ کر کیا گیا تا کہ متروک سماع ہال کو اسلحے کے گودام کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ یہاں صرف اسلحہ اور اس سے متعلقہ لوگ ہوتے تھے اس لیے وہی مارے گئے۔''

''سوال یہ ہے کہ آپ لوگوں پر اپنی حماقت کا انکشاف کب ہوا؟''

''اسی پر ہوا ہے۔'' وسیم نے سفیر کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہم پر تو اب تک نہیں ہوا۔''

''ہونا ہوگا بھی نہیں۔'' سفیر نے جواب دیا۔ ''کیونکہ تم لوگوں کے سر میں وہ عقل نہیں ہے جو اس سر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔'' اس نے سر بجایا۔ میں نے سر ہلایا۔

''ہاں آواز تو کچھ خالی ڈبے کی سی آئی ہے۔''

''شہباز میری پیٹھ میں چھرا مت گھونپ۔'' سفیر غرایا۔ ''مت بھول کہ تو پہلے میرا دوست ہے۔''

''اچھا بھائی میں تیرا دوست ہوں اب جلدی سے باقی ماجرا بھی سنا دے۔''

اسلحے کی تباہی کے بعد ہمارے دو آدمیوں میں سے ایک وہاں سے نکل آیا کیونکہ وہ مشکوک ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے جو اسٹوری سنائی تو مجھے لگا یہ تو کوئی طے شدہ کام ہے۔ اس نے مجھے ایک شخص کا حوالہ دیا۔ لطیف شاہ نامی یہ شخص درگاہ کے سرکردہ لوگوں میں سے ہے۔ اگرچہ اس کا تعلق مرشد کے خاندان سے نہیں ہے مگر اس کا خاصا منہ چڑھا ہوا ہے۔ یہ رہتا بھی درگاہ پر ہے۔ اصل میں اسی نے ہمارے آدمیوں کی رہنمائی آنے والے اسلحے تک کی تھی۔ میں نے اندر رہ جانے والے سے اس کی نگرانی کرائی اور اس سے پتا چلا کہ وہ ہر دوسرے دن دوپہر کے وقت کہیں جاتا ہے اور دو ڈھائی گھنٹے بعد آتا ہے۔ میں نے اس کی نگرانی شروع کر دی۔''

''خود؟''

''نہیں میرے ساتھ دو را حمید راور بھی ہوتے ہیں، ہم یوں باری باری اس کا تعاقب کرتے رہے کہ اسے شک نہ ہو۔ اس نگرانی سے پتا چلا کہ وہ جنگل میں ایک فارم پر جاتا ہے اور پھر وہاں سے واپس درگاہ چلا جاتا ہے۔''

''تم نے فارم کی نگرانی شروع کرا دی؟''

''بالکل اور آج ہی انکشاف ہوا کہ ہم احمق بن رہے

تھے فاضلی کے ہاتھوں۔"

میں اور باقی سب اچھل پڑے تھے۔ "فاضلی....؟ آج ہی تو اس شیطان کا ذکر ہو رہا تھا۔"

"کہتے ہیں جب شیطان کا ذکر ہو تو وہ آس پاس ہی ہوتا ہے۔" سفیر نے سر ہلایا۔ "اس سے اندازہ کر لو فاضلی کے بارے میں۔"

"فارم میں فاضلی ہے؟"

"صرف فاضلی نہیں ہے بلکہ وہاں دو ایسے افراد بھی ہیں جن کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ اسلحے میں ہونے والے دھماکے میں مارے گئے ہیں اور وہ اس گودام کے نگرانوں میں شامل تھے۔"

"ممکن ہے یہ مرشد کی چال ہو؟"

"چال ہے...... لیکن فاضلی کی ہے اور مرشد کے خلاف ہے۔"

اس بار میں زیادہ چونکا تھا۔ "تمہارا مطلب ہے فاضلی نے جان بوجھ کر مرشد کو نقصان پہنچایا ہے؟"

"بالکل.... اس نے صرف اسلحہ ہی تباہ نہیں کرایا بلکہ مرشد کو بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے کیونکہ یہ اسلحہ بعض ایسے تخریب کار گروہوں کے لیے بھیجا جا رہا تھا جو آئے دن بم دھماکے اور ٹارگٹ کلنگ کی وارداتیں کرتے ہیں۔ وہ اس کی ادائیگی کر چکے تھے اور مرشد مڈل مین کا کام کر رہا تھا۔"

"یعنی ادائیگی اب اسے کرنا پڑے گی؟"

"بالکل کیونکہ یہ کروڑوں کا اسلحہ ہے۔ دوسری مشکل یہ کہ جن لوگوں کو اپنے مذموم عزائم کے لیے اسلحہ نہیں ملے گا اور جو خود بیرونی دشمنوں کے پے رول پر ہیں وہ مرشد کے خلاف ہو جائیں گے۔" سفیر نے کہا۔ "سب سے اہم بات یہ کہ خفیہ ایجنسیوں نے اس دھماکے کے بعد جو اسلحہ پکڑا ہے یعنی بچ جانے والا اور تباہ شدہ اسلحہ، وہ ملک بھر میں تخریب کاریوں میں استعمال ہوا ہے۔ خاص طور سے بارود وغیرہ۔ اس کا جواب بھی مرشد کو دینا پڑے گا۔"

"یہ مفروضہ ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ فاضلی مرشد کے خلاف ہو گیا ہے۔"

"یہ اسٹوری بھی آج ہی علم میں آئی ہے، مرشد نے اپنے خاص آدمیوں کو حکم دیا ہے کہ فاضلی کو تلاش کیا جائے اور وہ جہاں ملے اسے دنیا سے رخصت کر دیا جائے۔"

"یہ بھی چال ہو سکتی ہے مرشد اور فاضلی کی وہ دونوں باپ بیٹے ایک نمبر کے حرامی اور ڈرامے باز ہیں۔"

"اس میں چال کہاں سے آگئی اور یہ چال چال میں وہ اپنا اتنا بڑا نقصان کر لیں گے؟" سفیر نے کہا۔

"فارم ہاؤس کس کا ہے؟"

"کسی کرم الدین نامی زمیندار کا ہے۔ وہ خود خان پور میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کی اصل زمینیں خان پور میں ہیں اور یہ فارم اس نے فاضلی کے حوالے کیا ہوا ہے۔ اس پر سنگترے اور مالٹے کے باغات ہیں اور ایک عالی شان کوٹھی بھی بنی ہوئی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ وہاں موجود ہر بندہ مسلح نظر آتا ہے اور ان کی تعداد بھی خاصی ہے، صورتوں سے وہ سب چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے ہیں۔"

"تم نے جو نتیجہ نکالا ہے اس سے قطع نظر فاضلی کا نظر آنا ہی بہت بڑی کامیابی ہے اور ہمیں جلد از جلد اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کرنی چاہیے۔" وسیم نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ "آپ کیا کہتے ہیں؟"

"اچھا خیال ہے۔ یہاں تمہارے کتنے آدمی ہیں؟"

"یہاں تو بس دو تین ہی ہیں، باقی سب حویلی میں ہیں۔" وسیم نے کہا۔ "مگر وہ تین منٹ کے نوٹس پر یہاں آسکتے ہیں۔"

میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ "فارم کے اندر کی پوزیشن کیسے معلوم کی؟"

"اس سے دو سو گز دور ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ میں نے وہاں سے جائزہ لیا تھا۔ فارم تقریباً دو ہیکٹر رقبے پر ہے۔ کوٹھی سامنے ہے اور باغ عقب میں ہے۔ کوٹھی تقریباً ایک کنال رقبے پر ہے۔ سڑک سے ہٹ کر ہے مگر یہاں بجلی ہے۔"

"اندر کتنے آدمی ہیں؟"

"ایک درجن تو ہیں۔" سفیر نے کہا اور اپنا جدید ترین اسمارٹ فون نکال کر اسے وہاں موجود ایل سی ڈی ٹی وی سے منسلک کیا اور پھر تصویریں اس پر دکھانے لگا۔ پہلی تصویر فارم کی تھی۔ اس کی ساخت بڑی حد تک نمایاں تھی۔ اس کے گرد پیلے پتھروں سے بنی کم سے کم آٹھ فٹ اونچی چار دیواری تھی اور اس پر خار دار تار کی باڑ بھی لگی ہوئی تھی۔ فرنٹ پر بڑا فولادی گیٹ تھا۔ اس کے اندر کوٹھی کی چار دیواری الگ تھی اور اس کا چھوٹا گیٹ بھی الگ تھا۔ فارم کا گیٹ اتنا بڑا تھا کہ اس سے بڑے سے بڑا ٹرک نکل سکتا تھا۔ کوٹھی دو منزلہ تھی مگر اس کی اوپری منزل پر صرف دو کمرے تھے اور باقی کھلی چھت تھی اور نیچے مکمل عمارت تھی۔ اسمارٹ فون کا کیمرا بہت ہائی میگا پکسل تھا مگر اس میں زوم زیادہ نہیں تھا اس لیے کوٹھی اور اس میں نظر آنے والے

افراد کو قریب سے نہیں دکھایا جا سکا تھا۔ مختلف تصاویر میں مختلف لوگ نظر آ رہے تھے اور پھر ایک لمبے بالوں والے کو دیکھ کر میں چونک گیا۔

"یہ فاضلی ہے؟"

سفیر مسکرایا۔ "غلط... فاضلی اس کے برابر والا شخص ہے۔"

فاضلی نے بال اتنے چھوٹے کرا لیے تھے کہ وہ تقریباً گنجا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی کلین شیو ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر جو ہلکی سی داڑھی رہا کرتی تھی وہ غائب تھی۔ ساتھ ہی اس نے موٹے سیاہ فریم کی عینک لگا رکھی تھی جو بظاہر نظر کی دکھائی دیتی تھی اور ان تمام تبدیلیوں نے اس کا حلیہ یکسر بدل دیا تھا۔ اس کے ساتھ نظر آنے والے افراد میں سے دو وہ تھے جن کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ درگاہ میں ہونے والے دھماکے میں مارے گئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "تم نے کیسے پہچانا؟"

"میں نے اس کا پیچھا کیا اور چند مواقعوں پر اس کی آواز سنی تو تصدیق ہو گئی کہ یہ فاضلی ہے۔"

"اگر بقول تمہارے اس نے تمہیں کوئی کانٹیکٹ کیا۔ یعنی فاضلی تمہارے آدمیوں سے واقف ہے تو وہ اپنے تعاقب اور نگرانی سے کیسے بے خبر رہا؟"

"جیسے ہم بے خبر ہے۔" سفیر نے دانت نکالے۔

"وہ الٹا تمہارا تعاقب اور نگرانی بھی کر سکتا ہے۔"

"میں نے اس کا پورا خیال رکھا ہے۔ الیکٹرانک ڈیوائسز کا بھی۔" سفیر نے جواب دیا تو میں مطمئن ہو گیا۔

"سوال وہی ہے کہ فاضلی اور مرشد میں یہ اختلاف کیوں اور کیسے ہوا؟"

"میرا خیال ہے فاضلی کے زخمی ہونے کے بعد کچھ ہوا اور وہ غائب ہو گیا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ مہینے سے بھی زیادہ غائب رہنے کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔"

"تمہارے جاسوس پتا نہیں کر سکے کہ فاضلی کی موت کا تاثر کیوں جاری کیا گیا ہے؟"

"امکان ہے کہ اس کے پیچھے مرشد کے سیکریٹری کا ہاتھ ہے۔ وہ فاضلی سے خار کھاتا ہے۔ شاید اس نے کوئی چکر چلایا ہے جو باپ بیٹے کی آپس میں ٹھن گئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے میں نے فاضلی کے جو خیالات سنے تھے اس کے دل میں پہلے ہی مرشد کے خلاف رنجش ہے کیونکہ اس نے اس کی ماں کے ساتھ بہت برا کیا۔"

وسیم نے میری طرف دیکھا۔ "کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ مرشد اور فاضلی میں اختلاف کس وجہ سے ہے اور اگر فاضلی ہمارے آدمیوں کو جان گیا ہے تو اس نے ان کی نشان دہی کی بجائے انہیں استعمال کیا ہے؟ مگر یہ ہمارا نہیں اس کا مفاد ہے۔"

"بالکل... ہمارے لیے جاننا اشد ضروری ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔"

"تب...."

"اپنا جاسوسی کا یونٹ استعمال کرو۔" میں نے کہا۔ "فارم ہاؤس کو ہدف بناؤ... وہاں فون لائنز موجود ہیں۔ اس کے علاوہ موبائل فریکوئنسی پکڑنے والا آلہ استعمال کرو۔ روایتی جاسوسی سے کام نہیں چلے گا۔"

"سنا تم نے روایتی جاسوسی سے کام نہیں چلے گا۔" وسیم نے سفیر کی طرف دیکھا۔

"تو کرلو اپنی جیمز بانڈ والی جاسوسی۔" سفیر نے کہا۔

"یہ تم نے کی تو ہے۔" میں نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ "اور خدا کے واسطے آئندہ کوئی ڈھنگ کا زوم لینس والا کیمرا ساتھ رکھنا... یہ تم کیا پکنک کی تصویریں لینے گئے تھے۔"

وسیم کھڑا ہو گیا۔ "میں یہ کام کرتا ہوں۔ ریتا حویلی میں ہے اسے منگوانا ہوگا اور مانی کو ساتھ رکھنا ہوگا۔"

وسیم کے جانے کے بعد میں نے ایاز کا پوچھا۔ عبداللہ نے بتایا کہ وہ شازیہ کے باپ کے آٹو ورکشاپ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ سفیر نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں اسے خرید لوں اور ایاز سے پارٹنرشپ کرا لوں۔"

"یہ کام کر لینا چاہیے تھا۔ ہمیں ایک آسانی میسر آ جائے گی۔ اس آٹو ورکشاپ کی مدد سے ہم گاڑیوں میں حسب منشا تبدیلیاں آسانی سے کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں ایاز سے کہتا ہوں۔"

"ضرور کہیے۔" ایاز نے نشست گاہ میں آتے ہوئے کہا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ ایاز میرا کم وقت کا ساتھی تھا مگر اس کے انداز میں کبھی مجھے خلوص اور گرم جوشی دوسروں سے کم محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مجھ سے مل کر وہ سامنے بیٹھ گیا۔

"بیٹو کی خبر نے اندر تک دکھ بھر دیا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "شاہین پورا دن روتی رہی اور ماں جی حیران تھیں کہ وہ کیوں کسی کو اتنا رو رہی ہے۔"

"وہ تھا ہی ایسا، ہمارا کچھ نہیں لگتا تھا مگر سب کچھ

تھا۔ سب کو رلا کر چلا گیا۔" میں نے کہا۔ کچھ دیر جیز کی بات ہوتی رہی۔ میں نے ایاز کو مختصر احوال سنایا۔ کچھ دیر بعد صوفی چائے لے آیا تو ماحول بدل گیا اور گفتگو بھی بدل گئی۔ وسیم اپنے آدمیوں کو ہدایات دے کر آ گیا تھا۔ میں نے ایاز سے ورکشاپ کا پوچھا تو اس نے کہا۔

"بہت اچھی ورکشاپ ہے لیکن وہاں کے انتظامات دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ وہاں چوری کی یا اسمگل شدہ گاڑیوں کو جعلی نمبر اور کاغذات کی مدد سے فروخت کیا جاتا تھا۔ دونوں ملازموں نے کھل کر اقرار نہیں کیا مگر وہ بھی شاقی تھے۔ باقی سامان اور لوکیشن کے لحاظ سے بہت اچھی جگہ ہے۔ گے بندھے گاہک بھی خاصے ہیں۔"

"سفیر کا ارادہ ہے یہ ورکشاپ تمہارے ساتھ پارٹنرشپ میں خریدے لیکن اس کے لیے تم او کے کرو گے۔"

"ہماری او کے تو آپ کے ساتھ ہے جی۔" ایاز نے اپنی لمبی زلفوں پر ہاتھ پھیرا۔ "اور پارٹنرشپ کیا جی ملازم رکھ لے گا اپنی دال روٹی بھی چلتی رہے۔"

"زیادہ سادہ مت بنو۔" سفیر نے اسے گھورا۔ "مجھے اچھی طرح پتا ہے تم وہاں سبزی کتنی کھاتے ہو۔"

ایاز مسکرایا۔ "جتنی آپ کھاتے ہیں جناب اتنی ہم بھی کھا لیتے ہیں۔"

چائے کے بعد میں نشست گاہ کے ایک کونے میں چلا گیا اور ندیم کے دفتر کا نمبر ملایا۔ کال اس کی سیکریٹری یا آپریٹر نے ریسیو کی اور نقرئی آواز میں بولی۔ "جنتی لارز ایسوی ایٹس۔"

"ٹھیک کہا ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔" میں نے تائید کی۔ "ویسے وہ ہے کہاں؟"

"سوری سر۔" سیکریٹری گڑبڑا گئی تھی۔

"ندیم جنتی.... میں اس کا ایک بھوت کلائنٹ بات کر رہا ہوں اس کی وجہ سے پھانسی ہوتی بچی مجھے۔"

سیکریٹری نے بہتر سمجھا کہ لائن ندیم کو ٹرانسفر کر دے اور اس نے آغاز ہی گالی سے کیا۔ "....کے بھوت، مجھے پتا تھا تو ہی ہوگا، واپس آ گیا پھر بچ کر، انڈین سالے تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔"

"جب تجھ جیسے ملک دشمن کچھ نہیں بگاڑ سکے تو دوسرے سالے کیا بگاڑ لیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اور سنا کتنی ترقی کی ہے بھوت بول بول کر بینک بیلنس اور بیوی بچے کہاں تک پہنچے۔"

اس پر ندیم نے مزید گالیاں دی تھیں اور کچھ بیتوں کو بھی نکھارا۔ "سب نے زندگی حرام کی ہوئی ہے۔"

"شکر کر تو زندہ ہے ورنہ میرے دشمن کسی کو معاف کرنے کے قائل نہیں ہیں۔"

"کسر تو کوئی نہیں چھوڑی تھی اس حرامیوں کے مرشد نے۔" ندیم نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تیری جان عدالت سے چھڑوائی تو وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔"

"کیا مطلب؟"

"دھمکیوں اور حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پہلے میری گاڑی کو ایک ٹرک نے مری مالی دے پر ٹکر ماری۔ وہ تو اللہ نے زندگی رکھی اور کھائی میں گرتے گرتے بچا.... پھر میرے بیوی بچوں کے حوالے سے دھمکیاں ملنے لگیں۔"

"تو نے وسیم یا عبداللہ کو نہیں بتایا۔"

"ان کو بتایا اور انہوں نے اس کا دماغ درست کیا اور کچھ میں نے بھی جیک لگائے۔ اعلیٰ حکام کو درمیان میں ڈالا تو وہ انسان کا بچہ بنا۔"

"ندیم تجھ پر یہ آفتیں میری وجہ سے آئی ہیں۔"

"بکواس نہ کر اب تو نیک پروین بن کر ساری آفتیں خود پر لینے کی بات کرے گا۔ تجھے بتانے کا مطلب جتانا نہیں ہے۔ لگی کی تھی اس مرشد کی۔ میں نے اس کے کچھ معاملات کی فائلیں بنائی ہوئی ہیں اور وہ میں نے اسے بھجوائی تھیں۔ اگر یہ کیس عدالت میں آ گئے تو اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے اس کے بعد وہ انسان سے بندر کا بچہ بن گیا۔ میرے اشاروں پر ناچنے کو بھی تیار ہو گیا۔"

"یہ تو نے اچھا کیا۔" میں نے سکون کا سانس لیا۔ "مجھے آتے ہی پتا چلا کہ تو میرے فراق میں بے قرار ہے۔ دن رات تڑپتا ہے اور بیوی کے پہلو میں بھی چین نہیں آتا۔"

"ہاں تو کیا جانے ان معاملات کو.... بیوی عاق کرنے کی دھمکی دے چکی ہے۔"

خاصی دیر بکواس کے بعد وہ اصل بات پر آیا۔ عدالتوں سے کیس خارج ہو گئے تھے مگر کچھ کاغذات جمع کرانے تھے اور ان پر میرے سائن ضروری تھے۔ میں نے کہا۔ "میں کسی کو بھیجوں گا اس کے ہاتھ بھجوا دینا اور بتا دینا کہ کہاں کہاں سائن کرنے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں تیرے لیے ایک چیک پر بھی سائن کر دوں اگرچہ بینک اکاؤنٹ میں شاید ہی کچھ ہو۔"

اس پر ندیم نے کال کا اختتام پھر گالیوں پر کیا

تھا۔ کال کے بعد میں نے موبائل جیب میں رکھا تھا کہ اس کی بیل بجی۔ میں نے نکال کر دیکھا۔ تمام کی بجائے نمبر آ رہا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ تمام جاننے والوں کے نمبر اس میں ناموں سے فیڈ تھے پھر یہ کس کا نمبر ہو سکتا تھا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"شہباز ملک۔" دوسری طرف سے ایک سرد اور ٹھہری ہوئی آواز نے کہا اور مجھے شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

"ڈیوڈ شا۔"

"تم واپس پہنچ گئے ہو اور جس مقصد کے لیے انڈیا گئے تھے وہ بھی پورا ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے پوچھا نہیں کہ اسے یہ نمبر کہاں سے ملا تھا۔ میں نے اب تک عمر اور پھر ندیم سے بات کی تھی اور یقیناً ان میں سے کوئی نمبر انڈر آبزرویشن تھا۔ اسی سے ڈیوڈ شا کو پتا چلا تھا۔ "تم نے کیوں کال کی ہے؟"

"تمہیں یاد دلانے کے لیے کہ میرا تم سے ایک معاہدہ ہوا تھا۔"

"وہ معاہدہ جسے تم پورا نہیں کر سکے۔" میرا لہجہ بھی سرد ہو گیا تھا۔ ڈیوڈ شا کا نام سنتے ہی وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور میں نے ان کے درمیان میں آتے ہوئے موبائل کا اسپیکر فون آن کر لیا تھا۔ "پلان تمہارے آدمی کرنل جیمز نے بنایا اور وہی اس مشن کا سربراہ تھا مگر کیا ہوا؟"

"ٹھیک ہے سب مارے گئے اور ویسا نہیں ہوا جیسا سوچا تھا لیکن تم اس لڑکی کو نکال لائے۔"

"ڈیوڈ شا یہ میری ذاتی کاوش تھی۔ میری خوش قسمتی کہ میں پہلے پکڑ کر تور چیلس پہنچا دیا گیا تھا ورنہ تمہارے پلان پر عمل کرتا تو میں بھی مارا جا چکا ہوتا۔ کرنل بھی اپنی قسمت سے محفوظ رہا۔ تم نے منشی دل جی پر بھروسا کیا اور اس نے تمہیں دھوکا دیا۔"

"وہ کیفر کردار کو پہنچ گیا ہے۔"

"اس میں تمہارا کوئی کردار نہیں ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ڈیوڈ شا مجھے تمہاری وجہ سے فائدہ نہیں نقصان ہوا ہے میرا ایک قیمتی ترین ساتھی مارا گیا۔"

"مجھے اس کا افسوس ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تو تم معاہدے سے انکار کر رہے ہو؟"

"میں انکار نہیں کر رہا کیونکہ تم اپنی کمٹ منٹ پوری نہیں کر سکے۔ تمہارا پلان مکمل ناکام رہا اور میرے ساتھی سمیت سینکڑوں لوگ اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اب تم کس منہ سے مجھ سے معاہدے کی بات کر رہے ہو؟"

"میرا تو خیال ہے میں نے کمٹ منٹ پوری کی ہے۔ تم اس لڑکی کو لے جانے میں کامیاب رہے۔"

"ڈیوڈ شا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہارے جیسے بین الاقوامی مذاکرات کار کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ کیا تم معاہدے کے لفظ سے اتنے ہی لاعلم ہو جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو۔"

"وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "شہباز مجھے تمہارا تعاون ہر قیمت پر درکار ہے۔"

میں جھنجلایا۔ "اب بھی تم سوچے سمجھے بغیر بات کر رہے ہو تم ہر قیمت کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"ہاں۔" وہ بدمزگی سے بولا۔ "ٹھیک ہے میرا ایک پلان ناکام رہا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھ سے اس لہجے میں بات کرو۔"

"غالباً بے عزتی محسوس کر رہے ہو لیکن ڈیوڈ شا انسان اپنے کردار اور کاموں سے ہی عزت یا بے عزتی کماتا ہے۔ تم شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے ہو جو بلا وجہ تمہاری عزت کی جائے۔ درحقیقت میرے ذہن میں تمہارا جو امیج تھا پچھلے کچھ عرصے میں اسے بہت نقصان ہوا ہے۔ جیسے مرشد نے تمہاری ضمانت کو جوتے کی نوک پر رکھا اور رب نسی دل جی جیسا عام آدمی تمہیں استعمال کر گیا۔ کیا تم اب بھی خود کو اسی مقام پر محسوس کرتے ہو؟"

"شہباز..... ان سب باتوں کو بھول جاؤ ہم نئے سرے سے شروع کرتے ہیں۔" اس نے غالباً کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں معاہدہ پورا کرنے میں ناکام رہا لیکن میں اب بھی تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم بولو میں سن رہا ہوں۔"

"میں مرشد سے تمہارا تصفیہ کرا سکتا ہوں اس بار ضمانتی تمہارے اپنے ملک کا آدمی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے تم پیشکش کرو لیکن میں اس کا جائزہ لے کر ہی فیصلہ کروں گا۔ یاد رہے کہ اب میں ہر صورت تمہاری مدد کا پابند نہیں ہوں گا۔"

"شہباز تمہارے کچھ دشمن کم ہوئے ہیں اور مجھے امید ہے تم دشمن بڑھانے والے کام نہیں کرو گے۔"

"بالکل نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں باقی ماندہ دشمنوں کو بھی کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے کہا اور کال

کاٹ دی۔ اس کے ساتھ ہی موبائل آف کر دیا۔ وہ سب تشویش زدہ تھے۔ گفتگو انہوں نے سن لی اور آخر میں ذیوز شا کی دھمکی بھی سن لی تھی۔ سفیر نے کہا۔

"اسے تیرا نمبر کیسے ملا؟"

"جیسے پہلے ملتا رہا ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا "ہمارے ملک کی موبائل کمپنیاں ان کی غلام ہیں۔ یہاں اگر پولیس کو مدد درکار ہو تو انہیں نہ جانے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں، کسی نمبر کو ٹریس یا آبزرویشن میں رکھنے کے لیے اور ذیوز شا جیسے لوگ ان سے براہ راست کام لیتے ہیں۔"

"یہ سب ان کا بنایا ہوا سسٹم ہے۔" وسیم نے کہا "مانی نے بتایا کہ ایک آئی ٹی کمپنی جس کے آپریٹنگ سسٹم ہم استعمال کرتے ہیں ان میں ایسی چیزیں چھپی ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں ہوتا اور وہ ہماری معلومات انٹرنیٹ کے توسط سے آگے بھیجتی ہیں۔"

"شکر ہے میں نے اس سے صرف توقی اور ندیم کو کال کی ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں اب اپنے لیے ہم الگ سے سم استعمال کریں گے۔" عبداللہ نے کہا "سب کے پاس ڈبل سم والے موبائل ہیں۔ خاص سم ہم صرف آپس میں رابطے کے لیے استعمال کریں گے۔"

"ایک بات اور ہے۔" ایاز نے ہاتھ اٹھایا۔ "اب موبائل سگنل سے لوکیشن بھی نکال لی جاتی ہے۔"

یہ قابل غور بات بھی کم سے کم ذیوز شا کو پتا تھا کہ میں کہاں تھا اور میں اخلاقی طور پر اس سے معاہدے کا پابند نہیں رہا تھا اس لیے وہ مجھے تباہ کرنے کے لیے دوسرے حربے استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ "تم نے مزید ٹھکانے بنائے ہیں؟"

"وہ فارم ہاؤس دوبارہ لے لیا ہے جسے ایک بار خدشے کی بنا پر چھوڑا تھا۔" عبداللہ نے بتایا۔ "اتفاق سے فتح جنگ سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔" میں نے کہا۔ "بس تو ہم ابھی وہاں جا رہے ہیں۔"

"سب؟" وسیم نے پوچھا۔

"بالکل... اصل وجہ سادی ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ محفوظ ہونا چاہیے جب تک اسے مولی نہیں بھیجا جاتا۔"

"تم مولی کی بات کر رہے ہو جبکہ موٹا یہاں آنے کے لیے پر تول رہی ہے۔"

"اس کے پر کاٹ دو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"نا بابا۔" سفیر نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "یہ مجھ غریب کے بس سے باہر ہے۔"

"یار شوہر تھن زن مرید تھا۔"

سفیر نے دانت نکالے۔ "زن مریدی میں زیادہ مزے ہیں۔"

وسیم نے تائید کی۔ "جب بندے نے گدھا بن کر بوجھ ہی اٹھانا ہے تو تابعدار گدھا کیوں نہ بنے۔"

"ہاں گدھا ذرا زیادہ ہی ہے۔"

ایاز زیر مونچھ مسکرا رہا تھا۔ اچانک ہی سادی اندر آئی۔ "اچھا، موضوع چل رہا ہے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم بوجھ ہیں۔"

"خوب صورت بوجھ۔" وسیم نے تصحیح کی۔

"جو ہم خوشی خوشی اٹھانے کے لیے مرے جاتے ہیں۔" سفیر نے لقمہ دیا تو سادی مزید خفا ہوگئی۔

"آپ تو بات نہ کریں سفیر بھائی۔ آپ کو بالکل شرم نہیں آتی ہے۔"

"شرم تم لوگوں کو جو آتی ہے۔" سفیر نے ڈھٹائی سے کہا۔

"آپ کیسے ہیں ایاز بھائی... شاہین کیسی ہے؟"

"اس کا بھی تو پوچھو جو آنے والا ہے۔" سفیر نے پھر ٹانگ اڑائی۔ سادی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"آپ سچ مچ بہت واہیات ہیں۔"

"بھئی میں ایاز کے بے بی کی بات کر رہا ہوں تمہارے...."

"آپ تو چپ ہی رہیں۔" سادی نے اٹھ کر وہاں سے جاتے ہوئے کہا۔ سفیر نے دانت نکالے۔

"دیکھا کیسے جان چھڑائی۔"

"یار تو بے لگام ہوتا جا رہا ہے۔" میں نے کہا "ہم دوستوں کی بات الگ ہے مگر عورتوں کے سامنے ذرا زبان پر قابو رکھا کر۔"

"کوئی بات نہیں اس نے برا نہیں منایا صرف شرما کر گئی ہے۔" سفیر بولا۔ "اب مطلب کی بات کر.... کب چلنا ہے؟"

"جلد از جلد۔" میں نے کہا۔ "لیکن خیال رہے اس جگہ کو خفیہ رکھنا ہے موبائل کا استعمال کم سے کم ہے اور آنا جانا بھی کم سے کم.... اب ڈبل بڑا اور چکن تکہ پارسل نہیں ہوگا۔"

"تب میں بھی ٹھیک ہوں۔" سفیر نے اعلان کیا۔ "زبیدہ خانم کے ہاتھ میں کیا ذائقہ ہے۔"

"بیٹے دشمنوں کے ہاتھ میں بھی کم ذائقہ نہیں ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے یار ویسے ذائقہ ساوی کے ہاتھ میں بھی کم نہیں ہے۔" سفیر نے کہا۔

"وہ آرام کرے گی۔" میں نے اسے گھورا۔ "اس کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے۔"

"یار اسی کنڈیشن میں ہماری مائیں اور نانیاں دادیاں سب کرتی تھیں۔"

"ان کی بات الگ تھی۔" میں نے کہا۔ "ساوی شہزادی ہے اس نے ساری عمر کچھ نہیں کیا ہے۔ یہ تو اس کی نیک نفسی ہے جو ہمارے ساتھ عام عورتوں کی طرح رہتی ہے اور سب کرتی ہے۔"

"کیونکہ میں عام عورت ہوں۔" ساوی نے اندر آتے ہوئے کہا۔ وہ چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے تھی۔ "آپ فکر نہ کریں سفیر بھائی آپ جو کہیں گے میں بنا کر کھلاؤں گی۔"

"دیکھا ایسی ہوتی ہیں سعادت مند بچیاں، [illegible] کی خدمت کرنے والی۔"

"ہاں کیونکہ اپنی بچی جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔" وسیم نے آہستہ سے کہا۔ "دوسروں کی بچیوں پر نظر رکھتی ہے۔"

"برادرانہ نظر۔" سفیر نے ڈھٹائی سے کہا۔

"کیا برادرانہ سفیر بھائی۔" ساوی نے ٹرے میں چائے کے ساتھ سیاہ کافی کے مگ تھے ساتھ میں کریم اور شوگر تھی۔

"تھینک یو۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ سفیر اور ایاز نے منہ بنائے تھے۔ وہ چائے کے عادی تھے۔ وسیم بھی کافی کا شوقین تھا۔ ساوی خوش تھی اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ میں اس بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا جو ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا۔ ساوی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔ طے ہوا کہ وسیم وہیں سے فارم ہاؤس آئے گا۔ کافی کے بعد وسیم ساوی کو لے کر چلا گیا۔ میں نے عبداللہ سے مالی معاملات کو پوچھا۔ زیورات کا موڑ فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم اس نے کیش میں تبدیل کرا کے اسے ایک درجن مختلف بینک لاکروں میں رکھا تھا۔ یہ تقریباً پانچ کروڑ سے اوپر رقم تھی۔ باقی کیش کی صورت میں پاس تھی اور

روز مرہ کے کاموں میں استعمال ہو رہی تھی۔ کمیونیکیشن وین سمیت ہمارے پاس سات گاڑیاں تھیں جن میں دو مزدا وین تھیں۔ ان میں بارہ تیرہ افراد مع ساز و سامان کے آرام سے آسکتے تھے اور یہ اسی لیے مخصوص تھیں۔ کمال کھوکھر کے ڈیرے پر آنے والے وسیم کے آدمی ایک مزدا وین میں آئے تھے۔ دو گاڑیاں یہاں تھیں اور باقی بھگوال والی حویلی میں تھیں۔

یہاں صرف صوفی اور زبیدہ تھے۔ وسیم کے آدمی گیٹ کی نگرانی کرتے تھے۔ یہ وہی بائیک رائڈر تھے جو سفیر کے ساتھ جاسوسی کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ جاتے۔ صوفی نے اصرار کیا کہ اسے بھی ساتھ لیا جائے مگر عبداللہ نے منع کر دیا۔ ''تم یہاں کے نگران ہو اس لیے یہیں رہو گے اس جگہ کو خالی نہیں چھوڑ سکتے۔''

''میں بھی چلتا ہوں۔'' ایاز نے سب سے ہاتھ ملایا۔ ''کل آؤں گا۔ باقی ضرورت پڑنے پر آپ کسی وقت بھی کال کر سکتے ہیں۔''

ایاز کے جانے کے بعد ہم سارے ساز و سامان کے ساتھ اسی نسان وین کار میں سوار ہوئے جس میں سرحد سے یہاں تک آئے تھے۔ دونوں رائیڈر اپنی بائکس پر تھے۔ مانی خفا تھا کہ اسے عجلت میں اپنا سب سمیٹنا پڑا اور جب سفیر نے اسے دشمنوں سے ڈرایا تو وہ فوراً اپنا سامان سمیٹ کر سب سے پہلے وین میں آ بیٹھا تھا۔ عبداللہ نے اس کی بھی تنخواہ مقرر کرنا چاہی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔

''میں گزارے لائق کما لیتا ہوں۔ اگر ضرورت ہوگی تو آپ سے کہہ دوں گا۔''

اس پر عبداللہ نے اسے ڈالر دیئے تھے کہ اسے سامان کی ضرورت ہو تو وہ بلا تکلف خرید لے۔ وہ سن کر خوش ہوا تھا کہ ہم اسی فارم پر جا رہے تھے اور جب اسے پارسل فوڈ پر پابندی کا پتا چلا تو اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ ''تب ہم کیا کھائیں گے؟''

''جو وہاں بنے گا۔'' سفیر نے کہا۔ ''ہم ناشتے اور کھانے کے لیے ایک ساتھ ہی راشن لے کے جائیں گے۔ جیسے دلیہ، دودھ، سیریل، انڈے اور اسٹور ہونے والی سبزیاں اور دالیں۔''

''تب میں نہیں جا سکتا۔'' مانی نے انکار کیا۔ سفیر نے اسے دوبارہ دشمنوں کا واسطہ دے کر راضی کیا اور ان کی نوک جھونک میں ہم ہنستے اور مسکراتے رہے۔ جب بیٹو تھا تب بھی یہی سین چلتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کسی کے جانے سے فرق نہیں پڑتا ہے۔ انسان پھر اپنی زندگی میں مگن ہو جاتا ہے لیکن یہ انسان کی خامی نہیں بلکہ وہ فطرت ہے جو اللہ نے بنائی ہے۔ ہم سب گاڑی میں لد گئے۔ فاضلی جیسے دشمن کا سن کر میں نے محتاط رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور سب مسلح تھے۔ پستول سب کے پاس تھے جب کہ بڑا اسلحہ بھی پیچ میں تھا۔ سفیر بار بار اپنی بیلٹ میں لگا پستول مانی کو دکھا رہا تھا اور وہ ذرا کراہت دور کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یار تم نے اتنی صفائی سے بھارتیوں کو نشانہ بنایا اور اب ایک معمولی پستول سے ڈر رہے ہو۔''

''شوبی وہ تو میں ویڈیو گیم کھیل رہا تھا، اس کا ماہر ہوں نا۔''

''ماہر نہیں ہو بچے تم چیٹ کرتے ہو۔'' سفیر نے اب زبان کا استعمال کیا۔ ''تم گیم میں بھی اپنی مرضی کی چیزیں ڈال دیتے ہو۔''

''یہ بھی تو میری مہارت ہوئی نا۔'' مانی نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''شوبی کمال تو سارا اس مشین کا ہے وہ بالکل ٹھیک نشانہ لگا رہی تھی اور گولی چلنے کی معمولی سی آواز آ رہی تھی ورنہ تو میرا ویسے ہی ہارٹ فیل ہو جاتا دھماکے کی آواز سن کر۔''

ہم فیض آباد سے نکلے اور کچھ دیر بعد کشمیر روڈ پر آ گئے۔ وہاں سے جی ٹی روڈ پر آئے لیکن ترنول سے دوبارہ جی ٹی روڈ سے اتر گئے۔ اب ہم فتح جنگ روڈ پر تھے۔ اگرچہ فتح جنگ یہاں سے کوئی چند درجن کلومیٹرز دور تھا۔ ہم پی اے ایف ترنول سے پہلے جہاں اسلام آباد کا آخری جی چند دو سیکٹر ختم ہو رہا تھا نیو غازی کے ساتھ واقع فارم ہاؤس تک پہنچے۔ یہ سڑک سے کسی قدر ہٹ کر تھا اور اس کے عقب میں دور تک کھیت تھے۔ ایک موقع پر ہم ان ہی کھیتوں سے نکل کر فرار ہوئے تھے کیونکہ مانی کے لگائے کیمروں نے بر وقت دشمنوں کو آتے دکھا دیا تھا۔ وہ اپنے کیمرے اور نگرانی کا دوسرا سامان لایا تھا۔ چابی عبداللہ کے پاس تھی اس نے اتر کر گیٹ کھولا اور اچانک ہی واپس آیا اس نے گاڑی میں منہ ڈال کر کہا۔

''اندر کوئی ہے... ایک گاڑی کھڑی ہے۔''

میں نے فوری فیصلہ کیا اور مانی سے کہا۔ ''تم یہیں رکو۔''

''اور آپ سب؟'' مانی نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ہم دیکھتے ہیں یہاں معاملہ کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم دیکھو اگر خطرہ ہو اور ہم میں سے کوئی مدد کے لیے آس پاس نہ ہو تو گاڑی لے کر دوڑ جانا۔''

ماں ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا اور ہم نے اسلحے والے بیگ سے خودکار رائفلیں نکالیں۔ عبداللہ بتا رہا تھا کہ گیٹ کھلا ہوا تھا مطلب لاک نہیں تھا۔ فارم ہاؤس کے چاروں طرف سات فٹ اونچی چار دیواری تھی پہلے اس پر خاردار تار بھی تھی مگر اب وہ ہٹا دی گئی تھی۔ میں نے وسیم کے دونوں آدمیوں خاور اور اشفاق کو پیچھے کی طرف بھیجا۔ دائیں طرف سفیر اور عبداللہ بائیں طرف سے گیا تھا میں گیٹ سے اندر جاتا۔ ان لوگوں کے جانے کے چند منٹ بعد میں گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک چھوٹی لیکن نئی کار کھڑی تھی۔ مگر کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں پورچ سے ہوتے داخلی دروازے تک آیا اور وہ اندر سے بند تھا۔ اسی دوران میں سفیر بھی آگیا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"باہر کوئی نہیں ہے اور یہ تو اندر سے بند ہے؟"

"کیا خیال ہے کال بیل بجائیں۔" میں نے کہا۔

"تاکہ وہ اندر سے سیدھی گولی ماریں۔" سفیر نے بھنا کر کہا۔ "آپ نے کیا عقل بھی گاڑی میں بھیج دی ہے۔"

"تم مذاق بھی نہیں سمجھتے۔" میں نے ایک کھڑکی سے اندر جھانکا۔ یہ لاؤنج تھا اور اس کے ساتھ نشست گاہ تھی۔ فارم ہاؤس کی بیرونی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس کی باقاعدگی سے دیکھ بھال کی جاتی تھی اور پودوں کو پانی وغیرہ بھی دیا جاتا تھا۔ اس لیے سبزہ ہرا تھا۔ کھڑکی کے ساتھ ستون پر بوگن ویلیا کی بیل چڑھی ہوئی تھی اس لیے یہاں سایہ تھا اور اندر کا منظر تاریک لگ رہا تھا۔ میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ہی شیشے کے دوسری طرف ایک نسوانی چہرہ نمودار ہوا۔ وہ بھی جھانک رہی تھی اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں پھر وہ چیخ مار کر بھاگی۔ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ میں تیزی سے داخلی دروازے تک آیا اور دروازے کے لاک پر پستول رکھ کر فائر کر دیا۔ پستول پر سائلنسر تھا اس لیے آواز کا خدشہ نہیں تھا۔ دوسرے فائر پر لاک ٹوٹ گیا۔ سفیر میرے آس پاس ناچتے ہوئے اس فائرنگ کی وجہ دریافت کر رہا تھا۔ مگر میں اس کی بک بک پر توجہ دیے بغیر دروازہ کھلتے ہی اندر گھس گیا تھا۔ اندر آیا تو اسی وقت لڑکی ایک لڑکے کے ساتھ اندر سے نمودار ہوئی۔ لڑکا صرف پاجامے میں ملبوس تھا اور لڑکی نے بھی باتھ روب پہن رکھا تھا۔ مجھے مسلح دیکھ کر وہ واپس بھاگے تھے کہ میں نے للکار کر کہا۔

"بس....."

وہ دونوں منجمد ہو گئے۔ دس منٹ میں پورا فارم ہاؤس چیک کر لیا گیا تھا وہاں بس یہی دونوں تھے۔ میں ان کے سر پر تھا اور وہ دونوں سہمے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی شکل سے انیس بیس سال کی تھی اور بہت حسین تھی۔ جب کہ لڑکا بھی اچھے نقوش کا اور اسمارٹ تھا۔ جب عبداللہ نے آل کلیئر کا اشارہ کیا تو میں نے اسے ماں کو اندر بلانے کے لیے کہا۔ وسیم کے آدمی سفیر کے ہمراہ فارم کے آس پاس چیک کر رہے تھے مگر میں نے محسوس کر لیا تھا کہ خطرہ نہیں ہے۔ عبداللہ نے مزید رپورٹ دی تھی کہ اندر ایک بیڈ روم زیر استعمال تھا اور وہاں باقاعدہ ان کا سامان تک موجود تھا۔ وہ دونوں سہمے ہوئے تھے اگرچہ لڑکا کسی قدر بہادر نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اندر سے اس کی ہوا بھی خراب تھی۔ میں نے ان دونوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا کچھ سوالوں کے جوابات دو۔"

"کیسے سوالات؟" لڑکے نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

"ایسے نہیں جناب... الگ الگ پوچھتے ہیں۔" عبداللہ نے بروقت عقل مندی کی بات کی اور لڑکی سے کہا۔ "چلو اٹھو اندر جاؤ۔"

لڑکی ہچکچاتے ہوئے اٹھی اس کا خیال تھا کہ ہم میں سے کوئی اس کے پیچھے آئے گا مگر ہم بیٹھے رہے اور وہ بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ یہاں باہر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک کچن کا دروازہ تھا وہ سامنے تھا اور سیڑھیاں بھی لاؤنج سے ہی اوپر جا رہی تھیں۔ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"تمہارا نام؟"

"راشد علی۔" اس نے جواب دیا۔

"راشد علی... تم یہاں کیا کر رہے ہو... اس لڑکی کے ساتھ....؟ اور اس کا نام کیا ہے؟"

"رومانہ۔" اس نے جواب دیا۔ "اس کا نام رومانہ ہے۔"

"اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ "ہم یہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

میں چونکا۔ "چھپے ہو کس سے؟ اور تمہیں اس جگہ کا پتا کیسے چلا؟"

"ہم اپنے گھر والوں سے چھپے ہوئے ہیں۔ مجھے اس... جگہ کا معلوم تھا۔ میں ایک بار اپنے دوست کے ساتھ یہاں آ چکا ہوں۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہوگا اس لیے تم یہاں چلے آئے لیکن تمہیں کیسے معلوم کہ یہاں کوئی نہیں ہو

گا؟"

"اس فارم ہاؤس کا مالک باہر ہوتا ہے۔ یہ جگہ کرائے پر دی جاتی ہے لیکن ابھی خالی ہے۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ خالی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم نے اسے کرائے پر لے لیا ہے۔"

"ہم سے غلطی ہوئی لیکن ہم نے یہاں سے کچھ لیا نہیں ہے صرف ایک تالا توڑا ہے۔"

"عمارت میں کیسے آئے؟"

"اتفاق سے اس کی چابی میرے پاس تھی اسی لیے تو یہاں کا رخ کیا۔" اب وہ کسی قدر اعتماد سے بول رہا تھا ویسے بھی اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ "اندر والا بیڈروم لاک تھا اس کا تالا توڑنا پڑا۔"

"کیوں نہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔"

"کر دیں۔" اس نے بے خوفی سے کہا۔ "پولیس مسئلہ نہیں ہے۔"

"تب تمہیں تمہارے گھر والوں کے حوالے کیوں نہ کر دیں۔"

اس بار اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اس نے گھبرا کر کہا۔ "پلیز ایسا مت کریں۔ میں بچ جاؤں گا مگر رومانہ ماری جائے گی اس کا باپ بہت ظالم ہے۔"

"جب تمہیں معلوم ہے کہ اس کا باپ بہت ظالم ہے تو یوں بھاگ کر چھپنے کی کیا ضرورت تھی؟ ویسے تم دونوں نے شادی کر لی ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "کل ہی ہمارا نکاح ہوا ہے۔ بھاگ کر شادی اس لیے کی کہ رومانہ کا باپ جو میرا رشتے کا چچا ہے اس شادی کے لیے بالکل آمادہ نہیں تھا۔"

"اور تمہارے گھر والے؟"

"ہاں تو وہ بھی نہیں مان رہے تھے مگر اصل مسئلہ رومانہ کے باپ کا تھا۔ وہی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔"

"اسے تم نے بائی پاس کر دیا۔" میں نے کہا۔ اسی اثنا میں بابی بھی اندر آ گیا۔ وہ خوش تھا کہ خطرہ نہیں تھا اور مارا ماری نہیں ہوئی۔ اس نے مجھ سے سامان لانے اور سیٹ کرنے کی اجازت مانگی۔

"جلد از جلد کر لو خاص طور سے سیکیورٹی سسٹم۔"

"میں چند گھنٹے میں کر لوں گا۔ لیکن مجھے ایک آدمی چاہیے۔"

عبداللہ نے نادر کو اس کے ساتھ کر دیا۔ میں نے راشد سے چند سوال اور کیے اور پھر رومانہ کو بلایا۔ راشد کے ساتھ عبداللہ گیا تھا۔ وہ بہر حال مرد تھا اور اس سے مزاحمت اور گڑبڑ کی توقع کی جا سکتی تھی۔ رومانہ نے ان تمام سوالوں کے جوابات درست دیے جو میں نے راشد سے کیے تھے۔ وہ شروع میں نروس تھی مگر اب اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اسے کم سے کم لڑکی ہونے کی حیثیت سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ اعتماد سے جواب دے رہی تھی۔ آس پاس سب کلیئر تھا۔ سفیر کچن میں کھانے پینے کا سامان رکھ رہا تھا جو صوفی نے ساتھ کیا تھا۔ اس میں کئی تیار ڈشیں تھیں جو زبیدہ نے عجلت میں تیار کر دی تھیں۔ میں سوچ کر آیا تھا کہ اب ہم فاضلی کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کریں گے اور یہ کام آج ہی سے شروع کر دیں گے مگر یہاں یہ مسئلہ موجود تھا۔ راشد اور رومانہ کا ہم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ وہ ہمارے لیے خطرہ تھے مگر انہیں چھوڑنے کا فیصلہ اتنی جلدی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ جانے کیا گل کھلاتے اور ہم مشکل میں پڑ جاتے۔ میں نے راشد کو بلا لیا۔

"تم دونوں نے سچ کہا ہے لیکن ہم اس کی مزید تصدیق کریں گے اور اس کے بعد ہی تم دونوں کو یہاں سے جانے کی اجازت دی جائے گی تب تک تم یہیں رہو گے۔"

"ہم قید ہوں گے؟" راشد نے بے یقینی سے کہا۔ "مگر کیوں؟"

"نقب زنی کے جرم میں۔ اگر تمہیں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے تو چند مہینے کی سزا تو لازمی ہو گی۔ سمجھو کہ ہم نے تمہیں چند دن قید کی سزا دی ہے۔ اس دوران میں تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک نہیں ہوگا اور نہ ہی تمہیں کسی بھی طرح مجبور کیا جائے گا۔ صرف باہر جانے پر پابندی ہو گی تم اپنے کمرے تک محدود رہو گے۔"

"کب تک؟" رومانہ نے پوچھا۔

"کہہ نہیں سکتا چند دن بھی ہو سکتے ہیں اور چند ہفتے بھی۔" میں نے کہا اور عبداللہ کو اشارہ کیا۔ وہ انہیں کمرے کی طرف لے گیا۔ اس کا دروازہ باہر سے بند نہیں ہوتا تھا اور لاک کرنا بھی بیکار تھا کیونکہ وہ آسانی سے اندر سے کھل سکتا تھا۔ ویسے بھی لاک انہوں نے توڑ دیا تھا۔ اس لیے یہاں کسی نہ کسی کو ان کی نگرانی کے لیے موجود رہنا ضروری تھا۔ وسیم اور ساوری تاحال ہجرت آئے تھے اور وجہ صاف ظاہر تھی وہ سرگزشت کر کے آ رہے تھے۔ ہم لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ سفیر نے کہا۔

"دیکھا آئے ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں

ہوئے ہیں اور آوارہ گردی شروع۔"

"سفیر بھائی ہم میاں بیوی ہیں۔" سادی نے احتجاج کیا۔

"تم شادی سے پہلے گھوم پھر لیے ہم شہزادیں شادی کے بعد سب کام کرتے ہیں۔" وسیم نے کہا تو سادی جلدی سے بولی۔

"میں ذرا فریش ہو جاؤں۔"

"احتیاط سے، اس کمرے میں مت جانا۔" سفیر نے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں اس میں کیا ہے؟"

"ایک نیا شادی شدہ جوڑا... ہنی مون منا رہا ہے۔"

سفیر کی بات پر سادی اور وسیم نے اسے شک سے دیکھا۔ "نیا شادی شدہ جوڑا کہاں سے آ گیا۔"

"وہ پہلے سے موجود تھا۔" میں نے کہا۔ پھر وسیم کو بتایا تو وہ فکر مند ہو گیا۔

"یہ تو اچھا نہیں ہوا، ہم یہاں چھپنے آئے ہیں اور یہاں پہلے ہی کوئی موجود تھا۔"

"مجھے لگ رہا ہے وہ سچ کہہ رہے ہیں مگر ہم انہیں ایسے ہی نہیں چھوڑ سکتے۔"

وسیم نے تائید کی۔ "ٹھیک ہے ابھی تو ان کو رکھتے ہیں بعد میں دیکھیں گے۔"

یہاں تین بیڈ روم تھے۔ ایک وسیم اور سادی کے حصے میں آیا اور دوسرے میں، میں نے سفیر کے ساتھ ڈیرا جمایا۔ بانی حسب معمول اسٹڈی میں اپنا سیٹ اپ کر چکا تھا اور وہ رات بھی وہیں گزارتا۔ وہ کیمرے لگانے میں مصروف تھا پھر اس نے عمارت کے چاروں طرف لیزر جال لگایا۔ اگر کوئی اس جال میں مداخلت کرتا تو اندر الارم بج جاتا۔ کھانے کی میز پر وہ عجلت میں آیا اور پھر چلا گیا۔ کھانے کے بعد عبداللہ بھی اس کی مدد کرنے لگا تھا اور سفیر تفریح کرنے پہنچ گیا تھا۔ میں کچھ دیر ٹی وی دیکھتا رہا۔ پھر راشد اور روبینہ کو چیک کیا۔ وہ فکر مند تھے مگر زیادہ نہیں۔ انہیں کھانا کمرے میں ہی دے دیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد انہیں چائے بھی مہیا کی گئی۔ یہاں ہر کمرے میں اے سی تھا اس لیے سکون تھا۔ ویسے موسم بارش کے بعد بہتر تھا اور باہر کچھ اچھا ہی تھا میں ٹہلنے باہر آیا تو خنکی کے ساتھ نباتات کی خوشبو نے استقبال کیا تھا۔ دس بجے گیٹ کے سامنے کیٹرنگ سروس کی وین رکی اور اشفاق جو ڈیوٹی پر تھا اس نے دروازہ کھولا۔ کیٹرنگ سروس وین اندر آئی۔ اس کا رنگ آسمانی کر دیا تھا اور اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس پر سرکاری نمبر پلیٹ لگی تھی۔ اس کے پیچھے مزید دو رائیڈر آئے تھے۔ اب یہاں چار رائیڈر ہو گئے تھے۔ یہ یہاں پہرہ بھی دیتے اور گیٹ کی دیکھ بھال بھی کرتے۔ ان کے لیے اوپر موجود واحد کمرا مختص کر دیا تھا جس کے ساتھ باتھ روم بھی تھا۔ ہمہ وقت دو افراد پہرے پر رہتے اور ان میں سے ایک وقفے وقفے سے فارم ہاؤس کا چکر بھی لگاتا۔ وہ واکی ٹاکی سے آپس میں اندر موجود وسیم سے رابطے میں رہتے۔ میں حفاظتی انتظامات سے مطمئن ہو گیا تھا۔ انہیں ان کی ذمے داریاں سمجھا کر وسیم میرے پاس آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"نا خلقی کے لیے کیا پلان ہے؟"

"اسے اٹھانے کا سوچا ہے لیکن جیسا آپ کہیں۔"

"نہیں اٹھانے کا مسئلہ ہو گا۔ تم جانتے ہو وہ خطرناک آدمی ہے۔"

"تب اس کا پتا صاف کر دیتے ہیں۔"

"ہاں اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے لیکن پہلے دیکھا جائے کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ ممکن ہے کوئی موقع ہاتھ لگے اور ہم اسے اٹھا بھی سکیں۔"

"میں سمجھ گیا... ہم اوپن مائنڈ کے ساتھ جائیں گے۔"

"بالکل پہلی شرط مکمل نگرانی کی ہے۔"

"کیا خیال ہے ہم آج رات سے ہی یہ کام شروع کر دیں۔" وسیم نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ ہم عام زندگی نہیں گزار رہے تھے جو روٹین کا کام روٹین کے مطابق انجام دیتے۔ ملک میں آتے ہی دشمنوں نے ڈیوڈ شا کی صورت میں رابطہ کر لیا تھا اور ہمیں دربدر ہونا پڑا تھا اس لیے بہتر یہ تھا کہ ہم کبھی وقت ضائع نہ کرتے۔ میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے ابھی سے شروع کرتے ہیں۔"

"تب آپ اور دو بندے چلتے ہیں۔ عبداللہ اور سفیر یہیں رہیں گے۔" وسیم خوش ہو گیا۔ "آپ کو ایک نئی چیز بھی دکھاتا ہوں۔"

"کیا چیز ہے؟"

"وہیں چل کر دکھاؤں گا کچھ دن پہلے منگوائی تھی اور بہت شاندار رزلٹ ہے اس کا۔"

مجھے خیال آیا۔ "وہ جگہ بھی ہے؟"

"ہمارے ساتھ جو دو جائیں گے انہوں نے دیکھی ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک مرشد کی درگاہ میں جاسوس بھی تھا پھر یہ مشکوک ہو گیا تو اسے واپس بلا لیا دوسرا کام کر رہا

ہے۔"

ہم کیمونیکیشن وین لے کر نکلے۔ سفر ہو گیا تھا اور عبداللہ جاگ رہا تھا اسے بتایا۔ ہم اندر جا کر دیکھ آئے سارہ بھی سو گئی تھی۔ ہم روانہ ہوئے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس وقت ہائی وے پر ٹریفک کم تھا۔ فتح جنگ کے پاس جھیل کے کنارے بہت سے کھانے پینے کے ریستوران اور ڈھابے کھل گئے ہیں۔ شوقین لوگ آخر یہاں آتے ہیں خاص طور سے تازہ مچھلی بہت اچھی ملتی ہے۔ اس وقت اس طرف سے گاڑیاں آ رہی تھیں اور ان میں زیادہ تر ٹریلر اور گروپ تھے جو یقیناً کھانا پکڑا کر آ رہے تھے۔ جس سمت میں ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ وزارت دفاع کی جاسوس تھا۔ اس کا نام احسان تھا۔ وہ تقریباً پینتیس برس کا سابق آرمی کمانڈو تھا۔ اس نے ہائی وے کے کنارے وین روک دی اور بولا۔ "ہم پاس ہیں۔"

"فارم کہاں ہے؟" وسیم نے پوچھا۔

"وہ جس چھت پر سرخ لائٹس لگی ہیں۔" احسان نے اشارہ کیا۔

یہ فارم ہاؤس سڑک سے کوئی دو سو گز دور تھا اس سے پہلے والی زمین خالی تھی اور شاید یہ ہائی وے کا حصہ تھی۔ فارم کے وسط میں عمارت بنی ہوئی تھی اور اس کی چھت پر تیز روشنی والی سرخ لائٹس لگی تھیں جو آس پاس کے علاقے کو منور کر رہی تھیں۔ اتنی روشنی کا مقصد یقیناً سیکورٹی تھی۔ وسیم نے وین کا خاص کیمرا آن کیا جس کا ٹیلی لینس اس کی چھت پر تھا اور وہ مزید بلند ہو کر دیکھ سکتا تھا مگر فارم کے گرد چار دیواری اتنی اونچی تھی کہ کیمرا اونچا ہو کر بھی اس کے اندر دکھانے سے قاصر تھا۔ وسیم نے کہا۔ "اب میں آپ کو خاص چیز دکھاتا ہوں۔"

وسیم نے ایک دھاتی بریف کیس اٹھایا اور اسے کھولا تو اس سے ایک چار انچ قطر کی گول سیاہ ڈسک نکلی۔ اس کی موٹائی مشکل سے دو انچ ہوگی۔ اس نے مجھے تھما دی۔ "دیکھیں اور بتائیں یہ کیا ہے۔"

ڈسک کے اوپر ایک گھومنے والا روٹر لگا ہوا تھا۔ اس میں مخصوص کھانچے تھے جیسے اس میں کچھ لگایا جا سکتا ہو۔ میں نے اسے پلٹ کر دیکھا تو اس کے نیچے ایک گول لینس نما شیشہ لگا ہوا تھا مگر یہ ڈسک کے کناروں سے اندر تھا یعنی اگر ڈسک نیچے رکھا جاتا تو یہ شیشہ نیچے نہیں ٹکراتا۔ اس کا وزن ایک پاؤ سے زیادہ نہیں تھا۔ میں نے غور کیا اور کہا۔ "مجھے یہ کوئی جاسوس ڈیوائس لگ رہی ہے۔ اس میں کیمرا ہے اور اس کے اوپر گھومنے والا روٹر ہے اس میں کچھ لگ سکتا ہے شاید پنکھا یا ایسی کوئی چیز....."

"آپ نے درست پہچانا یہ چھوٹا سا جدید ترین اسپائی ڈرون ہے۔"

"فوجی مقاصد کے لیے ہے؟"

"نہیں یہ اتنا ہائی فائی نہیں ہے خاص طور سے کیمونیکیشن میں عام پبلک استعمال کرتی ہے۔ میں آپ کو دکھاتا ہوں۔"

وسیم نے بریف کیس سے پنکھڑیوں کا ایک سیٹ نکالا۔ یہ فائبر کی بنی ہوئی بہت ہلکی لیکن مضبوط پنکھڑیاں تھیں۔ اس نے انہیں روٹر کے کھانچے میں فٹ کر کے کلپس کی مدد سے بند کر دیا اب یہ کسی صورت از خود نہیں کھل سکتی تھیں۔ پنکھڑیوں کا قطر تقریباً دس انچ تھا اور ان کی تعداد آٹھ تھی۔ پھر ہم وین سے اتر آئے۔ بریف کیس ہی اس کا کنٹرولنگ یونٹ تھا۔ اس میں اوپر والے حصے میں اسکرین لگی تھی۔ وسیم نے مجھے پکڑایا اور بولا۔ "اسے سر سے اوپر کر لیں۔"

میں نے اس کا نچلا حصہ اوپر کیا تو وسیم نے بریف کیس میں لگا ایک بٹن دبایا۔ کنٹرولنگ یونٹ آن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرون کے نیچے کیمرے کے ساتھ بہت ہلکی تیز سرخ روشنی جل اٹھی اور پھر اس کی پنکھڑیاں گردش کرنے لگیں۔ وسیم بریف کیس کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ "چھوڑ دیں۔"

میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ ڈرون زور لگا رہا ہے اور میرے چھوڑتے ہی وہ اوپر جانے لگا۔ تقریباً دس فٹ اوپر جانے کے بعد وہ نظروں سے تقریباً اوجھل ہو گیا تھا۔ اتفاق سے آسمان پر بادل تھے اور اس وجہ سے بھی وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آواز اس وقت بھی بمشکل آ رہی تھی جب وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ ہم وین میں واپس آ گئے۔ وسیم نے بریف کیس اس طرح رکھا کہ میں اسکرین دیکھ سکتا تھا اور پھر وہ ڈائے اسٹک کی مدد سے ڈرون کنٹرول کرنے لگا۔ اس کا بڑا لینس نیچے کا منظر صاف دکھا رہا تھا۔ مگر ابھی سب تاریکی میں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ پچاس فٹ کی بلندی پر تھا وسیم نے تصدیق کی۔ "یہ ابھی پچاس فٹ پر ہے اور یہ دو سو فٹ کی بلندی تک جا سکتا ہے۔"

"کتنی دوری تک آپریٹ ہو سکتا ہے؟"

"آدھا کلومیٹر تک۔" وسیم نے جواب دیا۔ "اس میں ایک چھوٹی سی لیکن بہت طاقتور ری چارج ایبل بیٹری

گئی ہے۔ ایک بار چارج ہونے کے بعد یہ آدھا گھنٹا بہ خوبی کام کرسکتا ہے۔ اس کی بیٹری کو پھر چارج ہونے میں آدھا گھنٹا ہی لگتا ہے۔"

"اگر فوری ضرورت ہو تو؟"

وسیم نے بریف کیس میں لگی اضافی بیٹری کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں اسپیئر بیٹری ہے۔ اسے لگایا جاسکتا ہے یہ اسی پوائنٹ سے چارج ہوتی رہے گی۔"

ڈرون اب فارم ہاؤس کے اوپر تھا۔ نیچے روشنی کی وجہ سے سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں لوکاٹ، شہتوت اور انگور کے باغات تھے۔ کوٹھی نما عمارت وسط میں تھی۔ اس کے اگلے حصے میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور وہاں کرسیوں پر تین مسلح افراد بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے پاس شراب کی بوتل تھی اور وہ تینوں پینے میں مصروف تھے۔ پہلے وسیم نے پورے فارم کا جائزہ لیا۔ عقبی حصے میں کچھ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ سامنے گیٹ پر دو افراد اور تھے اور وہ گشت کر رہے تھے۔ باہر یہی پانچ افراد تھے۔ اب وسیم ڈرون کو عمارت کے گرد گھما رہا تھا۔ اس میں موجود کیمرے کا لینس گھوم سکتا تھا اور آس پاس کے مناظر بھی دکھا سکتا تھا۔ ڈرون گھومتا ہوا ایک کھڑکی کے سامنے پہنچا تو میں نے اور وسیم نے بیک وقت لاحول پڑھی۔ اندر موجود جوڑا ایک دوسرے میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ انہیں کھلی کھڑکی کا احساس بھی نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ کھڑکی زمین سے سات فٹ اونچی تھی اور کوئی زمین پر کھڑے ہوکر اندر نہیں جھانک سکتا تھا۔ باہر موجود پانچ افراد میں فاضلی نہیں تھا اور جوڑے میں مرد بھی فاضلی نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے مقابلے میں بہت دبلا پتلا تھا۔ فاضلی کا جسم بھرا ہوا تھا۔ باقی کھڑکیاں بند تھیں۔ وسیم ڈرون کو اوپری منزل پر لایا جہاں تین کمرے تھے۔ یہ تینوں کمرے ایک قطار میں تھے اور ان کے دروازے کھلے صحن کی طرف تھے۔ فاضلی یا اکان جیسے لوگ انہیں رہائش کے لیے استعمال نہیں کرسکتے تھے کیونکہ یہ اوپن تھے اور باہر سے سیڑھیاں براہ راست اوپر تک آرہی تھیں یہ یقیناً ملازمین کے لیے مخصوص تھے۔

"میرا خیال ہے فاضلی اندر ہے۔" میں نے کہا۔

"گاڑیاں دیکھتے ہیں۔" وسیم نے کہا اور ڈرون کو پورچ کی طرف لایا۔ اب احتیاط سے کام کرنا تھا کیونکہ یہاں روشنی تھی اور تینوں مسلح پہریدار بھی موجود تھے۔ گاڑیاں اعلیٰ درجے کی اور نئی تھیں۔ ان میں ایک لینڈ کروزر کا نیا ماڈل تھا۔ ایک ہیلکس تھی اور یہ بھی تقریباً نئی تھی جب کہ تیسری فراری تھی۔ مگر یہ چند سال پرانا ماڈل تھا۔ اچانک ہی کوٹھی کی طرف سے کوئی آیا۔ وسیم مسلسل لینس گھما رہا تھا اور اسی وجہ سے پتا چل گیا۔ اس نے عجلت میں ڈرون اوپر اٹھا لیا۔ آنے والا فاضلی تھا اور اس کے ساتھ ایک خوب صورت عورت تھی۔ وہ دونوں فراری میں بیٹھے۔ پورچ میں بیٹھے تین افراد میں سے ایک اٹھ کر فاضلی کے پاس آیا۔ وہ اسے کچھ کہہ رہا تھا کیونکہ وہ سننے والا صرف سر ہلا رہا تھا۔ پھر فاضلی نے کھڑکی کا شیشہ اوپر کیا اور کار اسٹارٹ کر کے باہر لے گیا۔

میں نے احسان سے کہا۔

"وین آگے لے جاؤ مگر روڈ سے دور مت جانا اور رفتار سلو رکھنا۔"

ہم مخالف سمت میں جانے لگے۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل تھا کہ فاضلی کس طرف کا رخ کرے گا مگر امکان یہی تھا کہ وہ پنڈی اسلام آباد کی طرف جائے گا۔ وسیم نے ڈرون واپس بلا لیا تھا۔ مگر اس کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ فراری ایک سمت سے گئی پہلے بائی وے پر آئی اور پھر نئی روڈ کی طرف روانہ ہوگئی۔ احسان نے حکم پر وین واپس گھمائی۔ جب تک ڈرون آتا فراری اتنی دور جاچکی تھی کہ اس کی عقبی روشنیاں بہ مشکل نظر آرہی تھیں۔ ڈرون آیا تو وسیم نے خود باہر جا کر اسے پکڑا اور آف کر دیا۔ پھر وہ جیسے ہی اندر بیٹھا احسان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وسیم نے ڈرون کو ایسے ہی چھوڑا اور عجلت میں وین کا کیمرا سسٹم آن کیا۔ اس کا زوم بہت طاقتور تھا۔ اس نے ایک کلو میٹر دور نکل جانے والی فراری کو واضح دکھایا۔ لیزر رینج فائنڈر فاصلہ بھی بتا رہا تھا۔ وسیم نے احسان سے کہا۔ "وہ ایک کلو میٹر آگے ہے۔ رفتار بڑھاؤ۔"

وین کا انجن طاقتور تھا مگر وہ رفتار میں فراری کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ ہاں اگر فاضلی نارمل رفتار سے چلاتا تو اس کا پیچھا کیا جاسکتا تھا۔ وسیم نے اسکرین کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اچھا موقع ہے وہ اکیلا ہے۔"

"عورت ساتھ ہے۔"

"ہاں لیکن میرا خیال ہے وہ اس کی ساتھی نہیں ہے صرف دل بستگی کے لیے ساتھ ہے۔ اسے قابو کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اتنا تو مجھے یقین ہے کہ وہ دانتوں تک مسلح ہوگا اور ہوشیار ہوگیا تو بہت مار دھاڑ کے بعد ہاتھ آئے گا یا مارا جائے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"تب آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

"فی الحال دیکھو اور انتظار کرو۔" میں نے

کہا۔ "فاضلی ایسے ہی مرشد کے دماغ میں نہیں آ گیا۔"

"آپ کو شبہ ہے کہ اسے کسی کی پشت پناہی حاصل ہے؟"

"شبہ نہیں یقین ہے۔" میں نے کہا۔ وین رفتہ رفتہ فراری کے پاس آ رہی تھی اور اب دونوں گاڑیوں میں نصف کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ کچھ دیر میں موٹروے کے نیچے سے گزر کر نوفازی کی طرف آ گئے۔ فراری کا رخ جی ٹی روڈ کی طرف تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ جی ٹی روڈ پر تھی اور ترنول سے وہ اسلام آباد کی طرف مڑ گئی۔ دو منٹ بعد وہ کشمیر ہائی وے پر آ گئی تھی۔ ہائی وے سے اترنے کے بعد وسیم نے فاصلہ تین سو گز کرا لیا تھا اور یہ بھی اچھا خاصا تھا۔ اگر ہم وین کے سسٹم سے اس پر نظر نہ رکھے ہوتے تو اتنی دور سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اب فاضلی کسی صورت تعاقب کا شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم نے کسی ناگہانی صورت حال کے لیے اسلحہ تیار کر لیا تھا۔ نزدیک آنے کی وجہ سے وسیم نے کیمرے کو نیچے کر لیا تھا۔ اب وہ چھت پر اتنا نمایاں نہیں تھا مگر اپنا کام کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد فراری جی ناین کی طرف مڑ گئی۔ میں اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا کیونکہ ایک زمانے میں یہاں موجود بہت بڑے پارک میں جاگنگ کے لیے آتا تھا۔ اسے فاطمہ جناح پارک کہتے ہیں۔ اتفاق سے فراری اس پارک کی طرف جانے والی سڑک پر مڑی تھی۔ پارک کے ساتھ جی ناین کا پوش ترین علاقہ تھا۔ یہاں بڑے بنگلے اور کوٹھیاں تھیں جو زیادہ تر اوپری طبقے یا غیر ملکیوں کے استعمال میں تھیں۔ وسیم فکرمند ہوا۔

"یہاں پولیس مستعد ہوتی ہے اور ذرا سی شک کی بنیاد پر روک لیتی ہے۔"

"جب روکے گی تو دیکھ لیں گے۔" میں نے کہا۔ "اسلحہ چھپایا جا سکتا ہے؟"

"بالکل اور وین کے باہر ایک ایسے ٹی وی چینل کا نام اور لوگو ہے جو شاید ہی کوئی دیکھتا ہو۔" وسیم مسکرایا۔ "اس صورت میں ہم میڈیا والے بن جائیں گے۔"

"یہ اچھی ترکیب ہے۔ اگر اوپر ایک آدھ ڈش بھی لگا لو تو پوری چینل وین بن جائے گی۔"

فراری اس سیدھی سڑک پر جا رہی تھی پھر وہ پارک کے ساتھ والی سڑک سے پہلے جی ناین کی آخری لائن کی طرف مڑ گئی۔ یہ بائیں طرف کی روڈ تھی جو ابن سینا روڈ کہلاتی ہے۔ احسان نے میرے کہنے پر رفتار تیز کی کیونکہ ایسا لگ رہا تھا کہ فراری کسی گلی میں مڑنے والی ہے اور میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس بنگلے یا کوٹھی میں داخل ہوتی ہے۔ یہاں زیادہ بڑے مکان نہیں تھے۔ زیادہ تر نصف کنال کے بنگلے تھے اور کچھ جگہیں خالی پڑی تھیں۔ ہم موڑ تک پہنچے تو فراری گرین بیلٹ کے ساتھ رک رہی تھی اور پھر اس سے فاضلی اتر کر ایک بنگلے کی طرف بڑھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ بنگلے کے آگے کنکریٹ کی تیار رکاوٹ رکھی ہوئی تھی۔ یہ شاید دو تھا یا پانچواں بنگلا تھا۔ احسان نے وین ذرا پیچھے روک دی مگر وسیم نے کہا۔ "نہیں اسے آگے لے جاؤ اور گھوم کر دوسری طرف آؤ۔ بالکل اس بنگلے کی سیدھ میں۔"

احسان نے وین آگے بڑھائی اور بنگلے کے سامنے سے گزرا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا اگلا حصہ مکمل طور پر بند تھا اور کنکریٹ کی رکاوٹ کی وجہ سے کوئی گاڑی آسانی سے گیٹ تک نہیں جا سکتی تھی۔ سیاہ گیٹ بڑا اور مکمل طور پر سیل فولادی چادر سے بنا ہوا تھا۔ وین آگے نکلی تو وسیم نے کہا۔ "اس قسم کی حفاظتی رکاوٹیں غیر ملکی افراد کے لیے کھڑی کی جاتی ہیں۔ عام افراد ایسا کریں تو یہ جرم شمار ہوگا۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "بعض اوقات تو لگتا ہے پاکستانی ہونا ہی کوئی جرم ہے۔"

احسان نے پچھلے کٹ سے گاڑی دوسری سڑک پر کی اور گھما کر بنگلے کے سامنے لے آیا۔ مگر یہاں درمیان میں گرین بیلٹ کے درخت بڑے تھے اور منظر واضح نہیں تھا اس لیے وین کچھ آگے لے گئے جہاں سے چھت پر کی دوربین سے بنگلا دکھائی دے رہا تھا۔ وسیم نے بڑی اسکرین پر اسے زوم کیا اور اس کا اوپری حصہ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ یہ دو منزلہ مکمل کور کوٹھی تھی مگر اس کے بائیں طرف ایک گیلری تھی۔ اسے بھی فولادی گرل سے بند کیا گیا تھا۔ سامنے والا حصہ ٹیرس کے ساتھ تھا وہ اس پر پوری دیوار سیاہ شیشے کی تھی اور اس کے اندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ "اس کے اندر نہیں دکھائی دے سکتا ہے؟"

"کوشش کرتا ہوں اس میں تھرمل امیجر ہے لیکن یہاں روشنی بہت زیادہ ہے اس کے ساتھ ہی ایک سنسر سے کام لینا ہوگا۔"

وسیم نے کیمرے کو تھرمل موڈ پر کیا تو پوری اسکرین برائٹ ہو گئی تھی پھر اس کی برائٹ نس کم کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ اتنا کم کرنے میں کامیاب رہا کہ شیشے کے پرے دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ لاؤنج ہی تھا جہاں تین افراد تھے دو صوفوں پر بیٹھے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کون تھے کیونکہ

وہ صرف رنگین ہیولوں کی صورت میں تھے۔ وسیم نے کہا۔ ''مانیٹر ہوتا تو سافٹ ویئر کی مدد سے انہیں واضح کر لیتا مجھے اس سافٹ ویئر کا استعمال نہیں آتا ہے۔''

اب کیمرا بتا رہا تھا کہ بنگلے میں کم سے کم چھ افراد تھے ان میں تین اوپر تھے اور تین نیچے تھے۔ نیچے والے سامنے کے حصے میں تھے اور وہ مستعد گارڈز کی طرح ٹہل رہے تھے۔ وسیم نے اشارہ کیا۔ ''اصل آدمی اوپر ہی ہے۔''

''یہ نمایاں ہو سکتے ہیں میرا مطلب ہے زوم ہو سکتے ہیں؟''

''میں کرتا ہوں۔'' وسیم نے کی بورڈ کے چند بٹن دبائے اور اوپری منزل کا منظر زوم ہونے لگا مگر اس سے امیج کی کوالٹی خراب ہو رہی تھی بڑی کوشش کے بعد وہ اسے اتنا زوم کر سکا کہ ان تینوں افراد کی جسامت نمایاں ہونے لگی۔ ان میں سے ایک کی داڑھی تھی۔ یہ کسی قدر بڑی فرنچ کٹ تھی۔ باقی دو افراد کلین شیو تھے۔ ایک کے سر کے بالوں سے مجھے شبہ ہوا کہ وہ فاضلی تھا اور اس نے سوٹ پہن رکھا تھا فاضلی نے بھی آج سوٹ پہنا ہوا تھا۔ تینوں گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک اور اسکرین پر سادہ منظر آ رہا تھا۔ اس سے چھت کا منظر دکھائی دے رہا تھا جس پر ڈش اور سیٹلائیٹ کمیونیکیشن کے آلات دکھائی دے رہے تھے۔ وسیم نے تصدیق کی۔

''یہ سیٹلائیٹ پر مخصوص چینلز کے لیے استعمال ہونے والے آلات ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے اس کوٹھی میں کوئی اہم بین الاقوامی شخصیت موجود ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر آپ کا اشارہ ویڈیو شا کی طرف ہے تو مجھے یہ جگہ اس کے شایان شان نہیں لگتی ہے۔''

''بات شایان شان کی نہیں ہے۔ سیکیورٹی اور ضرورت کی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کوئی مستقل اڈہ ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ویڈیو شا ہے تو وہ اس جگہ بھی رک سکتا ہے۔''

''اس صورت میں یہ جگہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔'' وسیم نے کہا۔ ''فاضلی سے زیادہ اہمیت۔''

''بالکل اس صورت میں فاضلی ثانوی اہمیت اختیار کر جائے گا۔ مگر فی الحال ہم فاضلی کے پیچھے ہیں۔''

''اب اسے چیک کرنا اور مشکل ہو جائے اس صورت میں یہاں موجود شخص چوکنا ہو جائے گا۔'' وسیم نے ایک نقطہ اور اٹھایا۔

میں سوچ رہا تھا۔ ''دیکھو اگر یہ شخص ویڈیو شا ہے تو ہم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے کیونکہ اس صورت میں ایک طاقتور ملک ہمارا دشمن ہو جائے گا۔ بین الاقوامی دباؤ سہنے کی ہم سکت نہیں رکھتے ہیں اس لیے فاضلی کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں تو ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ قطع نظر اس کے یہاں کون ہے۔''

وسیم مسکرایا۔ ''لگتا ہے آپ نے کچھ سوچ لیا ہے؟''

''میں سوچ رہا ہوں موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس بے ہوش کرنے والی کوئی چیز ہے؟''

''بالکل ہے۔'' وسیم نے کہا اور ایک خانہ کھول کر اس سے ڈارٹ گن نکالی۔ اس میں چھ تیر لوڈ تھے۔ یہ انجکشن کی سوئی جیسے تھے۔ جسم پر لگتے ہی یہ دوا انجکٹ کر دیتے تھے اور دوا اتنی زود اثر تھی کہ دس سیکنڈ سے بھی پہلے آدمی مکمل طور پر بے ہوش ہو جاتا تھا۔ میں پہلے بھی اسے استعمال کر چکا تھا۔ میں نے واکی ٹاکی اور ڈارٹ گن لی اور وین سے اتر گیا۔ دوسرا آدمی رفاقت بیک اپ میں تھا۔ میں سڑک پار کر کے گرین بیلٹ تک آیا اور بے قدموں چلتا ہوا فراری کے پاس پہنچا۔ یہاں ایک چھوٹا جھاڑی نما درخت تھا جو مجھے پوری طرح چھپا رہا تھا۔ فراری یہاں سے کوئی سات آٹھ گز دور تھی اور یہ فاصلہ مناسب تھا۔ میں نے واکی ٹاکی کا بٹن دبایا اور آہستہ سے بولا۔

''کوئی تبدیلی آئی؟''

''نہیں۔'' وسیم نے جواب دیا۔ ''وہ سب اپنی جگہوں پر ہیں.... لیکن نہیں اوپر والے کھڑے ہو گئے ہیں۔ دو کھڑے ہیں اور ایک بیٹھا ہے۔ جو دو کھڑے ہوئے ہیں وہ نیچے آ رہے ہیں۔''

''میرا خیال ہے ان میں فاضلی ہوگا اسے دیکھتے ہی مجھے خبردار کرو۔'' میں نے کہتے ہوئے واکی ٹاکی کا والیم اتنا کم کر دیا تھا کہ صرف مجھ تک آواز محدود رہے۔ ایک منٹ بعد وسیم نے تصدیق کی۔

''فاضلی ہے اور وہ باہر آ رہا ہے۔''

''رفاقت سے کہو مجھے بیک کرے اگر کوٹھی کی طرف سے کوئی آئے تو وہ اسے دیکھے لیکن مار دھاڑ سے گریز کرے۔''

''میں کہتا ہوں۔'' وسیم نے کہا تو میں نے واکی ٹاکی بند کر دیا اور تیار ہو گیا۔ مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا اور فاضلی باہر آیا۔ اس نے سگریٹ سلگائی تھی پھر آرام سے

فراری کی طرف آیا۔ عورت بدستور کار میں تھی اور سکون سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ گرین بیلٹ کی طرف تھی اس لیے ناصلی اس طرف آیا جیسے ہی دروازہ کھولنے کے لیے مڑا میں نے ڈارٹ اس کی پشت میں اتار دی تھی۔ بہت معمولی سی آواز آئی اور اتنی ہی ہلکی سی کراہ ناصلی کے منہ سے نکلی اور اس کا ہاتھ پشت کی طرف گیا مگر ڈارٹ پشت پر ایسی جگہ تھی جہاں اس کا ہاتھ جا نہیں سکتا تھا اور اس کوشش میں اس نے وہ وقت گنوا دیا جس میں وہ کسی سے مدد طلب کر سکتا تھا۔ وہ منہ کے بل کار پر گرا اور پھر آرام سے نیچے لڑھک گیا اسی اثنا میں گھبرائی ہوئی عورت نیچے آئی۔ اس نے کسی قدر تیز آواز میں کہا۔

"کیا ہوا تمہیں؟"

جیسے ہی وہ فراری کے بونٹ تک آئی۔ میں نے اسے بھی نشانہ بنایا۔ ڈارٹ اس کے سینے پر بائیں طرف ذرا اوپر لگا تھا۔ اس نے فوراً ہاتھ مار کر ڈارٹ نکالا اور کچھ دیر اسے دیکھتی رہنے کے بعد لہرا کر گر گئی تھی۔ اسی لمحے بنگلے کا گیٹ کھلا اور دو افراد باہر آئے۔ مگر فوراً میرے دائیں طرف سے سائلنسر لگے ہتھیار سے ان پر فائرنگ ہوئی۔ گولیاں ان کے قدموں کے سامنے لگی تھیں۔ وہ تجربے کار لوگ تھے پلٹ کر واپس بھاگے۔ اتنی دیر میں میں نے ناصلی کو اٹھا کر پشت پر لاد لیا تھا اور تیزی سے واپس آیا۔ وین کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا اور انجن اسٹارٹ تھا۔ میں اندر گھسا تو وسیم نے دروازہ بند کر لیا۔ وین حرکت میں آئی اور رفاقت اس میں دوڑتے ہوئے فرنٹ ڈور سے اندر آیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وین واپس بڑی سڑک پر گھوم چکی تھی۔ پیچھے سے کوئی کارروائی ہوئی تھی تو اس کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ان لوگوں نے کوئی آتشیں ہتھیار استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خاموش بیٹھ گئے تھے۔ بلکہ وہ پیچھے بھی آ سکتے تھے۔ وسیم کے ذہن میں یہ خدشہ تھا اس نے ویو مرر آن کی اور عقب میں دیکھنے لگا۔ ابھی ہم کشمیر ہائی وے سے دور تھے کہ عقب میں تیز روشنیاں نمودار ہوئیں اور ایک گاڑی تیزی سے نزدیک آنے لگی۔ یہ طاقتور لگژری کار تھی۔ وسیم نے زوم کیا اور کار کی اگلی سیٹوں پر دو افراد نظر آنے لگے۔ یہ حلیے سے غیر ملکی اور خاصے تنومند لگ رہے تھے۔ وسیم نے پوچھا۔

"گاڑی ناکارہ کر دوں؟"

"بالکل۔" میں نے جواب دیا۔ "اس نیک کام میں دیر مت کرو۔"

اس نے آٹو میٹک اسنائپر رائفل کا میکنزم استعمال کیا اور چھت پر رائفل لگی۔ وسیم کار کے اگلے ٹائر کا نشانہ لینے لگا۔ اس نے فائر کا بٹن دبایا۔ مگر کار بدستور چلتی رہی۔ اس نے پھر فائر کیا۔ اس بار بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "میرے خدا اس کے تو ٹائر تک بلٹ پروف ہیں۔"

"دوسرے کا نشانہ لو۔"

وسیم نے دوسرے کا نشانہ لیا اور اس بار بھی کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "اسکرین کا نشانہ لو۔"

جب ٹائروں پر اثر نہیں ہوا تھا تو اسکرین پر کیا ہوتا۔ گولیاں اس سے اچٹ کر نکل گئی تھیں۔ میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "اب مجھے بڑی حد تک یقین ہو گیا ہے کہ کوٹھی میں ڈیوڈ شاہی ہے اور یہ اس کے خاص آدمی ہیں۔"

"ان سے پیچھا کیسے چھڑایا جائے؟" وسیم بولا اسی لمحے ہم ایک بڑے ٹرک کے پاس سے گزرے جس پر دودھ لدا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے وسیم سے کہا۔

"جب کار اس ٹرک کے پاس پہنچے تو اس کا ٹائر اڑا دینا۔"

وسیم میری بات سمجھ گیا ہم میں ایسی ذہنی ہم آہنگی تھی کہ ہم بہت کم الفاظ میں ایک دوسرے کی بات سمجھ جاتے تھے۔ ٹرک نارمل رفتار سے چل رہا تھا اور کار بہت تیزی سے آ رہی تھی جب وہ ٹرک کے پاس پہنچی تو وسیم نے ٹرک کے سامنے والے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کے ٹائر پر فائر کیا۔ ایک دھماکے سے ٹائر اڑا تھا اور وزنی ڈبوں سے لدا ٹرک بے قابو ہو کر دائیں طرف گھوما۔ اس وقت تک کار اس کے پاس آ چکی تھی اور اس کے ڈرائیور کے پاس بچنے کا موقع نہیں تھا۔ ٹرک نے کار کو ٹکر ماری اور کار گھوم کر گرین بیلٹ پر چڑھ گئی۔ اس کے بعد وہ کسی انداز میں ہوا میں بلند ہوئی اور قلابازی کھا کر چھت کے بل سڑک پر گری۔ اس کے شیشے بلٹ پروف تھے حادثہ پروف نہیں۔ کار کا پورا وزن آیا تو شیشے ٹوٹنے لگے۔ پھر کار اچھل کر سیدھی ہوئی اور مسلسل قلابازیاں کھانے لگی۔ ٹرک اتنی رفتار سے نہیں جا رہا تھا پھر کار ٹکرانے کے بعد اس کی رفتار مزید کم ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے بریک لگائے تو وہ کچھ دور گھسٹنے کے بعد رک گیا تھا۔ کوئی درجن قلابازیاں کھانے کے بعد کار بھی رک گئی اور اس کے فوراً بعد ہماری وین کشمیر روڈ پر مڑ گئی تھی۔ سب نے سکون کا سانس لیا۔

"جان چھوٹی۔" وسیم نے گن اور کیمرے کو اندر کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بروقت سوجھی۔"

''اندھیرا تھا، اس لیے دور کی سوجھی۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب وین مشکوک ہو گئی ہے پہلی فرصت میں اس کا حلیہ تبدیل کرا لو۔''

''ایاز کے پاس پہنچتے ہیں۔'' وسیم نے کہا۔ ''ورکشاپ پاس ہے۔''

وسیم نے اس سے رابطہ کیا تو وہ گھر پر تھا مگر موقع کا سن کر فوری آنے کا کہہ کر کال بند کر دی۔ دس منٹ بعد ہم ورکشاپ کے سامنے تھے۔ یہ پوش علاقے کا کمرشل ایریا ہے اور یہاں تمام دکانیں مختلف قسم کی ورکشاپوں پر مشتمل ہیں۔ رات سات آٹھ بجے ہی یہاں سناٹا ہو جاتا ہے اس وقت تو ہو کا عالم تھا۔ میں نے فاضلی کا جائزہ لیا۔ وہ بے ہوش تھا۔

''اسے کب تک ہوش آئے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''کم سے کم چھ گھنٹے بعد۔'' وسیم نے کہا اور پوچھا۔ ''اسے حویلی منتقل کر رہے ہیں؟''

''نہیں اسے ساتھ رکھیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''معاملے کو زیادہ پھیلانا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے صبح ہی اس کا فیصلہ ہو جائے اس صورت میں اسے شہر میں کہیں ڈالنا ہوگا۔''

''اگر اس کے پیچھے زیوڈ شا ہے تو وہ جلد یا بدیر آپ سے رابطہ کرنا چاہے گا۔''

''میں نے سم بند کر دی ہے اور دوسری سم لگا لی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ زیوڈ شا کیسے رابطہ کرتا ہے۔''

''اس کے پاس دوسروں کے نمبر تو ہیں۔'' وسیم نے کہا۔ ''رابطہ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔''

''اس کا مطلب ہے ہم اس سے پہلے جو کر لیں وہ بہتر رہے گا۔'' میں نے فاضلی کی طرف دیکھا۔

''اکرم چشتی والا ٹریٹمنٹ کیسا رہے گا؟'' وسیم نے پوچھا۔

''تم نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ کمینہ دشمن نمونہ عبرت بنا کر رہ جاتا ہے۔''

ایاز مزید دس منٹ بعد پہنچا تھا۔ وقت نہیں تھا اس لیے ہم نے عجلت میں ساز و سامان اس کی جیپ میں منتقل کیا۔ اس میں سب سے اہم فاضلی تھا اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ جب ہم جا رہے تھے تو وہ وین ورکشاپ کے اندر لے جا رہا تھا۔ خیال تو بعد میں آیا کہ وہ واپس کیسے جائے گا۔ میں نے کہا تو وسیم نے جواب دیا۔ ''فکر نہ کریں اس کے پاس کچھ نہ کچھ ہوگا۔''

ہم واپس فارم پہنچے تو دو بج رہے تھے اور ہم بہت بڑی کامیابی حاصل کر کے آئے تھے۔ فاضلی کو عقب میں موجود ملازمین کے لیے مخصوص ایک کمرے میں ڈالا گیا۔ اس کا دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا اور کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں تھیں اس کے باوجود ایک آدمی کو وہاں لگا دیا۔ سفیر سو گیا تھا اور خراٹے لے رہا تھا۔ میں جوتے اتار کر لیٹ گیا۔ مشکل سے دو گھنٹے پہلے ہم صرف نگرانی کا سوچ کر نکلے تھے۔ اس وقت میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہمارے ہاتھ فاضلی اتنی آسانی سے آ جائے گا اسے اٹھانے کا صرف یہ سوچ کر منع کیا تھا کہ وہ شدید مزاحمت کرے گا اور میں اپنے مزید کسی ساتھی کا نقصان نہیں چاہتا تھا۔ جیو کی موت نے مجھے اس حوالے سے حساس کر دیا تھا۔ لیکن فاضلی کے ہاتھ آنے سے مجھے لگ رہا تھا جیسے قدرت کی طرف سے میری مشکلات کے خاتمے کا وقت آ گیا تھا۔ میرے دشمنوں کا برا وقت شروع ہو گیا تھا۔

کچھ عرصے پہلے اکرم چشتی جیسے موذی سے نجات ملی تھی۔ وہ زندہ تھا مگر سانپ سے کیچوا بن گیا تھا۔ پھر کنور خاندان کا خاتمہ ہوا۔ ان کے ساتھ راسن اور غشی ولی جی جیسے ذیلی دشمن مارے گئے۔ اب فاضلی ہاتھ آیا تھا۔ زندگی و موت اللہ کے ہاتھ میں تھی لیکن عزم یہی تھا کہ اس موذی کو صحیح سلامت نہیں چھوڑنا ہے کہ یہ سلسلہ دشمنی کو آگے بڑھا سکے۔ مگر اس سے پہلے اس سے معلومات حاصل کرنی تھیں۔ ایک بار پہلے بھی وہ ہاتھ آیا تھا اور ہم نے اسے ہیروئن کا عادی بنا کر اس کی زبان کھلوائی تھی۔ نشے کی طلب میں وہ ہماری ہر بات ماننے کو تیار ہو گیا۔ ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔ اب بھی اس پر یہی حربہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اچانک مجھے خیال آیا کہ اس حادثے کی خبر شاید ٹی وی پر آ گئی ہو۔ میں اٹھ کر لاؤنج میں آیا ٹی وی لگا کر مختلف چینل دیکھنے لگا مگر کہیں خبر نہیں تھی۔ میں وہیں صوفے پر نیم دراز ہو گیا اور وقفے وقفے سے چینل گھما رہا۔ پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔ رات کسی وقت ساوی باہر آئی تو اس نے ریموٹ لے کر ٹی وی آف کیا اور میرے پاؤں اوپر کیے تھے۔ صبح اٹھا تو صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ کچن سے سفیر اور وسیم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وسیم سفیر کو رات کے مشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ عبداللہ کو ہم رات کو ہی بتا چکے تھے۔ وہ جاگ رہا تھا اور اس وقت فاضلی کی نگرانی وہی کر رہا تھا۔

میں باتھ روم سے فریش ہو کر آیا تو ساوی ناشتا لگا رہی تھی۔ انڈوں کے خاگینے کے ساتھ پراٹھے تھے۔ وسیم

اور سفیر میں کھانے کا مقابلہ جاری تھا۔ میں نے ناشتے کے دوران شامل ہوتے ہوئے عبداللہ اور مانی کے بارے میں پوچھا۔ وسیم نے کہا۔ "عبداللہ اور دوسرے صبح ہی ناشتا کر کے چلے گئے۔ مانی سو رہا ہے۔"

"شکر ہے ورنہ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا ہے کھانے میں۔" سفیر نے کہا۔

"سوائے جیتو۔" میں نے کہا۔

جیتو کا ذکر آیا تو سب کے سب سنجیدہ ہوگئے۔ میں نے کہا۔ "یاروں وہ صرف ہمارے آنسوؤں کا حقدار تو نہیں ہے اسے ہماری مسکراہٹیں اور ہنسی بھی تو چاہیے ہوگی۔"

ساوی مسکرائی اور آنکھیں صاف کیں۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جیتو سے ہمارا تعلق عام نہیں ہے۔"

اس کے بعد ہم نارمل ہوگئے۔ میں نے پوچھا۔ "رات کے واقعے کی میڈیا پر کوئی خبر آئی ہے؟"

"بالکل لیکن سرسری سی۔ اس کے مطابق سڑک کے ایک حادثے میں ایک سفارت خانے سے تعلق رکھنے والے دو افراد زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں اسپتال سے متعلقہ سفارت خانے والے لے گئے ہیں۔"

"اتنی فائرنگ ہوئی اور ٹرک جس کا ٹائر گولی سے برسٹ ہوا تھا اس کا کوئی ذکر نہیں ہے؟"

میرے سوال پر سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ "بالکل بھی نہیں۔"

"خیر ایسا تو ہوتا ہے غیر ملکیوں کے بارے میں میڈیا کی زبان پر بھی تالے لگ جاتے ہیں۔ یہ اچھا ہوا کہ کوئی مرا نہیں۔"

مانی سونگھتا ہوا کچن میں آگیا۔ "اف.... مجھے بھوک لگی ہے۔ یہاں پراٹھے اور انڈے چل رہے ہیں۔"

"بیٹا تمہیں بھوک کب نہیں لگی ہوتی ہے۔" سفیر نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے معدے کے علاوہ تمہارے تمام اعضائے رئیسہ اور غیر رئیسہ بھی خوراک ہضم کرنے کا کام کرتے ہیں۔"

"آپ بولتے رہا کریں۔" مانی نے اس کے سامنے رکھا ہوا پراٹھا اٹھالیا۔ "میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

"تمہاری صحت پر تو کھانے اور محبت کا اثر بھی نہیں پڑتا۔" سفیر نے چھیڑا۔ "سنا ہے لڑکی نے انکار کردیا ہے کہ تجھ سے شادی نہیں کرنی ہے۔"

اس بار مانی جھینپ گیا۔ "ایسی بات نہیں ہے وہ مان گئی ہے۔"

"سچ میں۔" ساوی نے پراٹھا پلٹتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں تھی جب تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"ابھی بات ہوئی ہے اس سے۔" مانی نے انکشاف کیا۔ "اب آپ سب نے میری اور شازیہ کی شادی کرانی ہے۔"

"اس کے بعد تم کیا کرو گے؟" سفیر نے پوچھا۔ "میرا مطلب بگرات ہے۔ شادی کے بعد ہونے والے کاموں کے علاوہ۔"

"میرا ارادہ اپنی آئی ٹی فرم کھولنے کا ہے۔" مانی نے کہا۔ "اب اس پر یہاں بھی بہت کام ہو رہا ہے۔ لاہور میں ایک بندہ ہے اس نے کچھ عرصے پہلے فرم کھولی تھی مگر اسے کام کے بندے نہیں ملے۔ کچھ دن پہلے میری اس سے بات ہوئی ہے وہ مجھے پارٹنر بنانے پر راضی ہے۔"

"پارٹنرشپ میں جھنجھٹ بہت ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟"

"اس کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے۔ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ پاپا دے سکتے ہیں مگر وہ دیں گے نہیں، وہ تو مجھے پکڑ کر سول سروس میں جھونک دیں گے۔"

"رہنے دے یار اس ملک اور قوم کا بیڑا غرق تیرے پاپا جیسے بیوروکریٹس نے ہی کیا ہے۔" سفیر نے کہا۔ "تم آگئے تو مزید بیڑا غرق ہوگا۔"

"میں متفق ہوں۔" مانی نے اگلا گرم گرم پراٹھا توڑتے ہوئے کہا۔ "مگر مسئلہ میرے پاپا کا نہیں ہے سول سروس کی تربیت ہی اس طرح کی جاتی ہے۔ آدمی کیسا ہی ہو وہاں سے ایک مخصوص سانچے میں ڈھل کر نکلتا ہے اور پھر ایک مشین کا پرزہ بن جاتا ہے۔"

"مانی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا اور پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ تم اپنا بزنس اسٹیبلش کرنا چاہو تو کتنی رقم درکار ہوگی کہ تم باقاعدہ اپنا بزنس چلا سکو۔"

"کم سے کم بیس سے پچیس لاکھ روپے۔" اس نے انکشاف کیا۔ "دس لاکھ میں جمع کرچکا ہوں۔"

"وہ کیسے تم جاب تو کرتے نہیں ہو؟" سفیر نے اعتراض کیا۔ "سارے دن کھاتے ہو، کمپیوٹر پر گیم کھیلتے ہو یا سوتے ہو۔"

"میں رات بارہ سے صبح چار پانچ بجے تک کام کرتا ہوں۔ اس دوران میں آرام سے چالیس پچاس ڈالرز کما لیتا ہوں۔"

ہم حیران ہوئے تھے میں نے کہا۔ "یعنی فی گھنٹہ دس

ڈالرز؟“

”ہاں بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں انٹرنیٹ کے ذریعے آئی ٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹھیکے لیتا ہوں۔ کام کر کے دیتا ہوں اور مجھے پے پال اکاؤنٹ سے تھرو رقم مل جاتی ہے۔“

”یعنی تم اپنا کام کرو گے تو اس سے زیادہ کماؤ گے۔“

”بہت زیادہ.... اب تو پاکستانی آئی ٹی فرمز بھی تیزی سے آگے آ رہی ہیں۔ حکومت کیا سپورٹ کرے گی اسے تو خود سپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم اپنے ٹیلنٹ کے بل پر آگے جا رہے ہیں۔ میں نے ایک گروپ بھی بنا لیا ہے ہم اسی طرح گھروں پر کام کرتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک چھپا بندہ ہے۔ ایک انیس سال کا لڑکا ہے۔ اس کا باپ شیخوپورہ میں آڑھتی کا کام کرتا ہے۔ میٹرک تک پڑھا پھر باپ نے کام پر لگا لیا وہاں اس نے کمپیوٹر استعمال کیا اور پھر اس لائن میں اتنا ماہر ہو گیا کہ باہر سے پڑھا ہوا سافٹ ویئر انجینئر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔“

”پیسے والا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم فرم کے لیے کام شروع کرو۔“

”رقم ہم دیں گے۔“ سفیر نے کہا۔ ہانی نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں ادھار کا قائل نہیں ہوں۔“

”ہم ادھار نہیں دے رہے ہیں۔ تمہارے ساتھ پارٹنر شپ کر رہے ہیں، آخر تم ایسے شخص سے بھی تو پارٹنر شپ پر راضی ہو گئے جسے چار دن سے زیادہ نہیں جانتے ہو۔“

میری بات پر ہانی سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”آپ کی بات سمجھ میں آ رہی ہے مگر آپ لوگ اس طرح بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں بزنس کہاں سے کریں گے؟“

”بزنس تم کرو گے اور تمہارا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“ سفیر نے کہا۔ ”تم رقم لے کر لاہور جاؤ اور وہاں اپنا سیٹ اپ قائم کرو۔ جس گروپ کی بات کر رہے ہو اسے ہائر کرو اور کام شروع کر دو۔ میرا اندازہ ہے تمہیں بزنس سیٹ کرنے میں چھ مہینے سال سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اللہ نے چاہا تو تب تک ہم بھی اپنے مسئلے نمٹا لیں گے۔“

”اس سے زیادہ کی ضرورت پڑے تو وہ بھی دے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بنیادی طور پر ہم کاروباری لوگ ہیں، یہ تو بلاوجہ کے دشمن پیچھے پڑ گئے۔“

ایسا پرفیوم جو پسینے کو خوشبو میں بدل دے

موسم گرما میں پسینا ایک وبال جان بن جاتا ہے اور انسان کو ہر وقت فکر لاحق رہتی ہے کہ کہیں اس کے پسینے سے بو تو نہیں آ رہی ہو، مارکیٹ میں ایسے بے شمار پرفیومز اور باڈی اسپرے دستیاب ہیں جن کے متعلق بہترین خوشبو کا دعویٰ تو کیا جاتا ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ تر پرفیومز دیر تک کام نہیں کرتے، ہالینڈ میں پسینے کی بو کو ختم کرنے کا ایک منفرد حل نکالا گیا ہے جہاں ایسا پرفیوم متعارف کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو انسانی پسینے کو خوشبو میں بدل دے گا، اس پرفیوم کو بنانے والوں کا کہنا ہے کہ اس انوکھی ایجاد کے بعد انسان کی بہت سے پراڈکٹس سے جان چھوٹ جائے گی اور پسینے کی وجہ سے جو ذہنی کوفت ہوتی ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

مرسلہ: زرتیب توحید، سیالکوٹ

”تب ٹھیک ہے۔“ ہانی خوش ہو گیا۔ ”میں آج سے ہی تیاری شروع کرتا ہوں۔“

”بالکل اگر تم لاہور جانا چاہو تو جلد از جلد روانہ ہو جاؤ۔“

”آپ کے کام کا کیا ہوگا؟“

”لاہور زیادہ دور نہیں ہے اور تمہارا کام تو ایک آدھ دن کا ہوتا ہے باقی ہم سب دیکھ لیتے ہیں ضرورت پڑی تو تمہیں بلا لیا کریں گے۔“

”یہ بھی بزنس کا حصہ ہوگا۔“ سفیر نے لقمہ لگایا۔ ”تمہیں ادائیگی کریں گے۔“

”آپ نا ہمیشہ دل دکھانے والی بات کیا کریں۔“ ہانی نے خفگی سے کہا۔ ”آپ لوگوں سے کیا بزنس کا تعلق ہے، کوئی اور ہوتا تو میں بہت پہلے خدا حافظ کہہ چکا ہوتا، یوں آپ لوگوں کے ساتھ دھکے کھا رہا ہوتا اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پھر رہا ہوتا۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ میں نے سفیر کو ٹوکا۔ ”یہ کوئی ملازم نہیں ہے جسے ہم معاوضہ دیں۔ یہ ہمارا ساتھی ہے۔“

”میں ہر وقت حاضر ہوں، جب آپ بلائیں گے میں سب چھوڑ کر آ جاؤں گا۔“

”بس تو تم جانے کی تیاری کرو۔“ میں نے کہا اور

کھڑا ہو گیا۔ ''آؤ ذرا فاضلی سے ملاقات ہو جائے۔''

میں، منیر اور وسیم پہنچے تو عبداللہ کوٹھری کے باہر کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ وسیم نے پوچھا۔ ''پنچھی کیسا ہے؟''

''کچھ دیر پہلے تک پھڑپھڑا رہا تھا۔ اب سکون سے ہے۔'' عبداللہ مسکرایا اور تالا کھول دیا۔ اس نے صرف کنڈی لگانے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ اندر فاضلی ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کے سر اور ناک سے خون نکلا ہوا تھا۔ جسے اس نے اپنے کوٹ کی آستین سے صاف کر کے اس کا صفایا اس کر لیا تھا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا اور غرا کر بولا۔ ''شہباز یہ تم نے اچھا نہیں کیا...... فضلی کو جو باب میں نے بند کر دیا تھا وہ تم نے پھر سے کھول دیے۔''

''تمہیں میں اسے ہمیشہ کے لیے بند کر رہا ہوں۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے بہت عرصے اس کی پالیسی پر عمل کر کے دیکھ لیا لیکن میرے دشمن اس کے قائل نہیں ہیں اس لیے اب میں نے پالیسی بدل دی ہے۔ تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ میں سرحد پار کیا کر کے آیا ہوں۔ میں نے وہاں اپنے تمام دشمنوں کا نام و نشان مٹا دیا ہے۔''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم کیا کر کے آئے ہو اور واپس آ گئے ہو کیونکہ اب میں نے تمہارے راستے میں نہ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔''

''فاضلی تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ کیا تم اس کوٹھی میں جس شخص سے ملنے گئے تھے اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟''

وہ چونکا۔ ''تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟''

''میں بہت کچھ جانتا ہوں جب میں تمہیں اٹھا کر لے جا رہا تھا تو ایک گاڑی نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔''

''افسوس کہ گاڑی تباہ ہوئی اور پیچھا کرنے والے اسپتال پہنچ گئے جہاں سے ان کے لواحقین انہیں لے گئے۔'' وسیم نے کہا تو میں نے سفارت خانے کا نام لیا۔

''اب کیا کہتے ہو؟''

''میں کسی غیر ملکی سے ملنے نہیں گیا تھا۔'' فاضلی نے ڈھٹائی سے کہا۔

''میں نے کب کسی غیر ملکی کا کہا ہے۔'' میں ہنسا۔ ''خیر تم فکر مت کرو ابھی تم ہمارے پاس ہو اور جلد وہ وقت آئے گا جب تم سچ بولنے کے لیے بے تاب ہو جاؤ گے اور ہمیں سننے کی جلدی نہیں ہوگی۔''

''شہباز اب بھی وقت ہے مجھے جانے دو۔'' اس نے کہا۔ ''میں سب بھول جاؤں گا یقین کرو میں اس وقت تمہارے لیے ہی کام کر رہا ہوں۔''

''اگر تمہارا اشارہ مرشد سے تمہاری دشمنی کی طرف ہے تو تم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ میں وہ شخص نہیں ہوں جو دوسروں کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائے۔ میں مرشد سے نمٹ آیا ہوں اور آگے بھی اس سے نمٹ لوں گا۔''

اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ ''تو تم نہیں مانو گے؟''

''میری نہیں اپنے ماننے یا نہ ماننے کی فکر کرو کیونکہ جسمانی طور پر اس کا تم پر بہت برا اثر پڑنے والا ہے۔''

''شہباز تم حوصلہ مند دشمن ہو لیکن میں بھی بزدل نہیں ہوں۔ اگر تم پہلے والا حربہ استعمال نہ کرو تو تم مجھ سے کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔''

''اگر یہ چیلنج ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔ دیکھتے ہیں کون کامیاب رہتا ہے۔'' میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ کوٹھری میں گرمی شدید تھی کیونکہ وہاں اسے ہی تو کیا پنکھا تک نہیں تھا۔ درحقیقت یہ کمرا بالکل خالی تھا اور کچے فرش پر سوائے خاک کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''ابھی اس کو کھانا پانی بند رکھو۔ دیکھتے ہیں کہ کب تک برداشت کرتا ہے۔''

ہم اندر آ گئے۔ ابھی صبح کا آغاز تھا اور نو بجے ہی گرمی شدت اختیار کر گئی تھی۔ جب میں معمول کی زندگی گزار رہا تھا تو میرا گرمیوں کا اکثر وقت شمالی علاقے میں گزرتا تھا۔ اس وقت یہ جگہیں جنت بنی ہوتی ہیں۔ بلکہ بلند جگہوں پر تو جون جولائی اور اگست میں بھی کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہوتی ہے۔ گلیشیرز پر درجہ حرارت منفی میں ہوتا ہے اور ہائی کرز سردی سے بچاؤ کے سامان اور لباس کے بغیر وہاں نہیں جا سکتے تھے۔ ایک بار میں کنکورڈیا گیا تھا جو کے ٹو کا اور کئی دوسری بلند چوٹیوں کا بیس کیمپ ہے۔ وہاں اس جون کے دن درجہ حرارت منفی سات تھا اور برف باری ہو رہی تھی۔ اسے دنیا کا بلند ترین بیس کیمپ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

اندر سادی ناشتے کے بعد اب دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ وہ گوشت پلاؤ کے ساتھ شامی کباب بنا رہی تھی۔ سامان منیر نے صبح سویرے ایک راشن ڈپو سے منگوا لیا تھا۔ کباب کے ساتھ روغنی نان ہوتے۔ میں نے کہا۔ ''یار اسے آتے ہی کس چکر میں ڈال دیا ہے۔''

''خود اسے شوق ہو رہا ہے۔'' وسیم نے بتایا

اچکائے۔

''میں چاہتا ہوں اسے ایک دو دن میں حویلی بھیج دوں اس حالت میں جب کہ ہمیں کسی وقت بھی یہاں سے بھاگنا پڑ سکتا ہے ساوی کو ہم ساتھ نہیں رکھ سکتے۔''

''میں سمجھتا ہوں اور کل سے اسے سمجھا بھی رہا ہوں۔'' وسیم نے دبی زبان میں کہا۔ ''مگر یہ ٹن کر رونے دھونے لگتی ہے۔ پھر میری ہمت جواب دے جاتی ہے۔''

''یار وہ بہت دنوں بعد تم سے ملی ہے لیکن تم جانتے ہو یہاں خطرہ ہے اور پھر سوال تمہارے ہونے والے بچے کا ہے اسے پُرامن ماحول چاہیے اس دنیا میں آنے کے لیے۔''

''ٹھیک ہے آج میں فیصلہ کن بات کرتا ہوں۔'' وسیم نے کسی قدر بہادر بن کر کہا۔ ''اسے ماننا پڑے گی جذباتی پن سے کام نہیں چلے گا۔''

''شاباش۔'' میں نے ہمت بندھائی۔ ''ہمت کر یار۔''

''کس بات کی ہمت۔'' ساوی نے اچانک ہی لاؤنج میں انٹری دی۔

''بی بی تمہارے کان بہت تیز ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اپنے مطلب کی باتیں سن لیتی ہوں یقیناً میرے بارے میں ارشاد ہو رہا تھا... جبھی انہیں ہمت دلائی جا رہی ہے۔'' اس نے ترچھی نظروں سے وسیم کو دیکھا تو اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

''شہباز صاحب مجھے فاضلی کے معاملے میں ہمت کرنے کو کہہ رہے ہیں۔''

''اس میں ہمت کہاں سے آگئی؟'' ساوی نے طنز کیا اور واپس چلی گئی۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا تو وسیم کھسیا گیا۔ سفیر یہاں نہیں تھا وہ عبداللہ کے پاس رک گیا تھا ورنہ وسیم کی مزید شامت آتی۔ دوپہر کے کھانے میں سب موجود تھے۔ ساوی نے خاصی مقدار میں بنایا تھا اور میز پر چُن بھا کر اعلان کر دیا تھا کہ یہ رات تک کا ہے اس لیے چاہیں تو ابھی کھا لیں ورنہ رات کا بچا کر کھائیں۔ مگر پلاؤ اور کباب اتنے مزے کے تھے کہ سب نے رات کا خیال دل کیا معدے سے بھی نکال دیا تھا۔ میں اور وسیم جلد ہار مان گئے۔ مگر سفیر، عبداللہ اور ہانی میں کھانے کا مقابلہ ہوا جو بالآخر ہانی نے جیتا اور فاتحانہ انداز میں ہم سب کو دیکھتا ہوا رخصت ہوا تھا۔ اب چائے کافی کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ میں رات کو ٹھیک سے نہیں سو پایا تھا پھر کھانے کو خمار الگ تھا۔ اس لیے کمرے میں جا کر جو بیڈ پر لیٹا تو پھر ہوش نہیں رہا تھا۔ شام کو سفیر نے منہ پر ٹھنڈا پانی ڈالا اور میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ پھر بھنا کر کہا۔

''یہ کیا حرکت تھی؟''

''سوتا مسیح مجھے اسی طرح اٹھاتی ہے۔'' اس نے سکون سے کہا۔ ''طریقہ واہیات ہے لیکن آنکھیں فوراً کھل جاتی ہیں جو دوسری صورت میں اٹھنے کے آدھے گھنٹے بعد کھلتی ہیں۔''

''تو اسی لائق ہے کہ سوتا جیسی کسی بیوی کا شوہر ہو اور ساری کیسے ہے سر پر بیلن مار کر؟'' میں نے اٹھ کر واش روم جاتے ہوئے کہا۔ نہا دھو کر باہر آیا تو لان میں ٹی پارٹی چل رہی تھی۔ ایاز بھی آیا تھا۔ وہ فاضلی کے دیدار کا شائق تھا۔ پچھلی بار اس سے زیادہ ملاقات نہیں رہی تھی۔ عبداللہ اسے فاضلی سے ملوا لایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''شہباز صاحب... یہ اللہ کی مہربانی ہے جو اس جیسا اتھرا جانور آسانی سے ہاتھ آگیا۔ اب جلد فرصت میں اس کا جھٹکا کر دیں۔ حلال تو یہ کسی صورت نہیں ہوگا۔''

''کرنا جھٹکا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے اس کی زبان کھلوانی ہے۔''

عبداللہ نے اسے آگاہ کیا۔ ''اس نے شہباز صاحب کو چیلنج دیا ہے کہ فاؤل پلے کے بغیر اس کی زبان کھلوا کر دکھائیں۔''

''فاؤل پلے؟'' ایاز نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''پچھلی بار اسے ہیروئن کا عادی بنا دیا تھا اور مجبوراً اسے زبان کھولنا پڑی تھی۔''

''اس وقت بھی اس نے ساری بات نہیں بتائی تھی اور اس کی قوت ارادی یقیناً مضبوط ہے جبھی اس نے ہیروئن جیسے موذی نشے سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔''

''ہم اس کی زبان کھلوا کر کیا کریں گے۔'' ایاز نے کہا۔ ''ہمیں تقریباً سب تو معلوم ہے۔''

''کل رات یہ کس سے ملنے گیا تھا یہ معلوم کرنا ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے شبہ ہے اس مکان میں ڈیوڈ شاہ موجود تھا اور جب ہم فاضلی کو لے کر آرہے تھے تو اس کے گرگے ہمارے پیچھے آئے تھے اور وہ ایسی بلٹ پروف کاریں تھے جس کے ٹائروں تک پر گولی کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔''

''پھر شہباز صاحب نے حل نکالا اور ہم پیچھا چھڑانے میں کامیاب رہے۔'' وسیم نے بتایا۔ باقی سب کو علم تھا مگر ایاز کو پتا نہیں تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

''کمال کر دیا... کیا خیال آیا بروقت۔''

''ہاں بھائی بس ابھی کا دماغ کام کا رہ گیا ہے۔'' سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہمارے دماغ تو فارغ ہو چکے ہیں۔''

''ان کا تو خوب چلتا ہے۔'' سادی نے وسیم کی طرف دیکھا۔

''ہاں لیکن تمہارے کہنے پر۔'' وسیم بولا۔ ''اگر میں اپنی چلاؤں گا تو تم سنو گی نہیں۔''

''اگر آپ یہاں سے جانے کا کہیں گے تو بالکل نہیں سنوں گی۔''

''پلیز سادی۔'' وسیم کا لہجہ تیز ہو گیا اور سادی کی آنکھوں میں نمی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھایا۔

''بھئی یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ تم اکیلے میں نمٹاؤ گے سب کے سامنے نہیں۔''

''آپ اسے اور سر دے رہے ہیں۔'' وسیم نے بھنا کر کہا تو سادی کھڑی ہوئی اور پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

''بھائی تمہیں بھی سب کے سامنے ہی یہ بات کرنی تھی۔'' میں نے ملامت سے کہا۔

''سب کیا یہاں کوئی غیر ہے۔''

''پھر بھی میاں بیوی کی آپس کی بات آپس میں رہنی چاہیے۔''

''اس طرح تو وہ کبھی نہیں مانے گی۔''

''کیوں نہیں مانے گی یار شوہر اپنی بیوی سے بات نہ منوا سکے تو اسے شوہر کہنا ہی نہیں چاہیے۔''

''یعنی یہاں سوائے تیرے کوئی شوہر نہیں ہے۔'' سفیر نے دانت نکالے۔ ''کیونکہ وہ تیری نہ ہوی تیرے اشارہ ابرو پر چلتی ہے۔''

''شادی کے بعد یہ چلیں گے۔'' وسیم نے ٹانگ اڑائی۔

''شادی تو میری بھی نہیں ہوئی ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''ہاں مگر تو جس کے چکر میں ہے وہ تو یہ بات بھی مان کر نہیں دے رہی ہے۔'' سفیر نے کہا تو عبداللہ کھسیا گیا۔

''ایسی بات بھی نہیں ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

آج دن میں شدید گرمی رہی تھی اور اس وقت بھی خاصی گرمی تھی مگر گھاس کو پانی دیا گیا تھا اس لیے اس سے سکون آمیز نمی اٹھ رہی تھی۔ سورج غروب ہونے تک بادل گھر کر آئے تھے اور پھر اچانک ہی بہت تیز بارش ہونے لگی تھی۔ لیکن ہم اندر نہیں گئے۔ باہر ہی بارش سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ کچھ دیر بعد اندر سے سادی کی کال آ گئی۔ وہ پکوڑے بنا رہی تھی۔ ہم پورچ والے حصے میں آ گئے۔ اس نے برآمدے میں میز پر تھال سجا دیا تھا اور اندر سے بنوا کر بھجوا رہی تھی صرف پکوڑے ہی نہیں ساتھ میں چٹنی اور آلو فرائی بھی تھے۔ گرج چمک کے ساتھ برستی بارش میں پکوڑے کھانے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ سفیر نے مجھ سے کہا۔ ''اب بول جتنا اسے واپس بھجوا دے گا تو یہ مزے کہاں سے ہوں گے۔''

''یار یہ مزے بھی ہوں اللہ وہ وقت بھی لائے گا جب سب کی فیملیاں ہوں گی اور ہم ایسے موسم کو ایک ساتھ انجوائے کیا کریں گے۔'' میں نے کہا۔ سادی اندر سے بھجوا رہی تھی اور ہم کھا رہے تھے کچھ دیر بعد دیکھا تو وسیم غائب تھا۔ میں نے پوچھا۔

''یہ کہاں گیا؟''

''چھت پر جناب۔'' ایاز بولا۔ ''بیگم کے ساتھ بھی تو ساون منانا ہوتا ہے۔''

عبداللہ بھی غائب تھا اور کچھ دیر بعد وہ بالٹی میں آم بھر کر لے آیا تھا۔ انہیں مزید ٹھنڈا کرنے کے لیے بالٹی میں برف بھی ڈالی ہوئی تھی۔ ہم وہیں پورچ میں کرسیاں ڈال کر آموں کا مزہ اٹھاتے رہے۔ آم ایاز لایا تھا۔ عبداللہ وسیم اور سادی کے لیے اوپر دے آیا۔ دو گھنٹے تک ہم نے بارش کو انجوائے کیا تھا مگر پھر تھک گئے۔ اندر آئے تو سادی اوپر سے آ چکی تھی اس نے کپڑے بدل لیے تھے اور بہت خوش لگ رہی تھی۔ وسیم نے اسے منا لیا تھا۔ ہم نے چائے کافی کا مطالبہ کیا لیکن پہلے اس نے سب کو زبردستی یخنی پلائی۔ جب تک ہم کپڑے بدل کر آئے اس نے چائے اور کافی دونوں بنا لیے تھے۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ شہزادی تھی۔ اس نے کبھی ہل کر پانی بھی نہیں پیا تھا۔ مگر یہاں کیسے صبح سے ہماری خدمت میں لگی تھی۔ اتنا کام اور ایسے سب نمٹانا ایک عورت کے بس کی بات ہے اور سادی عورت بھی تھی۔ دس مرد ایک جگہ ہوں تو وہ جگہ کبھی اتنی رونق والی نہیں ہو سکتی جتنی ایک عورت سے ہو جاتی ہے۔ صرف میرے ہی نہیں سب کے یہ احساسات تھے۔ سفیر تو اتنا جذباتی ہوا کہ ہاتھ پکڑ کر سادی سے اپنی ساری بکواس اور خطاؤں کی معافی چاہی تھی۔

''سفیر بھائی ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ میرے بھائی ہیں میرے دیور ہیں۔ میں آپ کی بہن اور بھابی

ہوں۔ رشتے میں ماننہ کی عمر میں چھوٹی ہوں۔"

"تم بھی کن کی باتوں میں آرہی ہو۔" وسیم ہنسا۔ "کل تک یہ پھر بکواس اور خفا ہیں کر رہا ہوگا۔"

مجھے اس وقت مزید حیرت ہوئی جب سادی نے ایاز کو جاتے ہوئے ایک ٹفن دیا جس میں اس نے پلاؤ اور کباب ڈالا تھا۔ اس نے پہلے ہی اس کے لیے نکال دیا تھا۔

"ایاز بھائی یہ شاہین اور ماں جی کے لیے ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ آئے گا؟"

"ایاز بھائی کی جیپ جو یہاں تھی۔" سادی نے جیپ کی طرف اشارہ کیا تو ایاز جھینپ گیا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو فاصلی کا سن کر آنے کے لیے بے قرار تھا۔"

"میں چھیڑ رہی ہوں ایاز بھائی... اب کے آئیے گا تو شاہین کو بھی لے کر آئیے گا۔"

"لو جی شروع ہوگئی میل ملاقات کی فرمائشیں۔" سفیر بولا۔ "جلد یہاں فاصلی کے والد نامی گرامی اور اس کے بھی والد گرامی ڈیوز شا کی آمد بھی ہوگی۔"

سادی ہنسی۔ "انہوں نے تو کل تک کا انتظار بھی نہیں کیا ابھی سے شروع ہوگئے۔"

سفیر نے ڈھٹائی سے کہا۔ "آج بات کہنے کے لیے کون کل تک کا انتظار کرتا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ سادی کا مسئلہ مجھے ہی حل کرنا پڑے گا اس سے پہلے موٹا اور اسے حویلی بھیجنے کا ہو رہا تھا تو وسیم اور سفیر کچھ نہیں کر سکے تھے، مجھے ہی زور دے کر یہ کام کروانا پڑا تھا۔ اس بار بھی شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔ اب یہ اتفاق تھا کہ اس وقت موٹا اُمید سے تھی مگر اس کی یہ امید بھی کا پنر کریش میں ختم ہوگئی تھی اور اب سادی امید سے تھی۔ میری اور ہم سب کی خواہش تھی کہ وسیم اور سادی کا بچہ خیر خیریت سے دنیا میں آئے۔ لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ سادی حویلی چلی جائے۔ یہاں ہم خطرے میں تھے اور اسے خطرے میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایاز کے جانے کے بعد ہم اندر آئے۔ وہ ٹیکسی سے آیا تھا اور اپنی جیپ پر واپس گیا تھا اس نے شناخت کے مسئلے کی وجہ سے بادل ناخواستہ اسے فروخت کیا تھا مگر اس کی جدائی برداشت نہ کر سکا اس نے دوبارہ اسے حاصل کر لیا تھا مگر کلر اور کچھ دوسری چیزوں سے اس کا حلیہ بالکل بدل دیا تھا۔ ہم اندر آئے تو میں نے سادی سے کہا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

وہ چونک گئی تھی۔ "کیسے؟"

"یہاں نہیں۔" میں نے کہا اور اسے چھت پر لے آیا۔ بارش تھم جانے کے بعد موسم خوشگوار حد تک ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ اچھی خنک ہوا چل رہی تھی۔ سادی جو چند منٹ پہلے تک بہت خوش تھی اس کا چہرہ اتر گیا تھا اور میری ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر کہنا تو تھا۔ "گڑیا تم جانتی ہو ہم فی الحال کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"مجھے وضاحت مت دیں بس اپنا حکم سنائیں۔"

"یہ حکم نہیں درخواست ہے، تم موقع کی نزاکت کو سمجھو اور پلیز حویلی چلی جاؤ۔ مجھے لگ رہا ہے میں اپنی جدوجہد کے آخری حصے میں ہوں۔ فنا و بقا کی اس جنگ میں کون جیتا ہے اور کون مارا جاتا ہے میں کہہ نہیں سکتا۔ میری تو خواہش ہے تم سب ہی چلے جاؤ۔ اس ملک سے دور نکل جاؤ جب تک میں اپنے دشمنوں سے نمٹ نہ لوں۔ جیتو کے بعد اب میں اور کوئی نقصان برداشت نہیں کر سکتا اگر ایسا ہوا اور میرے کسی ساتھی کی زندگی پر بن آئی تو میں سرنڈر کر دوں گا خود کو مرشد یا ڈیوز شا کے حوالے کر دوں گا۔"

"پلیز ایسا نہ کہیں۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "ہم آپ کو نہیں چھوڑ سکتے اور آپ کیوں حکم نہیں دے سکتے آپ ہر طرح کا حق رکھتے ہیں۔ وسیم، سفیر بھائی اور عبداللہ بھائی آپ کا ساتھ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے اس سے زیادہ آسان تو ان کے لیے مرنا ہوگا۔ اگر وسیم نے آپ کو چھوڑا تو اللہ کی قسم میں ان کو چھوڑ دوں گی۔ شوبی آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔"

"تب تم جاؤ گی۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں وسیم کا حکم ماننے سے انکار کر سکتی ہوں آپ کا نہیں۔"

میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بے چارہ مجازی خدا.... پہلے ہی جوتے کی نوک پر رہتا ہے۔"

سادی جھینپ گئی اور آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "جی نہیں ان کی بھی مانتی ہوں۔ مگر یہ بات نہیں مانی جا رہی تھی جو آپ نے ایک منٹ میں منوالی۔"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "خدا کی قسم، خود میں بھی تم لوگوں سے دور نہیں رہ سکتا مگر دل پر پتھر رکھ کر تم لوگوں کی بہتری کے لیے دور بھیجنا پڑتا ہے۔ ہم سب کو سب سے زیادہ خیال آنے والے مہمان کا ہے۔"

سادی شرما گئی۔ اس نے جلدی سے موضوع بدل

بولا۔ "مجھے کب بھیج رہے ہیں؟"

"کل ہی۔" میں نے کہا۔ "وسیم تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

"ٹھیک ہے میں تیاری کر لوں۔" اس نے نیچے جانے کو کہا اور اس کے جانے تک وسیم آ گیا۔

"ہاں جی۔"

"تمہیں بتایا اس نے؟"

"نہیں۔" اس نے دانت نکالے۔ "جس طرح وہ میرے پاس سے منہ بنا کر گئی ہے اس سے مجھے پتا چل گیا۔ آپ کو معلوم ہے بیوی رنجانا جان کی باتوں کے بدلے بے چارے شوہر سے لیتی ہے۔"

"کیونکہ شوہر ہی ان ساری آفتوں کے ذمے دار ہوتے ہیں۔" سنجر بولا وہ بھی اوپر آ گیا تھا اور گولڈن رنگ کے نخ بستہ ٹن لے آیا تھا۔ اس نے ایک ٹن مجھے اور ایک وسیم کو تھمایا۔

"بچیوں کا کیا حال ہے؟"

"مزے میں ہیں، عباسی والا فوز کیا اور باقی عباسی کے لیے اپنے کمرے میں ہیں۔"

میں نے سنجر کو گھورا۔ "وہ میاں بیوی ہیں۔"

"تو نے نکاح نامہ دیکھا ہے کیا؟"

"آدمی کو زبان پر اعتبار کرنا چاہیے جب تک اس کے برعکس ثبوت نہ ہو جائے۔"

"شہباز صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وسیم نے سر ہلایا۔ "ویسے ہم بہت مہذب اور مینرز والے بنتے ہیں مگر ان باتوں میں مینرز بھول جاتے ہیں۔"

"اچھا بابا وہ میاں بیوی ہیں میں نے مان لیا۔" سنجر نے کہا۔ "اب بتاؤ ان کا کرنا کیا ہے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ انہیں ان کی گاڑی دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔"

"وہ آگے کہیں پھنسے تو ہمیں بھی پھنسوا دیں گے۔" سنجر نے خبردار کیا۔ "اس لیے سوچ سمجھ کر چھوڑنا۔"

"ان کا کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" میں نے کہا اور فاضلی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا کیا کرنا ہے۔"

"وہی جو ہم نے طے کیا تھا۔" وسیم چہکا۔ "میں نے تو ابلنے والے سلوشن کی ٹیوب بھی منگوالی ہے۔"

آج سنجر اس کی نگرانی کر رہا تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "اس کا کیا حال ہے سارا دن کھانا پانی بند ہونے سے کچھ فرق پڑا؟"

سنجر کا منہ لٹک گیا۔ "بہت حرامی ہے ابھی بارش میں اس نے کھڑکی سے لگ کر اوپر بہنے والے پانی سے پیاس بجھالی اور کھانا ابھی مسئلہ نہیں ہے۔"

وسیم نے کہا۔ "کم سے کم اڑتالیس گھنٹے بعد وہ بلبلائے گا بھوک سے۔"

"اسے کمزور مت سمجھو۔" میں نے کہا۔ "میں نے ایسے سخت جان لوگ کم دیکھے ہیں۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ وہ مرشد جیسے بزدل شخص کی اولاد ہے۔"

"ہمارے پاس بہت وقت ہے۔" سنجر بے پروائی سے بولا۔ "دیکھتے ہیں کب تک اپنی اکڑ پر قائم رہتا ہے۔"

بارش کے بعد بھی دیر ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہی تھیں مگر اب ہوا رک گئی تھی اس کے باوجود خنکی برقرار تھی اور ہم چھت پر اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہاں سے کچھ دور واقع فتح جنگ روڈ صاف دکھائی دے رہی تھی اور نصف رات کے قریب وہاں سے اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ وسیم کے آدمی گیٹ اور احاطے میں چوکس تھے۔ سنجر جمائیاں لے رہا تھا وہ سب سے پہلے رخصت ہوا پھر وسیم بھی چلا گیا۔ اب میں اکیلا تھا۔ میں کچھ دیر اور ٹہلنا چاہ رہا تھا۔ پکوڑے اور آم زیادہ ہی کھا لینے سے پیٹ میں کچھ گرانی تھی جو ٹہلنے سے کم ہوئی تھی۔ مگر ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی میں چاہتا تھا کہ یہ ختم ہو جائے تو میں بھی سونے کے لیے نیچے جاؤں۔ بارہ بجے تک میں نے بہتر محسوس کیا اور نیچے جانے کا ارادہ کیا تھا کہ سڑک کی طرف سے ایک بڑی گاڑی فارم کی طرف آنے والے راستے پر مڑی۔ یہ شاید پرانے ماڈل کی ڈبل کیبن پک اپ تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹ کے ساتھ اوپر بھی تیز روشنی والی لائٹس لگی تھیں۔ اس کے پیچھے ایک گاڑی اور تھی۔ فارم کی طرف مڑنے کے بعد پک اپ کی رفتار کم ہونے کی بجائے تیز ہوئی تھی اور جب وہ گیٹ سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر رہ گئی تو مجھے خطرے کا احساس ہوا اور میں بھاگ کر مورچے کے اوپر والی چھت تک آیا میں نے چلا کر گیٹ کے گارڈز سے کہا۔

"ہوشیار دو گاڑیاں اس طرف آ رہی ہیں۔"

گارڈز پہلے ہی ہوشیار ہو گئے تھے اور وہ مورچوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ پک اپ گیٹ کے نزدیک آ گئی تھی اور اس کی رفتار برقرار تھی۔ پھر گارڈز پلٹ کر بھاگے اور ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک دھماکے سے فارم کا گیٹ ٹوٹا اور پک اپ دندناتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

(جاری ہے)

انجام خطا

مکرمی ایڈیٹر
السلام علیکم
میں بہت زیادہ پڑھا لکھا بندہ نہیں ہوں مگر سرگزشت شوق سے پڑھتا ہوں۔ جب لانچ پر سمندر کے بیچ میں کئی کئی دن گزارنے پڑتے ہیں تو سرگزشت ہی میرا رفیق اوّل ہوتا ہے۔ اس بار کے شمارے میں خطا نمبر کا اشتہار دیکھ کر میں نے اپنی بیوی کی ایک خطا کو لکھنے کی کوشش کی ہے پھر بھی کسی اچھے رائٹر سے اسے درست کرالیں گے۔
جان محمد
(ابراہیم حیدری)

"جان محمد کھانا کھالے۔" رانو نے میرے سامنے کھانا رکھا تو برسوں سے ہر بار ذہن میں آنے والا سوال جانے کیسے ہونٹوں پر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"رانو اس میں زہر تو نہیں ہے؟"

رانو کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ وہ گھور کر مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جان کیسی بات کرتے ہو میں تمہاری بیوی ہوں تجھے زہر کیوں دوں گی؟"

میں کھوکھلا سا ہنس کر رہ گیا پھر اچانک ہنسی روک کر بولا۔ "میں مذاق کر رہا تھا تو تو برا ہی مان گئی۔ بے وقوف مذاق بھی نہیں سمجھتی۔"

میرے ہنسنے اور بولنے سے رفتہ رفتہ اس کا خوف کم ہو گیا تھا اور وہ مسکرانے لگی۔ رانو اور میری شادی کو دس سال ہو گئے تھے اب ہمارے چار بچے تھے لیکن یہ خیال میرا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ شاید اسی لیے جب میں نے پہلا نوالہ منہ میں رکھا تو میرے ذہن میں پھر یہی خیال آیا کہ اس میں زہر ہے؟

☆☆☆

"اٹھ رے جان محمد۔" بابا نے جال کشتی میں ڈالتے ہوئے چلا کر کہا۔ "جانا نہیں ہے؟"

"آج نہیں بابا۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے بھی آدمی تو پورا ہے، مجھے لے جا کر کیا کرو گے؟"

بابا جال ڈال کر میرے پاس آیا۔ "یہ بات تو میرا بیٹا ہے میرے بعد تو ہی کشتی چلائے گا، تو مالک بن کر جائے گا ملازم بن کر نہیں۔"

میں پندرہ سال کی عمر سے بابا کے ساتھ سمندر میں جانے لگا تھا۔ بابا پہلے دوسروں کے لیے کام کرتا تھا پھر کراچی کے ایک سیٹھ نے اسے کشتی دلا دی۔ بابا کی مچھلی بھی وہی لیتا تھا۔ اگرچہ دام دوسروں کی نسبت ذرا کم دیتا تھا مگر پھر بھی بابا کو تمام مچھیروں سے کہیں زیادہ ملتا تھا۔ ہمارا مکان پکا اور بڑا تھا۔ بابا نے ایک پرانی جیپ بھی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے اور مجھ سے چھوٹی بہن کو بابا نے پڑھایا تھا مگر ہمارے علاقے میں بس میٹرک تک اسکول تھا اس لیے ہم میٹرک کر سکے تھے۔ میری خواہش تھی کہ آگے پڑھوں لیکن بابا نے اجازت نہیں دی۔ انہوں نے کہا۔ "اب تو میرے ساتھ سمندر میں جائے گا۔"

اماں نے بہت بگڑ کر کہا۔ "تو ابھی سے چھوکرے کو لے جا رہا ہے؟"

"یہ چھوکرا نہیں مرد ہے۔" بابا نے فخر سے میرے

شانے پر ہاتھ مارا۔" اور مرد کام پر جاتے ہیں۔"

اماں کی مخالفت کے باوجود بابا مجھے سمندر لے جانے لگا۔ ایک دو بار تو میں بے دلی سے گیا لیکن پھر میرا دل لگ گیا اور میں بابا سے کام سیکھنے لگا۔ بہ ظاہر سمندر میں جانا اور مچھلیاں پکڑنا عام سی بات ہے لیکن جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہی جانتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل اور پیچیدہ ہے۔ انسان برسوں میں جا کر ماہر مچھیرا بنتا ہے۔ اس کے باوجود سمندر کے اسرار اتنے زیادہ ہیں کہ انسان ساری عمر بھی سمندر میں گزارے تب بھی ان کو نہیں جان سکتا۔ جب میں پہلی بار بابا کے ساتھ گیا تو میں نے اکثر تنہائی میں بابا کو زیر لب بولتے اور پانی میں ہاتھ ڈالتے دیکھا۔ میں نے بابا سے پوچھا تو اس نے کہا۔ "جان میں سمندر سے بات کرتا ہوں۔"

"سمندر سے بات؟" میں حیران ہوا۔ "بابا سمندر بھی بولتا ہے؟"

"ہاں نا، سمندر بھی بولتا ہے پر اسی سے بولتا ہے جو اس سے بات کرتا ہے۔ اب سمندر اپنا دوست ہے۔ بتاتا ہے مچھلی کدھر ملے گا۔ موسم خراب ہونے والا ہے۔"

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سچ میں بابا جدھر کشتی لے جاتا وہاں اسے بہت اچھا شکار مل جاتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ موسم خراب ہونے سے پہلے بابا کشتی واپس لے آیا یا کسی کھاڑی میں لے کر چلا گیا اور ہم خراب موسم سے بچ گئے۔ بابا کی کشتی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ یہ مشکل چالیس فٹ بڑی تھی۔ مگر یہ لکڑی کی نہیں بلکہ فائبر کی بنی تھی۔ اس میں مچھلی محفوظ رکھنے کے لیے بجلی سے کام کرنے والا سرد خانہ بھی تھا اس لیے بابا کو برف بھی نہیں لینا پڑتی تھی۔ یہ سرد خانہ کشتی کے انجن کی مدد سے کام کرتا تھا۔ جب مچھلی پکڑ کر اس میں ڈالتے تو انجن چلا دیتے تھے۔ ویسے کشتی انجن سے بھی چلتی تھی مگر جب مچھلی نہیں ہوتی تو بابا بادبان سے چلاتا تھا۔ عام طور سے ایک ٹرپ دس سے پندرہ دن کا ہوتا تھا۔ بابا کے ساتھ چار بندے جاتے تھے۔ یہ بابا کے پرانے آدمی تھے۔ سب اپنے کام میں ماہر اور بابا سے مخلص تھے۔ بابا بھی ان کا پورا خیال رکھتا تھا۔ ہر بار اچھا معاوضہ دیتا اور اگر مچھلی زیادہ ملتی تو ان کو زیادہ حصہ دیتا تھا اسی لیے وہ بابا کے لیے دل و جان سے کام کرتے تھے۔

آنے والے چار پانچ سال تک میں نے بہت کچھ سیکھ لیا۔ اب میں بابا کے ساتھ مچھیرے کے طور پر جاتا تھا۔ بابا مجھے بھی معاوضہ دیتا تھا۔ تب اماں نے کہا۔ "جان محمد کے ابا اب اس کی شادی بنا دو، اس کے ساتھ کے سب

لڑکوں کی شادی ہوگئی ہے۔"

بلوچستان میں پسنی سے ذرا نیچے ہمارے اس چھوٹے سے گاؤں میں لڑکیوں اور لڑکوں کی جلد شادی ہو جاتی تھی۔ لڑکیاں تو عام طور سے جوان ہوتے ہی بیاہ دی جاتی تھیں یعنی چودہ پندرہ سال کی عمر میں اور لڑکے بھی اٹھارہ انیس برس تک شادی شدہ ہو جاتے تھے۔ میں بیس سال کا ہونے والا تھا اس لیے اماں نے میری شادی کا کہا۔ ہول کی شادی ایک سال پہلے ہوگئی تھی جب وہ سولہ سال کی تھی اور اب تو

اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ میں تن میں لیٹا ہوا اماں بابا کی بات سن رہا تھا اور مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی میرے رشتے کی بات نہیں ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ بابا اور اماں خاندان میں ہی دیکھیں گے۔ ویسے تو ہمارا پورا گاؤں ہی رشتے داروں پر مشتمل تھا۔ مگر بابا اور اماں کی طرف سے قریبی رشتے دار بھی خاصے تھے۔ اب تک میں کام اور یار دوستوں میں مگن تھا مگر اماں بابا کی بات سن کر میرے اندر ہل چل مچ گئی تھی اور میں سوچنے لگا کہ میری بیوی خوب صورت ہو۔ صورت شکل کے لحاظ سے میں بھی اچھا تھا۔ میرا رنگ سرخ اور نقوش اچھے تھے۔ قد بہت لمبا نہیں تھا، پانچ فٹ نو انچ تھا۔ اماں کہتی کہ میرا بیٹا شہزادہ ہے۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ بیوی بھی میرے لحاظ سے ہی ہونی چاہیے تھی۔

رانو ہماری گلی میں رہتی تھی۔ اس کا باپ محمد ایک بلوچ رشتے میں بابا کا دور کا چچا زاد بھائی تھا۔ رانو اس کی ایک ہی اولاد تھی اور خاصے لاڈ پیار میں پلی تھی۔ میں نے بچپن سے اسے نخرے کرتے اور ضدیں کرتے ہی دیکھا تھا۔ صفائی ستھرائی سے اسے کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا۔ اکثر وہ بکھرے بالوں اور گندے منہ کے ساتھ گلی میں کھیلتی رہتی تھی۔ جب میں نے میٹرک کیا تو وہ دس سال کی تھی اور پانچویں میں پڑھتی تھی۔ اب بھی وہ اسکول یونیفارم میں آتی جاتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ پڑھ رہی تھی۔ اگلی صبح اماں نے مجھے دودھ اور دہی لینے کے لیے دکان پر بھیجا اور میں واپس آرہا تھا تب میں نے رانو کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اس نے بڑے سلیقے سے اپنے سنہری مائل بھورے بال دو چوٹیوں کی صورت میں باندھے ہوئے تھے جو منہ سیلا کچیلا دکھتا آیا تھا وہ اب صاف ہو کر سرخی مائل رنگت میں دمک رہا تھا۔ بہت اچھے انداز میں سلا ہوا یونیفارم اس کے نازک بدن پر سج رہا تھا۔ دوپٹے تلے ابھرتا بدن جوانی کی خبر دے رہا تھا۔ چال میں لچک آگئی تھی۔ وہ تو بالکل بدل گئی تھی۔ میرے پاس سے گزرنے لگی تو میں نے بے ساختہ کہا۔

”رانو یہ تو ہے؟“

”ہاں تو تجھے کیا کوئی اور نظر آرہی ہوں۔“ اس نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔ رشتے دار اور گلی میں رہنے کی وجہ سے ہمارے درمیان پردہ یا جھجک نہیں تھی۔

”نہیں اتنی صاف ستھری اور پیاری تو پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔“ میں نے پھر بے تکلفی سے کہا تو اس کا سرخ چہرہ یک دم مزید سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر آس پاس دیکھا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ میں پلٹ کر اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی تھی۔ مجھے اس کے جانے کے بعد احساس ہوا کہ میں نے اس سے کیا کہا تھا۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اڑے جان تو واقعی جاہل ہو گیا ہے۔ کسی لڑکی کو ایسا نہیں بولتے ہیں۔“

اپنی غلطی کے احساس کے باوجود میں اسے معافی مانگنے کو تیار نہیں تھا۔ رانو یک دم جیسے دل میں اتر گئی تھی اور میں نے اسے جو کہا تھا وہ دل سے کہا تھا۔ میں سارا دن اس کے بارے میں سوچتا رہا اور بے دھیانی میں غلطیاں کرتا رہا۔ اس پر اماں سے باتیں سننے کو ملیں۔ پھر دوپہر کا وقت آیا تو میں گرمی میں باہر نکل آیا۔ اسکول کی چھٹی کا وقت ہو گیا تھا اور رانو واپس آنے والی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ نمودار ہوئی۔ پسینے میں شرابور اور گرمی سے تپتے چہرے کے ساتھ۔ شاید اس نے مجھے دیکھا بھی نہیں اور اپنے گھر میں جا گھسی۔ اس کے بعد میں نے معمول بنا لیا جب وہ صبح نکلتی تو میں گلی میں موجود ہوتا تھا اور جب وہ واپس آتی تب بھی میں باہر ہوتا تھا۔ وہ ہر بار مجھے نظر انداز کر دیتی۔ ایک صبح فجر کے بعد بابا مجھے لے کر کام سے کشتی پر گیا تھا۔ پھر اس نے مجھے ناشتا لانے بھیجا تو راستے میں رانو اسکول جاتی نظر آگئی۔ یہاں کوئی نہیں تھا اور میں نے موقع غنیمت سمجھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

”کیوں روکا ہے مجھے؟“

”رانو میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”تجھی تو روز صبح اور دوپہر کے وقت گلی میں کھڑا ہوتا ہے۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”دوسرے بھی دیکھتے ہیں اور بات بابا تک گئی تو جھگڑا ہو جائے گا۔“

”کیوں جھگڑا ہوگا۔ تو میرے چاچا کی بیٹی ہے۔ کیا میں تجھ سے بات نہیں کر سکتا۔“

رانو نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ”تو مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتا ہے؟“

میں ہچکچایا مگر پھر کہہ دیا۔ ”رانو تو مجھے اچھی لگتی ہے۔“

وہ بدحواس ہوئی اور تیزی سے جانے لگی تھی، میں نے پھر روکا۔ ”میری بات کا جواب تو دے۔“

”کیا جواب دوں مجھے جانے دے۔“ وہ بولی اور تیزی سے میرے برابر سے نکلتی چلی گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو رانو سے ذرا دور حنیف چلا آرہا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا اور پھر اس نے پاس سے گزرتی رانو کو بھی دیکھا تھا۔ حنیف بھی بابا کے رشتے کے ایک چاچا کا بیٹا تھا۔ اس طرح وہ بھی رانو کا

اسی طرح رشتے وار لگتا تھا جیسے میں تھا۔ فیض سے میرے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ بچپن میں دو تین بار اس سے لڑائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے ہم ایک دوسرے سے گریز کرتے تھے۔ کہیں آمنا سامنا ہوتا تو نظر بچا کر گزر جاتے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے خدشہ ہوا کہ اس نے مجھے رانو سے بات کرتے دیکھ لیا تھا اور کہیں وہ یہ بات پھیلا نہ دے، رانو کا خدشہ درست ثابت ہو اور تماشا ہو جائے۔ اگرچہ گاؤں کا ماحول ایسا نہیں تھا۔ ایک ہی برادری ہونے کی وجہ سے مرد عورت آپس میں بات کر لیتے تھے پھر پردے کا رواج نہیں تھا عورتیں اور جوان لڑکیاں باہر جاتے ہوئے چادر دوپٹا لیتی تھیں۔ پسند کی شادیاں بھی ہوتی تھیں مگر ساتھ ہی عزت کے معاملے میں حساس بھی تھے۔ اگر لڑکا اور لڑکی غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث پائے جاتے تو ان کی سزا کڑی ہوتی تھی مگر ایسا شاذ ہی ہوتا تھا۔ سزا کے طور پر دونوں گھروں کو گاؤں سے نکال دیا جاتا تھا مگر میرا ضمیر مطمئن تھا۔ میں رانو سے چکر نہیں چلا رہا تھا۔ میں نے اسے پسند کیا تھا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ اماں بابا سے کہوں کہ وہ اس کے گھر رشتہ لے کر جائیں۔ دو دن بابا کے ساتھ کشتی پر رہا اس لیے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تیسرے دن کشتی سے فارغ ہوئے تو میں نے موقع پا کر اماں سے کہا۔

''اماں مالک چاچا کی بیٹی رانو ہے نا؟''

''ہاں ہے تو پھر؟''

''اماں وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ اب تم اور بابا اسے دیکھ لو۔'' میں نے جھجک کر کہا۔ ''پھر جو فیصلہ کرو گے مجھے منظور ہو گا۔''

اماں مسکرانے لگی۔ ''ارے چھورا تو نے لڑکی خود تلاش کر لی، میں تیرے بابا سے بات کرتی ہوں۔''

میں جھینپ گیا۔ اماں نے اسی رات بابا سے بات کی اور بابا نے گویا بم گرا دیا۔ ''جان محمد کی ماں یہ نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں؟'' اماں بولیں۔ میں حسب معمول کن سوئیاں لیتا ہوا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ''لڑکی یا اس کے گھر میں کوئی برائی تو نہیں ہے پھر اپنے جان کو پسند ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں نیک محمد نے پہلے ہی اپنے بیٹے کے لیے بات کر لی ہے۔''

میری دنیا جیسے زیر و زبر ہو کر رہ گئی۔ بابا فیض کی بات کر رہے تھے۔ وہ نیک محمد کا بیٹا تھا۔ اماں بھی دکھی ہو گئی۔ ''تو کیا مالک نے ہاں کر دی ہے؟''

''شاید، کیونکہ اس کی نیک محمد سے بہت بنتی ہے۔

دونوں ساتھ ہی کشتی پر جاتے ہیں۔''

''پھر بھی تو اس سے بات تو کر، ہماری حیثیت اچھی ہے، تیری اپنی کشتی ہے۔ اس کی بیٹی ہمارے گھر آئے گی تو آرام سے رہے گی۔ نیک کے پاس کیا ہے اس کا تو بیٹا بھی آوارہ پھرتا ہے سنا ہے چرس پیتا ہے، ہمارا جان تو کام پر جاتا ہے، کوئی بری عادت بھی نہیں ہے۔''

''تو کہتی ہے تو میں اس سے بات کروں گا۔'' بابا نے کہا۔

''میرے کہنے سے نہ کر، یہ جان کی خواہش ہے اسے

رانو اچھی لگتی ہے۔ ہمارے لیے تو بیٹا تیری خوشی سب سے بڑھ کر ہے۔"

"پھر بول تو وہ بات کروں گا۔" بابا نے کسی قدر بےزار ہو کر کہا۔ "پھر غصہ کیوں کھاتی ہے۔"

"کیونکہ تمہیں بیٹے سے زیادہ اپنی کشتی کی پڑی رہتی ہے۔" اماں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تمہیں تو کبھی تو اس کی شادی کا خیال بھی نہ آتا۔ تم چھوڑو، میں خود رانو کی ماں سے بات کرلوں گی۔"

میں خوش ہوگیا کہ اماں پوری طرح میری طرف تھی لیکن اگر رانو کے باپ نے کسی اور کے لیے ہاں کردی تھی تو اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اماں اگلے دن صبح ہی رانو کے ہاں چلی گئی۔ اس وقت مالک چاچا گھر پر نہیں ہوتا اور رانو بھی اسکول گئی ہوئی وہ میٹرک کررہی تھی۔ میں گھر میں اماں کی واپسی کا انتظار کررہا تھا۔ وہ خاصی دیر بعد آئی اور چادر اتار کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا۔ "اماں کیا ہوا؟"

"میں نے سکینہ سے بات کی ہے۔ ابھی مالک نے ہاں نہیں کی ہے پر وہ اس کا دوست ہے اسے انکار کرنا آسان نہیں ہوگا۔ سکینہ کا تو بالکل دل نہیں ہے وہ اسے بالکل پسند ہی نہیں ہے۔"

میں خوش ہوگیا۔ "تو اماں بس پیچھے لگ جاؤ ان سے منوالو۔"

"تو فکر نہ کر میں پوری جان ماردوں گی۔" اماں نے پیار سے مجھے دیکھا۔ "تیری خاطر سمندر سے لڑ جاؤں گی۔"

دو دن بعد بابا مجھے لے کر سمندر چلا گیا۔ سیزن تھا اور ہمیں دو چکر لگانے تھے اس لیے تین ہفتے بعد واپسی ہوتی، میں نے اماں سے کہا تھا کہ میرے لیے خوشخبری تیار رکھنا۔ یہ تین ہفتے میں نے بہت بے چینی سے گزارے تھے۔ مچھلی اتنی تھی کہ بابا نے دو کی بجائے تین چکر لگائے۔ ہر بار پہلے سے زیادہ مچھلی ملی۔ بابا سمیت سب خوش تھے کیونکہ زیادہ مچھلی کا مطلب تھا زیادہ آمدنی۔ مگر میری خوشی تو کشتی پر تھی۔ خدا خدا کرکے تین ہفتے پورے ہوئے اور ہم واپس آئے۔ جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوا اور میں نے اماں کا جگمگاتا ہوا چہرہ دیکھا تو مجھے یقین ہوگیا کہ اماں کامیاب رہی ہے۔ اس نے مجھے گلے لگایا اور سرگوشی میں بولی۔ "چھورا مبارک ہو۔"

"خیر مبارک۔" میں شرما گیا۔ "اماں یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"مالک مان گیا ہے، میں کل یا پرسوں تیرے بابا کے ساتھ جاؤں گی بات پکی کرنے۔"

یوں رانو میری ہوگئی۔ طے پایا تھا کہ جب وہ میٹرک کرلے گی تب ہماری شادی ہوگی۔ میری خوشی کا کیا کہنا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہے۔ ایک ہفتے بعد بابا پھر گیا تو میں خوشی خوشی اس کے ساتھ گیا تھا۔ بابا نے کہا تھا کہ میں زیادہ کام کروں اور رقم جمع کروں کیونکہ شادی پر اور شادی کے بعد بہت رقم چاہیے ہوگی۔ میں بھی دل و جان سے راضی تھا۔ یہ سیزن بہت اچھا گیا۔ ہر بار زیادہ مچھلی ملی اور جلدی ملی اس لیے ایک کی بجائے دو پھیرے اور دو کی بجائے تین پھیرے لگائے تھے۔ سیزن سردی میں ہوتا ہے مگر دسمبر اور جنوری میں مغرب کی طرف سمندر خراب ہوتا ہے۔ لہریں اونچی اٹھتی ہیں اور مچھلی مشکل سے ملتی ہے اس لیے بابا جلدی جلدی پھیرے لگا رہا تھا۔ اس بار بھی مجھے جانا تھا مگر بابا کا ایک پرانا آدمی آگیا اور اسے ضرورت بھی تھی تو بابا نے اسے میری جگہ رکھ لیا۔ آدمی پورے ہوگئے تھے اس لیے میں نے جانے سے انکار کردیا۔

دراصل میں نے بہانہ بنایا تھا۔ میں بات طے ہونے کے بعد سے اب تک ایک بار بھی رانو سے نہیں ملا تھا۔ میں نے اس کے لیے چھوٹا سا سونے کا لاکٹ لیا تھا۔ کراچی بادر پر ایک شخص بیچ رہا تھا اور مجھے سستا مل گیا۔ میں نے بابا سے نظر بچا کر لے لیا۔ اب میں یہ رانو کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ بابا ہمیشہ صبح سویرے جاتا تھا۔ میں اسے رخصت کرنے کے بہانے صبح اس کے ساتھ گیا۔ بابا کشتی لے کر نکل گیا تو میں اس راستے پر آگیا جس سے گزر کر رانو اسکول جاتی تھی۔ وہ نمودار ہوئی تو میں اندر سے مکمل اٹھا تھا۔ وہ سر جھکائے تیز قدموں سے جا رہی تھی پھر میری موجودگی کا احساس کرکے چونکی اور مجھے دیکھ کر ساکت ہوگئی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں اس کے پاس آیا۔ "رانو کیسی ہو تم؟"

"میں ٹھیک ہوں مجھے کیوں روکا ہے؟" وہ سر جھکا کر بولی۔

"اب تو میری منگیتر ہے، کیا میں تجھ سے بات نہیں کرسکتا۔"

"اس طرح نہیں۔" وہ بے چینی سے بولی۔ "کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔"

"میں زیادہ دیر نہیں روکوں گا۔" میں نے کہا۔ "میں تیرے لیے یہ لایا ہوں۔" میں نے اسے لاکٹ نکال کر دکھایا تو پہلی بار اس کے چہرے پر خوشی اور رونق نظر آئی تھی۔ اس نے لاکٹ لیا اور خوشی سے بولی۔

''یہ تو بہت خوب صورت ہے۔''
''پر تجھ سے زیادہ نہیں۔'' میں نے کہا تو رانو شرما گئی۔
''اب مجھے جانے دے کسی نے دیکھ لیا اور اماں بابا کو بتا دیا تو میری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔''
''کوئی تجھے ہاتھ نہیں لگا سکتا اب تو میری ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے مجھے دیکھا اور پھر لاکٹ اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔
''اب میں جاؤں گی۔''
وہ میرے پاس سے گزر کر چلی گئی اور میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ میں گھر آ گیا۔ اس دن صبح سے بادل آئے ہوئے تھے اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ اماں بے چین تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ''تیرے باپ کو منع کیا تھا کہ موسم ٹھیک نہیں ہے وہ پھر بھی چلا گیا۔''
''اماں کچھ نہیں ہو گا بابا سمندر کو سمجھتے ہے خطرہ ہو گا تو وہ فوراً واپس آ جائے گا۔'' میں نے اماں کو تسلی دی۔ مگر اس بار بابا خطرہ نہیں جان سکا تھا۔ وہ ایک ٹرپ کے لیے گیا تھا کیونکہ سمندر خراب تھا اس لیے ایک ٹرپ کی مچھلی بھی مشکل سے ملتی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں آ جانا چاہیے تھا۔
بابا کی کشتی میں ریڈیو تھا جس سے وہ بستی کی بندرگاہ سے رابطے میں رہتا تھا۔ اگر وہ رابطہ نہیں کرتا تو پھر اس کی کشتی کی تلاش شروع کر دی جاتی۔ لوگ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے بارے میں بندرگاہ سے معلوم کرتے رہتے تھے۔
تیسرے دن بابا کا ایک دوست بستی سے آیا اور اس نے یہ خبر سنائی کہ بابا کی کشتی سے دو دن سے رابطہ نہیں ہوا اور ریڈیو پر رابطہ کرنے پر کوئی جواب بھی نہیں دیا جا رہا ہے۔ حکام نے کشتی کو گمشدہ قرار دے کر اس کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اس خبر نے ہم سب کو ہلا دیا تھا۔ اماں رو رہی تھی مگر ہچکے ہچکے۔
میں بستی چلا آیا۔ وہاں پتا چلا کہ میری ٹائم اور کوسٹ گارڈ والے گم شدہ لانچ کو تلاش کر رہے تھے صرف بابا کی نہیں بلکہ تین دوسری کشتیاں بھی خراب موسم میں غائب ہو گئی تھیں۔ میں دو دن بستی میں رکا رہا اور اس دوران میں بابا کی کشتی کا کوئی سراغ نہیں لگا تھا۔ میں واپس آیا تو اس سے اگلے دن سمندر سے ایک لاش ملی جو بابا کے ایک ساتھی یاور علی کی تھی۔ باقی افراد کا کچھ پتا نہیں چلا لیکن اس ایک لاش سے سب کو علم ہو گیا کہ باقی افراد بھی زندہ نہیں بچے تھے اس لیے سب کے گھروں میں ماتم شروع ہو گیا تھا۔ حکام

باسلیقہ رہبر

ہمارے رہبرانِ قوم اتنے باسلیقہ ہیں
بنانے پر جو آئیں زاغ کو بلبل بناتے ہیں
جو انتہا سے بھی دور ترقی پیٹ میں ان کے
جہاں دریا نہیں ہوتا وہاں بھی پل بناتے ہیں

شاعر: ظفر کمالی

نے بھی ایک ہفتے بعد کشتیوں کی تلاش روک دی۔ اماں، میرا اور مومل کا برا حال تھا۔ پھر مجھے خود کو سنبھالنا پڑا، اب میں اس گھر کا بڑا تھا۔ سب مجھے ہی کرنا تھا۔ مچھیروں کی ایسوسی ایشن اور حکومت کی طرف سے ہمیں کچھ مدد ملی تھی مگر نقصان بہت بڑا تھا۔ جانی نقصان کا تو کوئی بدل ہی نہیں تھا پر بابا کی کشتی کی مالیت ہی کوئی بیس لاکھ روپے تھی۔ اس کی انشورنس ختم ہو گئی تھی اس لیے ہمیں کچھ نہیں ملا۔ اب مجھے کام کرنا تھا مگر کسی دوسرے کے ساتھ۔ سیٹھ نے کشتی کے مطالبے پر مجھے ٹال دیا تھا کہ پہلے میں ذرا تجربہ حاصل کر لوں پھر وہ مجھے کشتی دلائے گا۔ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں کہا کہ کشتی اس کی تھی اور یہ اس کا نقصان تھا۔ حالانکہ بابا اسے کشتی کی مالیت سے کہیں زیادہ منافع پہنچا چکے تھے۔
فروری تک موسم اچھا ہو گیا تھا اور سیزن ختم ہونے کے پاس تھا کیونکہ بہار اور مون سون میں حکومت کی طرف سے شکار پر پابندی لگا دی جاتی تھی اور تین چار مہینے ماہی گیر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اگرچہ بابا بہت کچھ چھوڑ کر گئے تھے۔ یہ مکان تھا، گوٹھ میں تھی بینک میں بھی خاصی رقم تھی مگر مجھے کمانا تو تھا اس لیے میں نے کشتی کے مالکوں سے بات شروع کر دی۔ ہمارے گاؤں میں بابا کو سب سے تجربے کار اور ماہر ملاح سمجھا جاتا تھا اور میں بابا کا تربیت یافتہ تھا اس لیے کئی لوگوں نے مجھے ساتھ لے جانے کی پیشکش کی۔ میں نے کریم بھائی کی پیشکش قبول کر لی۔ وہ بابا کا دوست تھا اور اچھا آدمی تھا۔ پھر اس نے مجھے پہلی بار میں ہی اس معاوضے کی پیشکش کی جو وہ اپنے پرانے آدمیوں کو دے رہا تھا۔ کریم بھائی کے پاس بڑی لانچ تھی اس میں سات آدمی کام کرتے تھے۔ میں نے اماں سے کہا۔ ''تم رانو کے گھر بات کر لو ہم بابا کی برسی کے بعد ہی شادی کر لیں گے۔''
''نہیں تیرے بابا نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تیری شادی اسی اپریل میں کرنی ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''میرے

لیے رسم و رواج سے زیادہ تیرے بابا کی بات کی اہمیت ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اپریل میں برات لاؤں گی۔"

میں خوش ہوگیا خواہش میری بھی یہی تھی کہ میں رانو کو لے آؤں تا کہ گھر کا افسردہ ماحول بدلے، اماں اکیلی روتی تھی اسے بھی ہوتی۔ مگر مجھے برادری کا خیال تھا۔ بہر حال بابا مر کر گئے تھے۔ میں نے اماں سے کہا۔ "ٹھیک ہے تب میں واپس آؤں تو تاریخ رکھ دینا۔"

مگر اماں نے کہا۔ "میں نے سوچ لیا ہے جب تک تو آئے گا میں تاریخ لے لوں گی۔"

بابا کی گم شدگی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے دل سے خوشی محسوس کی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رانو کی محبت میرے دل میں جیسے جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔ میں اسے بہانے بہانے سے دیکھتا تھا۔ اس کے گھر نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ میرے گھر آ سکتی تھی اس لیے ایک جھلک سر راہ ہی دیکھنے کو ملتی تھی اور وہ بھی رانو مجھے دیکھتے ہی چادر یا دوپٹے سے منہ چھپا لیتی تھی۔ میں سحر خیز تھا اور صبح جلدی اٹھ جاتا۔ کبھی سمندر کی طرف جاتا تو وہاں سے اس راستے پر رانو کا انتظار کرتا جو اسکول کی طرف جاتا تھا۔ یہ اس کا آخری سال تھا اور جب میں جاتا تو اس کے میٹرک کے پرچے ہوتے۔ میری واپسی تک وہ امتحان دے چکی ہوتی۔ پھر وہ میری ہو جاتی۔ یہ تصور ہی اتنا سرور انگیز تھا کہ میں سوچتا تو مد ہوش سا ہو جاتا۔

میں نے جانے کی تیاری شروع کر دی اور میری خواہش تھی کہ جانے سے پہلے ایک بار رانو سے بات ہو جائے۔ موقع بس وہی تھا جب وہ اسکول جا رہی ہوتی تھی۔ اس لیے جانے سے ایک دن پہلے میں صبح سویرے اٹھ اور جھاڑیوں والے راستے پر رانو کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ آتی دکھائی دی مگر اس کے ساتھ ایک لڑکی اور تھی۔ میں جھاڑیوں میں ہو گیا اور جب وہ ذرا قریب آ گئیں تو میں جھاڑیوں سے نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹکیں اور پھر دوسری لڑکی تیزی سے آگے چلی گئی۔ رانو وہیں رکی رہی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ میں اس کے پاس آیا۔

"رانو کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔" وہ شرما کر بولی۔ "تو سمندر میں جا رہا ہے؟"

"ہاں کل چلا جاؤں گا اس لیے آج تجھ سے ملنے آیا ہوں۔"

"میں بھی تجھ سے ملنا چاہتی تھی۔" اس نے کہا۔

میں خوش ہو گیا۔ "سچ؟"

اس نے سر ہلایا اور اپنے بیگ سے ایک شاپر نکالا جس میں سوجی کے خشک حلوے کے ٹکڑے تھے۔ "یہ میں نے تیرے لیے بنایا ہے اسے ساتھ لے جا اور جب میری یاد آئے تو کھانا۔"

میں نے اس سے شاپر لے لیا۔ "رانو میرا انتظار کرنا میں واپس آ کر تجھے ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے آؤں گا۔"

اس کا رنگ سرخ ہو گیا پھر اس نے کہا۔ "جان اس میں سے ابھی مت کھانا جب سمندر میں ہو تب کھانا اور سب سے چھپا کر رکھنا میں نے بس تیرے لیے بنایا ہے۔"

"میں کسی کو نہیں دوں گا سب سے چھپا کر رکھوں گا۔" میں نے وعدہ کیا تو رانو مجھے اللہ حافظ کہہ کر آگے چلی گئی۔ میں شاپر کو سینے سے لگائے گھر آیا اور اسے اپنے چھوٹے سے بیگ میں سب سے نیچے چھپا دیا جو میں ساتھ لے جاتا۔ کل صبح سویرے روانگی تھی۔ مجھے سورج نکلنے سے پہلے کشتی پر پہنچنا تھا۔ بابا کے حادثے کے بعد اماں ڈر گئی تھی وہ بے چین تھی مگر اس نے مجھے روکا نہیں۔ مچھیرے کا بیٹا مچھیرا ہی ہوتا ہے اور میں کیا کر سکتا تھا مجھے یہی کام آتا تھا اور ہماری روزی روٹی سمندر سے وابستہ تھی۔ صبح اماں سے مل کر رخصت ہوا۔ یہ بڑا ٹرپ تھا کیونکہ کریم بھائی کی لانچ خاصی بڑی تھی اور اسے بھرنے میں وقت لگتا۔ پہلے ہمیں بستی جانا تھا جہاں سے برف لیتے۔ اس لانچ میں انجن سے ٹھنڈا ہونے والا برف خانہ نہیں تھا۔ برف کی سلیں بھر کر ہم سمندر میں جاتے اور مچھلی پکڑتے۔ ہم تین ہفتے کا راشن پانی لے کر جا رہے تھے۔

سب لوگ آ گئے تھے مگر کریم بھائی کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس بار وہ سات کی بجائے آٹھ آدمی لے جا رہا تھا اور جب آٹھواں آدمی آیا تو میں چونکا۔ وہ فیض تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ اس کے چلن اچھے نہیں تھے اور سننے میں آیا تھا کہ وہ اسمگلروں کے ساتھ کام کرنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بظاہر کوئی کام نہ کرنے کے باوجود اس کے پاس کھلا پیسا نظر آتا تھا۔ اس نے بھاری موٹر سائیکل لے رکھی تھی اور کھل کر خرچ کرتا تھا جب کہ اس کا باپ ایک غریب مچھیرا تھا۔ مگر یہ کوئی بہت تعجب کی بات نہیں تھی۔ ادھر علاقے میں بغیر نمبر پلیٹ کی گاڑی اور موٹر سائیکل بہت سستی مل جاتی تھی پھر ایران سے اسمگل ہو کر آیا پیٹرول اور ڈیزل بھی بہت سستا ملتا تھا اس

لیے عام فوری بھی مجبوری رکھ سکتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھی صمد سے پوچھا۔ "کس خوشی میں ساتھ جا رہا ہے؟"

"پتا نہیں ان کے باپ نے کریم بھائی کی منت ساجت کی ہے تو وہ اسے لے جا رہا ہے۔" صمد نے آگاہ کیا۔ "سمجھو سیکھنے کے لیے ساتھ جا رہا ہے۔"

"یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ میں بھولا نہیں تھا کہ اس نے بھی راز کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ میرے مقدر میں تھا۔ پہلے بھی اس کے لیے میرے جذبات کچھ اچھے نہیں تھے مگر اب تو میں اسے بالکل ناپسند کرنے لگا تھا کریم بھائی کشتی کا مالک تھا وہ جسے چاہتا لے جاتا اور جسے منع کر دیتا۔ پوچھتے ہی کریم بھائی نے کشتی چلا دی۔ پہلے انجن چلایا اور جب کھلے سمندر میں آئے تو بادبان کھول لیے۔ اب ہم پسنی کی بندرگاہ جا رہے تھے۔ چند گھنٹے بعد وہاں پہنچ گئے ابھی ہمارا کام شروع نہیں ہوا تھا اس لیے سب ٹولیوں میں بٹ کر گپ شپ کر رہے تھے۔ قنبر اور دوسرے دو افراد تاش کھیل رہے تھے اور چرس بھری سگریٹ پی رہے تھے۔ ہماری برادری میں چرس کا نشہ عام سمجھا جاتا ہے اور خصوصاً سفر کے دوران ان میں بھیر سے چرس پیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس سے سمندر میں ان کی صحت اچھی رہتی ہے اور رات کو بینائی تیز ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ سب نشہ کرنے کے بہانے تھے۔ بہرحال کسی کو چرس پینے کی وجہ سے برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

چند گھنٹے بعد ہم پسنی کی بندرگاہ پر تھے اور وہاں سے برف لے کر مچھلی رکھے جانے میں ڈالنا شروع کی۔ اس کام میں سارا دن لگ گیا۔ یہ برف کے بڑے بڑے بلاک تھے اور ٹنوں کے حساب سے برف تھی جو مہینے بھر تک مچھلیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ یہاں سے ہم نے پینے کا پانی بھی لیا اور پھر رات کے وقت کھلے سمندر میں آئے اور کشتی کا رخ اس طرف کر دیا جہاں ہمیں شکار کرنا تھا۔ برف بھرنے کے بعد کشتی بھاری ہو گئی تھی اور اس کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔

ہم مغرب میں گوادر سے اوپر جا رہے تھے۔ اس سے آگے ایران کا سمندر پاس تھا مگر ہم اس طرف جانے سے گریز کرتے تھے۔ کیونکہ بعض اوقات سمندری حد پار کرنے پر ایرانی کوسٹ گارڈز فائرنگ کر دیتے تھے یا وارننگ دیتے تھے۔ اس طرف اچھی مچھلی ملتی بھی نہیں تھی۔ اپنی کوسٹ گارڈز تنگ نہیں کرتی تھی اور ہمیں معمول کی چیکنگ سے گزرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات تو وہ کشتی ادھیڑ کر رکھ دیتے تھے کیونکہ ان سے روز سامنا ہوتا تھا تو وہ ماہی گیروں کو صورت سے بھی

غلطیاں جنگ کے میدان کی۔

ہٹلر کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ وہ کیسا آدمی تھا۔

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جو جتنا بڑا انسان ہوتا ہے۔ اس کی حماقتیں بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہیں۔ ہٹلر نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے روس کو فتح کرنے کی پلاننگ کی اور فوجوں کو روس کی طرف روانہ کر دیا۔ بہت زبردست فوج تھی۔ اور یہ جذبہ بھی تھا کہ ہر حال میں فتح حاصل کرنی ہے۔ لیکن تاریخ کی ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ ایک تو سردی کا موسم اور دوسرے روس کی سردی۔ ان بے چاروں کو موسم گرما کی وردیاں پہنا کر بھیج دیا گیا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایسی فوج کا کیا انجام ہوگا۔ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ پوری فوج سردی سے ٹھٹھر کر رہ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں فوجی ہلاک ہو گئے اور بچ جانے والوں کا دشمنوں نے صفایا کر دیا کچھ غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔

مرسلہ: نیاز کھوسو، لسبیلہ

****

یورپ میں ایک جنگ بہت مشہور ہوئی۔ یہ جنگ Agin court کی جنگ کہلاتی ہے۔ یہ جنگ فرانس اور برطانیہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ فرانس والوں کو عددی لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ اس کے باوجود وہ بری طرح ہار گئے۔ اس ہار کی وجہ بھی بہت دلچسپ تھی۔ فرانس کی فوجوں کے لیے اسلحہ ڈیزائن کرنے والا ایک شخص تھا۔ جس نے اس زمانے کے لیے... کمان اور تیر بنا کر رکھے۔ ان کمانوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ کمانیں انسانی قد سے بڑی تھیں۔ اس ماہر اسلحہ ساز کا کہنا تھا کہ ان کمانوں سے چلائے ہوئے تیروں میں بہت فورس ہوتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ عین جنگ کے وقت ان کمانوں کو کھینچنا ہی مشکل ہو گیا۔ بے چارے فرانسیسی فوجی کمانوں سے تیر چلانے کی کوشش ہی کرتے رہے اور برطانوی فوجوں نے انہیں تباہ کر دیا۔

مرسلہ: واجد الحسن، کراچی

پہچان لیتے تھے رد کر کے اس وقت تھے جب شک ہوتا۔

تقریباً ساری رات سفر کے بعد ہم شکار کے علاقے میں پہنچے جہاں مچھلیوں کے جھنڈ تھے۔ کریم بھائی نے ناشتے کے فوراً بعد جال ڈالنے کا کہا اور ہم جال ڈالنے لگے مگر یہاں جھنڈ بڑے نہیں تھے سارا دن کئی بار جال سمیٹنے کے باوجود بہت تھوڑی سی مچھلی ہاتھ آئی تھی اور اس کی بھی خاص قیمت نہیں تھی۔ اگلے دن ہم نے ایک اور علاقے کا رخ کیا مگر یہاں بھی قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ آنے والا پورا ہفتہ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہے اور کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ کریم بھائی کے ساتھ ایک تجربے کار ملاح رمضان چاچا تھا اس نے مشورہ دیا کہ ہمیں جیوانی کی طرف جانا چاہیے۔ اس طرف ان دنوں خلیج سے مچھلیوں کے جھنڈ آتے ہیں اور یہ بڑی اچھی نسل کی مچھلی ہوتی ہے۔ مگر کریم بھائی راضی نہیں تھا کیونکہ جیوانی بہت دور پڑتا۔ ہم عام مچھلی پسنی یا گوادر میں بیچتے تھے مگر اچھا مال ہاتھ آتا تو کراچی کا رخ کرتے تھے کیونکہ سب سے اچھی قیمت وہیں ملتی تھی۔ دو دن تک ہم گوادر سے اوپر سمندر میں پھرتے رہے اور کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ بالآخر کریم بھائی نے رمضان چاچا کی بات مان لی اور ہم نے جیوانی سے آگے سمندر کا رخ کیا۔

اس سفر کے دوران میں مجھے ایک بار بھی رانو کا دیا ہوا حلوہ کھانے بلکہ اسے نکالنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ کبھی میں بھول جاتا اور جب یاد آتا تو سب موجود ہوتے تھے میں سب کی موجودگی میں نکالتا اور کوئی مانگتا تو میں انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے دوبارہ جاتا۔ مجھے رانو کی بات یاد تھی کہ حلوہ صرف میرے لیے ہے۔ میری محبوب منگیتر نے پہلی بار میرے لیے کچھ بنایا تھا اور میں اس کی بات سے پھر نہیں سکتا تھا۔ اسی وجہ سے بارہ دن ہو گئے تھے اور اب تک میں ایک ٹکڑا بھی نہیں کھا سکا تھا۔ خراب ہونے والی اور کوئی چیز بھی نہیں تھی کیا سے بچانے کے لیے شاپر میں اچھی طرح پیک کیا ہوا تھا۔ اس سفر کے دوران نیفن کا رویہ مجھ سے لاتعلقانہ رہا تھا۔ وہ بس کام کی بات کرتا تھا اور میں بھی اس سے کام کی بات ہی کرتا تھا۔ صمد نے یہ بات محسوس کر لی اس نے کہا۔

”تم دونوں کی آپس میں لگی ہوئی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بس ہم ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے ہیں۔“

”میں نے محسوس کیا ہے وہ جب تمہاری طرف دیکھتا ہے تو بہت عجیب سے انداز میں دیکھتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے ویسے مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ اس ٹرپ میں ساتھ ہے تو شاید میں جانے سے انکار کر دیتا۔“

”تم فکر مت کرو۔ کریم بھائی نے بھی اسے پسند نہیں کیا ہے اگلی بار وہ اسے ساتھ نہیں لائے گا۔ اس کا کہنا ہے یہ بیکار آدمی ہے۔“ صمد نے انکشاف کیا۔ اس کی کریم بھائی سے بات چیت تھی اس لیے اسے اندر کی باتیں بھی پتا چل جاتی تھیں۔ باقی کریم بھائی خاموش طبع آدمی تھا۔ ہر ایک سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ میں خوش ہو گیا تھا کیونکہ مجھے اس کشتی پر کام کرنا اچھا لگا تھا۔ اگر نیفن نہ ہوتا تو میں خوشی سے کریم بھائی کے ساتھ کام کرتا۔ وہ بھی میرے کام سے خوش تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ”جان میرے آدمیوں میں شامل ہو جا تو اچھا ملاح ہے۔ تجھے بھی فائدہ ہوگا اور مجھے بھی۔“

اس وقت میں نے جواب نہیں دیا تھا مگر صمد سے بات کرنے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ یہ بات درست ہے تو میں اس سفر سے واپسی پر کریم بھائی کو ہاں کر دوں گا۔ بارہ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم جیوانی سے اوپر ایرانی سرحد کے پاس پہنچ گئے تھے۔ یہ دنیا کی مصروف ترین بحری گزرگاہ ہے جہاں سے ہر وقت بڑے اور چھوٹے بحری جہازوں کے ساتھ بے شمار مال بردار اور تفریحی کشتیاں بھی گزرتی ہیں، اس لیے یہاں ہمیں محتاط رہنا پڑتا تھا کیونکہ اگر کوئی بڑا بحری جہاز اچانک سر پر آ جاتا تو ہمیں بچنے کا موقع نہ ملتا بلکہ اس کی حرکت سے اٹھنے والی لہریں بھی کشتی الٹ سکتی تھیں اس لیے یہاں پہنچتے ہی کریم بھائی نے سب کو ہوشیار رہنے کو کہا۔ رمضان چاچا سمندر میں دیکھ رہا تھا۔ بالآخر ایک جگہ اس نے پانی کے نیچے موجود مچھلیوں کا بڑا جھنڈ تلاش کر لیا۔ یہاں سمندر کی گہرائی ستر اسی فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ ذرا سی کوشش سے تہ میں دیکھا جا سکتا تھا۔

ہم اس جھنڈ کے گرد جال پھیلانے لگے۔ جب جال پھیلا لیا تو اسے کھینچنے کا کام شروع کیا۔ اس کام میں بارہ گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگتا تھا اور رات ہو گئی اس لیے جال کھینچنے کا کام صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ یہ اچھا تھا کیونکہ اچھی طرح زیادہ مچھلی ہاتھ آتی مگر یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی بڑی کشتی یا بحری جہاز ہماری طرف آتا تو ہمیں جال چھوڑ کر اس جگہ سے دور ہٹنا پڑے گا۔ اس خطرے کے تدارک کے لیے بڑی لالٹینیں جلا کر مستول پر لٹکا دی گئیں تاکہ آنے والے بحری جہاز یا بڑی کشتی والوں کو ہم دور سے نظر آ جائیں۔

ہمارے پاس میگا فون بھی تھا جس سے ہم آنے والے کو خبردار کر سکتے تھے کہ وہ ہم سے دور رہے۔ سب ہی تھک گئے تھے اس لیے کچھ لوگ جاگتے رہے اور باقی سو گئے۔ میں بھی سونے والوں میں شامل تھا۔ اچانک میری شور سے آنکھ کھلی۔ رمضان چاچا کہہ رہا تھا۔

''بندے ہیں...... ادھر روشنی ڈال۔''

میں نے اٹھ کر دیکھا تو کشتی سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تین یا چار افراد کسی چیز سے چمٹے ہوئے تیر رہے تھے۔ روشنی ڈالی گئی تو وہ واضح نظر آنے لگے۔ انہوں نے لکڑی کا ایک تختہ پکڑ رکھا تھا۔ چاروں نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور حلیے سے وہ مچھیرے یا ملاح نہیں لگ رہے تھے۔ کریم بھائی کی ہدایت پر ہم کشتی ان کے پاس لے جانے لگے اور جب وہ دس بارہ گز دور رہ گئے تو ان کے لیے رسا پھینکا گیا۔ انہوں نے رسہ پکڑ لیا اور ہم نے انہیں کشتی کی طرف کھینچ لیا۔ پھر باری باری سہارا دے کر ان کو اوپر چڑھایا۔ چاروں کی حالت خراب تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کئی گھنٹوں سے سمندر میں تیر رہے تھے۔ جب ان سے بات کی تو وہ فارسی بول رہے تھے اور چاروں ایرانی تھے۔ کریم بھائی کو فارسی آتی تھی وہ ان سے بات کرنے لگے۔ پھر کریم بھائی نے ہمیں بتایا کہ وہ بھی مچھیرے تھے اور ان کی کشتی ڈوب گئی تھی۔ وہ کئی گھنٹے سے سمندر میں تیر رہے تھے۔ سمندری دھارا انہیں ایرانی حد سے کھینچ کر یہاں لے آیا تھا۔ میں نے کریم بھائی سے کہا۔

''یہ مچھیرے تو نہیں لگ رہے ہیں۔''

''یہ ایرانی مچھیرے ہیں۔'' کریم بھائی نے کہا۔ ''تم نے باہر کے ملکوں کے مچھیرے نہیں دیکھے کیا، وہ اپنی حلیے سے مچھیرے لگتے ہیں؟''

''یہ تو ہے کریم بھائی۔'' میں نے قائل ہو کر کہا۔ ویسے میں نے پہلی بار ہی ایرانی مچھیرے دیکھے تھے۔ اس مختصر سے ہنگامے کے بعد ان چاروں کو کھانا پانی دے دیا اور وہ آرام کرنے لگے تو وہ افراد جو پہلے جاگ رہے تھے وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میں اور صمد جاگ گئے تھے۔ میں نے آہستہ سے اس سے کہا۔

''مجھے یہ ٹھیک بندے نہیں لگ رہے۔''

''کیوں؟''

''تم نے دیکھا انہوں نے ہمارا شکریہ تک ادا نہیں کیا اور کھا پی کر آرام سے سو گئے۔ ان کی صورتیں دیکھو یہ عام لوگ نہیں ہیں۔''

''تو بلاوجہ شک کر رہا ہے۔'' صمد بولا۔

''انہیں ہماری زبان آتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب کریم بھائی ان کے بارے میں ہمیں بتا رہا تھا تو یہ یوں غور سے سن رہے تھے جیسے ہماری زبان سمجھتے ہوں۔''

صمد مجھ سے متفق نہیں تھا مگر ہمارے درمیان زیادہ دیر بات نہیں ہوئی تھی۔ پو پھٹنے سے کچھ پہلے کریم بھائی نے جال سمیٹنے کو کہا تاکہ جب روشنی ہو تو جال کا بڑا حصہ سمیٹا جا چکا ہو اور پھر مچھلی نکالنے کا کام باقی رہ جائے۔ جال کے وزن سے لگ رہا تھا اس میں خاصی مچھلی آ چکی تھی۔ سب خوش ہو رہے تھے۔ جیسے ہی روشنی ہوئی ہم نے مچھلی نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ رمضان چاچا کا کہنا درست ثابت ہوا تھا یہاں بہت اچھی والی مچھلیاں لگی تھیں۔ جال سے مچھلیاں نکالنے کے ساتھ ساتھ انہیں سرد خانے میں پہنچانے کا کام بھی شروع کر دیا۔ ہر دانہ بہت اچھا تھا۔ ہم سب نکال رہے تھے۔ چھوٹی مچھلیاں بھی کچرے میں ایک جانب پھینک رہے تھے۔ کئی گھنٹے بعد ہم جال سے ساری مچھلی نکال کر اسے سمیٹ چکے تھے۔ تھکن سے برا حال تھا مگر سب خوش تھے کیونکہ ایک ہی جال نے ایک تہائی سرد خانہ بھر دیا تھا۔ ایسے ہی دو جال اور لگتے تو سرد خانہ پورا بھر جاتا۔

چاروں ایرانی بڑے سو رہے تھے ان کو سامنے والی جگہ دے دی گئی تھی۔ اس طرف ہمارا سامان بھی رکھا ہوا تھا۔ اچانک ہمارا ایک ساتھی موسیٰ چلایا۔ ''اے یہ کیا کر رہے ہو۔''

جواب میں ایک فائر کی آواز آئی اور موسیٰ کی چیخ سنائی دی۔ ہم سب اس طرف جھپٹے تھے۔ وہاں چاروں ایرانی ریڈیو کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور اب ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ انہوں نے موسیٰ پر گولی چلائی تھی جو اس کے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ریڈیو چھوڑ کر باہر آ گئے۔ ہم سب ساکت رہ گئے تھے۔ وہ چلا چلا کر ہمیں اوندھے منہ لیٹنے کا حکم دے رہے تھے۔ کریم بھائی نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ایک ہوائی فائر کیا اور سب ڈر کر لیٹ گئے۔ سب کو لٹا کر انہوں نے ہماری ہی رسی سے ہمارے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیے پھر سب کو ایک ہی رسی سے یوں منسلک کر دیا کہ کوئی الگ ہو کر نہ تو کہیں جا سکتا تھا اور نہ حرکت کر سکتا تھا بھی نہیں آخر میں انہوں نے رسی مستول سے باندھ دی۔ موسیٰ کا زخم معمولی سا تھا شاید اس سبب اس کی پٹی تک کی اجازت نہیں دی۔ اس کا خون کچھ دیر بعد خود رک گیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا

تھا کہ وہ ہماری زبان جانتے تھے۔ کریم بھائی نے ان سے کہا۔

"یہ کیا ہے ہم نے تمہاری جان بچائی اور تم نے ہم پر ہتھیار نکال لیے ہیں؟"

"تم فکر مت کرو۔" ان میں سے ایک نے ذرا نرم لہجے میں کہا ورنہ اس سے پہلے تو وہ ہمیں پھاڑ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ "ہمیں اپنے ملک واپس جانا ہے۔"

"یہ کشتی ایران نہیں جا سکتی ہے۔ ادھر کوسٹ گارڈ والے روک لیں گے۔"

"ہم اسے ایران نہیں لے جا رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ہم اپنے آدمیوں سے رابطہ کر رہے ہیں ان سے رابطہ ہو گیا تو وہ کشتی لے کر ادھر آئیں گے اور ہم اس پر چلے جائیں گے۔"

"یہ ہم سب کو مار دیں گے۔" رمضان چاچا نے سرگوشی کی۔ "اب میرے کو یقین ہے کہ اسمگلر ہے۔ مقابلے میں اس کا کشتی ڈوب گیا اور اب یہ اپنا ساتھی کو بلانے جا رہا ہے۔ جانے سے پہلے ہم کو مار دے گا۔"

"چاچا ایسا مت کہو۔" فیض نے پریشان ہو کر کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ ہمیں چھوڑ دیں۔"

"ہاں ہم ان کے لیے خطرہ تھوڑی ہیں۔" کریم بھائی نے کہا لیکن مجھے رمضان چاچا کی بات درست لگ رہی تھی۔ اسلحہ بتا رہا تھا کہ یہ جرائم پیشہ تھے۔ پستول انہوں نے لباس میں چھپا رکھے تھے اور موقع پا کر نکال لیے۔ اب کشتی پر ان کا قبضہ تھا اور انہوں نے اس کا انجن اسٹارٹ کر کے اس کا رخ مغرب کی طرف کر دیا تھا۔ یعنی ہم خلیج کی طرف جا رہے تھے۔ جال کھینچنے کے چکر میں ہم نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا اور اب بھوکے پیاسے بندھے پڑے تھے جب کہ وہ لوگ ہماری خوراک پر عیش کر رہے تھے۔ ہم تیز دھوپ میں تھے اس لیے سب کو پیاس لگنے لگی تو بار بار کہنے پر انہوں نے بہ مشکل ہمیں چند گھونٹ پانی دیا تھا۔ ہم نے جو مچھلی پکڑی تھی اسے وہ بھون کر کھا رہے تھے۔

جب مچھلی کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی تو ہمارے معدوں میں جیسے تڑپ سی جاگ گئی۔ مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جن لوگوں نے اتنی مشکل سے پانی دیا تھا وہ ہمیں کھانے کو کیا دیتے۔ دراصل وہ ہمیں کھولنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے اس لیے کھانا نہیں دے رہے تھے ورنہ ہمارے ہاتھ کھولنے پڑتے۔ شام کے قریب سورج ڈھلا تو ہمیں ذرا سکون ملا ورنہ بہ راہ راست تیز دھوپ میں ہم خود فرائی ہو

رہے تھے۔ کریم بھائی اور رمضان چاچا آپس میں بات کر رہے تھے۔ میں ان کے نزدیک تھا اس لیے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ کریم بھائی نے کہا۔ "مجھے لگ رہا ہے ہم پاکستان کے سمندر سے آگے نکل گئے ہیں۔"

"اپنے کو بھی ایسا ای لگ رہا ہے۔ یہ انجن کو پوری رفتار سے چلا رہے ہیں اور کشتی بارہ ناٹیکل کی رفتار سے جا رہی ہے۔ اب تک ہم ستر اسی ناٹیکل آگے جا چکا ہے۔"

جیوانی سے آگے ایران کی سرحد زیادہ دور نہیں ہے۔ بلکہ مکران کوسٹل کے ساتھ ایران کی طرف یہ پاکستان کا آخری بڑا سمندری قصبہ ہے۔ سمندر میں ہم ذرا اوپر تھے یعنی جنوب کی سمت تھے اس لیے ایرانی سرحد کے پاس جانے میں کچھ وقت لگتا۔ میں نے کریم بھائی سے کہا۔ "ہمیں آزاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"کیسے؟" انہوں نے پوچھا۔ "اگر آزاد بھی ہو گیا تو ان لوگوں کے پاس پستول ہے۔ وہ گولی مار دے گا تب ہم کیا کرے گا؟"

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ صمد نے دبی زبان میں کہا۔ "ہم سمندر میں کود جائے گا۔"

"ارے چریا..... یہ کشتی میں سے آرام سے ایک ایک کو مغز میں گولی مارے گا۔ کیا ہم کشتی سے تیز جا سکتا ہے۔" رمضان نے کہا تو صمد بھی چپ ہو گیا۔ فیض نے ہماری مخالفت کی۔

"ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہیے ورنہ یہ ہمیں مار دیں گے۔ دوسری صورت میں پھر بھی بچنے کا امکان ہے۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ ان لوگوں نے خود کو ان چاروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے جب کہ وہ مجھے رحم کرنے والے نہیں لگ رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ سرگوشی میں بات کرنے لگتے اور ہماری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں نوجوان تھا ان لوگوں کی طرح تجربے کار نہیں تھا مگر بابا نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ میرے پاس عقل تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ یہ ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکے ہیں۔ شام کے قریب انہوں نے نیچے سامان والے خانے سے ہمارے بیگ نکالے اور ان کی تلاشی لینے لگے۔ وہ ایک ایک چیز نکال کر دیکھ رہے تھے۔ کریم بھائی کے بیگ سے خاصی رقم نکلی جو انہوں نے اپنے قبضے میں لے لی۔ جس کے بیگ سے جو چیز پسند آئی وہ بلا تکلف ہتھیا لیتے اور باقی سامان بے پروائی سے ادھر اُدھر پھینک رہے تھے اور بعض چیزیں تو سمندر میں پھینک دی تھیں۔ جب میرے بیگ کی باری آئی

تو میں بے چین ہو گیا اس میں کچھ رقم تھی اور میرے کپڑے تھے یا پھر ڈائجسٹ تھے جو میں شوق سے پڑھتا تھا مگر اصل چیز رازکار یا ہوا حلوا تھا۔ وہ ان کے ہاتھ آجاتا تو وہ کسی صورت اسے نہیں چھوڑتے۔ میری خواہش تھی کہ وہ اسے نہ کھائیں مگر میں کیا کرتا۔

بالآخر تلاشی لینے والے نے شاپر تک رسائی حاصل کی اور اسے کھولنے کی کوشش میں اس نے پھاڑ ڈالا۔ پھر اس نے قلقاری ماری اور اپنے ساتھیوں سے کچھ کہنے لگا۔ وہ سب جھپٹ کر آئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے تقریباً آدھا کلو حلوے کے ٹکڑے آپس میں بانٹ کر کھا بھی لیے اور میں دیکھتا رہ گیا۔ ہاتھ پشت پہ باندھنے کے بعد انہوں نے ہمیں سیدھے بیٹھنے یا لیٹنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا تھا اور مجھ سے کچھ دور فیض بھی بیٹھا ہوا تھا جب میں نے فیض کو دیکھا اس کے چہرے پہ عجیب سے تاثرات تھے اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے فارسی میں قریب موجود آدمی سے کچھ کہا تو وہ چونکا تھا۔ میں بھی چونکا۔ مجھے یا کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ فارسی جانتا ہے۔ فیض آگے بیٹھا تھا کریم بھائی اور رمضان پیچھا ان سے دور تھے اس لیے وہ اس کی بات نہیں سن سکے تھے۔ پھر فیض نے جان کر اپنی آواز آہستہ رکھی تھی۔ ایرانی اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس نے فیض کو گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور کچھ بولا۔ فیض خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے بولتے ہوئے میری طرف دیکھا اور ایرانی میری طرف آیا۔ اس نے پوچھا۔

"حلوے والا بیگ تیرا ہے؟"

"ہاں میرا ہے۔"

ایرانی نے فیض کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کہہ رہا ہے اس میں زہر ملا ہے۔"

میں دنگ رہ گیا۔ پھر میں نے سنبھل کر کہا۔ "یہ بکواس کرتا ہے، حلوا میری منگیتر نے بنا کر دیا ہے۔ اس میں زہر کیسے آسکتا ہے۔"

سب ہماری طرف متوجہ تھے اور غور سے سن رہے تھے۔ کریم بھائی نے بھی فیض کو گھورا۔ "تو پاگل ہو گیا ہے، ہم سب مصیبت میں ہیں اور تجھے مسخری سوجھ رہی ہے۔"

فیض کو بھی احساس ہو گیا کہ اس نے کتنی احمقانہ بات کی ہے۔ وہ چپ ہو کر بیٹھ گیا اور ایرانی اپنے ساتھیوں کے پاس واپس چلا گیا۔ وہ سامان نکال کر اس کی تلاشی لے رہے تھے۔ ان کے انداز سے ہم فکر مند ہو گئے تھے۔ مگر فکر مند ہو کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اچانک ان چاروں میں سے ایک اپنا پیٹ پکڑ کر جھکا اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ انہوں نے قہقہہ لگایا تھا۔ کریم بھائی نے آہستہ سے کہا۔ "یہ پیٹ میں تکلیف کا کہہ رہا ہے بول رہا ہے حلوے میں زہر تھا۔"

پیٹ پکڑنے والے کے ساتھی اس کا مذاق اڑا رہے تھے مگر پھر دوسرا کھڑا ہو گیا اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور فارسی میں کچھ کہا۔ کریم بھائی نے ترجمہ جاری رکھا۔ "اسے چکر آرہا ہے نظر دھندلا رہا ہے۔"

ایک منٹ سے بھی پہلے ان چاروں کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ کوئی پیٹ پکڑ رہا تھا اور کوئی سر۔ پھر ان میں سے ایک چلایا۔ "حلوے میں کچھ تھا۔ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اس نے فیض کی طرف اشارہ کیا اور ایک ایرانی فیض کی طرف آیا۔ اس نے جھک کر پوچھا۔

"کیا اس میں سچ مچ زہر تھا؟"

"ہاں اس میں زہر تھا۔" فیض بولا۔ "اس کی منگیتر نے ملایا ہے۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"تم اپنا منہ بند رکھو۔" میں چلایا۔ "رانو اور میری شادی ہونے والی ہے اس لیے تو بکواس کر رہا ہے۔ وہ کیوں زہر ملانے لگی۔"

"کیونکہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔" فیض زہریلے لہجے میں بولا۔ "تجھ سے نہیں۔"

میں پاگل سا ہونے لگا۔ اگر میرے ہاتھ نہ بندھے ہوتے اور میں برابر والوں سے نہ بندھا ہوتا تو میں فیض پر ٹوٹ پڑتا۔ میں اسے گالیاں دینے لگا۔ باقی سب بھی اسے سنا رہے تھے۔ ایرانیوں کی حالت ہر گزرتے لمحے خراب ہو رہی تھی۔ مجھ سے بات کرنے والا شخص بولا۔ "لیکن حلوے میں زہر تھا۔ وہ انہوں نے کھا لیا ہے۔"

"زہر اسی نے ملایا ہوگا۔" میں نے فیض کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میری منگیتر سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر اس کے ماں باپ نے مجھ سے رشتہ کر دیا اس نے زہر ملا دیا ہوگا تاکہ میں مر جاؤں اور یہ رانو سے شادی کر سکے۔"

"زہر رانو نے ملایا ہے۔" فیض چلایا۔ "وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی اس لیے اس نے حلوے میں زہر ملا کر دیا ہے۔"

فیض چلا رہا تھا اور میں بھی چلا چلا کر اسے گالیاں دے رہا تھا۔ باقی لوگ ہمیں خاموش ہونے کو کہہ رہے تھے مگر ہم کسی کی نہیں سن رہے تھے۔ پھر ایک ایرانی نے اچانک

جھکتے ہوئے الٹی کی اور اس کی الٹی میں خون ہی خون تھا۔ یہ دیکھ کر باقی سب دہشت زدہ ہو گئے۔ وہ الٹی کر کے وہیں گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ ایک ایرانی فیض کی طرف آیا اور اس نے پستول اس پر تان لیا۔ "یہ تیرا کیا ہوا ہے؟"

فیض دہشت زدہ ہو گیا اس نے انکار کیا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"تو نے ہی زہر ملایا تھا۔" ایرانی چلایا اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اب دوسرا ایرانی بھی خون والی الٹیاں کر رہا تھا۔

"اسی نے ملایا ہے۔" میں نے بھی کہا۔ "ورنہ اسے کیسے پتا چلا کہ حلوے میں زہر ہے۔"

"مجھے راتو نے بتایا تھا اس نے کہا تھا کہ میں حلوا نہ کھاؤں۔"

"کتا ہے، جھوٹ بکتا ہے۔" رمضان چاچا نے کہا۔ "میں راتو کو جانتا ہوں وہ شریف بچی ہے تو اس پر الزام لگاتا ہے۔"

باقی سب بھی فیض کو الزام دے رہے تھے اور اس کی حالت خراب تھی کیونکہ اگر الزام اس پر آ جاتا تو ایرانی اسے نہیں بخشتے۔ پستول تانے والے ایرانی نے چاقو نکال کر فیض کے ہاتھ سے بندھی رسی کاٹ دی اور اسے کھینچ کر عرشے پر دوسری طرف لے گیا۔ فیض اس کی منت سماجت کر رہا تھا مگر اس نے فیض کی ایک نہیں سنی۔ وہ پچھلے عرشے پر گئے تو ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے کیونکہ درمیان میں کیبن کی چھت آ گئی تھی۔ اس دوران میں تیسرا ایرانی بھی گر گیا تھا ان کی خون آلود الٹیوں سے سارا عرشہ گندہ ہو رہا تھا۔ اب ہمیں ایرانی اور فیض نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ ایرانی چیخ چیخ کر فیض کو کچھ کہہ رہا تھا۔ اچانک ایک فائر کی آواز آئی اور فیض کی چیخ سنائی دی۔ کچھ دیر پہلے میں اسے گالیاں دے رہا تھا مگر چیخ پر سب کے ساتھ میرا دل بھی دھک سے رہ گیا تھا۔

پھر ایرانی لڑکھڑاتا ہوا آیا اور اپنے ساتھیوں کو ہلانے لگا مگر وہ نہیں اٹھے۔ انہیں ہلاتے ہلاتے وہ خود بھی ڈھیر ہو گیا۔ اس دوران میں ہم خود کو آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ چوتھا ایرانی گرا تو ہم نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ فیض کے برابر میں صابر تھا۔ فیض کی رسی کٹی تو اس کی رسی کسی قدر ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اس نے کوشش کر کے سب سے پہلے اپنا ہاتھ آزاد کرایا اور پھر جلدی سے بے سدھ پڑے ایرانی کے پاس سے چاقو لے آیا اس نے سب سے پہلے کریم بھائی کو آزاد کیا اور وہ آزاد ہوتے ہی ایرانیوں کی طرف لپکا اس نے ان کے ہتھیار قبضے میں لے لیے۔ ان میں سے کوئی مزاحمت کے قابل نہیں تھا۔ صابر ہمیں آزاد کرا رہا تھا۔ رمضان چاچا اور دوسرے کشتی کے اس حصے کی طرف گئے جہاں ایرانی فیض کو لے گیا تھا اور پھر انہوں نے چلا کر کشتی روکنے کو کہا۔

کریم بھائی نے کشتی روک دی۔ فیض پانی میں پڑا تھا اور تقریباً ایک میل دور رہ گیا تھا۔ ہم نے جلدی سے کشتی کا رخ موڑا اور فیض تک پہنچے تھے۔ وہ اوندھے منہ پانی میں بے جان تیر رہا تھا اور اس کے سر سے نکلنے والا خون سمندر کے پانی کو سرخ کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک لکڑی سے کھینچ کر فیض کو اوپر لائے۔ اسے سر میں گولی ماری گئی تھی اور وہ فوراً ہی مر گیا تھا۔ اس کی لاش رکھ کر سب ہی مشغول ہو گئے تھے۔ فیض نے میرے ساتھ برا کیا تھا پھر بھی مجھے بھی ایرانیوں پر غصہ آ رہا تھا۔ مگر کس سے بدلہ لیتے اسے قتل کرنے والا تو خود قریب المرگ تھا۔ زہر اتنا خطرناک تھا کہ ان کے ناک منہ سے خون آنے لگا تھا۔ رمضان چاچا ان کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "کوئی نہیں بچے گا سب مر جائیں گے۔ بہت خطرناک زہر ہے۔"

میں کانپ کر رہ گیا۔ اگر میں حلوے کا ایک ٹکڑا بھی کھا لیتا تو اس وقت ان کی جگہ میری لاش پڑی ہوتی۔ پھر مجھے فیض کی بات یاد آئی۔ اس کے جھوٹ نے اس کی جان لی تھی۔ نہ وہ ایرانیوں سے زہر کے بارے میں جھوٹ بولتا اور نہ ہی یوں مارا جاتا۔ میں نے صمد سے کہا۔ "اس نے جھوٹ کہا تھا راتو ایسا نہیں کر سکتی ہے۔ ایک مہینے بعد تو میری اس سے شادی ہے۔"

صمد نے سر ہلایا۔ "یہ جھوٹ بول رہا تھا اپنی جان بچانے کے لیے۔"

"اڑے چھوڑو۔" کریم بھائی نے پکار کر کہا۔ "ابھی کوئی بات نہیں کرے گا۔ سب چپ کر کے بیٹھو۔"

کریم بھائی، رمضان چاچا اور ایک اور پرانے ساتھی سے مشورہ کرنے لگا۔ وہ آدھا گھنٹا آپس میں بات کرتے رہے۔ پھر کریم بھائی نے اعلان کیا۔ "ابھی ہم جیوانی جا رہا ہے۔ ادھر یہ چار بندے اور فیض کا لاش حکومت کے حوالے کرے گا۔"

"کریم بھائی اگر حکومت کو بتایا کہ حلوا میرا تھا تو پولیس مجھے پکڑ لے گی۔"

"اڑے نہیں جان محمد۔" رمضان چاچا نے کہا۔ "اشتو رنی یہ ہو نہیں گا کہ یہ چار بندے ہمیں سمندر میں

اسی حالت میں ملے۔ جب کشتی پر قبضہ کیا تو فیض نے روکا اور انہوں نے اسے گولی ماردی پھر خود بھی اسی طرح مر گئے۔ زہر کا نام نہیں لیتا ہے۔ کیا سمجھا؟''

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''سمجھ گیا چاچا۔''

''ابھی باقی سب بھی سمجھو پولیس کو کیا بولنا ہے۔ وہ سب سے الگ الگ بیان لے گا۔ کسی کا بیان الگ ہوا تو سب کا شامت آ جائیں گا۔''

کریم بھائی نے کشتی کا رخ جیوانی کی طرف موڑ دیا تھا۔ اس نے ایرانیوں سے اپنی رقم اور دوسروں کا سامان واپس لے لیا تھا۔ ایرانیوں کے پاس ڈالرز اور امارات کے درہم نکلے تھے۔ کریم بھائی نے وہ رقم ان کے پاس رہنے دی۔ انہوں نے قیمتی گھڑیاں اور انگلیوں میں جواہرات والی انگوٹھیاں بھی پہن رکھی تھیں لیکن کسی نے ان کی کوئی چیز نہیں چھوئی۔ رمضان چاچا سب کو سکھا پڑھا رہا تھا اور پھر سبق کی طرح سن رہا تھا۔ وہ اس وقت تک سنتا رہا جب تک مطمئن نہیں ہو گیا۔ حلوے والا شاپر سمندر میں پھینک دیا تھا اور حلوا تو بالکل نہیں بچا تھا۔ ہم نصف رات کے وقت جیوانی پہنچے اور اس وقت تک چاروں ایرانی مر چکے تھے۔ کب خاموشی سے ان کا دم نکل گیا پتا نہیں چلا۔ ایک بار رمضان چاچا نے ان کی نبضیں دیکھیں اور بلند آواز سے اناللہ پڑھا تو سب سمجھ گئے۔ بے شک وہ دشمن بن کر آئے تھے اور انہوں نے فیض کو قتل کیا تھا مگر وہ انسان تھے ہم سب افسردہ ہو گئے تھے۔

جیوانی میں کریم بھائی نے لنگر اندازی کی اور پولیس سے پہلے کوسٹ گارڈ کے آفس رابطہ کر کے رپورٹ کی۔ کوسٹ گارڈ والوں نے پولیس بلا لی۔ پولیس والے ہمیں بھی ملوث کرنا چاہ رہے تھے مگر کوسٹ گارڈ کے افسران درمیان میں آئے اور ہماری گلو خلاصی ہوئی۔ اس کے باوجود ہم دو دن تک وہاں رکے رہے۔ وہیں سے فیض کے باپ کو اطلاع کی اور وہ بے چارہ روتا دھوتا آیا تھا۔ بیٹے کو بری صحبت سے بچانے کے لیے اس نے کریم بھائی کے ساتھ کیا تھا اور یہاں موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کارروائی کے بعد لاش لے گیا اور ہمیں بھی جانے کی اجازت ملی۔ مرنے والوں کو ایرانی قرار دے کر ایران کی حکومت سے رابطہ کیا گیا تھا لیکن پھر ان کا کیا ہوا ہمیں نہیں معلوم۔ ہم واپس سمندر میں آئے اور جیوانی سے آگے پھر شکار کیا اس بار قسمت مہربان تھی اور مزید چند جال لگانے پر سرد خانہ پورا بھر گیا تھا۔ جیوانی سے مزید برف لے لی تھی اس لیے مچھلی بڑی اچھی طرح محفوظ تھی۔ پھر ہم نے کراچی کا سفر شروع

آپ نے پیرس اگر دیکھا نہیں تو اس شہر کی تصویریں ضرور دیکھی ہوں گی۔ آپ کو واضح طور پر دکھائی دے گا کہ پیرس میں یوں تو بہت اونچی اونچی عمارتیں ہیں لیکن وسطی پیرس میں ایسی اونچی اونچی عمارتیں نہیں بنائی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پیرس کے حسن کو برقرار رکھنے کے لیے ایسی پلاننگ کی گئی ہے، بلکہ اس کی وجہ ایک خطرناک غلطی ہے۔ تیرہویں صدی میں (جہاں اب پیرس آباد ہے) جپسم اور چونے کے بہت بڑے بڑے ذخائر تھے اور کان کنی کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے لاتعداد سرنگیں بنائی گئی تھیں۔ جو بہت دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ وہاں ایک طرف تو سرنگوں سے کام لیا جا رہا تھا اور دوسری طرف پیرس شہر کی بنیادیں رکھی جا رہی تھی۔ عمارتیں بنائی جا رہی تھیں لیکن کسی نے یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان سرنگوں کے جال کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان سرنگوں کے اوپر ہی عمارتیں بنتی شروع ہو گئیں۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جب شاخ نازک پر آشیانہ بنایا جائے گا تو ایسا ہی ہوگا۔ عمارتیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پھر کنگ لوئس کو تشویش ہوئی۔ اس نے ماہرین کی ایک ٹیم مقرر کی کہ دیکھو یہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ بادشاہ سلامت پورا پیرس ہی خطرے میں ہے۔ اب اس عظیم الشان غلطی کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے یہ طے پایا کہ سینٹرل پیرس یعنی وسطی پیرس میں اونچی عمارتیں نہ بنائی جائیں۔

مرسلہ: ندیم مرزا، حیدر آباد

کیا۔ سیزن کا آخر تھا اور اس لیے مال کم آ رہا تھا اور بیوپاری ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولی لگا رہے تھے۔ مچھلی کے بہت اچھے دام ملے۔

کریم بھائی نے میرے حصے کی رقم دی تو میں نے کراچی سے اپنی شادی کی خریداری کر لی۔ ساری رقم خرچ ہوگئی اور جو ساتھ لایا تھا وہ بھی لگ گئی بلکہ کچھ رقم ادھار لینی پڑ گئی۔ میں واپس پہنچا تو اماں تاریخ لے چکی تھی۔ اس سفر کے دوران میں اور گاؤں آنے پر بھی میں خود کو یقین دلا رہا تھا کہ فیض نے رانو کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ کریم بھائی نے سب کو سختی سے کہہ دیا تھا کہ اس بارے میں منہ سے ایک لفظ بھی مت نکالیں اگر کسی نے بات کی تو وہ آئندہ کریم بھائی کے ساتھ مچھلی کے شکار پر نہیں جا سکے گا۔ مگر بات چھپی نہیں رہ سکی۔ آدمی اپنے گھر والوں یا بیوی بچوں سے تو بات کرتا ہے۔ سب نے کی اور رفتہ رفتہ سارا گاؤں جان گیا کہ کشتی پر کیا ہوا تھا۔ مگر تقریباً سب کا یہی خیال تھا کہ حلوے میں زہر فیض نے ملایا تھا۔ وہ مجھے مارنا چاہتا تھا۔ زمین سے دور سمندر میں میرا علاج بھی نہیں ہو سکتا تھا اور زہر کتنا زوداثر تھا کہ اس نے چند گھنٹوں میں ان ایرانیوں کی جان لے لی تھی۔

میرا دل بھی یہی کہتا تھا کہ یہ کام فیض کا ہے۔ رانو ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ مگر دماغ شک کر رہا تھا۔ وہ سوال اٹھا رہا تھا کہ رانو نے خاص طور سے سمندر میں حلوا کھانے کو کیوں کہا تھا اور پھر کسی دوسرے کو حلوا کھلانے سے کیوں منع کیا؟ اس نے کیوں اصرار کیا تھا کہ حلوا صرف میں کھاؤں؟ یہ چیز میرے اندر بوجھ سی بن رہی تھی۔ اسے اتارنے کا آسان طریقہ یہ تھا کہ میں رانو سے شادی سے انکار کر دیتا مگر میں ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ رانو سے محبت میرے وجود کا حصہ بن گئی تھی۔ میں اسے اپنے وجود سے نکال نہیں سکتا تھا۔ میرا دماغ کہتا تھا کہ اسے چھوڑ دے شاید اسی نے تجھے زہر دیا ہے مگر دل کہتا تھا کہ اگر اس نے زہر دیا ہے تب بھی تو کھا لیتا۔ اب بھی دے تو کھا لینا۔ محبت میں جان دینا تو محبت کرنے والوں کا شیوہ رہا ہے۔ اسی کشمکش میں شادی کی تاریخ پاس آ گئی میں نے سر پر سہرا سجایا اور رانو کو دلہن بنا کر لے آیا۔

شادی کے شروع دنوں میں رانو نے مجھے ایسی محبت دی، میری ایسی خدمت گزاری کی کہ میں اسے اپنے ہاتھ سے حلوے میں زہر ملاتے دیکھ چکا ہوتا تب بھی بھول جاتا اور اس وقت تو میں بالکل بھول گیا تھا۔ شادی کے ایک ہفتے بعد شکار پر گیا تھا مگر میرا دل بالکل نہیں لگا تھا۔ میں نے دن نہیں

لمحے گن گن کر گزارے تھے اور میرے ساتھی میری کیفیت پر ہنستے تھے مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میرے دل و دماغ میں رانو بسی ہوئی تھی۔ جب میں واپس پہنچا تو وہ ماں بننے کی خوشخبری لیے میرا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی ہماری شادی کو مشکل سے ایک مہینا ہی ہوا تھا پھر اس نے میرے بیٹے کو جنم دیا تو میری کائنات مکمل ہو گئی تھی۔ مجھ سے زیادہ اماں خوش تھی۔ بیٹے کا نام بابا کے نام پر غلام محمد رکھا۔

رانو کا میکہ پاس تھا جب یاد آتی چلی جاتی۔ ایک بار میں شکار سے آیا تو وہ ماں باپ کے گھر گئی ہوئی تھی میں اس سے ملنے اور اس کے ماں باپ کو سلام کرنے چلا گیا۔ غلام محمد چلنے پھرنے والا ہو گیا تھا اور جیسے ہی میں اندر داخل ہوا وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے اسے پیار کیا۔ سب سے ملا۔ مالک چاچا نے کھانے پر روک لیا۔ کچھ دیر بعد صحن میں دسترخوان بچھا دیا اور کھانا لگا دیا تھا۔ ہم کھانا کھا رہے تھے اور غلام محمد آس پاس دوڑ رہا تھا۔ تب میری ساس لعتی چاچی نے کہا۔ ”رانو بچے کا خیال رکھ، ادھر بہت تیز چوہے مار زہر ہے۔ یاد ہے تیرا بابا لایا تھا جب گھر میں چوہے بہت آنے لگے تھے۔“

مالک چاچا نے سر ہلایا۔ ”تیری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے خالص زہر ہے آدمی کھا لے تو مشکل سے بچتا ہے تین چار گھنٹے میں خلاص ہو جاتا ہے۔“

تب میں نے چونک کر رانو کی طرف دیکھا اور اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا پھر اس نے جھپٹ کر غلام محمد کو پکڑ لیا۔ ”بابا میں تو بھول گئی تھی۔“

”اڑے تیرے پاس ہی تو رکھوایا تھا پھر بھی بھول گئی۔“ مالک چاچا نے ہنس کر کہا۔ سب آپس میں ہنس بول رہے تھے اور میں خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ چاچی نے کہا کہ وہ آج ہی زہر گٹر میں پھینک دے گی کیونکہ چوہے اب نہیں آتے تھے۔ جب میں اور رانو گھر آئے تو رانو چپ چپ سی تھی۔ البتہ جب میں نے اس سے بات شروع کی تو وہ بھی بولنے لگی۔ اگلے دن تک بظاہر سب ٹھیک ہو گیا تھا لیکن میرے اندر کچھ ٹھیک نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد جب رانو میرے سامنے کھانا یا کھانے کی کوئی چیز رکھتی تو میرے دماغ میں لازمی آتا تھا کہ اس میں زہر تو نہیں ہے۔ میں اس سوچ سے جتنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں یہ اتنی ہی میرے ذہن سے چپکی ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک بار خطا کر چکی تھی۔ دوبارہ بھی یہ خطا سرزد ہو سکتی تھی۔

سازش

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
اپنے مفاد کی خاطر لوگ کیسی کیسی سازش کرتے ہیں، دانستاً غلط راستے کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ تک بھول جاتے ہیں کہ اوپر والے نے کسی کا برا چاہنے سے منع کیا ہے، روبی کی خطائے میری زندگی میں خوشیاں کس طرح بپھردیں یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

عالیہ شبیر احمد
(کراچی)

"مس عالیہ سہیل۔" میرے سامنے بیٹھے کمپنی کے ہیومن ریسورس ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ ملک صاحب نے کہا۔ "آپ کو اس پوسٹ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔"

"تھینک یو سر۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں اس ملازمت کے لیے منتخب کر لی جاؤں گی کیونکہ میں نے حال ہی میں ایم کام کیا تھا اور میرے ساتھ جو دوسری خواتین اور لڑکیاں انٹرویو دینے آئی تھیں ان میں سے کئی کے پاس ملازمت کا تجربہ بھی تھا۔

''آپ کی امتیازی مارک شیٹ اس سلیکشن کی وجہ ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''ورنہ ہمارے پاس کئی کینڈیڈیٹس تجربہ کار کے تھے مگر کمپنی کا اصول ہے نئی ملازمتوں کے لیے ہم تازہ اور باصلاحیت امیدواروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ سیلری اور دوسری سہولیات کا پیکیج آپ کے اپائنٹ منٹ لیٹر میں شامل ہوگا۔ آپ کل سے جوائن کر سکتی ہیں لیکن یاد رہے آپ تین مہینے کی آزمائشی مدت کے لیے رکھی گئی ہیں۔ آپ کی کنفرمیشن آپ کی کارکردگی پر منحصر ہوگی۔''

''انشاء اللہ سر میں کنفرم بھی ہوں گی۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

''ویل ڈن ینگ لیڈی۔'' وہ مسکرائے۔ ''آپ کو مبارک ہو۔''

ایک ہفتہ پہلے میں نے انٹرویو دیا تھا۔ آج مجھے پھر انٹرویو کے لیے بلایا تھا لیکن میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ میرا انتخاب ہو جائے گا۔ پہلے انٹرویو میں بارہ امیدوار تھے آج صرف تین تھیں اور ان میں سے میرا انتخاب ہوا۔ یہ بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والی آئی ٹی کمپنی تھی جس کے فنانس ڈیپارٹمنٹ کے لیے ایک خاتون اسسٹنٹ کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک گھنٹے بعد اپائنٹ منٹ لیٹر مل گیا۔ اس کے مطابق آزمائشی مدت میں میری تنخواہ پچیس ہزار روپے تھی۔ کنفرم ہونے کی صورت میں اس میں تیس فیصد تک اضافہ ممکن تھا۔ کمپنی ملازمین کو ہر سال دو مکمل تنخواہ کے برابر بونس دیتی تھی۔ میڈیکل کی سہولت تھی اور پک اینڈ ڈراپ بھی تھا۔ یہ سب میری توقع سے بڑھ کر تھا۔ یہ تو نہیں تھا کہ مجھے اس ملازمت کی اشد ضرورت تھی کیونکہ گھر میں مالی مسئلہ نہیں تھا۔ ماشاءاللہ ابو اور بھائی سب کما رہے تھے۔

مگر میری امی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ آج کے دور میں عورت کو بھی کمانا پڑے یا کم سے کم اسے ملازمت کرنا آتی ہو۔ اسی سوچ کے تحت انہوں نے میری دو بڑی بہنوں کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ مریمہ آپی نے ایم اے کیا اور ایک کالج میں لیکچرر تھیں۔ ان سے چھوٹی شاہینہ آپی نے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ ان کی شادی ایک ڈاکٹر سے ہوئی تھی اور اب دونوں میاں بیوی مل کر اپنا کلینک چلا رہے تھے۔ مریمہ آپا کے شوہر چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں اور وہ مالی لحاظ سے بہت مضبوط ہیں لیکن انہوں نے آپا کو جاب کی اجازت دی ہے۔ میرا رجحان کامرس کی طرف تھا اس لیے میں نے بی کام کے بعد یونیورسٹی سے ایم کام کی ڈگری حاصل کی۔ امی نے مجھ سے کہا۔ ''تم دو سے تین سال جاب کرلو اس کے بعد ہم تمہاری شادی کر دیں گے۔''

امی اپنا نقطہ نظر ہم بہنوں کو پہلے ہی سمجھا چکی تھیں اور انہوں نے مریمہ آپا کے سامنے آپشن رکھا تھا کہ اگر ان کو جاب کرنے اور کمانے میں دلچسپی نہیں ہے تو وہ ان کی شادی فوری کر سکتی ہیں یعنی جیسے ہی کوئی مناسب رشتہ آیا وہ ہاں کر دیں گی۔ آپا نے پروفیشنل ڈگری اور جاب کو ترجیح دی تب امی نے انہیں بھی تین سال کی مہلت دی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر لڑکے یا اس کے گھر والوں کی طرف سے جاب پر اعتراض ہوا تو وہ جاب چھوڑ دیں گی۔ یہ سب امی نے شاہینہ باجی کے سامنے رکھا مگر وہ تو بچپن سے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھ رہی تھیں اور پری میڈیکل میں انہوں نے نمبرز حاصل کرنے کے لیے اتنی محنت کی تھی کہ ان کی اپنی صحت خراب ہو گئی تھی۔ بڑی بہنوں کی دیکھا دیکھی اور پھر یہ دیکھ کر کہ واقعی اگر لڑکی اچھی تعلیم یافتہ ہو اور جاب کر رہی ہو تو اس کے لیے اچھے رشتے بھی آتے ہیں میرا رجحان بھی پروفیشنل تعلیم اور ملازمت کی طرف ہوا تھا ورنہ میں نے دیکھا کہ جو لڑکیاں بس معمولی سا پڑھ کر گھر بیٹھ جاتی ہیں ان کے لیے اچھے رشتے مشکل سے ہی آتے ہیں۔

ماحول بدل رہا ہے۔ اب لڑکیوں کا جاب کرنا اچھا سمجھا جاتا ہے۔ ایک وجہ تو مہنگائی ہے۔ ایک آدمی کتنا ہی کما لے اس کے لیے گھر چلانا دشوار ہوتا ہے۔ اگر گھر میں دو تین کمانے والے ہوں تو پھر بچت کا بھی امکان ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے گھر میں ماشاءاللہ چار کمانے والے ہیں۔ مجھ سے بڑے تینوں بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی جابس پر تھے۔ ابو نے اپنی ملازمت کے دوران ہی یہ پلاٹ لیا تھا اور اس پر ایک پورشن بنوا لیا تھا پھر جب بھائی جاب کرنے لگے تو مزید پورشن بنوائے گئے اور ہر بھائی کی شادی پر اس کا پورشن الگ کر دیا گیا۔ اچھا ہے تو ان کے میٹرز تک الگ کر دیے تھے۔ یوں جب ہمارا گھر مکمل ہوا تو اس میں اوپر نیچے چار پورشن تھے اور چاروں الگ الگ تھے۔ بھائی اور بھابیاں بھی خوش تھیں۔ امی ابو اور میرا پورشن الگ تھا۔ ہم سب اپنی اپنی ذمے داریاں خود اٹھا رہے تھے۔ بھائی امی اور مجھے اپنی مرضی سے دیتے تھے ورنہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یعنی مالی لحاظ سے مجھے اس ملازمت کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں نے ڈگری کے ساتھ جو تجربہ حاصل کرنا تھا اس کے لیے مجھے اس ملازمت کی ضرورت تھی۔

دفتر کا ماحول تو انٹرویو کے دوران میں ہی سامنے آ گیا تھا۔ ایک بہت بڑی کمرشل بلڈنگ کے چار مکمل فلور

کمپنی کے پاس تھے۔ جب کہ آئی ٹی کے شعبے کے لیے گلشن میں الگ سے ایک عمارت تیار ہو رہی تھی جس کے بعد یہاں صرف بزنس کا شعبہ رہ جاتا۔ میری رہائش گلستان جوہر میں تھی اور دفتر شاہراہ فیصل پر تھا اس لیے دفتر آنے جانے میں مشکل سے آدھا گھنٹا لگتا تھا۔ میں پہلے دن دفتر پہنچی تو اپنا اپائنٹ منٹ لیٹر پیش کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ مجھے شبیر صاحب کے ساتھ کام کرنا ہے۔ وہ فنانس کے شعبے کے باس ہیں۔ فنانس کا شعبہ شبیر صاحب سمیت چھ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں دو خواتین اور چار مرد تھے۔ میرا خیال تھا کہ شبیر صاحب عمر رسیدہ شخص ہوں گے لیکن جب ان کو دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی ان کی عمر مجھ سے کم تھی۔ اپنے تر و تازہ چہرے اور چھریری جسامت سے وہ آدمی سے زیادہ لڑکے کا تاثر دے رہے تھے۔ تعارف اور دوسری رسومات کے بعد انہوں نے کہا۔ ”عالیہ آپ براہ راست میرے اندر کام کریں گی اگر آپ پسند کریں تو آپ کو الگ کیبن دیا جاسکے یا پھر آپ مسز بانیہ کے ساتھ کمرا شیئر کرلیں۔“

”سر یہ تو میں ایک دو دن کام کے بعد ہی بتا سکوں گی۔“

شبیر صاحب کے کمرے کے ساتھ ہی ایک کمرا تھا جو مسز بانیہ کو دیا ہوا تھا کیونکہ وہ واحد عورت تھیں۔ ان دونوں کمروں کے آگے چھوٹا سا ہال تھا جس میں لائن سے کیبن تھے۔ ان میں تین مرد حضرات، قاسم علی، شہزاد احمد اور کریم خان کام کرتے تھے۔ تقریباً سب نوجوان تھے۔ صرف مسز بانیہ چالیس بیالیس سال کی لیکن کیوٹ سی خاتون تھیں۔ پہلی ملاقات میں ان سے بے تکلفی ہوگئی اور شام تک میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں ان کے پاس ہی رہوں گی۔ کیونکہ یہاں کمرے کے ساتھ اٹیچ باتھ کی سہولت ملی ہوئی تھی۔ میں نے شبیر صاحب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور اگلے دن تک کمرے میں میری ٹیبل، کمپیوٹر اور دوسری دفتری لوازمات و آلات سیٹ ہو چکے تھے۔ کام سارا کمپیوٹر کا تھا اور ایم کام کے دوران میں ہی میں نے کمپیوٹر پر اکاؤنٹس کا کورس بھی کرلیا تھا اس لیے مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ چند دن میں، میں تمام کاموں سے واقف ہو چکی تھی۔

صبح آتے ہی ہمیں بذریعہ میل کام کا شیڈول مل جاتا تھا اور ہم سارا دن اس کے مطابق کام کرتے تھے۔ درمیان میں اضافی کام آتا تو اسے بھی نمٹاتے جاتے تھے۔ ماحول بہت اچھا تھا۔ پورا دفتر سینٹرلی اے سی تھا۔ جگہ جگہ منرل واٹر کے کولر لگے ہوئے تھے۔ چائے اور کافی کی مشینیں بھی لگی تھیں۔ لنچ پسند کا کینٹین سے آتا تھا۔ جس کا دل چاہتا دفتر میں کھا لیتا ورنہ کینٹین چلا جاتا مگر ساتھ ہی کام کا شیڈول بھی بہت سخت ہوتا تھا۔ صبح نو سے ایک بجے اور دو پہر دو سے شام چھ بجے تک ہمیں بہت کم فرصت کے لمحات ملتے تھے جن میں ہم آپس میں گپ شپ کرسکیں۔ ٹھیک چھ بجے چھٹی ہو جاتی اور جیسے ہی وین میں جانے والی خواتین کی تعداد پوری ہوتی ڈرائیور گاڑی نکال لیتا تھا۔ ساڑھے چھ بجے تک میں گھر آجاتی تھی۔ شروع میں یہ روٹین سخت لگی تھی مگر چند ہفتے بعد میں عادی ہوگئی اور پھر مزہ آنے لگا۔ کام پر حاوی ہونے کے بعد میں نئے مسائل کا حل خود نکال لیتی تھی۔ شاید اسی لیے تین مہینے ہوتے ہی مجھے کنفرمیشن مل گئی اور پھر میری تنخواہ میں پورے بیس فیصد کا اضافہ ہوا اس کا مطلب تھا کہ کمپنی میرے کام سے خوش تھی۔

میری فطرت ذرا ریزرو سی ہے اور میں اجنبی مرد حضرات تو کیا جان پہچان والے سے بھی بہت کم بات کرتی ہوں۔ اپنے کزنز میں، میں خشک مزاج مشہور ہوں کیونکہ میں ان سے زیادہ بات نہیں کرتی اور نہ ہی گھلتی ملتی ہوں۔ یہی رویہ میں نے آفس میں برقرار رکھا۔ یہ بات تو انتظامیہ کی طرف سے دفتر میں ایسا ماحول بنایا گیا ہے جس میں اسٹاف کا کوئی مرد ممبر خواتین سے بے جا بے تکلف ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا ہے کیونکہ ماضی میں بعض ایسے لوگ جو خواتین کا احترام نہیں کرتے تھے اور ان سے غیر مستحق تعلق رکھنا چاہتے تھے انہیں بلا تردد خارج کردیا گیا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کمپنی کے لیے کتنے کار آمد تھے۔ اس کے بعد سے رنگین فطرت لوگ محتاط ہو گئے اور جو اچھی فطرت کے مرد تھے انہوں نے ماحول کو مزید بہتر کیا۔ میرے شعبے میں کام کرنے والوں میں کریم خان کچھ رنگین مزاج تھا کیونکہ آتے جاتے اکثر اس کی نظریں میرا پیچھا کرتی تھیں مگر اس نے کبھی مجھ سے بے تکلف ہونے یا دفتری امور سے ہٹ کر بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

شبیر صاحب نوجوان ہونے کے باوجود اس معاملے میں بہت اچھے اخلاق والے تھے۔ وہ نہ تو بلا ضرورت ہمیں بلاتے تھے اور نہ ہی ہمارے کمرے میں آتے تھے حالانکہ درمیان میں دروازہ تھا۔ زیادہ تر وہ کال کرتے تھے اور جب بات آمنے سامنے کرنے والی ہو تب ہی بلاتے تھے۔ اسی طرح وہ شاذ ہی ہمارے کمرے میں آتے تھے اور جب آتے تو پہلے دستک دیا کرتے تھے۔ پیشہ ورانہ امور سے ہٹ کر بہت کم کوئی بات کرتے اور وہ بھی عام طور سے ایک دو جملوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ شبیر صاحب نے ایم بی اے کیا

تھا اور وہ آٹھ سال سے کمپنی کے ساتھ تھے۔ جب فنانس کو اکاؤنٹس سے الگ کر کے نیا شعبہ بنایا تو ان کو اس کا ہیڈ مقرر کیا۔ تعلیم کے معاملے میں شبیر صاحب کے بعد میں آتی تھی۔ میں نے ایم کام کیا تھا۔ مسز بانیہ گریجویٹ تھیں اور باقی مرد حضرات بھی گریجویٹ تھے۔ یہاں دفتری شعبے میں گریجویٹ سے کم رکھنے کا رواج ہی نہیں تھا۔

رفتہ رفتہ میری واقفیت دوسرے شعبوں سے بھی ہوتی رہی۔ اگرچہ پوری کمپنی کا ماحول تقریباً ایک ہی جیسا تھا مگر جہاں تک باس کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے ہم خوش قسمت تھے کہ شبیر صاحب جیسا باس ملا ہوا تھا جو صرف ہم سے کام کم لیتے اور خود سے ذمہ داریوں میں اپنا حصہ بڑا رکھتے تھے پھر ہمیں کوئی مسئلہ ہوتا تو اسے ذاتی کوشش سے حل کرتے۔ میں نے ایم کام کیا تھا جو خالصتاً اکاؤنٹس پر مشتمل ہوتا ہے جب کہ فنانس اس سے ذرا الگ شعبہ ہے۔ ہمیں کمپنی کے لیے فنانس پالیسی کی سفارشات بھی مرتب کرنی ہوتی تھیں اس لیے میں نے ایک سال بعد سوچا کہ مجھے فنانس کی فیلڈ میں شارٹ ایم بی اے کورس کر لینا چاہیے۔ ایک اچھا ادارہ ایوننگ کلاسز کر رہا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کی کلاسز شام چھ سے رات آٹھ بجے تک تھیں۔ یہ ایک سال کا کورس تھا۔ چھ بجے کلاس لینے کے لیے مجھے پانچ بجے آف کرنا ہوتا۔ میں نے شبیر صاحب سے بات کی اور انہوں نے اوپر بات کی مگر ہمارے شعبے کے ڈائریکٹر نے انکار کر دیا انہوں نے مجھے طلب کر کے کہا۔

”مس سنبل، کمپنی آپ کو پوری طرح سپورٹ کرے گی، آپ کی فیس بھی ادا کرے گی لیکن یہ کمپنی کو ورل ہے کسی بھی ورکر کو آفس ٹائم لیو نہیں دی جاتی ہے۔“

مجھے مایوسی ہوئی اور میں نے پھر شبیر صاحب سے درخواست کی۔ ”سر آپ اس معاملے میں کچھ کریں۔“

”میں نے کوشش کر لی ہے۔“ شبیر صاحب نے کہا۔ ”لیکن میں پھر کوشش کرتا ہوں۔“

اس کے دو دن بعد مجھے اجازت مل گئی۔ میں حیران رہ گئی کہ مجھے کیسے اجازت مل گئی جب کہ کمپنی کا یہ رول ہی نہیں تھا مگر اس وقت میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اسے شبیر صاحب کی کاوش سمجھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ کاوش سے بڑھ کر انہوں نے میرے لیے کیا کیا تھا۔ انہوں نے کمپنی حکام کو گارنٹی دی تھی کہ میرے حصے کا کام مکمل ہوگا۔ اجازت کے ساتھ کمپنی کی طرف سے مجھے یہ سہولت دی گئی کہ آفس کی گاڑی مجھے یونیورسٹی تک چھوڑ کر آتی جو گلشن میں تھی اور پھر میں وہاں سے خود واپس گھر آتی۔ یہ ذرا مشکل تھا کیونکہ اس علاقے میں پبلک ٹرانسپورٹ مشکل سے ملتی تھی۔ مجھے رکشا کر کے واپس آنا پڑتا تھا اور رات کے وقت اکیلے رکشے میں بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ مگر جلد یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ گلستان جوہر سے ہی دو لڑکیاں اور بھی جاتی تھیں وہ بھی جاب پیشہ تھیں اور جاب سے یونیورسٹی آتی تھیں۔ ہم تینوں نے مل کر ایک رکشے والا ہائر کر لیا وہ پہلے ان دونوں کو ان کے دفتروں سے لاتا تھا اور پھر چھٹی کے بعد ہم تینوں کو گھروں پر چھوڑتا تھا۔ میرا اور کسیرا کا بلاک چندرہ تھا اور ہما بلاک بارہ میں رہتی تھی۔ پہلے رکشے والا ہمیں چھوڑتا اور پھر آخر میں ہما کو اس کے گھر چھوڑتا تھا۔ اس کی وجہ سے ہمارے گھر والے بھی مطمئن ہو گئے کہ اب حالات کیسے ہی ہوں اور پبلک ٹرانسپورٹ بند بھی ہو تب بھی ہم گھر آ سکتے تھے۔

ایک سال کا عرصہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا اور میں نے بہت اچھے گریڈ کے ساتھ ایم بی اے کر لیا۔ اگرچہ مجھے بہت سخت محنت بھی کرنا پڑی تھی۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد بھی ایک دو گھنٹے پڑھنا پڑتا تھا۔ امی بے چاری اب سارا کام خود کرتی تھیں ورنہ پہلے میں دفتر سے آ کر رات کا کھانا تیار کرتی تھی۔ امی گوشت سبزی تیار کر دیتی تھیں۔ میں آ کر سالن بنا لیتی اور پھر روٹی ڈال لیتی تھی۔ آخر میں آٹا گوندھ کر، برتن اور کچن دھو کر سوتی تھی۔ پھر چھٹی والے دن سارے ہفتے کے کام نمٹاتی تھی۔ اگر کہیں آنا جانا نہیں ہوتا تو گھر کی تفصیلی صفائی کرتی تھی۔ صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی مگر وہ ایک حد تک ہی صفائی کرتی تھی۔ صحیح سے صفائی میں ہی کرتی تھی۔ مگر اب مجھے وقت نہیں ملتا تھا۔ بہرحال کورس مکمل ہوا تو میں نے دوبارہ سے کچن میں اپنا کام سنبھال لیا۔ تب امی نے مجھ سے کہا۔ ”عالیہ تجھے جاب کرتے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں ماشاءاللہ سے چوبیس کی ہو جائے گی۔ میں اور تیرے ابو سوچ رہے ہیں کہ اب تیری شادی کر دیں۔“

میں سچ کہوں گی ہر لڑکی کی طرح میرا خواب اور ارمان بھی شادی تھا۔ ایک شخص ہو جو میرا ہو۔ میرا اپنا گھر ہو میرے بچے ہوں۔ ایک عورت کو یہی چیزیں مکمل کرتی ہیں اس لیے امی کے منہ سے سن کر مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے شرما کر کہا۔ ”جیسے آپ مناسب سمجھیں، میں نے سب آپ پر چھوڑا ہے آپ اور ابو ہمارے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں وہی کرتے ہیں۔“

"جیتی رہو۔" امی نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "ہمیں بھی تم پر پورا اعتماد ہے کہ تم کوئی فیصلہ غلط نہیں کروگی اس لیے اگر تمہاری کہیں خواہش ہے تو......؟"

"بالکل نہیں امی۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ میری نیچر جانتی ہیں۔"

"ہاں بیٹا لیکن یہ چیز تو فطری ہے۔ اللہ نے مرد اور عورت دونوں کو پسند کا اختیار دیا ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ جو کریں گے وہی میرے لیے اچھا اور بہتر ہوگا۔"

"ٹھیک ہے میں اب تلاش شروع کرتی ہوں۔ باقی جو اللہ کی مرضی، جوڑے تو وہی بناتا ہے۔"

امی نے تلاش شروع کر دی۔ جہتوں اور ملنے والوں سے کہہ دیا۔ ہمارا خاندان خاصا بڑا ہے امی کی طرف سے بھی اور ابو کی طرف سے بھی۔ بے شمار کزنز ہیں ایک بار شاہینہ باجی نے باقاعدہ حساب لگا کر انکشاف کیا کہ ہمارے کزنز کی تعداد ستر سے زیادہ ہے۔ کسی شادی کے موقع پر صرف خاندان سے آنے والوں کی تعداد سو سے تجاوز کر جاتی تھی۔ امی ابو دور کے کزنز تھے اس لیے دونوں طرف سے تقریباً ایک ہی خاندان شمار ہوتا ہے۔ یعنی خاندان میں رشتوں کی کمی نہیں تھی مگر امی ابو خاندان میں شادیوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ خاندان میں مسلسل شادیاں کرنے سے اگلی نسل نقائص والی پیدا ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے خود میرے کئی کزنز ایسے نقائص کا شکار تھے اور ان کی زندگی بہت مشکل میں تھی۔

شاید اسی وجہ سے امی ابو نے ہم سب بہن بھائیوں کی شادیاں خاندان سے باہر کی تھیں۔ ماشاء اللہ سے میرے سارے بہن بھائیوں کی اولادیں صحت مند ہیں۔ امی کا کہنا تھا کہ اولاد کا دکھ ماں باپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ امی کی ایک بیٹی ہوئی تھی جن کی ریڑھ کی ہڈی میں پھوڑا تھا اور وہ صرف سات مہینے زندہ رہ کر وفات پا گئی تھیں۔ امی آج تک انہیں یاد کرتی تھیں۔ کبھی چپکے سے تنہائی میں ان کی تصویروں کا البم نکال کر بیٹھ جاتیں۔ روتی رہتیں اور تصویروں کو پیار کرتی رہتیں اس لیے امکان تھا کہ میری شادی بھی خاندان سے باہر ہوگی۔ میں خوش تھی اور جب اگلے روز دفتر گئی تو مسز ہانیہ نے بھانپ لیا۔ "کیا بات ہے آج تو بڑی پیاری لگ رہی ہو۔"

"پیاری تو میں ہمیشہ سے ہوں۔"

"مطلب یہ کہ آج رنگت میں گلابیاں زیادہ جھلک رہی ہیں۔"

میں نے ہنس دی مگر لنچ کے موقع پر انہیں بتا دیا کہ امی نے میرے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ مسکرائیں۔ "تبھی میں کہوں کہ چہرے پر کیا سج آیا ہے۔"

"لیکن آپ کسی سے کہیے گا مت۔"

"یہاں ہم دونوں کے سوا ہوتا کون ہے جس سے بات کی جائے۔" انہوں نے کہا۔ "ویسے ایک بات بتاؤ شادی کے بعد جاب کروگی۔"

میں نے شانے اچکائے۔ "ہونے والے میاں اور سسرال پر ہی منحصر کرتا ہے۔ ان کی طرف سے رضامندی ہوگی تو کرلوں گی ویسے کم سے کم ایک سال کی چھٹی تو کروں گی۔ صبح سے شام تک ایک روٹین نے تھکا دیا ہے۔"

"میرا بھی یہی مشورہ ہے اگر میاں جی اور سسرال والے جاب چھوڑنے کو کہیں تب بھی سال کی چھٹی لے لینا۔ بعد کے حالات کا کسے پتا ہوتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میں اس پر غور کروں گی۔"

اتفاق کی بات ہے کہ اس سے اگلے دن مسز ہانیہ کی طبیعت خراب ہوئی اور ڈاکٹروں نے ان کو اپنڈکس تشخیص کیا۔ وہ اسپتال ایڈمٹ ہو گئیں اور چودہ دن کی چھٹی لے لی۔ اب میں اکیلے کام کر رہی تھی اور میرا دل مشکل سے لگ رہا تھا اگرچہ ہمیں اکثر صرف لنچ میں بات کرنے کا موقع ملتا تھا مگر اس کے باوجود ان کی موجودگی کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ اب خالی کمرا کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ اگلے دن شبیر صاحب کو کوئی کام تھا تو انہوں نے دروازے پر ناک کی اور پھر اندر آ گئے۔ میں ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ "یس سر مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"نہیں چھوٹا سا کام تھا۔" وہ بولے۔ "اپنی آج کی ورک شیٹ کھولیں۔"

میں نے کھول لی اور وہ مجھے کچھ ہدایات دینے لگے۔ میں سمجھ گئی۔ "میں کرلوں گی۔"

"کر کے مجھے شیٹ بھیج دیجیے گا۔" انہوں نے جاتے ہوئے کہا پھر دروازے پر رک کر بولے۔ "اس سوٹ میں آپ اچھی لگ رہی ہیں۔"

میں حیران ہوئی تھی کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی ذاتی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ خاص طور سے میری تعریف تو کبھی نہیں کی تھی۔ ان کے لہجے میں کوئی خاص بات نہیں تھی بالکل عام سے لہجے میں کہا تھا مگر میرا دل دھڑک اٹھا۔ وہ کہہ کر چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب میں انہیں شیٹ مکمل

کر کے بتانے لگی تو میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔ ''سر کیا میں صرف اسی سوٹ میں اچھی لگی ہوں۔''

جیسے میں ان کی بات پر حیران رہ گئی تھی اسی طرح وہ میری بات پر حیران ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں آپ پر تو ہر لباس سجتا ہے، اچھا لگتا ہے لیکن یہ میرا فیورٹ کلر ہے اس لیے میں نے کہہ دیا۔ اُمید ہے آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔''

''نہیں سر بلکہ مجھے اچھا لگا۔'' میں کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ذاتی گفتگو نہ ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ جیسے مجھے علم تھا کہ شبیر احمد غیر شادی شدہ ہیں اور ان کا اس دنیا میں ایک ماں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ان کا پس منظر عام سا تھا اور وہ ذاتی محنت اور کاوش سے اس مقام تک پہنچے تھے۔ اسی طرح ان کو میرے گھر، ماں باپ اور بہن بھائیوں کے بارے میں علم تھا۔ انہیں امی کی یہ بات بہت اچھی لگی تھی کہ عورت کو اگرچہ ملازمت کرنی نہیں چاہیے لیکن اسے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ شبیر احمد نے کہا تھا۔ ''میرے خیال میں ایک پروفیشنل عورت نہیں بہتر بیوی اور ماں ثابت ہوتی ہے کیونکہ وہ دنیا کی اونچ نیچ اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ اولاد کی ٹھیک رہنمائی کر سکتی ہیں۔''

''میری امی بھی یہی کہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے دنیا کا سب علم بھی ہونا چاہیے تب ہی تو وہ اپنے بچوں کی صحیح پرورش کر سکتی ہے۔''

دیکھا جائے تو یہ سچ ہی ہے، عام پڑھی لکھی اور کسی کیریئر سے عاری لڑکیاں شادی کے بعد ایک عام سی بیوی اور ماں ثابت ہو رہی ہیں۔ بس کھا پی لیا، باہر تفریح کر لی اور ٹی وی کے آگے بیٹھ کر دنیا جہان کے ڈرامے دیکھ لیے۔ اس کے بعد بچوں کو کارٹون نیٹ ورک لگا کر ان سے جان چھڑا لی۔ بالآخر انہیں مہنگی فیسوں والے ذوقی اسکولز میں داخل کرا دیا جہاں ان پر علم کتابوں کی صورت میں لاد دیا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں جو عورتیں خود جاب کرتی ہیں وہ وقت کی کمی کے باوجود اپنے بچوں کے کیریئر اور ان کی تعلیم و تربیت پر کہیں زیادہ توجہ دیتی ہیں۔ ان کے بچے بہتر کیریئر منتخب کرتے ہیں اور کامیاب رہتے ہیں۔ شبیر احمد کے خیالات سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ مگر اس روز انہوں نے میری تعریف کی تو مجھے الگ طرح کی خوشی ہوئی تھی۔ میں سمجھنے سے قاصر تھی کہ مجھے اتنی خوشی کیوں ہوئی جب کہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھا کہ وہ میری ایسی کوئی تعریف کریں گے۔

وہ کافی پسند کرتے تھے اور ان کے کمرے میں اس کی کیٹل لگی ہوئی تھی جس میں ہمہ وقت گرم کافی موجود رہا کرتی تھی۔ وہ جب چاہتے اس میں سے نکال کر پی لیتے تھے۔ صبح چپراسی کیٹل میں کافی ڈال دیتا تھا لیکن اس روز وہ ڈالنا بھول گیا تھا۔ میں ایک کام سے ان کے کمرے میں آئی تو وہ کیٹل کے ساتھ لگے ہوئے تھے ان کو پتا نہیں تھا کہ کتنا پانی اور کافی پاؤڈر ڈالنا ہے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کہا۔ ''آج نیر کافی ڈالنا بھول گیا اب مجھے تناسب سمجھ نہیں آ رہا ہے۔''

''میں بتا دیتی ہوں سر۔'' میں نے کہا اور ڈبا لے کر کیٹل میں پانی اور کافی ڈال کر اسے پلگ پر رکھ دیا۔ یہ الیکٹرک کیٹل تھی۔ جتنی دیر میں، میں نے ان سے کام کی بات کی کافی تیار ہو گئی تھی ان کے منع کرنے کے باوجود میں نے انہیں مگ میں نکال کر دی۔ تب انہوں نے ذرا بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اُمید ہے یہ میری زندگی کی سب سے اچھی کافی ہو گی۔''

''مجھے کافی اچھی نہیں لگتی لیکن سب کہتے ہیں کہ میں کافی بہت اچھی بناتی ہوں۔''

وہ مسکرائے۔ ''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ میری زندگی کی سب سے اچھی کافی ہو گی۔''

اس بار بھی میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ شبیر احمد نے یہ بات عام انداز میں نہیں کہی تھی۔ جب میں اپنی سیٹ پر واپس آئی تو میری سانس تیز تھی اور کچھ دیر تک تو مجھ سے کام ہی نہیں ہوا تھا پھر مجھے اپنے اوپر ہنسی آنے لگی۔ وہ پتا نہیں کس سینس میں بات کر رہے تھے اور میں اسے کس طرح سے لے رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شکل و صورت، لب و لہجے اور مجموعی پرسنالٹی کے لحاظ سے شبیر احمد آئیڈیل انسان تھے۔ جتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اتنے ہی اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے میں نے کبھی ان کو کسی ماتحت سے اونچی آواز میں یا اخلاق سے گرے انداز میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سب کا نام لیتے مگر آپ جناب سے ہی بات کرتے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں ان سے ایسی توقع کیوں لگا رہی تھی، کیا میرے اندر ان کے لیے کوئی جگہ بنی تھی؟ میں نے اس حوالے سے خود کو ٹٹولا تو اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی۔ شاید امی نے جب سے شادی کی بات کی تھی تب سے میرے ذہن میں آ رہا تھا کہ میرا جیون

ساتھی کیسا ہونا چاہیے۔ میں سوچ میں اتنی گم تھی کہ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب شبیر احمد اپنے کمرے سے نکل کر آئے تھے۔

"عالیہ......"

میں چونکی اور گھبرا گئی۔ "سر آپ...... سوری میں سن نہیں سکی۔"

"میں آپ کو کال کر رہا تھا۔" انہوں نے انٹرکام کی طرف اشارہ کیا۔ "جب آپ نے جواب نہیں دیا تو مجھے فکر لاحق ہو گئی۔"

"سوری سر۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "میں پتا نہیں کس سوچ میں گم تھی۔"

وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ "عالیہ آپ کو کوئی پریشانی ہے جاب کے حوالے سے؟"

"نہیں سر میں اپنی جاب سے پوری طرح مطمئن اور خوش ہوں سر۔"

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو گھر میں کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں سر، گھر میں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے اس نے مجھے بہت اچھے ماں باپ اور بہن بھائی دیے ہیں۔"

شبیر احمد کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پھر کوئی سوال کرنا چاہ رہے ہیں لیکن ہچکچا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ "سر اگر آپ کچھ پوچھنا چاہ رہے ہیں تو پوچھ سکتے ہیں۔ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔"

انہوں نے سر ہلایا اور گہری سانس لے کر بولے۔ "عالیہ آر یو انگیجڈ؟"

میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ "نہیں سر لیکن......"

"لیکن کیا؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"میری امی آج کل میرے لیے رشتہ تلاش کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں دو سے تین سال جاب کر سکتی ہوں اس کے بعد وہ لازمی میری شادی کر دیں گی۔"

شبیر احمد نے پھر ایک گہری سانس لی اور اس بار زیادہ ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا۔ "عالیہ آپ کے نزدیک میں کیسا انسان ہوں۔"

"بہت ہی اچھے سر۔" میں نے اتنے بے ساختہ انداز میں کہا کہ میں خود حیران رہ گئی۔ پھر شرما گئی۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ گفتگو کس سمت جا رہی ہے اور شبیر احمد آگے کیا بات کرنے والے ہیں۔

"اگر میں اپنی والدہ کو آپ کے رشتے کے لیے آپ کے گھر بھیجوں تو آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟"

اس بار میرا چہرہ زیادہ سرخ ہوا تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر میں گھبرائی نہیں تھی بلکہ میں نے اعتماد سے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے سر آپ جیسے شخص کی رفاقت کسی بھی لڑکی کے لیے باعث فخر ہو سکتی ہے۔ مگر میں آپ کو بتا دوں کہ ایک تو میں آپ کا تعارف گھر میں نہیں کراؤں گی دوسرے فیصلے کا مکمل اختیار میرے امی ابو کو ہوگا وہ اس بارے میں خود چھان بین کر کے فیصلہ کرتے ہیں۔"

شبیر احمد خوش ہو گئے۔ "اگر آپ کو اعتراض نہیں ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں باقی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آپ کے گھر والے جیسے چاہیں چھان بین کریں۔ ویسے کیا آپ کے گھر میں پسند کی شادی اچھی نہیں سمجھی جاتی ہے؟"

"ایسا نہیں ہے امی ابو ہم بہن بھائیوں پر مکمل اعتماد کرتے ہیں، ابھی امی نے میرے رشتے کی تلاش سے پہلے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں کسی کو پسند کرتی ہوں تو وہ پہلے اسے دیکھیں گی۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میرے گھر والے کس طرح کی سوچ رکھتے ہیں۔"

"میری خوش قسمتی ہو گی اگر آپ میری زندگی میں آئیں اور آپ کی فیملی سے میرا تعلق بن جائے۔ آپ جانتی ہیں ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کچھ دور پرے کے رشتے دار ہیں تو انہوں نے خود بھی ہم سے تعلق نہیں رکھا۔ ابو اس وقت دنیا سے گزر گئے جب میں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا، اس کے بعد کا سارا وقت کیریئر بنانے میں گزرا۔ آپ یقین کریں میرے دوست نہ ہونے کے برابر ہیں۔ امی سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی ہیں اور میں ان کو مزید اکیلا چھوڑ کر دوستوں کے ساتھ نہیں گھوم سکتا اس لیے میں نے یہ چکر پالا ہی نہیں۔" شبیر احمد اپنی زندگی کے وہ گوشے میرے سامنے پیش کر رہے تھے جو اس سے پہلے انہوں نے کبھی نہیں دکھائے تھے۔ "امی سات سال سے مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ میں شادی کر لوں تاکہ ان کی اور میری تنہائی دور ہو مگر نہ جانے کیوں جب میں اس بارے میں سوچتا تو میرا دل نہیں چاہتا کہ میں کسی انجانی لڑکی سے شادی کروں جسے جاننے میں بہت سا وقت گزر جائے۔ میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جسے میں جانتا ہوں اور جسے میں چاہتا ہوں۔ عالیہ وہ لڑکی مجھے آپ میں نظر آئی ہے۔" ان کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ "پلیز عالیہ آئی کانٹ افورڈ تو لوز یو۔"

میرے اندر کچھ پگھلنے لگا تھا مگر میں نے خود کو

سنبھالے رکھا۔ ''سر میں نے جو کہنا تھا وہ میں کہہ چکی ہوں، آپ یقین کریں میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتی۔''

''مجھے یقین ہے۔'' وہ بولے اور پھر کھڑے ہو گئے۔ ''میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔'' وہ جاتے ہوئے دروازے کے پاس رکے۔ ''عالیہ ایک بات یاد رکھیے گا' آپ نہیں تو پھر کوئی نہیں۔''

ان کی یہ بات بہت دیر میرے کانوں میں گونجتی رہی کہ آپ نہیں تو کوئی نہیں۔ دو دن بعد مسز ہانیہ کا آپریشن ہو گیا تھا اور شام کو میں انہیں دیکھنے اسپتال گئی۔ وہ ٹھیک تھیں اور خوش تھیں۔ دوران گفتگو نہ جانے کیسے میرے منہ سے وہ سب نکل گیا جو شبیر احمد نے مجھ سے کہا تھا۔ مسز ہانیہ خوش ہو گئیں۔ ''سچ عالی..... کیا سر نے تمہیں پروپوز کیا ہے؟''

''نہیں تو انہوں نے اپنی امی کو ہمارے گھر بھیجنے کی اجازت مانگی ہے۔''

''تو پاگل پروپوز کرنا اور کسے کہتے ہیں۔'' وہ بولیں۔ ''سچ کہوں تو کئی بار مجھے بھی خیال آیا کہ ان کے ساتھ تیری جوڑی خوب سجے گی۔ دونوں ماشاءاللہ خوب صورت اور خوب سیرت ہو۔''

میں خوش ہوگئی۔ ''آپ کو یہ بات اچھی لگی؟''

''ہاں کیونکہ شریف لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، مجھے یقین ہے تمہارے گھر والے اس رشتے سے انکار نہیں کریں گے۔'' مسز ہانیہ نے یقین سے کہا۔ ''سر نے بتایا کہ وہ اپنی امی کو کب بھیجیں گے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں یہ تو انہوں نے نہیں بتایا۔''

''میرا خیال ہے وہ ابھی اپنی امی کو راضی کریں گے اور اس کے بعد ہی تمہیں بتائیں گے۔''

''شاید۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں اس معاملے سے بے خبر رہوں تو اچھا ہوگا۔''

باتوں کے دوران میں اچانک مسز ہانیہ نے انکشاف کیا۔ ''میں شاید جاب چھوڑ دوں۔''

میں بے چین ہوگئی۔ ''کیوں جی، میرا آپ کے بغیر دل نہیں لگ رہا ہے، چند دن میں بوکھلا گئی ہوں۔ خالی کمرا کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔''

''مجبوری ہے ڈیئر، میاں جی کو دبئی میں جاب مل گئی ہے۔ فیملی ویزا بھی ہے تو انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا ہے۔ بچے یہیں رہیں گے، وہ سیٹ ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔'' مسز ہانیہ کے تین بیٹے تھے ان میں سے سب سے بڑے نے حال ہی میں بی بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ اس سے چھوٹا کالج میں تھا اور سب سے چھوٹا نائن کلاس میں تھا۔ وہ جوائنٹ فیملی میں رہتی ہیں۔ ان کے ساس سسر اور دو دیور بھی ساتھ تھے اس لیے بچوں کو چھوڑ کر جانے میں مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

''یہ بہت اچھی جاب ہے۔''

''وہ تو ہے لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں اس سے اچھی جاب مل جائے گی۔ وہ اکیلے نہیں جانا چاہتے اس لیے مجبوری ہے۔ کچھ عرصے بعد تینوں بچے پرائیویٹ یونیورسٹیز میں آجائیں گے تو ان کی فیسیں ادا کرنا پڑیں گی اسی لیے ہم میاں بیوی دل پر پتھر رکھ کر ان سے دور جا رہے ہیں۔ میں ایک سال کی لیو پر جاؤں گی۔ اگر وہاں جاب کا ہو گیا تو یہاں آ کر استعفا دے دوں گی۔''

مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ پھر مسز ہانیہ نے اسپتال سے لیو کی درخواست بھیج دی کیونکہ ان کا ویزا آ گیا تھا اور انہیں جانا تھا۔ ان کی سیٹ خالی ہوگئی تھی اور کام کا بوجھ باقی افراد پر آیا تھا۔ شبیر احمد نے بتایا کہ کمپنی نے ہائرنگ پروسیس شروع کر دیا تھا اس لیے اُمید تھی کہ جلد مسز ہانیہ کا متبادل آ جائے گا۔ مسز ہانیہ کم تعلیم کے باوجود شبیر احمد کے بعد تھیں کیونکہ ان کے پاس تجربہ تھا اس بار جسے ہائر کیا جاتا وہ کم سے کم ماسٹر لیول کی ڈگری ہولڈر ہوتی۔ اس بار بھی کسی خاتون کو ہائر کیا جاتا کیونکہ کمپنی کی پالیسی تھی کہ عورت کی خالی کی ہوئی سیٹ پر کوئی عورت ہی آتی تھی۔ کمپنی نے ملازمتوں میں تقریباً تیس فیصد خواتین کے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔ صرف مخصوص حالات میں اس پالیسی سے انحراف کیا جاتا تھا۔

ایک ہفتے بعد شبیر احمد نے بتایا کہ ان کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ ہارٹ کی مریضہ ہیں اور فی الحال بیڈ ریسٹ پر ہیں جیسے ہی ان کی طبیعت سنبھلے گی وہ انہیں ہمارے گھر بھیجیں گے۔ ہم لڑکیاں کتنی ہی کوشش کرلیں لیکن جب ایک شخص ہمارا امیدوار بن کر سامنے آتا ہے تو ہم نہ چاہتے ہوئے اس کے بارے میں سوچنے لگتی ہیں اس سے اٹیچ ہو جاتی ہیں۔ شبیر احمد کی یہ بات سن کر مجھے شدت سے خواہش ہوئی کہ ان کی والدہ جلدی سے اچھی ہو جائیں اور ہمارے گھر آئیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ امی کے پاس کچھ اچھے رشتوں کا ڈیٹا آ گیا تھا اور اب وہ اس میں سے ابتدائی چھان بین کر رہی تھیں۔ اس کے بعد ہی کسی کو کہا جاتا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ امی کہیں ابتدائی سلیکشن نہ کرلیں۔ بہرحال اب بھی میں نے ان سے بات نہ کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس

پر قائم تھی۔ میں نے شبیر احمد کو اپنی بے چینی سے آگاہ نہیں کیا تھا صرف اتنا کہا۔

"جب آپ کو آسانی ہو۔"

انہوں نے خود پوچھ لیا۔ "آپ کی امی رشتے دیکھ رہی ہیں کہیں انہیں کوئی پسند تو نہیں آ گیا ہے؟"

"کچھ رشتوں کو چنا ہے مگر ابھی بات ابتدائی مرحلے میں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے کہا تھا کہ یہ میرے گھر والوں کا ہیڈک ہے وہ جو فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا۔"

"سچ مچ۔" انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں۔" میں نے آنکھیں چرا لیں۔

انہوں نے کسی قدر بے بسی سے کہا۔ "عالیہ میں کیا کروں قسم سے امی کی حالت ذرا سنبھلے گی تو میں انہیں لے آؤں گا۔"

"میں نے کہا نا آپ آسانی سے لے کر آئیں۔"

"مجھے خوف ہے۔"

میں کہنا چاہتی تھی کہ اب مجھے بھی خوف ہے مگر میں کہہ نہیں سکی۔ مسز بانیہ جانے سے پہلے ملنے آئی تھیں مجھے گلے لگا کر انہوں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "معاملہ آگے بڑھا؟"

"نہیں سر کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جب ٹھیک ہوگی تو وہ ہمارے ہاں آئیں گی۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے۔" انہوں نے کہا۔ "تم نے بتایا کہ تمہاری امی تمہارے لیے رشتے دیکھ رہی ہیں۔"

"میں نے سر کو بھی بتایا ہے لیکن ان کی بھی مجبوری ہے۔"

"کہیں ایسا نہ ہو مجبوری میں دو رہ ہی جائیں۔" مسز بانیہ نے کہا۔ میرا دل بجھ رہا تھا۔ اس بات کو بھی ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس صبح میں دفتر پہنچی تو کچھ دیر بعد شبیر احمد کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ آئے۔ باب کٹ بالوں کے ساتھ اس نے جدید فیشن کا بہت نمایاں کرنے والا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس میں دوپٹا سرے سے غائب تھا۔ خوش شکل ہونے کے ساتھ وہ خوش بدن بھی تھی اور اس کا اندازہ لباس سے بہ خوبی ہو رہا تھا۔ اس نے تقریباً اسکن فٹ لباس پہنا ہوا تھا جو اس دفتر میں نظر نہیں آتا تھا۔ ابھی میں حیران ہی ہو رہی تھی کہ شبیر احمد نے تعارف کرایا۔

"عالیہ یہ ہماری نئی کولیگ روبینہ ہیں لیکن روبی کہلاتی ہیں، مسز بانیہ کی پلیس میں آئی ہیں اور روبی یہ عالیہ ہیں۔"

"نائس ٹو میٹ یو۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن اس کی نظریں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں پھر اس نے منہ بنا کر کہا۔ "ہوا اولڈ اسٹائل سیٹنگ۔"

میں حیران ہوئی کیونکہ یہ سیٹنگ ایک ماہر فرم نے ڈیزائن کی تھی اور اس میں کوئی چیز بھی پرانے انداز کی نہیں تھی۔ اس نے شبیر احمد کی طرف دیکھا۔ "سر مجھے یہ سب چینج چاہیے۔"

"میرا خیال ہے مس روبی کو اپنی سیز کی سیٹنگ پسند نہیں آئی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرے خیال میں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے بہرحال یہ ان کی پسند ہے۔"

"میں صرف اپنی سیز کی نہیں اس سارے کمرے کی بات کر رہی ہوں۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور مجھے اسی لیے اس لڑکی سے چڑ ہوگئی۔

"یہ کمرا شیئرڈ ہے اس لیے سیٹنگ بھی شیئرڈ ہوگی۔ آپ اپنی پسند کی سیٹنگ کرانے کے لیے آزاد ہیں مجھے تو یہی پسند ہے۔"

"لیس مس روبی آپ اپنی پسند کی سیٹنگ کرا سکتی ہیں۔" شبیر احمد نے غیر واضح الفاظ میں میری تائید کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ منع کر دیں گے کہ یہ سیٹنگ مناسب ہے "آپ فی الحال اپنا کام شروع کریں۔"

"لیس سر۔" اس بار روبی کا لہجہ پروفیشنل تھا۔ اس نے اپنا بیگ اتار کر ایک طرف رکھا اور میز پر آ گئی۔ اس سارے دن میں اس نے وقتے وقفے سے شبیر احمد کے کمرے کے کوئی درجن چکر لگائے تھے۔ ذرا سی بات پر ان کے پاس دوڑی جاتی تھی۔ اتنا تو میں اور مسز بانیہ ایک ہفتے میں ان کے پاس نہیں جاتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ گریجویٹ اور ناتجربے کار تھی مگر چند دن بعد یہ جان کر میں حیران ہوئی کہ وہ نہ صرف ایم بی اے ہے بلکہ کسی کمپنی میں جاب کا دو سالہ تجربہ بھی رکھتی ہے۔ البتہ اس نے جس یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں پڑھنے والے اور پڑھانے والے دونوں طرح کے طلبہ پاس ہو جاتے ہیں۔ اس کی ساکھ نہایت خراب تھی اور عرف عام میں اسے ڈیٹ پوائنٹ یونیورسٹی کہا جاتا تھا۔ میرے ماموں کے بیٹے نے غلطی سے وہاں داخلہ لے لیا تھا اور ایک مہینے بعد ہی اس نے جانا چھوڑ دیا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ روبی کو معمولی سے مسئلے پر بھی جا کر

شبیر احمد سے پوچھنا پڑتا تھا۔ حالانکہ یہ سب وہ مجھ سے بھی پوچھ سکتی تھی کیونکہ میں دو برس سے ان ہی مسائل سے نمٹتی آرہی تھی مگر روز اوّل سے اس نے مجھے یوں نظر انداز کیا ہوا تھا کہ صرف اشد ضرورت کے تحت بات کرتی تھی۔ صبح آتی تو میری طرف دیکھے بغیر ایک 'ہائے' اور شام کو جاتے ہوئے بالکل اسی انداز کی 'بائے' ہوتی تھی۔ لنچ کے وقت وہ میس جاتی تھی اور بننے میں آرہا تھا وہاں مرد اسٹاف سے اس کی قہقہے دار گفتگو ہوتی تھی۔ اپنی بے تکلف شخصیت، ڈریسنگ اور معنی خیز انداز گفتگو سے وہ آفس کے مردوں میں خاصی مقبول ہوگئی تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے نیلوفر آپا بتاتی تھیں۔ مسز بانو کے جانے کے بعد میں ان کے ساتھ لنچ کرتی تھی۔ پھر ہم آتے جاتے بھی ایک ساتھ تھے۔ ایک بار اس نے کہا۔

''اس نے ماحول تقریباً خراب کر دیا ہے۔ پہلے جو لڑکیاں سادہ یا سوبر ڈریسنگ کرتی تھیں اس کی دیکھا دیکھی یا مقابلے پر اب وہ بھی اسی کی طرح ڈریسنگ کر کے آنے لگی ہیں۔''

یہ تو میں نے بھی نوٹ کیا تھا کہ جینز اور اسکن فٹنگ کا رواج ہمارے آفس میں بڑھ رہا تھا۔ ایک دن روبی چھٹی پر تھی اس کی طبیعت خراب تھی اس کا پتا مجھے یوں چلا کہ شبیر احمد نے مجھے بلایا اور اس کے خراب کیے ہوئے کچھ کام ٹھیک کرنے کے لیے میرے سپرد کیے۔ ''سوری عالیہ۔'' انہوں نے معذرت کی۔ ''یہ آپ کی ذمے داری نہیں ہے مگر کام اب میری طرف سے جا رہا ہے اور مجھے بہر صورت کر کے دینا ہے۔''

میں نے چیک کیا اور حیرت سے کہا۔ ''سر یہ تو بہت معمولی سی غلطیاں ہیں آدمی دو دن میں انہیں ٹھیک کرنا سیکھ جاتا ہے۔''

انہوں نے گہری سانس لی۔ ''عالیہ میں کیا بتاؤں، اس بار ایچ آر نے بالکل غلط ورکر بھیج دیا ہے۔ وہ نہ تو مطلوبہ قابلیت رکھتی ہے اور نہ ہی اس کے پاس مسائل سے نمٹنے والی ذہانت ہے۔''

''تب وہ یہاں کیسے آگئی؟''

''تم رحمانی صاحب سے واقف ہو۔'' انہوں نے ایک ڈائریکٹر کا نام لیا۔ ''یہ ان کی سفارش پر آئی ہے۔''

''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں سفارش چلتی ہو گی۔''

''سفارش کہاں نہیں ہے لیکن یہ زیادہ عرصے چلنے والی نہیں ہے۔'' شبیر احمد نے یقین سے کہا۔ ''یہ چار مہینے بھی گزار لے تو بڑی بات ہو گی۔''

شبیر احمد کو آخری بار مجھ سے اپنی امی کو بھیجنے کے بارے میں بات کیے ہوئے مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا اس کے بعد سے انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی ایسا کوئی اشارہ دیا تھا کہ ان کی امی جلد میرے گھر آنے والی ہیں۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی مگر میں ان سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ دوسری طرف امی اپنی کوششوں میں تیزی لے آئی تھیں کیونکہ جو ابتدائی رشتے آئے تھے انہیں کسی نہ کسی وجہ سے مسترد کر دیا گیا تھا اور اب نئے رشتوں کی تلاش جاری تھی۔ اس وجہ سے مہلت ملی تھی البتہ یہ زیادہ عرصے چلنے والی نہیں تھی۔ میں جانتی تھی امی ابو جلد یا بدیر کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے اور ایک بار انہوں نے کسی کو پسند کر لیا تو میرے لیے اسے رد کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اپنی پسند سے میں پہلے ہی دست بردار ہو چکی تھی تو اب کس منہ سے امی سے شبیر احمد کا ذکر کرتی۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ وہ جلد از جلد اپنی امی کو ہمارے ہاں بھیج دیں۔

روبی کے آنے کے بعد ماحول بڑا عجیب ہو گیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک شبیر احمد کے کمرے کے دس چکر لگاتی تھی مگر میں ایک بار بھی جاتی تو میری واپسی پر وہ مجھے اتنی معنی خیز اور کاٹ دار نظروں سے دیکھتی تھی کہ میرے لیے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا۔ بعض اوقات تو میرا دل چاہتا کہ اسے کھری کھری سنا دوں۔ کمپنی نے اسے اس کی پسند کی سیٹنگ کرا دی تھی۔ پہلے بھی اس میز پر جدید کمپیوٹر تھا مگر روبی کی فرمائش پر جدید ترین ماڈل منگوایا گیا۔ اس کے ساتھ نیا اور بڑا ایل سی ڈی تھا۔ شیشے کی بنی ہوئی جدید انداز کی میز اور فائبر مٹل چیئر تھی۔ کئی بار میں نے اسے کام کرنے کی بجائے کمپیوٹر پر کوئی میوزک ویڈیو یا انٹرنیٹ پر سرفنگ میں مصروف دیکھا تھا۔ مجھے یہاں جاب کرتے ہوئے دو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا لیکن تفریح کرنا تو ایک طرف رہا میں نے ذاتی ای میل اکاؤنٹ بھی شاید چند ایک بار ہی کھول کر دیکھا تھا۔ لنچ کے اوقات میں، میں اور مسز بانو گپ شپ کرتے تھے۔

اب میں اپنے ساتھ کوئی کتاب رکھنے لگی تھی۔ لنچ کے دوران میں مطالعہ کرتی تھی۔ کبھی کام زیادہ ہوتا تو اس دوران میں وہ نمٹا لیتی تھی۔ روبی دو دن بعد آئی۔ وہ لیٹ آئی تھی اور اتفاق سے میں شبیر احمد کے پاس سے آئی تھی۔ انہوں نے طلب کیا تھا۔ میں آئی تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی پھر

اپنی میز کی طرف بڑھی اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''شاید مجھے دیکھ کر دھچکا لگا؟''
''کیوں بھلا تم میں ایسی کیا بات ہے؟'' میں نے بھی ذرا تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔ ''دراصل اس دفتر میں لیٹ آنے کا رواج نہیں اس لیے تمہیں دیکھ کر میں چونکی تھی۔''
میرے کھرے جواب پر وہ بپھر گئی اور اپنی میز سے اٹھ کر میرے پاس آئی۔ اس نے جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مجھے بے وقوف مت سمجھو، میں اچھی طرح جانتی ہوں یہاں کیا چل رہا ہے؟''
مجھے لگا کہ میرا خون کھنچ کر سر میں آ گیا ہے۔ ''کیا چل رہا ہے؟''
''تم اور سر......'' اس کا جملہ منہ میں رہ گیا کیونکہ میرا ہاتھ اس کے منہ پر لگا تھا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ اس کا منہ پھر گیا۔ میں لرزتے ہوئے کھڑی ہو گئی اور گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔
''اب تم نے ایک لفظ بھی کہا تو......''
''تو کیا کر لو گی تم؟''
''اس تھپڑ سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں ہاتھ سے بھی تمہارا حلیہ بگاڑ سکتی ہوں لیکن میں کمپنی کے مالکان کے سامنے یہ معاملہ اٹھاؤں گی۔ یہ مت سمجھنا کہ کسی ڈر کی وجہ سے چپ کر جاؤں گی۔ تمہیں یہاں سے نکلوا کر دم لوں گی۔''
اس بار اس کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے مگر اس کی آنکھوں میں شدید نفرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ پھر وہ جھٹکے سے پلٹ کر میز کی طرف جانے لگی۔ میں نے پیچھے سے کہا۔ ''اپنے گھٹیا ذہن کو ان باتوں کی بجائے کام پر لگاؤ۔ میں یہاں اپنا کام کرنے بیٹھتی ہوں کسی کے باپ کی نوکر نہیں ہوں جو اس کی غلطیاں درست کروں۔''
میری اس بات پر وہ کسی ناگن کی طرح بل کھانے لگی تھی۔ اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ روبی انسانوں کی اس صنف سے تعلق رکھتی ہے جو دوسروں کی کرید میں رہتے ہیں اور اگر ان کو کسی کی کمزوری کا پتا چل جائے تو وہ اسے اچھالنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کرتے ہیں۔ شاید اسے شبیر احمد کی کسی بات سے اندازہ ہوا ہو گا کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تب ہی وہ میرے منہ تک آئی تھی لیکن میں نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو ایسے لوگوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ وہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ میں ڈر جاؤں گی اس کی منت سماجت کروں گی کہ یہ بات کسی سے نہ کرے مگر جب میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا تو میں کیوں اس سے دبتی۔ میرے تھپڑ اور دھمکی نے اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیے تھے۔ وہ دم سادھ کر کام کرنے لگی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ بات شبیر احمد کے علم میں لاؤں یا نہیں مگر خاصے غور وفکر کے بعد میں نے اس بارے میں چپ رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارا کمرا انفرادی طور پر ساؤنڈ پروف تھا اس لیے آوازیں باہر نہیں جا سکی تھیں اور روبی کے منہ پر تھپڑ کا خاص نشان نہیں آیا تھا اس کا سرخ ہو جانے والا گال کچھ دیر بعد نارمل ہو گیا تھا۔
دو دن تک کچھ نہیں ہوا۔ روبی آتی اور اپنا کام کر کے خاموشی سے چلی جاتی۔ اس نے ہیلو ہائے کرنا بھی چھوڑ دیا۔ میں بھی اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے سکون کا سانس لیا۔ ہمارا کام الگ الگ تھا اس لیے آپس میں بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس روز لنچ کے بعد جب کہ روبی ابھی نہیں آئی تھی شبیر احمد نے مجھے بلا لیا۔ کام معمولی سا تھا مگر اسے دینے کے بعد انہوں نے اچانک پوچھا۔ ''روبی سے آپ کا ریلیشن کیسا ہے؟''
میں اس سوال کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے سر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''
''میرا مشورہ ہے اس سے ذرا دور رہیں۔'' ان کا لہجہ سرد تھا مجھے خیال آیا کہ روبی نے شاید اس دن کے تھپڑ کی شکایت کی ہے۔
''سر روبی نے کچھ کہا ہے؟''
''نہیں۔'' ان کا لہجہ سرد ہی رہا۔ ''یہ ایڈوائس میں اپنی طرف سے دے رہا ہوں ویسے آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔''
نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ ان کا انداز اکھڑا اکھڑا ہے اور وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ میرا دل ڈوبنے لگا اور جب میں اپنی میز پر آئی تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر میں نے انہیں جلدی سے صاف کیا کیونکہ روبی آنے والی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اس کی تو شاید یہی خواہش تھی۔ وہ آئی اور آتے ہی شبیر احمد کے کمرے میں چلی گئی وہاں سے وہ چند منٹ بعد آئی تو اس کے چہرے پر خوشی تھی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ اتنی دیر شبیر احمد کے کمرے میں کیا کرتی رہی اور آتے ہوئے اتنی خوش کیوں تھی؟ شام کو ہم نکلنے لگے تو خلاف معمول روبی اسٹاف کے ساتھ پارکنگ میں نہیں آئی جہاں وین اسٹاف کو لے جانے کے لیے موجود تھی۔ وہ وین میں آتی جاتی تھی اس

کی رہائش شاہ فیصل کالونی میں تھی اس لیے ہماری وینز تقریباً ساتھ نکلتی تھیں پھر ہم راشد منہاس روڈ پر مڑ جاتے تھے اور روفی کی وین آگے چلی جاتی تھی۔

ہماری وین باہر نکلی تب میں نے دیکھا روفی شبیر احمد کی کار میں فرنٹ سیٹ پر ان کے ساتھ موجود تھی اور بہت والہانہ انداز میں ان کی طرف جھک کر کچھ کہہ رہی تھی۔ شبیر احمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ روفی ان کے اتنے قریب تھی کہ تقریباً جڑی ہوئی تھی۔ یہ مشکل سے روپے کا منظر تھا مگر اس نے میرے اندر سب کچھ تہہ وبالا کر دیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے روفی سے دور رہنے کا مشورہ دینے والے شبیر احمد اس کے اتنے قریب ہوں گے۔ وہ ان کی کار میں بیٹھی ہوئی تھی اور ان پر لدی جا رہی تھی اور وہ مسکرا رہے تھے۔ جب کہ انہوں نے کہا تھا کہ میں نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ میں ایسے شاک میں تھی کہ جب وین میری گلی کے کونے پر رکی تو ڈرائیور کو دو بار مجھے پکارنا پڑا تھا۔ تب کہیں جا کر مجھے ہوش آیا۔ "کہاں گم ہو بی بی گھر آ گیا ہے اب اترو تاکہ ہم بھی اپنے گھروں کو جائیں۔"

"سوری۔" میں نے خفت سے کہا اور نیچے اتر آئی۔ وین آگے بڑھ گئی تو میں کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر ایک گاڑی نے ہارن دیا تو میں چونکی تھی۔ اس رات تک میں نے خود کو بہت مشکل سے سنبھال کر رکھا تھا مگر جب اپنے کمرے کی تنہائی میں آئی تو میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ میں اتنا روئی کہ تکیہ بھیگ گیا تھا۔ صبح میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور میرا دفتر جانے اور اس سے بھی زیادہ شبیر احمد کا منہ دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں نے آفس کال کر کے چھٹی کا کہہ دیا۔ میں نے جان بوجھ کر شبیر احمد کی بجائے آفس منیجر کو کال کی تھی۔ میری اتری شکل نے امی کو پریشان کر دیا۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگایا۔

"میری بچی اتنی محنت کیوں کرتی ہے کہ بیمار پڑ جائے۔"

"کہاں امی نارمل کام تو ہوتا ہے۔"

"بس میں نے سوچ لیا ہے جیسے ہی تیری کہیں بات پکی ہو گی تم یا استعفا دو گی یا پھر لمبی چھٹی لو گی۔ شادی سے پہلے آرام کرنا اور اپنی شادی کی تیاری کرنا تاکہ فریش ہو کر جاؤ۔"

میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جیسا آپ کہیں امی۔"

امی نے پھر مجھے گلے لگایا۔ "میری بچی ہمیں تمہاری خوشی درکار ہے تم خوش ہو گی تو ہم خوش ہوں گے۔"

میں سوچ رہی تھی کہ میری خوشی کہاں تھی؟ جسے میں اپنی خوشی سمجھ رہی تھی وہ جھوٹی نکلی۔ شبیر احمد اتنی جلدی بدل جائیں گے۔ صرف کار میں روفی کی موجودگی ہی میرے یقین کی وجہ نہیں تھی بلکہ انہوں نے آفس میں میرے ساتھ جو رویہ رکھا تھا وہ بھی گواہ تھا کہ میرے لیے ان کے خیالات میں تبدیلی آ چکی تھی۔ جب تک روفی نہیں آئی تھی ان کا جھکاؤ میری طرف تھا لیکن جب روفی آئی تو سب بدل گیا۔ آفس کا ماحول بھی اور شبیر احمد کا رویہ بھی۔ میں سارا دن منہ لپیٹے پڑی رہی۔ امی نے زبردستی کھانا اور دوا دی ورنہ میرا پانی تک پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ شام تک حالت بہتر ہوئی تھی لیکن پھر رات کو تیز بخار چڑھا اور صبح تک میں اس قابل نہیں تھی کہ آفس جا سکوں۔ رات میں بھائی مجھے نزدیکی اسپتال لے گئے تھے وہاں مجھے ڈرپ بھی لگی اور ڈاکٹر نے انجکشن بھی دیے۔ اس کے باوجود میری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں بستر سے بھی نیچے قدم رکھتی۔ میں نے پھر آفس کال کر کے چھٹی لے لی۔ کمپنی میں مہینے میں تین میڈیکل چھٹیوں کی اجازت تھی۔ او پی ڈی کے لیے کمپنی پہلے ہی رقم مخصوص کر لیتی تھی میں خرچ کی ہوئی رقم لے سکتی تھی مگر اتفاق کی بات ہے جب سے جاب کی تھی ایک بار بھی میں نے کمپنی سے او پی ڈی الاؤنس نہیں لیا تھا۔ معمولی نزلہ زکام یا بخار ہوتا تو اس کی دوائیاں گھر سے نکل آتی تھیں۔

بیمار پڑی تو مجھے سوچنے کا موقع ملا اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے غلطی کی تھی جو شبیر احمد کی باتوں میں آئی اور ان سے قلبی تعلق قائم کر لیا۔ مجھے اس معاملے میں محتاط ہی رہنا چاہیے تھا۔ جیسا کہ میں نے جاب کے وقت سوچا تھا کہ میں وہی کروں گی جو میرے ماں باپ چاہیں گے میں عشق و عاشقی کی قائل نہیں تھی اور اب بھی معاملہ اتنا آگے نہیں گیا تھا کہ میں شبیر احمد کے بغیر رہ نہ پاتی میں نے ان کو سوچوں میں جگہ دی تھی دل میں نہیں یہاں تک رسائی صرف میرا شوہر حاصل کر سکتا تھا۔ ورنہ اپنی بے وقوفی پر تھا کہ اتنی میچور اور تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی میں نے جذباتی انداز میں شبیر احمد سے توقعات لگا لیں۔ دیکھا جائے تو اس معاملے میں میرا قصور تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ شبیر احمد کو پسند کرنے میں برائی نہیں تھی مگر ان کو ہی نگاہ مرکز بنا لینا یقیناً بے وقوفی تھی۔ ان دو دنوں میں، میں نے خود کو سمجھایا کہ اب مجھے شبیر احمد کو ذہن سے بھی نکال دینا ہے۔ میں انہیں منع کر دوں گی کہ وہ اپنی امی کو مت بھیجیں۔

شبیر احمد کے بدلے خیالات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا تھا کہ انہوں نے گھر فون کر کے ایک بار بھی میری خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ میں نے آفس میں سیل نمبر نہیں دیا تھا اور نہ ہی میرا نمبر ان کے پاس تھا مگر میرے گھر کا نمبر تو آفس ریکارڈز میں تھا۔ وہ چاہتے تو گھر کے نمبر پر فون کر لیتے مگر شاید انہوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

چوتھے دن میں اس قابل ہوئی کہ دفتر جا سکوں۔ امی اور گھر والے منع کر رہے تھے کہ میری طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہوئی ہے مجھے کچھ دن اور آرام کرنا چاہیے لیکن میں جانا چاہتی تھی۔ اتنے دنوں کا کام جمع ہو گیا ہو گا اور اپنا کام آ کر خود کرنا پڑتا تھا چاہے وہ ایک ہفتے بعد دفتر آئے۔ ہاں سالانہ چھٹیوں پر بغیر تنخواہ کی طویل چھٹی کی صورت میں یہ بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے میں اصرار کر کے دفتر روانہ ہوئی۔ پھر مجھے شبیر احمد سے بھی بات کرنی تھی۔ راستے میں لبنیٰ نے خیر خیریت پوچھی۔ ”میرے خدا! بالکل پیلی پھٹک ہو رہی ہو۔ تمہیں تو آرام کرنا چاہیے تھا۔“

”تین دن سے آرام ہی تو کر رہی تھی۔“

”میں تو کہتی ہوں ایک ہفتے کی لیو لے لو۔ تمہاری سالانہ چھٹیاں بھی تو ہیں۔“

”میں بھی سوچ رہی ہوں لیکن پہلے ان تین دنوں کا کام تو نمٹا لوں۔“

آفس پہنچی تو پتا چلا کہ شبیر احمد بھی تین دن سے دفتر نہیں آ رہے تھے۔ ان کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے انہوں نے چھٹی کی ہوئی تھی مگر اس اطلاع سے میرے دل میں کوئی خوش فہمی نہیں جاگی تھی کہ انہوں نے اس وجہ سے میری طبیعت پوچھنے کے لیے کال نہیں کی تھی۔ وہ بہر حال نمبر لے کر کہیں سے بھی کال کر سکتے تھے۔ روبی موجود تھی اور اس نے طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تم دونوں نے ایک ساتھ ہی آفس سے چھٹی کی۔ میں اسے گھور کر اپنے کام میں لگ گئی۔ تین دن کا کام پینڈنگ میں تھا۔ اگر شبیر احمد ہوتے تو اسے بانٹ کر نمٹا رہے تھے مگر وہ نہیں تھے تو کام جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ میں لگ گئی اور پھر جیسے سانس لیے بغیر کام کرتی رہی۔ اگرچہ تھکن اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے بڑا حصہ نمٹا کر دم لیا۔ لنچ کا وقت ہوا مگر روبی اپنی جگہ جمی رہی ایسا لگ رہا تھا کہ آج اس کا لنچ کے لیے جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس لیے جب لبنیٰ نے کمرے میں جھانک کر بس چلنے کی دعوت دی تو میں مان گئی اور اس کے

آپ نے یہ تو سنا ہی ہو گا کہ فلاں عمارت بیٹھ گئی کیونکہ اس کی تعمیر میں خرابی رہ گئی تھی۔
اس قسم کے حادثے ہوتے رہتے ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر ایسی بربادی کا تناسب بہت ہی کم ہے۔ پرانی تاریخ کو چھوڑیں موجودہ دور میں ہی لے لیں۔
اندازہ پوری دنیا میں کروڑوں عمارتیں تو ہوں گی لیکن ان میں سے کتنی عمارتیں بیٹھی یا منہدم ہوتی ہیں۔ بہت ہی کم۔
تباہ کن زلزلے آتے ہیں۔ سیلاب آتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر عمارتیں کھڑی رہتی ہیں، اور جو بیٹھ جاتی ہیں وہ زلزلے یا سیلاب کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانی غلطی کی وجہ سے بیٹھی یا تباہ ہوتی ہیں۔
ایسا نہیں ہے کہ صرف موجودہ یا زمانہ قریب ہی کی عمارتیں اپنے ڈیزائن یا انجینئرنگ کی خرابی کی وجہ سے منہدم ہوئی ہوں۔
بلکہ اس قسم کے واقعات صدیوں پہلے بھی ہو چکے تھے۔
مثال کے طور پر 27 اے ڈی کو ایسا ہی ایک حادثہ ہوا تھا۔
آپ نے روم کے تھیٹر کے بارے میں تو بہت کچھ سنا ہو گا۔ بلکہ اس کی تصویریں بھی دیکھی ہوں گی۔ اس زمانے میں اس اسٹیڈیم کی سیڑھیوں پر لوگ بیٹھ جایا کرتے اور درمیان میں تماشا ہوا کرتا۔
یہ تماشا کیا تھا۔
خطرناک لوگوں کی جنگ۔ ان جنگجوؤں کو Glabiators کہا جاتا تھا۔
یہ بہت بہادر اور قوی ہیکل ہوا کرتے تھے۔ جس طرح آج کل کے دور میں جب اکھاڑے میں کشتی ہوتی ہے تو اعلان کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہو سکیں۔
تو اس دن بھی ایسا ہی ایک تماشا ہونے والا تھا۔
شہر کے زیادہ تر لوگ اکھاڑے میں جمع ہو چکے تھے۔
اس تھیٹر کی تشکیل کچھ دنوں پہلے ہی ہوئی تھی اور یہاں یہ پہلا تماشا تھا۔
اس دور کے انجینئرز نے ایک غلطی کر دی تھی۔ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔
لہٰذا وہی ہوا۔ اس کے اندازے کی غلطی نے ہزاروں کی جانیں لے لیں۔ پورا تھیٹر ایک زوردار آواز کے ساتھ بیٹھ گیا اور ہزاروں جانیں ضائع ہو گئیں۔
اس دور کے حساب سے جو مالی نقصان ہوا ہو گا۔ وہ الگ ہے۔
مرسلہ: عنبرین سلطان علی، کراچی

سامنے میں آ گئی۔ میں نے ٹھیک سے ساتھ بٹا پھاڑا لیا تھا کیونکہ روزانوں نے متعدد گڑبڑ کر دیا تھا کوئی سخت چیز مسئلہ بن سکتی تھی۔ اچانک لبنی نے کہا۔ ”یہ کیا......؟“

میں نے پلٹ کر دیکھا تو لوگ میس سے نکل کر جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی گڑبڑ ہوئی ہے لوگ آپس میں تندہی سے بات بھی کر رہے تھے۔ میں اور لبنی بھی ان کے پیچھے گئے تو لوگ ہمارے شعبے کی طرف جا رہے تھے۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ ہال کے دروازے پر دو گارڈز لوگوں کو روک رہا تھا۔ ”پلیز کوئی آگے نہیں جا سکتا، اندر احسن صاحب ہیں انہوں نے حکم دیا ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“ میں آگے آئی۔ ”یہ میرا آفس ہے۔“

”مجھے نہیں پتا جی۔“ گارڈ نے اپنی جگہ سے ہٹے بغیر کہا۔ اسی لمحے احسن صاحب جو آفس منیجر تھے یعنی جی ایم تھے انہوں نے باہر جھانکا اور مجھے دیکھ کر کہا۔

”مس عالیہ آپ آ جائیے، ان کو آنے دو، باقی افراد اپنی جگہوں پر جائیں۔“ کہتے ہوئے احسن صاحب کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا اور سب بلا چوں چرا کے وہاں سے چلے گئے۔ میں اندر داخل ہوئی تو ہال میں عجیب منظر تھا۔ روبی اس حال میں کھڑی تھی کہ اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور بال بکھرے تھے رونے سے اس کا آئی میک اپ بہہ کر منہ پر آ گیا تھا۔ ایک طرف شبیر احمد سر جھکائے کھڑے تھے۔ میں دنگ رہ گئی پھر احسن صاحب سے پوچھا۔ ”سر یہ کیا ہے؟“

”مس روبینہ کا کہنا ہے کہ شبیر احمد نے ان پر دست درازی کی ہے۔“

شبیر احمد تڑپ کر بولے۔ ”یہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔“

”ذلیل شخص۔“ روبی بھی تڑپ کر بولی۔ ”پھر میرا یہ حال کس نے کیا ہے۔“

”مسٹر شبیر یہ پولیس کیس ہے۔“ احسن صاحب بولے۔

شبیر احمد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں انہوں نے گڑگڑا کر کہا۔ ”سر میں نے کچھ نہیں کیا ہے یقین کریں۔ میں آفس میں تھا کہ یہ اچانک میرے کمرے میں آئی اور چیخنے لگی۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا اور میرا منہ نوچ لیا۔“

تب میں نے دیکھا کہ شبیر احمد کے چہرے اور گردن پر خراشوں کے نشانات تھے۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ مجھے شدید دھچکا لگا تھا۔ معاملہ نہایت سنگین تھا۔ احسن صاحب نے کمپنی کے اعلیٰ حکام کو رپورٹ کر دی تھی اور آدھے گھنٹے کے اندر دو ڈائریکٹر صاحبان آ گئے اور انہوں نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان میں ایک ڈائریکٹر وہ بھی تھا جس کی سفارش پر روبی یہاں جاب پر آئی تھی۔ دوسرا عملہ پہلے ہی باہر تھا۔ اب مجھ سمیت سب کو چھٹی دے کر فوری گھر جانے کا حکم دیا گیا۔ احسن صاحب نے مجھے ذاتی طور پر زبان بندی کا حکم دیا تھا۔ میرا ویسے بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سچی بات ہے یہ سب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شبیر احمد کو میں اچھی طرح جان گئی تھی وہ اس قسم کے انسان نہیں تھے مگر بہرحال انسان ہی تو تھے۔ روبی کس طرح اتنا سنگین جھوٹ بول سکتی تھی؟ احسن صاحب نے چھٹی دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ میں ان سے اگلے دن کنفرم کر لوں۔ وہ بتائیں گے کہ ہمیں کب سے آفس آنا ہے۔ یہ بات ایسی تھی کہ مجھے گھر میں بتاتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں نے گھر میں کہہ دیا کہ میں کمزوری محسوس کر رہی تھی اس لیے دو دن کی چھٹی اور لے لی تھی۔ یہ سن کر امی سمیت سب خوش ہو گئے تھے۔

میں سوچ رہی تھی شاید یہ قدرت کا انتقام تھا۔ میں شبیر احمد کو جواب دینے گئی تھی مگر قدرت نے مجھے اس سے بھی بچا لیا۔ اب ان کا منہ نہیں رہا تھا کہ وہ ایسی بات کر سکتے بلکہ مجھے یقین تھا کہ اب وہ دوبارہ اس دفتر میں نظر نہیں آئیں گے۔ خواتین سے سلوک کے بارے میں کمپنی کی پالیسی نہایت سخت تھی۔ اس سے کہیں معمولی باتوں پر اچھی پوسٹ والے لوگ فارغ کر دیے گئے تھے۔ اب میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ شبیر احمد کی امی ہمارے گھر نہیں آئی تھیں ورنہ میں دو طرف سے ماری جاتی۔ ایک تو یہ سوچا جا سکتا تھا کہ اس رشتے میں میری مرضی شامل ہے اور دوسرے اس صورت میں یہ معاملہ لازمی میرے گھر والوں کے علم میں آ جاتا۔ میں کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہتی۔ میں اس پر جتنا سوچتی رہی مجھے لگا کہ قدرت نے میرے ہی حق میں بہتر کیا ہے۔ شبیر احمد کی اس کی بناوٹ میرے حق میں رحمت بن گئی۔

اگلے دن میں نے احسن صاحب کو کال کی تو انہوں نے بتایا کہ ہمیں اگلے دن سے کام پر آنا تھا۔ میں نے شبیر احمد اور روبی کے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن میری زبان سے نہیں نکلا تھا۔ ویسے یہ چھپنے والی بات نہیں تھی۔ دفتر میں سب کو پتا چل جاتا اور مجھے بھی معلوم ہو جاتا۔ اگلے روز میں دفتر پہنچی تو شبیر احمد اور روبی دونوں نہیں تھے۔ احسن صاحب

نے مجھ سے کہا۔ ''شعبے کا عارضی چارج آپ کو دیا جا رہا ہے جب تک مستقل ہیڈ نہیں آجاتا۔''

اس کا مطلب تھا کہ شبیر احمد کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ ہمارے گھر روزانہ اخبار آتا تھا اور میں نے ان دو دنوں میں پورا اخبار پڑھا لیکن مجھے کہیں کوئی خبر اس حوالے سے نظر نہیں آئی کہ زیادتی کی کوشش کا پولیس کیس بنا ہو۔ نام نہ بھی آنے تو خبر سے پتا چل جاتا مگر ایسی کوئی خبر نہیں تھی۔ مجھے شعبے کو ہیڈ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ میں تمام معمول ورک اور روٹین سے واقف تھی۔ البتہ دو افراد کی کمی سے کام بڑھ گیا تھا۔ میں شبیر احمد کے آفس میں بیٹھی تھی اور مجھے خیال آیا کہ میں اس آفس کو ہینڈل کر سکتی ہوں ممکن ہے کمپنی مجھے ہی یہاں کا ہیڈ بنا دے مگر ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ کمپنی کسی اور کو باہر کرے۔ شبیر احمد کو یقینی طور پر نکال دیا گیا تھا اور روبی شاید خود کمپنی چھوڑ گئی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کے لیے بھی تو باعث شرمندگی تھا کیونکہ سب کو پتا چل گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ لوگوں سے کیسے نظریں ملاتی۔ لنچ میں لبنیٰ نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ معاملہ رفع دفع کر دیا گیا تھا۔ شبیر احمد نے استعفا دیدیا اور خاموشی سے چلے گئے۔

''اور روبی؟''

''اس کا نہیں پتا۔'' لبنیٰ بولی۔ ''ویسے وہ بھی اس کے بعد سے آفس نہیں آئی۔''

''شاید اس نے بھی کمپنی چھوڑ دی ہے۔''

''وہ اتنی آسانی سے چھوڑنے والی چیز نہیں ہے یقیناً اس نے کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھایا ہوگا۔''

''پولیس تک بات نہیں گئی اس کا مطلب ہے کمپنی نے معاملہ خود سنبھالیا اور اس کے لیے اسے روبی کا منہ بند کرنا پڑا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تم سے متفق ہوں وہ ایسے جان چھوڑنے والی چیز نہیں ہے۔''

اگلے دن مجھے معاون کے طور پر اکاؤنٹس سیکشن سے دو افراد دیے گئے تھے۔ ان کے آنے سے کام آسان ہو گیا۔ یقیناً کمپنی خالی جگہوں کے لیے ہائرنگ کر رہی تھی مگر اس میں کچھ وقت تو لگتا۔ آنے والے ایک مہینے تک میں ہیڈ کے طور پر کام کرتی رہی۔ اس دوران میں ایک لڑکی آ گئی تھی وہ روبی کی جگہ آئی تھی مگر ابھی تک ہیڈ کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے یہ کام بہت اچھی طرح کیا تھا اور اوپر والوں کو کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی اس لیے میری اُمید بڑھ رہی تھی کہ شاید میں ہی اس کے لیے منتخب ہو جاؤں تب ہی کمپنی نے ابھی تک ہیڈ ہائر نہیں کیا تھا وہ میری کارکردگی کا جائزہ لے رہی تھی لیکن یہ میری غلط فہمی تھی اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو میں دفتر پہنچی اور کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں روبی کو اپنی کرسی پر براجمان پا کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ مزے سے کرسی گھما رہی تھی اور اس کے تاثرات کچھ طنزیہ سے تھے۔ پھر اس نے کہا۔

''مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوئی ہو نا؟''

''یہ میز زے کری حرکت ہے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''اچھا۔'' وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔ ''اپنے آفس میں آ کر بیٹھنا مینرز سے گری ہوئی حرکت کیسے ہو گئی؟''

میں ایک بار پھر دنگ رہ گئی۔ ''تم مذاق کر رہی ہو۔''

''مذاق ختم۔'' اس نے میز پر ہاتھ مارا۔ ''کمپنی نے مجھے اس شعبے کا باس بنایا ہے۔ میں ایک مہینے کی چھٹی پر تھی اس لیے تم عارضی باس تھیں اب میں آ گئی ہوں اس لیے تم اپنا سیٹ پر واپس جا سکتی ہو۔''

میرے اندر جیسے آندھی سی آئی تھی اور میں بے مشکل کھڑی رہ پائی تھی۔ مجھے ساکت دیکھ کر اس نے کہا۔ ''مس عالیہ اب تم جا سکتی ہو۔''

''او کے۔'' میں نے سر ہلایا اور واپس مڑی تھی کہ وہ غرائی۔

''ناٹ او کے مجھے ہر جملے کے ساتھ میڈم کہا کرو۔''

میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''ٹھیک ہے میں آپ کو میڈم کہوں گی لیکن آپ بھی مجھے تم کہہ کر مخاطب نہیں کریں گی۔''

''میں باس ہوں۔''

''تب میں باس کہہ لوں گی۔'' میں نے جواب دیا اور کمرے سے نکل آئی۔ نئی آنے والی لڑکی صائمہ نے حیرت سے مجھے دیکھا کیونکہ میں اپنی میز پر آ گئی تھی۔ میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''نظام سقے کی ایک دن کی بادشاہت ختم ہو گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا تو روبی کمرے سے نکل آئی۔ اس نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔

''میں بتاتی ہوں اب میں اس شعبے کی ہیڈ ہوں۔ سب مجھے میڈم کہیں گے۔''

میں نے اس کے بات کی احسن صاحب کے کمرے کا رخ کیا۔ ''سر میں ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔''

''کیسی درخواست مس ثنا؟''

''میں اب اس سیکشن میں کام نہیں کر سکتی کیونکہ مس روبینہ سے میرے اختلافات رہے ہیں اور ہمارے درمیان زبردست انڈر اسٹینڈنگ ہے یہ چیز کمپنی کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔''

''فوری طور پر تو یہ مشکل ہے۔'' احسن صاحب نے کہا۔

''اس صورت میں مجھے تبادلے تک کے لیے چھٹی دی جائے میں بلا تنخواہ کے چھٹی لینے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''یہ بھی مشکل ہے، کیونکہ سیکشن میں عملے کی ویسے ہی کمی ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''سر تیسری صورت یہ ہے کہ میں استعفا دے دیتی ہوں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں کس حد تک جانے کو تیار ہوں۔''

احسن صاحب سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے کہا۔ ''مس ثنا، موجودہ صورت حال میں امکان ہے کہ آپ کا استعفا منظور ہو جائے گا۔ جب کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کمپنی چھوڑیں۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ کچھ عرصے خود پر جبر کر کے یہاں کام کریں اس دوران میں، میں آپ کا تبادلہ اکاؤنٹس میں کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''سر بہت مشکل ہے میں ان کے ساتھ کام کر چکی ہوں۔''

''پلیز اسے میری ریکویسٹ سمجھ لیں۔''

احسن صاحب بہت اچھے آدمی تھے اور اپنے ماتحتوں کا خیال رکھتے تھے اس لیے سب ان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے سر آپ کہتے ہیں تو میں یہ بھی کر کے دیکھ لیتی ہوں مگر مس روبینہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں دوسروں کو تنگ کرنے میں مزہ آتا ہے۔''

''میں انہیں سمجھا دوں گا۔ ویسے بھی کمپنی کا ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ معاملہ اوپر گیا تو ان کے لیے بھی اچھا نہیں ہو گا۔''

یہ درست ہے کہ کمپنی کی پالیسی سخت تھی مگر روبی سازشی قسم کی عورت تھی۔ میرا اندیشہ اس حد تک درست نکلا کہ اس نے مجھے اس انداز میں تنگ کرنا شروع کر دیا جس میں اس کی پکڑ نہ ہو۔ خاص طور سے کام کے حوالے سے وہ تنگ کرتی تھی۔ جان کر مجھے زیادہ اور مشکل کام دیتی تھی۔ خیر یہ تو کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر پھر اس نے یہ کرنا شروع کیا کہ میری ورک شیٹ کو بدل کر بھیجتی تھی ان میں غلطیاں شامل کر کے۔ اس کے بعد جب اوپر سے جواب طلب کیا جاتا تو مجھے بلا کر سناتی تھی۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ ورک شیٹ کی ایک کاپی متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کو بھی میل کرنے لگی۔ تیسری بار جب اس نے یہ حرکت کی تو میں نے ڈیپارٹمنٹ کو بھیجی جانے والی ورک شیٹ منگوا لی اس میں مذکورہ غلطی نہیں تھی اور دونوں ورک شیٹس میں نے ایک ہی میل میں روبی اور ڈیپارٹمنٹ کو بھیجی تھیں۔ اس کا میرے سینٹ باکس میں ریکارڈ موجود تھا۔ اس کے بعد میں نے اس سارے معاملے کی رپورٹ بنا کر احسن صاحب کو بھیج دی۔ انہوں نے روبی کو طلب کر لیا تھا۔ اس شام چھٹی کے وقت میں پارکنگ میں وین کی طرف جا رہی تھی کہ روبی میرے سامنے آ گئی۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ تم اس طرح بچ جاؤ گی۔''

''ہاں کیونکہ میرا تعلق کسی گرے پڑے گھرانے سے نہیں ہے اور نہ میں اتنی مجبور ہوں کہ سازشیں کر کے جاب حاصل کروں۔ میں بہت آرام سے استعفا دے سکتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''میں سمجھ لوں گی تمہیں۔''

''کیا کر لو گی۔'' میں طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ''شبیر صاحب والا حربہ میرے خلاف تو آزما نہیں سکتیں۔ اب مجھے یقین ہے تم نے ان بے چارے کے خلاف سازش کی تھی۔''

''تم اس کے چکر میں تھیں اور وہ تمہارے پیچھے پاگل تھا۔'' اس بار روبی کے لہجے میں غرور آ گیا۔ ''اس نے دیکھ لیا مجھے ٹھکرانے کا انجام۔''

مجھے جھٹکا لگا۔ ''کیا مطلب؟...... تم نے سچ مچ شبیر صاحب کے خلاف سازش کی تھی؟''

روبی نے آس پاس دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔ ''ہاں میں نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے مجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس نے میرے ساتھ اس سے کہیں برا سلوک کیا تھا اس نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ تم اس سے محبت کر لی ہوتا لیکن تم نے اسے پلٹ کر بھی نہیں پوچھا۔''

''یہ تم سے کس نے کہا کہ میں شبیر احمد سے محبت کرتی ہوں یا تھی۔'' میں نے انکار کیا۔ ''ہاں انہوں نے اپنی پسند کا اظہار کرتے ہوئے اپنی امی کو میرے گھر بھیجنے کو کہا تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا مگر میں شادی اپنے گھر والوں کی مرضی سے کروں گی۔''

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو حیرت آئی اس نے شک سے کہا۔ ”تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”ہاں اگر میں شبیر احمد سے محبت کرتی تو کبھی ان پر تمہارا لگایا ہوا الزام تسلیم نہیں کرتی۔ اگرچہ میں نے اب بھی تسلیم نہیں کیا تھا مگر میں اس واقعے سے پہلے انہیں بتانے والی تھی کہ وہ اپنی امی کو ہمارے گھر بھیجنے کی زحمت نہ کریں میں ان سے شادی نہیں کرسکتی ہوں۔“

”لیکن کیوں؟“

”کیونکہ میں نے تمہیں ان کی کار میں دیکھا تھا اور تم ان کے بہت قریب تھیں۔ تب سے میرا دل خراب ہوگیا تھا میں نے سوچا کہ یہ شخص میرے گھر رشتہ بھیجنا چاہتا ہے اور تمہیں کار میں لے جارہا ہے۔“

روبی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”اسے میں نے مجبور کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے راستے میں ایک جگہ اترنا ہے اور میں تمہیں دکھانے کے لیے جان بوجھ کر ان کے پاس آئی تھی۔“

”مگر شبیر احمد مسکرا رہے تھے۔ اگر ان کو اعتراض ہوتا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ ہوتی۔“

”میں نے تمہارا ذکر کیا تھا تو وہ مسکرانے لگا تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد اس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ میں چپکے ہوکر بیٹھوں۔“

میرے اندر کی دنیا ایک بار پھر اتھل پتھل ہورہی تھی جسے میں نے بڑی مشکل سے پُرسکون کیا تھا۔ روبی نے صرف مجھے اذیت دینے کے لیے اپنی شکست کی جھینپ مٹانے کے لیے جو آج اسے ہوئی تھی مجھے یہ سب بتایا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے میری آنکھوں میں نمی آگئی تھی میں نے کہا۔ ”تم نے بہت برا کیا ایک بہت اچھے شخص پر ایسا الزام لگایا۔ اس کا کیریئر ختم ہوگیا اور اس کی شخصیت پر ہمیشہ کا داغ لگ گیا۔ وہ اپنی نظروں میں گرگیا۔“

”یہ میرا انتقام ہے۔“ روبی نے کسی ناگن کی طرح پھنکار کر کہا۔

”تم بھول رہی ہو اوپر بھی ایک ذات ہے جو اپنے بندوں کے اعمال کا حساب کرتی ہے۔ تم اس کی پکڑ سے بچ سکو گی؟“

”مولویوں جیسی باتیں نہ کرو یہ دنیا اس کی ہے جو اسے حاصل کرلیتا ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

میرا دل دکھ رہا تھا اور اب مجھے اس عورت سے اتنی نفرت محسوس ہورہی تھی کہ میں نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا کہ اب میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گی اگر میرا تبادلہ نہیں کیا گیا تو میں آفس آنا چھوڑ دوں گی۔ اگلے دن میں نے احسن صاحب سے بات کی اور انہوں نے پھر دہرایا کہ میں کچھ عرصے رک جاؤں مگر اب میں فیصلہ کرچکی تھی میں نے پہلے ایک مہینے چھٹی کی درخواست دی۔ حسب توقع وہ نامنظور ہوئی تو میں نے استعفا دے دیا اور اگلے دن سے میڈیکل بھیج کر آفس آنے سے معذوری ظاہر کردی۔ امکان تھا کہ میری ایک مہینے کی تنخواہ اور واجبات میں سے کچھ کٹوتی ہوگی۔ مگر احسن صاحب نے اپنی کوشش سے مجھے تنخواہ اور واجبات پورے دلوائے اور ساتھ ہی جاب کا بہت اچھا سرٹیفکیٹ بھی دیا۔ میں نے ان کا خصوصی شکریہ ادا کیا تھا۔ میں چاہتی تو کہیں اور جاب کرسکتی تھی مگر ابھی میں کچھ عرصے آرام کرنا چاہتی تھی۔ میں نے گھر میں بھی یہی بتایا کہ میں تھک گئی تھی اس لیے استعفا دے دیا۔

امی اپنی سی کوششوں میں لگی تھیں۔ ابھی بھی انہوں نے جو رشتے دیکھے تھے۔ وہ ان کی اور گھر والوں کی نظر میں جچے نہیں تھے۔ گرمیاں تھیں ان ہی دنوں امی کی طبیعت خراب ہوئی اور ڈاکٹر نے انجائنا کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے ان کی انجیوگرافی کا مشورہ دیا۔ ایک معروف سرکاری ادارے میں امی کے لیے اپائنٹ منٹ لیا گیا۔ جس دن امی کی انجیوگرافی تھی میں بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ امی گھبرا

بچوں کی حس مزاح کا انحصار

والدین پر ہوتا ہے: تحقیق

ایک نئی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ بچوں کی حس مزاح کا تعلق والدین پر ہوتا ہے یعنی اگر آپ سنجیدہ مزاج ہیں تو یہ بھول جائیں کہ آپ کے بچے حس مزاح سے مالا مال ہوں گے کیونکہ بچوں کے مزاج کی حس ویسی ہی ہوتی جیسی ان کے والدین کی تھی۔ محققین کے مطابق بچوں میں حس مزاح 18 ماہ کی عمر سے پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہے اور وہ اپنے بڑوں کو دیکھ کر اپنی حس مزاح کو نشوونما دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر والدین سنجیدہ ہوں تو بچوں کی حس مزاح بھی محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ بچے حس مزاح سمیت متعدد چیزیں اپنے بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں اور دو سال کی عمر تک وہ یہ سمجھنا شروع ہوجاتے ہیں کہ کون سی چیزیں غلط ہیں اور کون سی مزاح کے زمرے میں آتی ہیں۔

مرسلہ: ذیشان اکبر، شادی پور

رہی تھیں اور میں ان کو تسلی دینے کے لیے ساتھ ساتھ رہی۔ انجیو گرافی کے بعد شریان بند کر کے امی کو چھ گھنٹے کے لیے روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ جب تک شریان ٹھیک سے بند نہیں ہو جاتی ان کو جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ اس کمرے میں ایک خاتون اور داخل تھیں۔ ان کی انجیو پلاسٹی ہوئی تھی اور اب وہ صحت یاب ہو رہی تھیں۔ امی وقت گزاری کے لیے ان سے باتیں کرنے لگیں۔ میں موبائل میں لگی تھی اس لیے ان کی باتوں پر خاص دھیان نہیں دیا۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ ان کے درمیان میرے بارے میں ہی گفتگو ہو رہی تھی۔

چھ گھنٹے بعد ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد امی کو جانے کی اجازت دے دی۔ اس دوران میں رپورٹ آ گئی تھی اس کے مطابق ایک شریان میں معمولی سی بلاکیج آ رہی تھی جو دواؤں اور پرہیز سے دور ہو سکتی تھی۔ جب گھر آ کر یہ خوشخبری سنائی تو سب نے سکون کا سانس لیا تھا اور خدا امی کی بیماری نے سب کو ڈرا دیا تھا۔ اس کے تین دن بعد امی کو کسی کی کال آئی میں نے ان کو فون پر کہتے سنا۔ ”کیوں نہیں بہن آپ کا اپنا گھر ہے ضرور آیئے اور جب چاہے آیئے۔“

فون کے بعد میں نے امی سے پوچھا۔ ”امی آپ کسے آنے کا کہہ رہی تھیں۔“

”وہی تھیں جو اس دن اسپتال میں ملی تھیں۔“ امی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اپنے بیٹے کے لیے آ رہی ہیں۔“

میں چونکی۔ ”آپ نے بلا لیا ہے اس کا مطلب ہے آپ کو یہ لوگ اچھے لگے ہیں۔“

”ہاں اس دن ہمارے پاس وقت تھا ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں اچھی طرح جان لیا ہے۔ تمہیں پتا نہیں ہے آنے ہوئے ان کے بیٹے سے بھی ملی تھی مجھے وہ بہت اچھا لگا۔“

”اچھا کب ملا؟“

”جب تم اپنے ابو کے ساتھ ڈاکٹر سے رپورٹ لینے گئی تھیں۔“

میرے اندر کوئی ہل چل نہیں مچی تھی۔ ”جیسے آپ مناسب سمجھیں امی۔“

”بس اب میں تیری ذمے داری سے جلد از جلد فارغ ہو جانا چاہتی ہوں زندگی موت کا......“

”پلیز امی ایسی باتیں نہ کریں۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”اللہ آپ کو لمبی عمر دے اور میں کب منع کر رہی ہوں آپ کا جو دل چاہے اور جب دل چاہے کریں۔“

”بڑا وہ پرسوں آ رہی ہیں بہت اچھی اور سادہ خاتون ہیں۔ ان کا بس ایک ہی بیٹا ہے اور اس دنیا میں ماں بیٹے ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔“

امی کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ جب تک وہ خاتون نہیں آ گئیں میں امید و یاس کے درمیان میں رہی۔ مجھے لگتا کہ یہ اتفاق ہے اور پھر ہنسی آتی کہ ایسے اتفاقات تو قصے کہانیوں میں ہوتے ہیں۔ پھر وہ ہمارے گھر آئیں اور جب میں نے پردے کی اوٹ سے ڈرائنگ روم میں موجود شبیر احمد کو دیکھا تو میرے اندر ڈھیروں اطمینان اتر آیا تھا۔ اللہ نے ہمارا نصیب ایک کیا تھا اور ہمیں ایک دوسرے سے ملنا تھا مگر راستہ وہ تھا جو قدرت نے طے کیا تھا۔ جب شبیر نے ہر ممکن جتن کر لیا تب ہمارے ملاپ کا آسرا بھی سامنے نہیں آیا مگر جب وہ اور میں پیچھے ہٹ گئے تو قدرت نے خود انتظام کر دیا۔ شبیر بظاہر بہت اچھی جاب سے لگے تھے اور ان کو تجربے کا سرٹیفکیٹ بھی نہیں ملا تھا مگر ایک ٹیکسٹائل مل میں انٹرویو کے دوران میں انہوں نے سچ سچ بتا دیا کہ انہیں وہاں سے تجربے کا سرٹیفکیٹ کیوں نہیں ملا تھا۔ ان کی صاف گوئی نے ٹیکسٹائل مل کے مالک کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے شبیر احمد کو بحیثیت چیف اکاؤنٹنٹ کے رکھ لیا۔ یہاں شبیر احمد کی تنخواہ اور مراعات بھی ناصی تھیں۔ اب میں ان کی بیوی ہوں۔ شبیر احمد نے شادی کے بعد مجھے جاب کرنے کی اجازت دی تھی مگر میں نے امی کی وجہ سے انکار کر دیا۔

”امی بہت عرصہ اکیلی رہ لی ہیں اور ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی ہے، اب ان کو کسی ساتھی کی زیادہ ضرورت ہے۔“

پھر اللہ نے جلد مجھے خوشخبری بھی دی اور اب ہم سب بے تابی سے ننھے مہمان کے دنیا میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہاں روبی کا انجام بتا دوں جس کی وجہ سے میں نے یہ سچ بیانی لکھی ہے۔ وہ اکیڈمی ڈائریکٹر رحمانی صاحب کے ساتھ کہیں باہر گھوم رہی تھی جنہوں نے اسے سفارش کر کے ملازمت دلوائی تھی کہ روبی کے منگیتر نے ان پر فائرنگ کر دی۔ روبی موقع پر ہلاک ہو گئی اور رحمانی صاحب شدید زخمی ہوئے تھے۔ گولی نے ان کا جبڑا اڑا دیا اور وہ ساری عمر کے لیے بد شکل ہو کر رہ گئے۔ روبی نے جو خطا کی تھی اس نے اس کی سزا پائی مگر اس کی خطا نے مجھے شبیر احمد کے قریب کر دیا ہے تو یہ ایک بہترین خطا۔

بے نام خطا

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
اپنی آپ بیتی کو کہانی کے انداز میں لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ یہ میری خطا نہیں کہ میں نے عقل رہتے بھی بے عقلی کا ساتھ دیا۔ ایک ایسا کام کر بیٹھی جو مجھے تا عمر گیلی لکڑی کی طرح سلگا رہی ہے اور شاید عمر بھر سلگاتی رہے۔ یہ خطا کیا ہے آپ بھی ملاحظہ کریں۔
عالیہ فرحان
(کراچی)

مجھے اپنی یہ کہانی نہیں لکھنی تھی۔ لیکن لکھ رہی ہوں۔ سرگزشت میں اشتہار دیکھا بے خطا نمبر کا، سوچا کہ جذبات میں آکر میں نے بھی ایک خطا کر دی ہے اس کا ذکر کر دوں تاکہ لوگوں کو احساس ہو جائے کہ ایک زرا سی جذباتی غلطی زندگی بھر کے لیے کتنے عذاب چھوڑ جاتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے دوسرے کمرے سے احمر کے رونے کی آواز آئی اور میں بے چین ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے نائلہ پر غصہ آرہا تھا۔ کم بخت بچے پر دھیان ہی نہیں دیتی۔ ہر وقت اپنے میک اپ میں لگی رہتی ہے۔ چاہے بچہ کچھ بھی کرتا رہے۔

جلدی سے میں دوسرے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ احمر بستر پر تھا اور نائلہ نیم دراز کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ نائلہ نے میری طرف دیکھا۔ "میں سمجھ گئی آپا۔ احمر کی آواز کھینچ لائی ہوگی۔"

"اور کیا۔" میں اس کی بے پروائی سے جھلا گئی۔ "کیوں رو رہا تھا یہ۔"

"اوہو آپا۔ بچے تو رونے ہی رہتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "تم تو ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہو۔"

میں نے احمر کو گود میں اٹھا لیا۔ "تم تو جانتی ہو کہ میں اس کا رونا برداشت نہیں کر سکتی۔"

نائلہ ہنس پڑی۔

مجھے اس کی اس بے پروائی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ میری بھولی بہن تھی اور احمر اس کا بیٹا تھا۔ وہ ماں تھی اس کی لیکن اس سے کہیں زیادہ پیار میں کرتی تھی۔

"یار آپا۔ ناراض مت ہوا کرو۔" نائلہ نے کہا۔ "ایسا کرو۔ تم ہی اس کو رکھ لو۔"

''زیادہ وہ پک کرو گی تو رکھ ہی لوں گی۔ پھر تم سے ملنے ہی نہیں دوں گی۔'' میں بھی ہنس پڑی تھی۔

ڈنکا کہیں اور رہتی تھی۔ لیکن یہ میرا حکم تھا کہ وہ ہر ہفتے کی شام کو ہمارے یہاں احمر کو لے کر آیا کرے۔ پہلے ڈنکا آ جاتی تھی۔ اس کے بعد اس کا شوہر آصف بنز سے آ جاتا۔ اور تھوڑی دیر میں فرحان بھی آ جاتا۔ فرحان میرا شوہر تھا۔

پھر ہم چاروں رات بھر انجوائے کرتے۔ آؤٹنگ پر جاتے۔ ہوٹل میں کھانا کھاتے۔ واپس آ کر وہ دونوں تو تاش کی بازی جما لیتے اور میں احمر کو لے کر کمرے میں آ جاتی۔

یہ کئی مہینوں سے ہمارا معمول تھا۔ کم از کم جب سے احمر پیدا ہوا تھا۔ ماشاءاللہ اب تو وہ سوا سال کا ہو چکا تھا۔

میری اور فرحان کی شادی کو پانچ برس ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی تک ہمارے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی جبکہ ڈنکا کی شادی میرے بعد ہوئی اور وہ ایک بچے کی ماں بھی بن چکی تھی۔

ڈنکا کی شادی تو والدین کی مرضی سے ہوئی تھی جبکہ میں نے محبت کی شادی کی تھی اور یہ محبت بھی کیسی تھی۔ جنونی۔

محبت شاید جنون ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

فرحان مجھے پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔ ایک شرمایا شرمایا سا نوجوان۔ جس کا لہجہ مہذب تھا اور جس کے انداز مہذب تھے۔

میں اس دفتر میں انٹرویو دینے گئی تھی۔ جس بلڈنگ میں فرحان پہلے سے کام کرتا تھا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی تھی۔

صاف ستھرا ماحول۔ صاف ستھرا اسٹاف۔ سلیقے سے ٹائی باندھے اور سوٹ پہنے ہوئے نوجوان لڑکے اور جدید انداز کی ڈریسنگ میں خوبصورت اسمارٹ لڑکیاں۔

ایسی کمپنیوں کا ماحول ایسا ہی ہوتا ہے۔ دیکھ کر سکون ملتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ بس اسی ماحول میں کام کیا جائے اور میرا بھی دل چاہا کہ کاش یہیں ملازمت مل جائے۔

میں یہ بھی بتا دوں کہ ملازمت میرے لیے کوئی مجبوری نہیں تھی بلکہ یوں ہی وقت گزارنے اور زندگی کا مختلف تجربہ کرنے کے لیے چلی گئی تھی اور وہیں میری ملاقات فرحان سے ہوئی۔ وہ اسی آفس میں ایک اچھے عہدے پر تھا۔ پہلی نگاہ میں وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ ایک انتہائی مہذب قسم کا نرم گفتار انسان۔ اس وقت وہاں انٹرویو کے لیے کچھ اور لڑکیاں بھی آئی ہوئی تھیں لیکن ہوا یہ کہ مجھے منتخب کر لیا گیا تھا۔

اب تو فرحان کے ساتھ میرا کم از کم آٹھ گھنٹے روزانہ کا ساتھ تھا۔ نتیجتاً ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہم لنچ کے لیے باہر بھی جانے لگے۔ میں نے ایک بات یہ محسوس کی کہ وہ بہت خیال رکھنے والا شخص تھا۔ وہ دکھوں میں شیئر کرتا جاتا تھا۔ اگر کسی دن میں دفتر نہیں جا پاتی تو وہ بے قرار ہو کر فون کرنے لگتا۔ بہانہ چاہے کچھ بھی ہو۔

جتنا میں نے اسے پسند کیا تھا اتنا ہی اس نے بھی۔ میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے سمجھنے والا وہی ایک شخص تھا۔ اس نے احساس دلا دیا تھا کہ میں جس آئیڈیل کی تلاش میں تھی فرحان وہی ہے۔

میں اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بھی بہت کچھ جان گئی تھی۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے دو بھائی تھے۔ جن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بہن کوئی نہیں تھی۔ والدین بھی حیات تھے۔ اس کا اپنا گھر تھا۔

فرحان کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ پڑھا لکھا تھا۔ مہذب تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ اب اس سے زیادہ کسی لڑکی کو اور کیا چاہیے۔

میں نے اپنی ایک دوست نیلوفر سے جب اس کا ذکر کیا تو وہ چہک اٹھی۔ ''تو پھر سوچ کیا رہی ہے۔ اچھے بندے آج کل ملتے کہاں ہیں۔ پکڑ لے اس کو۔''

''کیسے پکڑ لوں۔ وہ تو کچھ بولتا ہی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا اس نے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا۔''

''دس دفعہ کر چکا ہے۔''

''تو پھر کیا پرابلم ہے۔''

''یار۔ محبت سے آگے بھی تو ہونا چاہیے۔ اس کو شادی کی بات کر لینا چاہیے۔''

''یہ تو ہے۔'' نیلوفر نے گردن ہلائی۔ ''تو پھر تو ہی اس سے بات کر لے۔''

''کیا پاگل ہو گئی ہے۔ میں لڑکی ہوں۔ میں کس طرح اپنی شادی کی بات کر سکتی ہوں۔ یہ بات تو اسے کرنی چاہیے۔''

''دیکھ لڑکی۔ ایسا نہ ہو کہ اس چکر میں کہیں وقت ہی

نکل جائے۔'' اس نے کہا۔ ''پہلے اس سے کنفرم کر لے کہ وہ تجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد اس سے یہ معلوم کرلے کہ کہیں اس کا رشتہ تو نہیں ہوگیا۔''

''نہیں۔ یہ میں معلوم کر چکی ہوں۔ کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''تو بس۔ تو خود اس سے بات کرلے۔ کسی نہ کسی انداز سے۔''

نیلوفر کی بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ فرحان اس معاملے میں واقعی ابھی تک پتھر کا صنم بنا ہوا تھا۔ اصولاً تو اس کو مجھ سے بات کرلینی چاہیے تھی۔

خیر۔ ایک دن میں نے دفتر میں اس سے کہا۔ ''فرحان۔ آج ہم کسی پارک میں چل کر بیٹھیں گے۔ تم سے کچھ باتیں کرلی ہیں۔''

''ضرور۔'' وہ خوش ہوگیا تھا۔ ''ایسا کرتے ہیں زمزمہ پارک چلیں گے۔ وہ بہت پُرسکون ہے۔'' میں یہ بتانا بھول گئی کہ پچھلے کچھ دنوں سے فرحان ہی چھٹی کے بعد اپنی گاڑی میں مجھے میرے گھر تک ڈراپ کرنے جاتا تھا اور میں رکشا ٹیکسی کی جھنجٹ سے بچ گئی تھی۔

چھٹی ہوئی تو میں اس کی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ پہلے اس کے ساتھ جاتے ہوئے جھجک ہوتی تھی۔ دفتر والے ہمیں معنی خیز نگاہوں سے دیکھا کرتے لیکن اب عادت پڑ چکی تھی۔

دفتر والے بھی ہم دونوں کے درمیان ہونے والے اس معاہدے کو قبول کر چکے تھے۔

''جی ملکہ عالیہ۔ کیا حکم ہے آپ کا۔ کہاں چلنا ہے؟''

فرحان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کہیں بھی۔ کسی بھی پُرسکون جگہ۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کسی ہوٹل میں نہیں۔ بلکہ کسی پارک میں۔ جیسا تم کہہ چکے ہو زمزمہ پارک۔ وہیں چلتے ہیں۔''

''اوکے۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔

ہم زمزمہ پارک کے ایک پُرسکون گوشے میں آکر بیٹھ گئے۔ ''ہاں اب کہو۔'' فرحان نے کہا۔ ''ہم کیوں آئے ہیں۔''

''فرحان۔ آج ہمیں اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس فیصلے کا انحصار تم پر ہے۔ جبکہ میری طرف سے سب کچھ واضح ہے۔''

''عالیہ۔ کہو تو سہی۔''

''فرحان۔ کیا اب ہم اس موڑ تک نہیں آگئے ہیں کہ اب ہمیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ کیا ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جان نہیں چکے؟''

''کیوں نہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا ہے عالیہ۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر۔'' میں جھلا گئی۔ ''اب کیا سب کچھ میں ہی کہوں۔''

''اوہ۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔''

''بڑی مہربانی ہے آپ کی۔ اگر آپ کچھ کچھ سمجھ رہے ہیں۔'' میں جل کر بولی۔ ''تم کو معلوم ہے۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی راضی کرلیا ہے۔ وہ ایک بار تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''عالیہ۔ ایک بات بتاؤ، کیا شادی کرنا ضروری ہے۔ میرا مطلب ہے کیا ہم یوں ہی ایک دوسرے کے دوست نہیں رہ سکتے۔''

''کیا؟'' میں بھڑک اٹھی۔ ''تم پاگل ہوگئے ہو؟ یہ کیسی بات کر رہے ہو۔ ایسا بھی ہوا ہے۔ تم نے کیا صرف وقت گزارنے کے لیے مجھ سے دوستی کی تھی؟ تم مجھے اپنانے کے لیے سیریس نہیں ہو۔''

''اوہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے عالیہ۔'' وہ جلدی

نضر بن حارث

کفار قریش کا ایک فرد جو آپؐ جیسی باتیں کرنے کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ کفار بھی آپؐ کے مقابلے میں نضر کی باتیں نقل کرتے۔ یہ آپؐ کا دشمن تھا مگر بعد میں کہتا کہ آپؐ کی باتوں اور میری باتوں میں کیا فرق ہے۔ جنگ بدر کے موقع پر عقبہ بن ابی معیط کے ساتھ گرفتار ہوا۔ اسے حضرت مقدادؓ نے گرفتار کیا۔ واپسی میں اسے خوف تھا کہ قتل ہوگا۔ اس لیے اپنے قریبی عزیز سے کہا کہ وہ حضور اکرمؐ کو کہیں کہ اسے بھی معاف فرما کر اپنے اصحاب میں شامل کرلیں۔ یہ عزیز حضرت مصعب بن عمیرؓ تھے۔ مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس موقع پر مقدادؓ نے پکار کر کہا کہ اسے میں نے اسیر کیا ہے۔ ان کے ساتھ ہی آپؐ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور حضرت مقدادؓ کے حق میں دعا کرتے ہوئے کہا۔ ''اے اللہ! حضرت مقدادؓ کو اپنے فضل و کرم سے غنی کردے۔'' آپؐ کے حکم کے ساتھ ہی حضرت علیؓ کے ایک ہی وار نے اس کی گردن اڑا دی۔

مرسلہ: صاحب خان، کوئٹہ

سے بولا۔ ”میں تو تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر کیا بات ہے۔ کیا تم کہیں زبان دے چکے ہو یا تمہارے والدین نے کہیں تمہارا رشتہ کر دیا ہے۔“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا بات ہے۔“

”کچھ نہیں۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کا جواب میں کل دوں گا۔“

اس کی باتوں نے میرا موڈ خراب کر دیا تھا۔ اس لیے ہم زیادہ دیر نہیں بیٹھے اور واپس آ گئے۔ جب میں اپنے گھر کے دروازے پر اس کی گاڑی سے اترنے لگی تو اس نے کہا۔ ”عالیہ مجھ سے ناراض نہ ہو۔ میں تم سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بس کل تک انتظار کرو۔“

”اوکے۔“ میں گاڑی سے اتر آئی۔ ”دیکھ لیتی ہوں کل تک۔“

☆☆☆

دوسرے دن وہ بہت خوش گوار موڈ میں تھا۔

”مس عالیہ۔ کل آپ کی خواہش تھی کسی پرسکون جگہ جانے کی۔ آج میری خواہش ہے۔ کیا خیال ہے۔“

”ضرور۔“ میں مسکرا دی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہتا ہے یا کیا سوچ رہا ہے۔

”تو پھر شام کے بعد اور ہاں تمہارے لیے ایک سرپرائز بھی ہے۔ لیکن وہ ابھی نہیں بتاؤں گا۔“

”کوئی بات نہیں۔ جب سرپرائز میرے لیے ہے تو پھر مجھے تو معلوم ہی ہو جائے گا۔“

شام کے وقت۔ ایک نئی بات یہ ہوئی کہ دفتر آف ہونے سے پہلے اس کا ایک دوست بھی آ گیا تھا۔

میں نے اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی ایک مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اس نے اپنا نام خورشید بتایا تھا۔

”یہ میرے بچپن کا دوست ہے۔“ فرحان نے کہا۔ ”ہم نے ایک ساتھ بہت خوبصورت دن گزارے ہیں۔ ڈھیری شرارتیں کی ہیں۔ یہ موصوف اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک چلے گئے تھے اور اب واپس آ گئے ہیں۔“

میں نے خورشید سے رسمی سی باتیں کیں۔ اس وقت مجھے شدید الجھن ہو رہی تھی کہ یہ کیا پاگل پن تھا۔ ہمارے درمیان اس شخص کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ ہم تو کہیں جا کر ایک دوسرے سے پرائیویٹ باتیں کرتی تھیں۔ پھر فرحان نے اس دوست کو اپنے ساتھ کیوں لگا لیا تھا۔

بہرحال میں کیا کہہ سکتی تھی۔ خاموش رہی۔

ہم دفتر سے نکلے اور ساتھ ساتھ ذرا سا چل کر بیٹھ گئے۔

اس دوران میرا ذہن نے اس کے دوست خورشید کا تجزیہ بھی کیا۔ وہ واقعی ایک اچھا انسان تھا۔ جس طرح کے پڑھے لکھے مہذب لوگ ہوا کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فرحان نے اس کو بھی اپنے ساتھ کیوں لے لیا ہے۔

ہم تینوں بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر فرحان نے کہا۔ ”بھئی تم دونوں باتیں کرو۔ میں کینٹین سے کچھ لے کر آتا ہوں۔“

اس پارک کے ایک طرف ایک صاف ستھری کینٹین بھی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ جا چکا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس کا رویہ حیران کیے جا رہا تھا۔

کیا ہو گیا تھا اس کو۔ کون اس طرح کسی غیر شخص کو اپنی ہونے والی کے پاس چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لاکھ ایک دوسرے پر اعتماد سہی۔ پھر بھی یہ غیر مناسب سا رویہ تھا۔

خورشید کچھ دیر تک میری طرف دیکھنے کے بعد بولا۔

”میں تو آپ کی تعریفیں سن سن کر پاگل ہو گیا تھا۔“

”وہ کیوں۔“

”لگتا ہے کہ بے چارے فرحان کے لیے اب صرف ایک ہی موضوع رہ گیا ہے اور وہ ہے آپ کی ذات۔ عالیہ ایسی ہیں، عالیہ ویسی ہیں، عالیہ کو فلاں چیز پسند ہے، فلاں ناپسند ہے وغیرہ وغیرہ۔“

”یہ تو ہے۔“ میں مسکرا دی۔ ”فرحان میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور وہ خود بھی بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”یہ تو ہے۔ ورنہ آپ جیسی لڑکی اسے کیوں پسند کرتی۔“

مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ فرحان نے سب کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔

اسی لیے اسے مجھ پر اتنا بھروسا تھا کہ میرے لیے ایک اجنبی شخص خورشید کو میرے پاس بٹھا کر پورے اعتماد کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔

کچھ دیر یونہی خورشید سے باتیں کرتی رہی اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی فرحان ہی کی طرح ایک مہذب اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو کسی طرح مجھے ناگوار ہوتی۔

فرحان بھی کچھ دیر بعد واپس آ گیا۔ وہ کینٹین سے بہت سی چیزیں لے آیا تھا۔

یہ سب تو ہو رہا تھا لیکن اب تک یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ میری بات کا کیا جواب دے گا۔ فرحان اسی لیے تو مجھے اپنے ساتھ لایا تھا۔ آج اسے شادی کے حوالے سے بات کرنی تھی لیکن خورشید کی موجودگی میں ابھی تک ایسی بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

کچھ دیر بعد خورشید اچانک کھڑا ہو گیا۔ "اچھا بھائی۔ مجھے تو اجازت دو۔ مجھے ایک جگہ پہنچنا ہے۔"

فرحان نے بھی اسے نہیں روکا۔ وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ شاید دونوں کے درمیان یہ طے ہو گیا ہوگا کہ وہ کچھ دیر بعد واپس چلا جائے گا اور ہم اطمینان سے اپنی باتیں کر سکیں گے۔

اس کے جانے کے بعد فرحان کچھ دیر تک خاموش سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "عالیہ۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم وہ باتیں کر لیں جس کے لیے یہاں آئے ہیں۔"

"ظاہر ہے۔" میں مسکرا دی۔ "ورنہ یہاں آنے کا فائدہ کیا ہوگا۔"

"تم یہ بتاؤ خورشید تمہیں کیسا لگا؟" اس نے پوچھا۔

"کیسی بات کر رہے ہو۔ ہم یہاں اپنی بات کرنے آئے ہیں یا خورشید کی اور خورشید کا ذکر کیوں چھیڑ دیا تم نے۔"

"پہلے میری بات کا جواب تو دو کیسا لگا وہ تمہیں۔"

"ظاہر ہے اچھا مہذب انسان ہے۔" میں نے کہا۔ "تو پھر اس سے کیا ہوا؟"

"عالیہ۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم خورشید سے شادی کر لو۔"

"کیا؟" میں بھڑک اٹھی۔ "کیا بکواس کر رہے ہو تم؟"

"عالیہ۔ کیا تم یقین کرو گی کہ میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ تم زندگی بھر خوش رہو۔"

"اسی لیے تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے بجائے کسی اور سے شادی کر لوں۔"

"ہاں۔ اسی لیے۔"

"معاف کرنا۔ تم نے عورت کی محبت کو بہت غلط سمجھا ہے۔" میں نے کہا۔ "محبت تحفے میں دینے والی چیز نہیں ہوتی کہ ایک کی جگہ دوسرے کو ٹرانسفر کر دی۔ تمہاری دوستی اور محبت اپنی جگہ ہوگی لیکن ایسا بھی نہیں ہوگا کہ میں تمہاری دوستی کی بھینٹ چڑھ جاؤں۔"

"نہیں عالیہ۔ پلیز تم مجھے غلط مت سمجھو۔" اس نے کہا۔ "یہ معاملہ کچھ اور ہے۔"

"میں بھی تو سنوں کہ وہ معاملہ کیا ہے۔"

"سنو۔ میں بتاتا ہوں۔"

☆☆☆

وہ روئے جا رہا تھا۔

"ہاں۔ غلط رسم و رواج اور بے جا شرم اور خاندانی عزت نے برباد کر دیا مجھے۔ تباہ کر کے رکھ دیا۔ میری معذوری کو کسی نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ سب میرا وہم سمجھتے رہے۔ میرے گھر والے، میرے دوست سب کا یہی خیال تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"عالیہ میں بچپن ہی سے دنیا کی سب سے بڑی خوشی سب سے بڑی نعمت سے محروم ہو چکا ہوں۔ ایک حادثہ ہوا تھا میرا۔ اس کے بعد مجھ میں یہ کمزوری نمایاں ہوتی گئی۔ میں کہتا رہ گیا لیکن خاندانی شرم اور ناک کٹ جانے کے خوف نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میں کسی قابل نہیں ہوں عالیہ کسی قابل نہیں ہوں۔"

میں ذہنی سناٹے میں رہ گئی تھی۔

زندگی میں ایک محبت ملی۔ جو ہر لحاظ سے میرے معیار کے مطابق تھا۔ جو بہت خیال رکھنے والا اور بہت پیار کرنے والا تھا۔ اس کے ساتھ ایسی مجبوری تھی۔

وہ بے چارہ شرم اور خجالت سے کھل کر رو بھی نہیں پا رہا تھا۔ مجھے تو اس کے آنسو اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ اپنے دوست خورشید کو میرے پاس کیوں چھوڑ گیا تھا۔ اس لیے کہ میں اسے پسند کر لوں۔

فرحان میری بھلائی چاہتا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ میں خوش رہوں اسی لیے وہ اپنی محبت کی قربانی دے رہا تھا کیونکہ وہ میرے قابل نہیں تھا۔

اور اس وقت اس کے آنسو مجھے ریزہ ریزہ کیے دے رہے تھے۔ افسوس ہو رہا تھا اس پر پھر اچانک نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "فرحان۔ کیا پاگل ہو گئے ہو۔ تم نے میری محبت کو بس اسی حد تک سمجھا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

''مطلب یہ کہ تم چاہے جیسے بھی ہو۔ ہم ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔'' شہا نے کہا۔

''نہیں عالیہ۔ اپنے آپ کو جہنم میں نہ ڈالو۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ شادی نام ہی اس کا ہے۔ ہم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔''

''دوستوں کی طرح تو رہ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے صرف تمہارے وجود سے دلچسپی ہے۔ تمہاری کسی اور طاقت یا کمزوری سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

''نہیں عالیہ۔ یہ فطرت کے خلاف ہوگا۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ شادی کے بعد تم اپنا علاج کراتے رہنا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری یہ محرومی ختم ہوجائے۔ اگر نہ بھی ہوئی تو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''عالیہ میں تم پر ظلم نہیں کرسکتا۔''

''کیسا ظلم۔ میں تو اپنی مرضی سے کہہ رہی ہوں۔ کم از کم تم نے مجھے دھوکے میں تو نہیں رکھا۔ بعد میں پتا چلتا تو پھر کیا ہوتا۔ افسوس بند کرو یہ آنسو وغیرہ۔ سب ٹھیک ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''بے وقوف انسان۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ بالکل درست ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم ایک ساتھ زندگی گزاریں گے۔ انجوائے کریں گے۔ دنیا کی سیر کرتے پھریں گے۔''

اس نے اپنے آنسو رومال سے پونچھ لیے تھے۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان تھا۔ شاید ہی کسی کو یقین آسکتا ہو کہ کوئی لڑکی اتنی بڑی قربانی بھی دے سکتی ہے۔

عام طور پر ایسے کیسز سننے کو ملتے ہیں لیکن ایسا شادی کے بعد ہوتا ہے۔ جب لڑکی شادی کرکے بے بس ہوجاتی ہے اور وہ معاشرے کے خوف سے علیحدگی اختیار نہیں کرتی لیکن شادی کے بعد۔ اور یہاں تو یہ حال تھا کہ بہت پہلے پتا چل گیا تھا پھر بھی ایک لڑکی اس محرومی کا سامنا کرنے کو تیار تھی۔

''اور ہاں۔ اگر تم نے اپنے اس دوست سے اس معاملے پر بات کرلی ہے تو اس سے کہہ دو کہ وہ میرے خواب نہ دیکھے۔ کہیں اور چلا جائے اور دوبارہ تم اسے میرے سامنے نہ لانا۔''

فرحان مسکرا دیا۔

اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو بھی یقین نہیں آسکتا کہ کوئی لڑکی اپنی محبت کے لیے ایسا بھی کرسکتی ہے۔

اور بالآخر یہی ہوا۔

فرحان نے ایک دن اور مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ میں کسی اور کو اپنالوں۔ بے چارہ نہ جانے کس دل سے یہ سب کہہ رہا ہوگا۔

لیکن میں تو اس کو اپنانے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ چاہے کچھ بھی ہوا اور آخر میرے اصرار پر ہماری شادی ہوہی گئی۔

ظاہر ہے میں نے کسی کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوگا۔

☆☆☆

شادی ہوگئی۔

میں فرحان کے خوبصورت اپارٹمنٹ میں آگئی۔

بہت ہی اچھے دن تھے۔ ایک دوسرے کی محبت میں سرشار۔ دکھاوے کے طور پر ہمارا ولیمہ بھی ہوا تھا لیکن ہم یہ جانتے تھے کہ یہ کیسا ولیمہ ہے۔

کوئی کمی محسوس نہیں ہورہی تھی۔ ہر شام ہم آؤٹنگ پر چلے جاتے۔ ایسی بے فکری اور ایسا سکون تھا کہ جس کا اظہار مشکل تھا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ہمارے خاندان میں احمر کی آمد ہوئی۔ احمر، میری بہن نائلہ کا بچہ۔

نائلہ کی شادی میری شادی کے دو سال بعد ہوئی تھی اور جب میں نے پہلی بار اس کو اپنی گود میں اٹھایا تو اسی وقت میرے اندر کچھ ٹوٹ کر رہ گیا۔

عورت تو پیدا ہی اس لیے ہوتی ہے کہ وہ نسل کو آگے بڑھائے۔ اس کے اندر تو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کا جذبہ رکھ دیا جاتا ہے۔ اور اس جذبے کی تکمیل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ طلب اور میں نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

میں تو جان بوجھ کر زندگی کی اس سب سے بڑی لذت سے محروم ہوگئی تھی۔ فلموں میں ہیرو ہیروئن کو ایک ساتھ دیکھ کر، بازار میں شاپنگ کرتے ہوئے بچوں کو ساتھ لیے جوڑوں اور پرندوں کو ایک ساتھ ملتے ہوئے دیکھتی تو میرے اندر ایک آگ سی دہکنے لگتی۔

وہ آگ جو قدرت لگاتی ہے اور قدرت ہی اسے بجھانے کا راستہ بھی دکھاتی ہے۔ فرحان کے ساتھ تو مجبوری تھی لیکن میں نے کیوں یہ سزا قبول کرلی تھی۔ کیوں۔ کیا یہ میری خطا تھی؟

میں یہ کہانی نہیں لکھنا چاہتی تھی لیکن اس لیے لکھ رہی ہوں کہ پڑھنے والوں کو پتا چل جائے کہ اول تو یہ وہ سیلاب ہے جس پر بند نہیں باندھا جاسکتا اور دوسرے یہ کہ کبھی کسی کی معذوری یا مجبوری پر ترس کھا کر شادی نہ کریں۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی گزر جائے، لیکن بہت بے کیف اور بہت اَن نیچرل گزرے گی۔

خطائے بزرگاں

جناب معراج رسول
مؤدبانہ سلام
آپ مجھے بے وقوف کہیں یا کچھ اور مگر میں کیا کروں کہ بزرگوں کی وجہ سے میں تا عمر ٹینشن میں رہا مگر جب خود بزرگوں کی صف میں آیا تو یہی باتیں نعمت لگ رہی ہیں۔

عرفان
(فیصل آباد)

ہمارا دو منزلہ مکان تھا۔ اوپر ایک کمرا بنا ہوا تھا اور ایک وسیع چھت تھی۔ جس پر ہم شام کے وقت پتنگیں اڑایا کرتے۔

میرے گھر والوں نے وہ کمرا اپنے کسی رشتے دار افضل میاں کو دے رکھا تھا۔ خدا جانے افضل میاں کون تھے۔ ان سے ہمارا کیا رشتہ تھا؟ لیکن میرے گھر والے ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ہمارے گھر میں ایک ملازمہ تھی۔ جوان سی لڑکی تھی۔

وہی افضل میاں کا ناشتا اور کھانا ٹرے میں سجا کر اوپر لے جایا کرتی۔

افضل میاں بزرگ آدمی تھے۔ یعنی میرے حساب سے تو بزرگ ہی تھے۔ میں پندرہ سولہ برس کا تھا اور وہ پچاس اور پچپن کے درمیان تھے۔

ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کی بیوی نے ان سے بے وفائی کی تھی۔ گھر سے بھاگ گئی تھی پھر طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد افضل میاں نے عبادت سے لو لگا لی تھی۔ بڑے نمازی پرہیزگار انسان تھے اسی لیے سب ان کا احترام کیا کرتے۔

میں عام طور پر شام کے وقت اوپر جایا کرتا۔ یعنی جب پتنگیں اڑانے کا وقت ہوتا اور سورج مغرب کی طرف جا رہا ہوتا۔

بہت آسودہ سا ماحول ہوا کرتا تھا۔ ہمارے مکان سے کچھ فاصلے پر کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ جن کے کناروں پر تاڑ کے اونچے اونچے درخت تھے۔

ادھر ادھر کے مکانوں سے بھی پتنگیں بلند ہو کر ان درختوں کے اوپر منڈلایا کرتی تھیں۔ فضا میں اڑتے ہوئے پرندے۔ ان کے ساتھ پتنگیں اور تاڑ کے درخت۔ یہ سب بہت پرکشش تھے۔ میں اس وقت تک پتنگ بازی میں مصروف رہتا۔ جب تک نیچے سے اماں کی آوازیں نہ آنی شروع ہو جاتیں۔

''ارے عرفان۔ نیچے آ جاؤ۔ مغرب ہو رہی ہے۔''

پھر میں اپنی پتنگیں اور چرخی وغیرہ سمیٹ کر افضل میاں کے کمرے میں رکھنے چلا جاتا۔ عام طور پر وہ مجھے کچھ نہ کچھ پڑھتے ہوئے ملتے۔ نہ جانے کیا پڑھتے رہتے تھے۔

کبھی کبھی افضل میاں میری پتنگ بازی دیکھنے خود بھی کمرے سے باہر آ جاتے اور مجھے پیچ لڑانے کے گر بتاتے رہتے۔ ''دیکھو میاں۔ یہ دیکھو کہ سامنے والا ڈھیل دے رہا ہے یا کھینچ رہا ہے۔ اسی حساب سے تم بھی چلو اور جہاں موقع ملے اس کے الٹ کام کر جاؤ۔''

بہرحال تو میں یہ بتا رہا تھا کہ میں صرف شام کے وقت اوپر جایا کرتا تھا لیکن اس دوپہر کو نہ جانے کیوں اوپر چلا گیا۔

شاید مجھے کوئی پتنگ اپنے کسی دوست کو دینی تھی۔ یا کوئی اور کام تھا۔ اب یاد نہیں آ رہا ہے۔ بہرحال جب میں افضل صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ ملازمہ کو ہاتھ پکڑے اسے جھٹکے دے رہے تھے اور وہ ہنگامہ کر رہی تھی۔ ''کیا کر رہے ہیں سرکار۔ چھوڑیں مجھے۔''

اور سرکار اسے چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے لیکن جب مجھے کمرے میں آتے دیکھا تو گھبرا کر ملازمہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ بے چاری تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اپنی پتنگ اٹھائی اور خود بھی باہر آ گیا۔ اس دوران میں افضل میاں بالکل خاموش رہے تھے۔ جیسے انہیں سکتہ سا ہو گیا ہو۔

مجھے ان کی یہ حرکت بری لگی تھی اسی لیے رات کے کھانے کے بعد میں نے ابا سے ذکر کر دیا۔ پھر ابا کا جو رد عمل تھا اس نے مجھے حیران ہی کر دیا تھا۔

ابا نے میری بات ختم ہوتے ہی مجھے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ ''بدتمیز، کیا تو نہیں جانتا کہ خطائے بزرگاں گرفتن نیست۔''

''ابا۔ میں اتنی فارسی نہیں جانتا۔'' میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''نالائق اس کا مطلب یہ ہوا کہ بزرگوں کی غلطی پر گرفت کرنا بھی غلطی ہے۔ اب سمجھے۔''

''جی ابا۔ سمجھ گیا۔ یعنی بزرگ چاہے کچھ بھی کرتے رہیں۔ ان کی خطاؤں پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ بزرگ تو اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکے لیکن تو ان کے سلسلے میں جو غلطی کر چکا اس کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔''

بس جناب۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ مجھے فارسی کی اس کہاوت سے چڑ ہو گئی ہے۔ خطائے بزرگاں گرفتن نیست۔

یعنی بزرگ چاہے کچھ بھی کرتے پھریں۔ آپ ان کو ان کی غلطی پر روک نہیں سکتے۔ ٹوک نہیں سکتے کیونکہ یہ آپ کی غلطی ہو گی اسی لیے انہیں چھوٹ کہا جائے۔

آپ ذرا اور وسیع تناظر میں دیکھیں۔ ہمارے آباؤ اجداد نے کیسی کیسی غلطیاں کی ہیں۔ جن کا خمیازہ ہمیں آج بھگتنا پڑ رہا ہے۔ لیکن آپ ان غلطیوں کی نشاندہی نہیں کر سکتے کیونکہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔

بہرحال تو میں اس کہاوت کو اپنے ذہن میں بٹھائے بڑا ہوتا چلا گیا۔ ایک بار والد صاحب نے ایک فراڈ شخص سے ایک پلاٹ کا سودا کیا۔ ڈیڑھ لاکھ روپوں میں۔ والد صاحب اس سودے سے بہت خوش تھے۔ اتفاق سے مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس پلاٹ کی کل قیمت پچاس ساٹھ ہزار سے

زیادہ نہیں ہے لیکن میں نے یہ بات اس وقت کہی جب والد صاحب سودا کرچکے تھے اور فراز نے کو بھی پیسے مل گئے تھے۔

والد صاحب تو اسی وقت بھڑک اٹھے تھے۔ ''کم بخت یہ بات تو نے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ اگر میں غلطی کر رہا تھا تو تجھے تو بتانا چاہیے تھا۔''

''کیسے بتاتا کیونکہ آپ ہی نے کہا تھا کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔'' میں نے کہا۔

والد صاحب تو پچھتا کر رہ گئے، کیونکہ اس کہاوت نے خود ان ہی کے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔

پھر برسوں گزر گئے اور یونیورسٹی میں مجھے افشاں مل گئی۔ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والی خوبصورت سی لڑکی۔ جس نے میری زندگی میں آکر بہاروں کے رنگ بھر دیے تھے۔

اس سے ملاقات کس طرح ہوئی؟ کس طرح ہم ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ مختصر یہ کہ ہم نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا تھا اور یہ سوچ لیا تھا کہ ایک دوسرے کو جیون ساتھی بنالیں گے۔

ایک دن یونیورسٹی کی کینٹین میں جب وہ مجھ سے ملی تو بہت اداس اور پریشان ہورہی تھی۔ ''کیا بات ہے افشاں؟'' میں نے پوچھا۔ ''آج تمہارا موڈ کچھ بدلا ہوا لگ رہا ہے۔''

''ہاں عرفان۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میرے پاپا کو نہ جانے کیا سوجھ گئی ہے۔''

''کیوں۔ کیا ہوگیا تمہارے پاپا کو؟''

''انہیں تو کچھ نہیں ہوا لیکن وہ میری زندگی برباد کرنے کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ میری شادی اپنے بھتیجے سے کرنا چاہتے ہیں۔'' افشاں نے بتایا۔ ''وہ ایک نمبر کا آوارہ اور بدمعاش ہے۔ دوبار جیل بھی جاچکا ہے۔''

''کمال ہے۔ کیا تمہارے پاپا کو یہ نہیں معلوم کہ وہ دوبار جیل جاچکا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''معلوم کیوں نہیں ہے۔ وہی تو اسے ضمانت پر چھڑا کر لائے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''تو پھر کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''ایک تو یہ کہ وہ ان کا بھتیجا ہے اور دوسرے ان کا خیال ہے کہ شادی کے بعد وہ سدھر جائے گا۔ اس کی عادتیں بدل جائیں گی۔''

''یہ تو بہت پریشانی والی بات ہے۔ کیا کسی طرح انہیں روکا نہیں جاسکتا۔'' میں نے پوچھا۔

''صرف ایک طریقہ ہے۔'' افشاں نے کہا۔

''وہ کیا۔''

''تم میرے پاپا سے ان کے دفتر جاکر مل لو۔'' اس نے بتایا۔ ''تم پڑھے لکھے ہو۔ دیکھنے میں بھی مہذب نظر آتے ہو۔ تم باتیں بھی اچھی کرلیتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں دیکھ کر پاپا اپنا ارادہ بدل دیں گے۔''

''لیکن یہ تو سوچو کہ میں ان سے کیا جاکر کہوں گا۔ کیا یہ کہوں گا کہ مجھ سے ملیں۔ میں وہ ہوں جس نے آپ کی بیٹیا سے محبت کی ہے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''میں نے پاپا سے کسی حد تک تمہارا ذکر کردیا ہے۔ تم چلے جاؤ۔ ان کے پاس۔''

''اوکے میڈم۔ چلا جاؤں گا۔''

میں نے افشاں سے وعدہ تو کرلیا تھا لیکن اسی رات جب میں بستر پر لیٹا تو مجھے وہ کہاوت پھر یاد آگئی۔ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔

یعنی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ افشاں کے پاپا نے اگر یہ رشتہ طے کیا تھا تو سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ اگر وہ کوئی غلطی کر بھی رہے تھے تو مجھے اس غلطی کا احساس دلانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیونکہ بزرگوں کی خطا پر ان کو روکنا نہیں چاہیے۔

میں نے جب یہی بات فون پر افشاں سے کی تو وہ مجھ پر برس پڑی۔ ''لعنت ہو تم پر۔ تم اوّل درجے کے بزدل انسان ہو۔''

''ارے۔ اس میں بزدلی کی کیا بات ہے۔ خود سوچو خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔'' میں نے کہا۔

''جہنم میں جاؤ تم، اور تمہاری یہ کہاوت۔'' افشاں نے دوسری طرف سے فون بند کردیا اور اس کا یہ فون آج تک بند ہے۔ کم از کم میرے لیے تو ہمیشہ کے لیے بند ہوچکا ہے۔

اس کہاوت نے اور بھی کئی مواقع پر مجھ پر ستم کیے۔ یہ کسی بلا کی طرح میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ایک بار تو ایسا جی چاہا کہ اس کہاوت کو لغت سے ہی کسی طرح نکال کر پھینک دوں۔

میرے ایک پھوپا نے اپنی دو اولادوں کی شادیاں

ملے گئیں۔ ان میں سے ایک بیٹا تھا دوسری بیٹی۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''عرفان میاں تم ذرا میرا ایک کام کردو لیکن پوری ذمے داری کے ساتھ۔''

''جی پھوپا فرمائیں۔''

''میں نے رخسانہ کے لیے ایک لڑکا تلاش کیا ہے۔ جان پہچان والوں میں سے ہے۔''

رخسانہ میری پھوپھی زاد کا نام تھا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے پھوپا۔ خدا مبارک کرے۔'' میں نے کہا۔

''لڑکا تو میرا دیکھا ہوا ہے۔ اچھی فیملی کا ہے۔ سعادت مند، مہذب۔ لیکن ان سب کے باوجود میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک بار اس سے مل لو۔''

''پھوپا۔ جب آپ نے دیکھ ہی لیا ہے تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔''

''میاں ہے تو ٹھیک۔ لیکن تم ایک سمجھدار انسان ہو۔ تم ایک بار اس سے مل لو۔''

اور پھوپا کے کہنے پر جب میں اس سے ملا تو ایک جھٹکا سا لگ گیا۔ پھوپا نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

نہ تو وہ مہذب تھا، نہ پڑھا لکھا تھا، بلکہ ایک عیاش اور بدمعاش ٹائپ کا نوجوان تھا لیکن میں نے اس کے بارے میں پھوپا کو کچھ نہیں بتایا۔

کیا فائدہ تھا بتانے سے؟ پھوپا اپنے طور پر رخسانہ کی شادی اس سے کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور بتانے کا مطلب یہ تھا کہ میں ان کی غلطی کی اصلاح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جبکہ صدیوں پرانا اصول یہ تھا کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔

اسی لیے میں نے کچھ نہیں بتایا اور رخسانہ کی اس سے شادی ہوگئی۔ شادی کے صرف تین مہینوں کے بعد ہی اس شخص کے کرتوت سامنے آگئے۔

اس شخص نے رخسانہ کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی تھی۔

ایک دن پھوپا مجھ پر برس اٹھے۔ ''کم بخت تیری وجہ سے میری بچی کی زندگی برباد ہو رہی ہے۔''

''کیوں پھوپا میں نے کیا کیا ہے؟''

میں نے انتظار سے ملنے کے لیے کہا تھا اس لیے نہیں کہا تھا کہ تو اس کو دیکھ کر چپ سادھ لے۔ مقصد یہ تھا کہ اس کے بارے میں رپورٹ دے مجھے کہ وہ کیسا ہے۔''

''پھوپا۔ ایک بات بتائیں۔ آپ نے تو خود ہی اس کی تعریف کی تھی کہ بہت مہذب اور پڑھا لکھا شخص ہے۔''

''ہاں وہ غلطی تھی میری۔''

''یہی تو بات ہے پھوپا کہ میں اس غلطی پر آپ کو ٹوک نہیں سکتا تھا۔ منع نہیں کر سکتا تھا آپ کو۔''

''کیوں۔ کیوں نہیں منع کر سکتا تھا۔''

''اس لیے کہ بچپن ہی سے مجھے یہ سمجھایا گیا ہے کہ بزرگوں کی غلطی پر انہیں روکا یا ٹوکا نہیں کرتے کیونکہ ایسا کرنا بذات خود ایک غلطی ہے۔''

''ارے مردود۔ روکنا، ٹوکنا ایک الگ بات ہے لیکن اچھا مشورہ تو دے سکتا ہے نا اور جب کھلی آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ کسی بزرگ نے اپنی غلطی یا حماقت سے کوئی غلط فیصلہ کر لیا ہے۔ تو اس کو روک دینا ہی سعادت مندی ہے۔ سمجھے۔''

''ٹھیک ہے پھوپا۔ آئندہ سے خیال رکھوں گا۔''

''اب کیا خیال رکھے گا۔ اب تو رخسانہ کی زندگی برباد ہو ہی گئی۔''

بہرحال رخسانہ کی زندگی کسی طرح چلتی رہی۔ پھر پھوپا کے بیٹے کی شادی کا مرحلہ آ گیا۔ اس بار پھوپا نے میری خدمات حاصل نہیں کی تھیں لیکن انہوں نے اتنا ضرور بتا دیا تھا کہ لڑکی اچھی ہے اور کرامت کنسٹرکٹر کی بیٹی ہے۔

یہ بہت پیسے والے لوگ ہیں لیکن پیسے ہونے کے باوجود فروزاں بہت سیدھی سادی اور مشرقی لڑکی ہے۔ پھوپا کا خیال تھا کہ فروزاں جب گھر میں بہو بن کر آ جائے گی تو گھر اس کی روشنی سے جگمگانے لگے گا۔

اب دیکھیں کہ حالات کس کس طرح انسان کو ذلیل کرواتے ہیں۔

ایک بار اتفاق سے مجھے اس لڑکی یعنی فروزاں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔ وہ میرے ایک جاننے والے کی دوست رہ چکی تھی۔

اس جاننے والے کو یہ نہیں معلوم تھا کہ فروزاں کی شادی جس سے طے ہوئی ہے وہ میرا پھوپی زاد بھائی ہے۔

وہ میرے سامنے مزے مزے سے فروزاں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ''یار۔ ایسی بے دھڑک لڑکیاں پاکستان میں کم ہی ہوں گی۔''

''کیوں بھائی۔ کیا خوبی ہے اس میں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مت پوچھو کیا خوبی ہے۔'' اس نے بدمعاشی والی ایک گہری سانس لی۔ ''اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک ہی

رفت میں کتنی کتنی عاشقوں سے کھیل جول رکھتی ہے۔"

"یار۔ کسی لڑکی کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنے چاہیے۔"

"میں کسی لڑکی کی نہیں۔ اس خاص لڑکی کی بات کر رہا ہوں اگر یقین نہ ہو تو چلو میرے ساتھ۔ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ لیکن تم کیوں اس کی حمایت کر رہے ہو۔"

"بس یار یوں ہی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کسی لڑکی پر الزام لگایا جائے۔"

"جان میرے۔ وہ کم بخت تو الزام لگوانے کے بہانے ڈھونڈتی پھرتی ہے۔"

میرا دوست ایسا تھا کہ اس نے ایسے معاملات میں کبھی غلط بیانی نہیں کی ہوگی۔ وہ اگر یہ سب کہہ رہا تھا تو پھر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

ایسی کسی لڑکی سے میرے پھوپھی زاد کا رشتہ ہرگز مناسب نہیں تھا لیکن پھوپا نے اس کا رشتہ اسی لڑکی سے طے کر دیا تھا۔ یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ وہ یقیناً اس گھر کو جہنم بنا کر رکھ دیتی۔ لیکن مجھے کچھ نہیں بتانا تھا کیونکہ وہ کبدلت میرے سامنے آگئی تھی۔ خطائے بزرگاں والی۔ میں ایک بار پھوپا کو بتا کر شرمندہ ہو چکا تھا اسی لیے میں خاموش ہی رہا۔

لیکن ایک بار پھر جب اس دوست سے ملاقات ہوئی اور اس نے فروزاں کے بارے میں ایک ایسی بات بتائی جو کسی عورت کو قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی تو پھر میں نے پھوپا کو بتا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس دوست نے بتایا تھا کہ فروزاں منشیات کی بھی عادی ہے۔ سگریٹ تو بہت چھوٹی سی چیز ہے۔ وہ چرس اور شراب تک چلی گئی ہے۔

اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ میں یہ سب جان کر خاموش رہتا۔ اسی لیے میں پھوپا کے پاس پہنچ گیا۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا۔ "پھوپا آپ اس لڑکی سے مکرم کی شادی نہ کریں۔"

"کیوں نہ کروں۔"

"اب میں آپ کو کھل کر تو نہیں بتا سکتا لیکن وہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے۔ اور آپ کو یاد ہوگا آپ نے کہا تھا کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است تو بالکل درست ہے لیکن جب کسی بزرگ نے اپنی لاعلمی میں ایسا کوئی قدم اٹھا لیا ہو تو بتا دینا ضروری ہوتا ہے۔"

"بدتمیز۔ مردود۔" پھوپا پھر مجھ سے اکھڑ گئے۔

☆ جارج کسٹر نے امریکی قبائل پر چڑھائی کا ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "بہادرو۔ یقین کرو اگر تم ان چند سو لوگوں کو برباد کر کے رکھ دو تو امریکا۔۔۔ کی تاریخ میں تمہارا نام ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ جارج کسٹر ورآرنی تھا۔ جسے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان کا نام تاریخ میں مشہور ہو جائے۔ ادھر سے گزرتے لوگ اشارہ کریں کہ وہ دیکھو امریکا کا بہادر انسان جا رہا ہے۔ ایک شخص نے سوال کیا۔ "کیپٹن کیا ہمیں قبائلیوں کی تعداد کا علم ہے۔"

"ہاں۔ وہ تین چار سو سے زیادہ نہیں ہیں۔" کیپٹن نے جواب دیا۔ لہٰذا تین چار سو کے چکر میں وہ لوگ قبائلیوں سے جا ٹکرائے۔

اور جب ادھر ادھر کی جھاڑیوں سے ہزاروں کی تعداد میں قبائلی نکل نکل کر سامنے آنے لگے تو کیپٹن اور اس کے آدمیوں کے ہوش اڑ گئے۔

لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ قبائلیوں نے انہیں چن چن کر مار دیا۔ یہ واقعہ 1876 میں پیش آیا تھا۔

مرسلہ: نعیم الدین۔ لسبیلہ بلوچستان

سیزر سینیٹ میں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یہ کہانی ہے روم کے مشہور کردار جولیس سیزر کی۔ جب وہ دروازے تک پہنچا تو اس کی بیوی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ "نہیں سیزر۔ آج تم سینیٹ میں نہیں جاؤ گے۔"

"وہ کیوں؟" سیزر نے پوچھا۔

"میں نے تمہارے لیے ایک برا خواب دیکھا ہے۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"خواب؟" سیزر مسکرا دیا۔ "کیوں ایسے واہموں کو ذہن میں آنے دیتی ہو۔"

"نہیں سیزر۔ بہت ہی بھیانک خواب تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں نے تم پر حملہ کر دیا ہے۔"

لیکن سیزر نے اس کی بات نہیں مانی اور اس کا مذاق اڑاتا ہوا سینیٹ کے اجلاس میں چلا گیا اور وہاں اسے اپنی اس غلطی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑ گئی۔ اس پر حملہ ہوا۔ بہت سے لوگوں نے اسے گھیر کر مار دیا۔

مرسلہ: انعام حنیف۔ اٹک

''اب کیا ہو گیا پھوپا۔ اب تو میں نے وقت سے پہلے بتا دیا ہے۔''

''تو نہیں چاہتا کہ اس گھر میں خوشحالی آئے۔'' پھوپا نے کہا۔ ''مجھے پتا چل گیا ہے کہ وہ ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہے اور اس کے باپ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شادی کے بعد وہ اپنے داماد کو ایک بڑا کاروبار سیٹ کروا دے گا۔ تو اسی لیے یہ سب بول رہا ہے۔''

''پھوپا۔ میں تو اس گھر کو پریشانیوں سے بچانا چاہتا ہوں۔''

''تو اس کی فکر مت کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اچھی مصیبت ہے۔ اس کہاوت پر عمل کرو تو برے بنو۔ نہ عمل کرو تو برے بنو۔ لعنت ہو۔ میں تو اب ایسے معاملے میں پڑوں گا ہی نہیں۔ جو آپ لوگوں کی مرضی ہو وہ کریں۔''

میں بھی پھوپا پر ناراض ہو کر چلا آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سارا قصور اسی کم بخت کہاوت کا تھا۔ اس نے اب تک مجھے برباد اور شرمندہ ہی کیا تھا۔

ارے کرتے رہیں بزرگ غلطیوں پر غلطیاں۔ میں نے کیا ٹھیکا لے رکھا ہے۔

برسوں گزر گئے۔ میں پھر اس کہاوت کے چکر میں نہیں پڑا۔ یا شاید کوئی ایسا موقع نہیں آیا کہ مجھے اس کہاوت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

میری شادی بھی ہو گئی، بچے بھی ہیں، اور اب تو اولادیں جوان ہو چکی ہیں۔ میں خود بزرگ بن چکا ہوں، اور ایک دن۔ ایک دن ایسا ہوا کہ مجھے کچھ اور احساس ہونے لگا۔ شاید اس مقام پر آ کر ایسا ہی ہوتا ہے۔

آپ نے شب برات میں بچوں کو پٹاخے چلاتے تو دیکھا ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ بچپن میں آپ نے بھی ایسا کیا ہو لیکن اب آپ کو یہ شور بہت برا لگتا ہے۔ آپ ان بچوں کو گالیاں دیتے پھرتے ہیں۔ جو گلیوں اور محلوں میں آتش بازیاں کر رہے ہوں۔ کیونکہ یہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔

میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ ایک بار میں نے ایک ایسے آدمی کو پچاس ہزار روپے دے دیے جس کو میں جانتا بھی نہیں تھا۔ میرے بیٹے نے بڑے ہو کر اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اس نے ابتدا میں ایک چھوٹی سی دکان کھولی تھی اور اب ماشاءاللہ وہ دکان ایک سپر اسٹور میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لاکھوں کا سامان رہتا تھا اس میں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں اس اسٹور کی طرف چلا جاتا۔ اس وقت یہ دیکھ کر خوشی ہوا کرتی کہ صاحب زادے نے ماشاءاللہ کتنی ترقی کر لی ہے۔

اس وقت وہ مجھے کیش پر بٹھا دیا کرتا۔ ''ابو۔ آپ یہاں بیٹھ جائیں۔ میں دو چار کام نمٹا کر آتا ہوں۔''

میں سیٹھ بن کر کیش پر بیٹھ جایا کرتا۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ میں کیش پر بیٹھا تھا کہ ایک آدمی میرے پاس آ گیا۔ ''صاحب جی۔ وہ رحیمی والے پچاس ہزار روپے منگوا رہے ہیں۔''

رحیمی والوں کو میں بھی جانتا تھا۔ ان کا بھی بہت بڑا کاروبار تھا اور وہ ہمارے اسٹور کے سامنے ہی تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں رحیمی والوں کو فون کر کے ان سے یہ معلوم کر لیتا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان تاجروں کے آپس میں اس قسم کے لین دین چلتے ہی رہتے ہیں۔

اسی لیے میں نے پچاس ہزار کی رقم اس کے حوالے کر دی۔ اور جب میرا بیٹا واپس آیا تو میں نے اسے بتا دیا کہ میں نے رحیمی والوں کے پچاس ہزار دیے ہیں۔ ان سے لے لینا۔''

''رحیمی والوں کو۔'' میرا بیٹا حیران رہ گیا تھا۔ ''ان سے تو میرا کوئی لین دین نہیں ہے۔ میں معلوم کر کے آتا ہوں۔''

وہ معلوم کرنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ ''ابو ان لوگوں نے کوئی پیسے نہیں منگوائے۔''

''تو پھر۔ وہ۔ وہ آدمی۔'' میری آواز کانپ رہی تھی۔

''وہ آدمی چیٹر تھا جو آپ کو دھوکا دے کر چلا گیا۔'' بیٹے نے کہا۔

''میرے خدا۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔'' پچاس ہزار کی رقم اچھی خاصی ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ پھٹ پڑے گا۔ ایک ہنگامہ مچا دے گا کیونکہ میں نے اپنی حماقت سے اسٹور کا اچھا خاصا نقصان کر دیا تھا۔ ان سب کی بجائے میرے بیٹے نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''ابو! آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ اس قسم کی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے لیے اتنی پریشانی کی کیا ضرورت ہے۔''

اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ صدیوں کی یہ کہاوت غلط نہیں ہے۔ اس کو برقرار رکھنا چاہیے۔ بزرگوں کی خطاؤں پر انہیں درگزر کر دینا چاہیے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

محترمہ عذرا رسول
آداب عرض
کیا واقعی کیمیاگری کے ذریعہ سونا بنایا جاسکتا ہے. یہ فن سیکھنے کے لیے میں نے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے مگر جب اصل کیمیا گری کا سراغ ملا تو دنیا سے دل اچاٹ ہوگیا اگر آپ بھی کیمیا گری سیکھنا چاہتے ہیں تو میری حالات زندگی ضرور پڑھیں۔

سہیل
(راولپنڈی)

میں اپنی زندگی سے تنگ آچکا تھا۔
یہ بھی کوئی زندگی تھی کہ ہر وقت پولیس اور قانون سے ڈرتے رہو۔ حالانکہ میں نے جتنی بھی خطائیں کیں یا جو بھی جرم کیا اس کا کوئی سراغ نہیں رہنے دیا۔

اس کے باوجود کھٹکا سا تو لگا ہی رہتا تھا۔ نہ جانے پولیس کے ہاتھ مجھ تک پہنچ جائیں۔ نہ جانے کب میرا ہی کوئی ساتھی میرے ساتھ غداری کر جائے۔
حالانکہ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے ساتھی

میرے اتنے وفادار ہیں کہ اگر ان کو کوڑے بھی مارے جائیں تب بھی وہ میرے خلاف کچھ نہیں کہیں گے۔ پھر بھی ایک کھٹکا سا لگا رہتا تھا۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے پہلی خطا یعنی پہلا جرم کب کیا تھا۔

شاید جرم میری فطرت میں شامل تھا۔ حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ کیونکہ انسان تو نیک خصلتوں پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس میں بگاڑ کب سے پیدا ہوتا ہے۔

میری پہلی خطا شاید وہ تھی جب میں نے عارف کی بات مانی تھی۔ میں اس زمانے میں اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ ویسے تو پڑھائی میں ٹھیک ہی تھا لیکن حساب میں بہت کمزور تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ حساب کے ٹیچر بہت سخت تھے۔

سخت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے رحم بھی تھے۔ بہت بے دردی سے مارا کرتے۔ بچے لاکھ بلبلاتا رہے لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

ان کے ہاتھوں زیادہ مار کھانے والوں میں میرے علاوہ عارف بھی تھا۔ وہ سخت ہاتھ پیروں والا لڑکا تھا۔ اس کا باپ کسی زمانے میں پہلوان رہ چکا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کو بھی روزانہ کسرت کروایا کرتا جس کی وجہ سے وہ خاصا مضبوط ہو گیا تھا۔

پوری کلاس میں اس کی دوستی صرف مجھ ہی سے تھی۔ دوسرے لڑکے اس سے کترایا کرتے تھے۔ ایک بار حساب کے ٹیچر نے جب اس کی خوب ٹھکائی کی تو ایک دن کے لیے وہ اسکول سے غائب ہو گیا۔

دوسرے دن وہ جب اسکول آیا تو بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔ ہاف ٹائم میں وہ مجھے اپنے ساتھ ایک درخت کے پاس لے آیا۔

''یار۔ سہیل تجھے میرا ساتھ دینا ہے۔ وعدہ کر کہ تو میرا ساتھ دے گا۔'' اس نے کہا۔

''بھئی بتا تو تجھے کس بات میں ساتھ دینا ہے۔''

''یار۔ یہ جو حساب کا ٹیچر ہے نا۔ اس کی ٹھکائی کرنی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ٹھکائی کرنی ہے؟ کیسے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''پہلے یہ بتا تجھے اس پر غصہ ہے یا نہیں۔ خوامخواہ مارتا رہتا ہے۔''

''ہاں ہے تو۔''

''بس تو پھر تیار ہو جا۔ آج رات اس کو مزہ چکھانا ہے۔''

''لیکن کیسے؟''

''سب سوچ لیا ہے میں نے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کا مکان جس گلی میں ہے۔ وہاں بالکل اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ٹھیکیدار کے بیٹے کو ٹیوشن پڑھانے جاتا ہے اور رات کو نو بجے واپس لوٹتا ہے۔ اس وقت گلی بالکل سنسان ہوتی ہے۔ ہم چبوترے کے پیچھے چھپ جائیں گے اور جیسے ہی وہ گزرنے لگے گا۔ پیچھے سے اس پر چادر ڈال کر اسے بے بس کر دیں گے۔''

''کیا وہ قابو میں آجائے گا۔'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں آئے گا۔ اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ اور میں نے اتنے برسوں سے اپنی جان شان یوں ہی نہیں بنائی۔ اس کو تو ہاتھ پاؤں چلانے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا۔''

''اس کے بعد اس گلی میں اس کو گرا کر خوب دھنائی کریں گے اس کی۔'' عارف نے کہا۔ ''سالا ایک ہفتے تک بستر سے نہیں اٹھ سکے گا۔''

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کام میں اس کا ساتھ دینے کی ہامی بھر لی۔ کیونکہ میں خود بھی اس سے تنگ آیا ہوا تھا۔ تو یہ میری زندگی کی پہلی خطا تھی۔

ہم نے وہی کیا جو ہم نے سوچا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اس کی اتنی ٹھکائی کر دی کہ وہ پندرہ دنوں سے پہلے اسکول نہیں آسکا۔ یہ پندرہ دن ہماری آزادی کے تھے۔

اس کے بعد میں نے عارف کا کچھ اور معاملوں میں بھی ساتھ دیا۔ اسکول سے بھاگنے لگا۔ ایک بار محلے کی ایک دکان کا تالا توڑا۔ اور رفتہ رفتہ یہاں تک ہوا کہ موٹر سائیکل چوری تک آگیا۔

میں اپنے جرائم اور واردات کی پوری تفصیل تو نہیں لکھوں گا۔ لیکن اتنا ضرور بتا دوں کہ میری ابتدا اس انداز سے ہوئی تھی۔

شاید ہر جرم کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے۔ پہلے ایک معمولی سی خطا۔ پھر وہ خطا پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔

شاید اپنے محلے کا میں پہلا شخص تھا جس کو تین سال کی جیل ہوئی تھی اور جیل سے باہر آ کر تو میں عارف جیسوں کو بہت پیچھے چھوڑ چکا تھا۔

رفتہ رفتہ کچھ بھی نہیں رہا میرے پاس۔ میرے

گھر والے مجھ سے دور ہو گئے۔ دوست رشتہ دار ملنے سے کترانے لگے اور میں اپنی بے سکونی کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ ایک تنہا انسان جس کا دوست کوئی نہیں تھا۔ جس کا سہارا اور کمائی بھی چوری اور ڈاکوں سے حاصل ہو جاتی۔

میں نے صرف ایک کام نہیں کیا۔ کسی کو قتل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ سارے جرائم میرے کھاتے میں درج ہو چکے تھے۔

اغوا برائے تاوان سے لے کر ڈکیتیاں تک۔ پولیس میرے تعاقب میں رہتی تھی۔ ایک بار اور بھی سات سال کے لیے قید ہو چکی تھی۔ لیکن جرم کی دنیا تو وہ دلدل ہے جس میں پھنس کر انسان کا نکل آنا ناممکن ہے۔ انسان جتنا ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اتنا ہی اندر اترتا چلا جاتا ہے۔"

میرا ایک چھوٹا سا گروہ بھی تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے گروہ میں بہت کم لوگوں کو رکھا تھا۔ میرا تجربہ بتاتا تھا کہ گروہ جتنا بڑا ہو۔ پھنسنے کے چانسز اتنے ہی زیادہ ہوا کرتے ہیں۔

گروہ چھوٹا ہو تو کنٹرول کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ میرے ساتھ صرف چار پانچ آدمی ہوا کرتے تھے۔ انتہائی بھروسے والے۔ جی دار قسم کے اور میرے وفادار۔ جو میں نے کہہ دیا اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے والے۔

ایک بار میں صدر کی ایک فٹ پاتھ سے گزر رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔ "سہیل۔ سہیل۔"

میں حیران ہو کر رک گیا۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی۔ میری زندگی میں کسی عورت کا کیا دخل ہو سکتا تھا۔ دو تین سے تعلقات رہے بھی تھے تو وہ بھی ایسی ویسی ہی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ ایک عورت میری طرف چلی آ رہی ہے۔ اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ورنہ وہ پوری طرح برقعے میں تھی۔ مجھ جیسوں کی زندگی میں اس قسم کی کوئی عورت کہاں آ سکتی تھی۔

بہرحال وہ میرے قریب آ گئی۔ "سہیل۔ تم نے پہچانا مجھے۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہاری صرف آنکھیں دکھائی دے رہی ہیں، اور صرف آنکھوں سے تو نہیں پہچان سکتا۔"

"چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ پھر تم پہچان لو گے۔"

ہم قریب ہی ایک ہوٹل میں آ گئے۔ یہاں آ کر اس نے اپنی نقاب الٹ دی۔ وہ شگفتہ تھی۔ ایک خراب سی لڑکی۔ جس کو آپ سوسائٹی گرل کہہ سکتے ہیں۔

اس سے پہلے اکثر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ پھر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ میرا اس سے بس کمرشل قسم کا تعلق تھا۔ اسی لیے میں نے بھی غور نہیں کیا کہ وہ کہاں ہو گی۔ کہاں نہیں ہو گی۔

ہم دونوں ایک ہی جیسے تھے۔ دونوں کا ذریعہ آمدن غلط تھا۔ بہرحال اتنے دنوں کے بعد وہ ملی اور وہ بھی اس طرح کہ اس نے باقاعدہ برقع پہن رکھا تھا۔ یہ میرے لیے حیران کر دینے والی بات تھی۔

"کیوں۔ اب تو پہچان لیا نا۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں بہت اچھی طرح۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ میں تو تم کو تلاش کر رہا ہوں۔"

"کیا کرنے مجھے تلاش کر کے۔" وہ ہنس پڑی۔ "تم جیسوں کے پاس اتنی فرصت کہاں ہے کہ ہم جیسی لڑکیوں پر دھیان دیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "پھر بھی تمہارا خیال آتا رہا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہاں رہیں، اور یہ تم نے پردہ کرنا کب سے شروع کر دیا۔"

"کیمیا گر بابا سے ملنے کے بعد۔" اس نے بتایا۔

"کیمیا گر بابا۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ کون صاحب ہیں۔"

"ایک بابا ہیں جو سونا بنانا جانتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"کیا بکواس ہے۔ سونا وغیرہ بنانا صرف کہانیوں میں ہوتا ہے۔"

"یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ تمہیں ایسا کوئی ملا نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن میں جانتی ہوں کہ ایسا ہوتا ہے۔ کیا تم میری کہانی سننا پسند کرو گے۔"

"ہاں ہاں سناؤ۔ میں اس لیے تو تمہارے ساتھ آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"سہیل۔ تم تو جانتے ہو کہ میری کیا زندگی تھی؟ کہاں کہاں بھٹکتی رہتی۔ اس لیے نہیں کہ میرا پیٹ خالی ہوتا یا میرے تن پر کپڑے نہیں ہوتے۔ نہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا میرے ساتھ۔"

"ہاں اسی لیے تو میں بھی حیران ہوا کرتا کہ تمہارے ساتھ تو ایسی کوئی مجبوری بھی نہیں تھی۔ پھر تم ایسی راہوں پر

کیوں چل پڑی تھیں۔"

"اس لیے کہ برائی کا نشہ میری رگوں میں شامل ہو گیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اس کی ابتدا سگریٹ، چرس، شراب وغیرہ سے ہوئی۔ اس کے بعد جنسی بے راہ روی تک جا پہنچیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک خواہش اور بھی تھی۔"

"وہ کیا۔"

"دولت کی خواہش۔" اس نے بتایا۔ "یہ ساری عیاشیاں اور سارے حربے تھوڑے سے پیسوں میں تو نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے لیے تو بہت دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہ دولت کہاں سے آتی۔ میں ڈاکے تو نہیں ڈال سکتی تھی۔ اسی لیے سوچتی رہتی کہ دولت حاصل کرنے کے طریقے کیا ہیں۔ کہاں سے اتنی دولت آ سکے۔ پھر اتفاق سے ایک عرصے کے بعد میری ایک دوست کا فون آ گیا۔ وہ دوست امریکا میں رہتی ہے۔ اس کو نہیں معلوم تھا کہ میں کن راہوں پر چل نکلی ہوں۔ اس نے جب مجھ سے میرا حال پوچھا تو میں نے اس سے کہا۔ "یار۔ آج کل تو بس ایک ہی دھن سوار ہے۔"

"اور وہ کیا ہے۔"

"دولت۔ زیادہ سے زیادہ دولت۔"

"یہ تو ہر انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "اس میں کیا خاص بات ہے۔"

"خاص بات یہ ہے کہ مجھے کچھ زیادہ کی ضرورت ہے۔"

"اچھا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "پھر تم ایسا کرو۔ تم کیمیا گر بابا کے پاس چلی جاؤ۔" اس نے کہا۔

"کیمیا گر بابا۔ یہ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک باکمال انسان جو سونا بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ اور اتفاق سے تمہارے ہی شہر میں رہتے ہیں۔"

"یار۔ کیوں بے وقوف بنا رہی ہو۔ ایسا کون ہو گا جو سونا بنانا جانتا ہو۔"

"میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں نے تم سے کبھی ایسا مذاق نہیں کیا ہو گا۔ اگر کہو تو میں تمہیں ان کا ایڈریس بھی لکھوا دیتی ہوں۔"

"کمال ہے یار۔ کیا اس دور میں بھی ایسا ہوتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہوتا۔ ہر دور میں باکمال لوگ ہوتے ہیں۔ بس دعا کرو کہ وہ تم پر مہربان ہو جائیں۔"

"اور ان کی مہربانی کی کیا شرائط ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"انہیں ایسا ویسا مت سمجھ لینا۔" میری دوست نے کہا۔ "وہ ذرا دوسرے قسم کے انسان ہیں۔"

"چلو۔ مان لی تمہاری بات۔ لیکن کیا ضرورت ہے کہ وہ مجھ پر مہربان ہوتی جائیں۔"

"تم ان کے پاس جاؤ تو سہی۔ اور اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔" میری دوست نے کہا۔ "انہیں صاف صاف بتا دو کہ تمہیں ڈھیر سے پیسوں کی ضرورت کیوں ہے۔ پھر وہ مناسب سمجھیں گے تو تمہیں سونے کی دولت دے دیں گے۔"

مجھے اپنی دوست کی اس انوکھی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص سونا بنانا جانتا ہو اور وہ کراچی کے ایک معمولی سے علاقے میں اپنی زندگی گزار رہا ہو۔

میری دوست نے مجھے ان کا پتا سمجھا دیا تھا اور پھر ایک دن میں کیمیا گر بابا کے پاس پہنچ گئی۔ بہت معمولی سا مکان تھا۔ مکان کیا وہ ایک کوارٹر تھا۔ ایک کمرے والا۔ اور وہ سونا بنانے والا وہیں رہتا تھا۔ لوگ بھی کیسی کیسی کہانیاں بنایا کرتے ہیں۔ سونا بنانے کا ماہر اور ایک عام سے کوارٹر میں زندگی گزارتا ہو۔

چونکہ اس دوست نے بہت زور دے کر یہ بات کہی تھی۔ اسی لیے میں آزمانے کی خاطر کیمیا گر بابا کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس کو آزمانے میں حرج بھی کیا تھا۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو کچھ دیر بعد ایک ضعیف شخص نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک مہربان چہرے اور روشن آنکھوں والا شخص تھا۔

میں وہاں نہ جانے کیا سوچ کر آئی تھی۔ پتا نہیں۔ کیسی صورت شکل کا ہو گا۔ پاپا ٹائپ کے لوگ تو کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وحشت زدہ سے۔ اس کے برعکس اس کے چہرے سے نرم دلی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا۔" اس نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس کا لہجہ بھی اتنا نرم اور مہربان تھا کہ میں حیران ہی رہ گئی تھی۔ "جی۔ وہ۔ وہ میں۔ کیمیا گر بابا سے ملنے آئی تھی۔"

"اوہ۔" وہ مسکرا دیا۔ "بیٹا۔ کس نے بھیجا ہے تمہیں۔" اس نے پوچھا۔

میں نے اپنی دوست کا نام بتاتے ہوئے کہا۔ "اس نے بتایا تھا کہ آپ سونا بنانا جانتے ہیں۔"

"آؤ اندر آجاؤ۔" اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔

میں کچھ جھجکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں وہاں تک پورے اعتماد اور ارادے کی قوت کے ساتھ گئی تھی۔ لیکن وہاں پہنچ کر جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ اس کے سامنے کچھ نہیں کہا جا رہا تھا۔

اس نے اپنے کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ اس کمرے کا ساز و سامان بھی بہت معمولی سا تھا۔ ایک دری بچھی ہوئی تھی۔ جس پر سفید چادر تھی اور روز مرہ استعمال کی کچھ چیزیں رکھی تھیں۔ بس اور کوئی ساز و سامان نہیں تھا۔ پتا نہیں کیسا سونا بنانے والا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں ایک طرف بیٹھ گئی۔ اب کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ یا یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کیسے کروں۔

"تو تم سونے کے لیے آئی ہو۔" اس نے پوچھا۔

"جی بابا۔ شاید میری دوست نے مجھ سے مذاق کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"نہیں بیٹا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "تمہاری دوست نے مذاق نہیں کیا تھا۔ کچھ لوگ مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ نہ جانے لوگوں کو کسی کا بھید ظاہر کرنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ میں خود کو جتنا چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ اسی قدر ان چکروں میں الجھتا جا رہا ہوں۔"

اب مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ میری دوست نے اس کے بارے میں غلط بیانی نہیں کی تھی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ میں اکثر ان کے پاس جانے لگی۔ کیونکہ مجھے تو جنون سا ہو گیا تھا۔ مجھے ہر حال میں دولت حاصل کرنی تھی اور اس بابا کے پاس دولت دینے کا ایک طریقہ تھا۔ یعنی سونا بنانے کا عمل۔ اور میں جانتی تھی کہ میں بابا کو مہربان کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ اور ہوا بھی یہی ایک دن بابا نے مجھ پر نظر عنایت کی اور مجھے دولت مند کر دیا۔"

"کیا خیال ہے۔ میں تمہاری اس کہانی پر یقین کرلوں۔" میں نے پوچھا۔

"یہ تمہاری مرضی ہے۔" شگفتہ نے کہا۔ "لیکن سچ وہی ہے۔ جو میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ جب مجھے کامیابی مل گئی تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ تمہیں بھی اس کامیابی میں شریک کرلیا جائے۔ اسی لیے تمہیں یہ سب بتا رہی ہوں۔"

"کیا وہ بابا مل جائیں گے مجھے بھی؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ملیں گے۔" اس نے کہا۔ "ان کا وہی گھر ہے۔ جو میں نے بتایا ہے۔"

"تو پھر میں کل ہی جاتا ہوں ان کے پاس۔ بات یہ ہے کہ میں بھی روز روز کی بھاگ دوڑ سے تنگ آ چکا ہوں۔ اب سکون چاہیے مجھے، اور سکون کے لیے آج کل دولت ضروری ہے۔"

"اور دولت کے حصول کا وہی طریقہ ہے جو میں تمہیں بتا چکی ہوں۔"

"دیکھو۔ اگر اس بابا نے یہ فن بتانے سے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ انکار نہیں کریں گے۔" شگفتہ نے کہا۔ "تم ان کے سامنے جا کر عاجزی دکھاؤ۔ اپنی مجبوریاں بیان کرو تو وہ مان جائیں گے۔"

"چلو۔" میں مسکرا دیا۔ "اگر وہ اس پر بھی نہیں مانے تو ایک دوسرا علاج تو ہے میرے پاس۔"

"وہ کیا ہے۔"

"اغوا۔ میرے بندے اس بابا کو اٹھا کر لے آئیں گے۔ پھر وہ ہر حال میں یہ طریقہ بتا دے گا۔ کنپٹی پر جب پستول رکھا ہوا ہو تو بڑے بڑے پانی ہو کر بہہ جاتے ہیں۔"

"اب یہ تمہاری مرضی ہے۔ لیکن شاید اس کی نوبت نہ آئے۔" اس نے پھر مجھے اس بابا کا ایڈریس سمجھا دیا۔

میں نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرا خیال رکھا تھا ورنہ یوں تو نہ جانے کتنی لڑکیاں آئیں اور رخصت ہو گئیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ اس حد تک جاتے۔"

جاتے جاتے شگفتہ نے اپنا موبائل نمبر بھی لکھوا دیا تھا۔

میں نے اپنے آدمیوں کو ابھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ اغوا وغیرہ کی نوبت تو اس وقت آتی جب وہ کمبخت بابا میری بات ماننے سے انکار کر دیتا۔

بہرحال میں شگفتہ کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ ایک خستہ سا ایک کمرے کا کوارٹر تھا۔

میرے دستک دینے پر اس بابا نے دروازہ کھولا تھا۔ شگفتہ اس کا حلیہ بتا چکی تھی۔ ایک مہربان چہرے اور روشن آنکھوں والا شخص۔

"کہو بیٹا کس سے ملنا ہے۔" اس نے نرم آواز میں پوچھا۔

"آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے

شگفتہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ شاید آپ اسے جانتے ہیں۔"

"ہاں جانتا ہوں۔ آؤ اندر آجاؤ۔"

اس نے اس کمرے میں لے جاکر بٹھایا جس کا تذکرہ شگفتہ کرچکی تھی۔

"سونے کی تلاش لائی ہے میرے پاس۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی بابا۔" میں نے بتایا۔ "میں اپنے حالات سے تنگ آچکا ہوں۔"

"شگفتہ اچھی لڑکی ہے۔ اس کو بہت خیال ہے تمہارا۔" بابا نے کہا۔ "اس نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتادیا تھا کہ تم کون ہو اور کیا کرتے ہو۔"

"اسی لیے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ اس زندگی سے جان چھوٹ جائے۔ بہت سی دولت مل جائے تاکہ کوئی اور دھندا دیکھوں۔"

"اس کے لیے تمہیں روزانہ میرے پاس آنا ہوگا۔" بابا نے کہا۔ "اور میری خدمت کرنی ہوگی۔ جو میں کہوں وہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ صرف تمہارے کہنے پر میں تمہیں یہ فن دے دوں۔ میں تمہیں آزماؤں گا۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

"میں تیار ہوں جی۔" میں نے کہا۔

"خوب۔" وہ مسکرادیا۔ "اب چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"مسجد تک۔" اس نے کہا۔ "میں نماز کے لیے جاؤں گا۔ تم باہر کھڑے رہنا۔ دل چاہے تو تم بھی اندر آجانا۔"

"کیوں نہیں آؤں گا جی۔ میں بھی مسلمان ہوں۔"

"تو پھر آؤ بسم اللہ۔"

ہم ایک ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔ جماعت ہونے والی تھی۔ شاید برسوں کے بعد میں کسی نماز میں شریک ہوا تھا ورنہ سوائے نماز کے دنیا کے ہر کام کی فرصت مل جاتی تھی۔

نماز ختم ہونے کے بعد ہم باہر آگئے۔ اس نے کہا۔ "اب تمہیں میرے ساتھ دکانداری کرنی ہے۔ میرا مطلب ہے میرے پاس چار پانچ ٹوکرے سیب ہیں۔ وہ اٹھا کر ایک دکان والے کو دینے ہیں۔ اس سے بات ہوچکی ہے۔"

"تو کیا آپ پھل بیچتے ہیں؟"

"ہاں زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے نا۔" اس نے کہا۔ "اور میرے پاس جو ہنر ہے۔ اس کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپانا بھی ضروری ہے ورنہ کتنے لوگ میرے پیچھے ہی پڑجائیں۔"

ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ جس کو پتا چلے وہ تو آپ کے دروازے پر آکر بیٹھ جائے۔"

"اسی لیے تو میں یہ سب چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اس قسم کے کام میرے لیے پردے کی طرح ہوتے ہیں۔"

ہم کوارٹر میں واپس آگئے۔ اس ایک کمرے کے برابر میں اسٹور نما ایک چھوٹا سا کمرا بھی بنا ہوا تھا۔ سیبوں کی چار ٹوکریاں اس اسٹور میں رکھی تھیں۔

سیب دیکھنے ہی سے خوش نما اور تازہ معلوم ہو رہے تھے۔

"بابا۔ یہ تو بہت اچھے سیب ہیں۔" میں نے تعریف کی۔

"ہاں۔ اچھے تو ہیں۔ لیکن یہ ذرا کم نسل کے سیب ہیں۔ اسی لیے بازار میں ان کی قیمت زیادہ نہیں لگے گی۔"

"کیوں نہیں لگے گی۔ یہ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ یہ سیب کس نسل کے ہیں اور کیسی نسل کے نہیں ہیں۔"

"نہیں۔ عیب بتانا ضروری ہوتا ہے۔" بابا نے کہا۔ "ورنہ قدرت کی طرف سے وہ قوت واپس لے لی جاتی ہے جو اس نے اپنی مہربانی سے مجھے دی ہے۔ یہاں دو چار پیسے کم آجائیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن جھوٹ بول کر پیسے آجائیں اور اس کے بعد اندر کا سکون غارت ہوجائے تو پھر بہت فرق پڑتا ہے۔ میری بات سمجھ گئے نا۔"

"جی ہاں سمجھ گیا۔"

"چلو ایک ٹوکری اٹھاؤ۔" بابا نے اشارہ کیا۔

میں نے اس قسم کی محنت کبھی نہیں کی ہوگی۔ اس نے جس دکان والے سے بات کررکھی تھی۔ وہ دکان زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اس کے باوجود ٹوکری وہاں تک لے جانا عذاب ہوگیا تھا۔ اتنا ہی نہیں۔ اس نے چاروں ٹوکریاں مجھ ہی سے اٹھوائی تھیں۔

اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی جاننے والا مجھے دیکھ لے تو وہ کیا سوچے۔ یہ تو کسی کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ مجھ جیسا آدمی اس قسم کا کام بھی کرسکتا ہے۔

لیکن یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔ اس ہنر کو پانے کے لیے اس بوڑھے کی خدمت تو کرنی تھی۔ بس صرف ایک بار وہ ہنر ہاتھ آ جائے تو پھر کہاں کا بابا، اور کس کا بابا۔

چاروں ٹوکریاں میں نے ہی پہنچائی تھیں۔ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ ایسی مشقت تو کبھی نہیں کی تھی۔ اس نے میرے سامنے دکاندار کو سیبوں کے بارے میں بتا دیا تھا کہ ان کا معیار اتنا اچھا نہیں ہے۔

میں اس کے کمرے میں جا کر بیٹھا تو اس نے میرے سامنے روٹی اور اچار رکھ دیا۔ ”لو یہ کھاؤ۔“

اتنی محنت کے بعد میری بھوک چمک رہی تھی۔ اس وقت روٹی اور اچار نے مزہ دے دیا تھا۔

”اب بتاؤ۔ یہ روٹی اور اچار کیسے لگے۔“ اس نے پوچھا۔

”بہت اچھے۔ بہت مزیدار۔“ میں نے بتایا۔

”جانتے ہو کہ ان میں اتنا مزہ کیوں آیا؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں۔ آپ ہی بتا دیں۔“

”اس لیے کہ تم نے اپنے بازوؤں کی محنت کے بعد روٹی اور اچار کھایا ہے۔ ان کے ذائقہ میں تمہارے پسینے کی مہک شامل ہے۔ سمجھ گئے۔“

میں تھوڑا بہت سمجھ ہی گیا تھا۔ ”چلیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کب سے کام شروع کر رہے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”میں نے تو اپنا کام شروع کر دیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اب تم کو کل پھر آنا ہوگا۔“

”عشا کی نماز سے پہلے۔“ اس نے بتایا۔ ”ہماری مسجد میں یہ جماعت سوا نو بجے کھڑی ہو جاتی ہے۔ تم نو بجے تک آ جانا۔ میں مسجد کے گیٹ پر ملوں گا۔ نماز کے بعد میں تمہیں گھر لے آؤں گا اور اس فن کی بنیادی باتیں بتا دوں گا۔“

”جی بہت بہتر۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

دوسری رات میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ وہ مسجد کے گیٹ ہی پر انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ”یہ بتاؤ۔ کل رات نیند کیسی آئی تھی تمہیں۔“

”جی بہت گہری۔ حالانکہ میں عام طور پر پلاؤ لیتا ہوں لیکن کل اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔“

”خدا نے چاہا تو آج وہ بھی نہیں ہوگا۔ چلو وضو کر کے جماعت میں شامل ہو جاؤ۔ پھر گھر چلتے ہیں۔“

نماز سے فارغ ہو کر ہم اس کے گھر آ گئے۔

اس نے پھر میرے سامنے کھانا لا کر رکھ دیا۔ ”یہ لو پہلے کچھ کھا لو۔“

”جناب۔ میں کھا کر آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”جانتا ہوں میں۔ لیکن اس کی بھی گنجائش نکل ہی آئے گی۔ یہ سب میں آگے بتاتا ہوں۔“

حالانکہ بہت عام سی چیزیں تھیں۔ سادہ سی روٹیاں اور آلو کا سالن۔ گرچہ میں خوب کھا کر آیا تھا۔ اس کے باوجود گنجائش نکل ہی آئی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے کہا۔ ”دیکھو میاں۔ اب میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ اس کا جواب دے دینا۔“

”جی فرمائیں۔“

”تم یہ ہنر کیوں سیکھنا چاہتے ہو۔“

”ظاہر ہے۔ دولت کے لیے۔“ میں نے بتایا۔

”اور دولت سے کیا ہوگا۔“

”ایک اچھی زندگی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھی زندگی سے تمہاری کیا مراد ہے۔“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”مراد یہ ہے کہ پرسکون زندگی۔ جس میں کوئی خوف کوئی بے چینی نہ ہو۔“ میں نے کہا۔

”ہوں۔ یعنی اصل چیز ہے سکون۔ جو تم ہر قیمت پر حاصل کر لینا چاہتے ہو۔“

”جی جناب۔ میں یہی چاہتا ہوں۔“

شمارہ اگست 2014ء کی منتخب سچی بیانیاں

بیانیاں چپ رہیں۔ آپ کا انتخاب

☆ اول: آخری راستہ ...... رباب (حیدرآباد)

☆ دوم: چھوٹا آدمی ...... عزیزہ ہمدانی (ملتان)

☆ سوم: زندگی ...... عنایت حسین چشتی (حیدرآباد)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی انتخاب کیجیے

"اب تمہارا عملی سبق شروع ہوگا۔" اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد بتایا۔ "سونا بنانے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کس مقدار میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سب تمہیں کل سے بتایا جائے گا۔ لیکن ایک شرط بھی ہے۔"

"جناب۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔"

"بس تو پھر کل سے اپنے تمام کام دھندے لپیٹ کر پندرہ دنوں کے لیے میرے پاس آجاؤ۔" اس نے بتایا۔

"پندرہ دنوں کے لیے؟"

"ہاں۔ یہ ضروری ہے۔ کیونکہ تم اس طرح جو بھی مجھے میری نگاہوں کے سامنے رہو گے۔ اور میں جو جو یاد آتا جائے گا۔ وہ بتاتا جاؤں گا۔" وہ مسکرا دیا۔ "بوڑھا بھی تو ہو چکا ہوں نا۔ وقت پر بہت کچھ یاد نہیں آتا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں آجاؤں گا۔"

میں نے اسے ٹھکانے پہنچ کر اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ میں پندرہ دنوں کے لیے کہیں جارہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں ہر بات کا دھیان رکھیں۔ ویسے بھی اس سے پہلے بھی جب میں فرار ہوکر ملک سے باہر جاتا تو یہ لوگ میرے دھندوں کا خیال رکھا کرتے تھے۔

سامان کے طور پر مجھے چار پانچ جوڑوں کے علاوہ اور کیا رکھنا تھا۔ اس غربت زدہ ماحول میں زیادہ ساز وسامان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں اپنا سوٹ کیس اٹھا کر کیمیا گر بابا کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے اس اکلوتے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ میرا بستر لگا رکھا تھا۔

"میاں۔ تم کو اس پر آرام کرنا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"اور آپ۔" میں نے پوچھا۔

"میاں۔ میری قسمت میں آرام کہاں۔" انہوں نے کہا۔ "میں باہر آنگن میں اس فن کی کتاب پڑھوں گا۔ بوڑھا ہو گیا ہوں نا اسی لیے بہت سی باتیں دھیان سے نکل جاتی ہیں۔ تم آرام سے سوتے رہنا اور ہاں عشا سے تو فارغ ہوکر آئے ہوگے۔"

اس وقت مجھے اس سوال سے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ میں کہاں نماز پڑھنے والا تھا۔ "نہیں جناب۔" میں دھیرے سے بولا۔ "اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

"چلو کوئی بات نہیں چار رکعت فرض ادا کرلو۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ پوری رکعتیں پڑھو۔ فی الحال اتنا ہی بہت ہے۔"

انہوں نے میرے لیے ایک طرف جانماز بچھا دی۔ نماز کے دوران جھلاہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں آیا کس کام سے تھا اور اس شخص نے مجھے کن چکروں میں الجھا دیا تھا۔

بہرحال مقصد نکلنے تک اس کی بات بھی ماننی تھی۔ ورنہ وہ ناراض بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے وضو کرکے چار رکعت نماز ادا کی اس کے بعد بستر پر بیٹھ گیا۔

"میاں۔ تم آرام کرو۔" اس نے کہا۔ "میں اپنا کام کررہا ہوں۔"

میں بستر پر لیٹ تو گیا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیمیا گر بابا آنگن میں جاکر کیا کام کررہے ہیں۔ وہ کون سی کتاب ہے جس کو پڑھ پڑھ کر انہوں نے سونا بنانے کا گر سیکھا ہے۔

میں بہت دیر تک کروٹیں لیتا رہا۔ پھر جب برداشت نہیں ہوا تو میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ کیمیا گر بابا آنگن کے تخت پر بیٹھے قرآن شریف کی تلاوت کررہے تھے۔

بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس طرح سونا کیسے بن سکتا تھا۔

بہرحال کچھ دیر بعد نیند آگئی۔

صبح آنکھ کھلی تو بہت سویرا تھا۔ زندگی میں کبھی اتنی جلدی بے دار نہیں ہوا تھا۔ کیمیا گر بابا کمرے میں نہیں تھے لیکن باہر سے تلاوت کی آواز آرہی تھی۔

میں بھی اٹھ کر ان کے پاس آگیا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دیے۔ "میاں آج سویرے سویرے اٹھ ہی گئے ہو تو وضو کرکے نماز بھی پڑھ لو۔"

جھنجلاہٹ بھی ہونے لگی تھی۔ یہ بابا مجھے کس کام میں لگائے جارہا تھا۔ لیکن لالچ ایسی تھی کہ میں نے ان کی بات مان لی اور وضو کرکے نماز پڑھ لی۔

"اب فرمائیں۔ اب کیا کرنا ہے مجھے۔" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ تم ایسا کرو۔ باہر کچھ دیر ٹہل کر آجاؤ۔" بابا نے کہا۔ "جب تک میں ناشتا تیار کرکے رکھتا ہوں۔"

پتا نہیں کیا چکر تھا۔ میں تو سونے کے لالچ میں آیا تھا اور ایسے کام کرنے پڑرہے تھے جن کا سونے سے کوئی تعلق

بھی نہیں تھا۔

بہرحال ان کے کہنے پر میں اس کوارٹر سے باہر آ گیا اور باہر آتے ہی دل خوش ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار اتنی تازہ ہوا کا ادراک ہوا تھا۔ پورے بدن میں سرشاری کی کیفیت دوڑ گئی تھی۔

میں نے کہاں ایسا تجربہ کیا ہوگا۔ عام طور پر بارہ ایک بجے سے پہلے اٹھنا ہی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ آدھے گھنٹے تک ادھر ادھر ٹہل کر واپس آیا تو پوری طرح خود کو تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔

بابا نے چائے تیار کر رکھی تھی۔ چائے کے ساتھ کچھ پاپے بھی تھے۔ ایسا ناشتا بہت اچھا لگا تھا۔ سیدھا سادا۔ ذہن کو چست کر دینے والا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے بابا سے پوچھا۔ "جناب یہ تو بتائیں کہ میرا کام کس حد تک آگے بڑھا ہے۔ میں تو آپ کی ہر ہدایت پر عمل کرتا جا رہا ہوں۔"

"میاں۔ میں تو تمہارے ہی کاموں میں لگا ہوا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "خدا نے چاہا تو ایک ہفتے کے اندر ہی اندر سب ہو جائے گا۔"

"کچھ مجھے بھی تو بتائیں کہ میں کیا کروں۔" میں نے پوچھا۔

تم وہی کرو۔ جو میں تم سے کہتا جاؤں۔" بابا نے کہا۔ "اور یہ میرا وعدہ ہے کہ جب تم یہاں سے جاؤ گے تو دولت مند ہو چکے ہو گے۔"

"چلیں۔ جیسی آپ کی مرضی۔"

اس کے بعد میرا اور کوئی کام نہیں تھا۔ بابا کے ساتھ جا کر مسجد میں نمازیں پڑھنا۔ ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹا دینا۔ ان کے کہنے پر میں نے دو دن قرآن کی تلاوت بھی کر لی تھی۔

ہوا تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن مجھے اپنے اندر ایک تبدیلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بالکل نئی قسم کی تبدیلی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ٹینشن فری ہوتا جا رہا ہوں۔

خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ جیسے کسی نے میرے ذہن سے بوجھ اتار دیا ہو۔

رات کو خوب پرسکون نیند آتی۔ صبح بہت جلدی بے دار ہو جاتا۔ تازہ ہواؤں کے مزے لیتا، اور جو بھی بابا دے دیتے وہ میں خوب ڈٹ کر کھاتا۔

کچھ دنوں کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں نے اب تک بس یوں ہی بے کار زندگی گزاری تھی۔ کیا چاہیے تھا

مجھے، سکون۔ اور اب ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔

میں جو خواہش لے کر وہاں آیا تھا۔ وہ خواہش اب رفتہ رفتہ کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ وہ تڑپ ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

دس بارہ دنوں کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں دولت کے چکر میں آیا ہی نہیں تھا۔ بلکہ یہاں آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں کچھ دنوں تک صاف ستھری زندگی کا مزہ چکھ لوں۔

دس بارہ دنوں کے بعد میں نے کیمیا گر بابا سے کہا۔ "جناب۔ اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

"میاں۔ تمہارا اصل کام تو ابھی ہوا ہی نہیں ہے۔" بابا مسکرا کر بولے۔ "میرا مطلب ہے کہ جس سونے کے لیے آئے تھے وہ تو تمہیں ملا ہی نہیں ہے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ اب مجھے ایسی کوئی خواہش بھی نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ اب ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی حماقت کر رہا تھا۔"

"اب میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔" انہوں نے کہا۔ "تم تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر جا رہے ہو۔ تم یہاں سونا لینے آئے تھے نا اور اب خود سراپا سونا بن کر واپس جا رہے ہو۔ ذرا اس پر تو غور کرو۔ تم نے جو کچھ حاصل کر لیا ہے کیا وہ کسی دولت سے کم ہے۔"

میں حیران ہو کر بابا کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"میرے بیٹے۔ مجھے اس قسم کا سونا بنانا آتا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "میں ایسا ہی کیمیا گر ہوں۔"

میں نے عقیدت سے ان کے ہاتھ چوم لیے۔ میری آنکھوں میں اس وقت آنسو تھے۔

میں وہاں سے سونا بن کر واپس آ گیا۔ میں نے اپنا سارا کام چھوڑ دیا۔ وہ رزق ترک کر دیا جس سے بدبو سی آ رہی تھی۔

میں نے ایک چھوٹا موٹا کام شروع کر دیا اور اب شگفتہ کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کو بھی یہی مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ سونے کی تلاش میں مت رہیں بلکہ خود سونا بن جائیں۔

ڈھونڈیں کسی کیمیا گر بابا کو۔ کوئی نہ کوئی ایسا آدمی آپ کے آس پاس ضرور ہوگا جو آپ کی خطا کو عطا میں بدل دے گا۔

خطا کار ہوں

محترم معراج رسول
السلام علیکم
میں نے کبھی کوئی کہانی یا مضمون نہیں لکھا۔ پہلی بار لکھ رہا ہوں وہ بھی خود بیتی۔ نادانستگی میں ایک "دانستہ" خطا مجھ سے سرزد ہوئی جس کی چبھن ضمیر کو کسی طور پُر سکون ہونے نہیں دیتی۔ اپنی بھوی پر جب جب نظر پڑتی ہے دل میں ایک طوفان سا اٹھنے لگتا ہے۔ اسی طوفان کو کم کرنے کے لیے میں خود بیتی قلم بند کررہا ہوں لیکن میں نے اپنا نام و مقام بدل دیا ہے۔ اگر آپ کو میری تحریر پسند آجائے تو اسی نام سے لگائیں جو میں نے لکھا ہے۔
امجد شیخ
(کراچی)

میرے والد کا انتقال ہوا تو ان دنوں میری عمر بہ مشکل سات سال رہی ہوگی۔ میں شہر کے ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ ابو نے اچھے وقتوں میں پیسے پیسے کراچی کی ایک متوسط آبادی میں چھوٹا سا ایک مکان بنالیا تھا۔

ان کے انتقال کے بعد مصیبتوں اور پریشانیوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا۔ دور و نزدیک کے سب رشتے داروں نے ہم سے منہ موڑ لیا۔ امی نے کچھ عرصے تو جمع پونجی سے کام چلایا، پھر گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی۔ میں ان حالات پر بہت کڑھتا تھا۔ ان ہی حالات کی وجہ سے مجھے تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ جب گھر میں دو وقت کی روٹیوں کے لالے ہوں تو کیسی پڑھائی اور کہاں کی پڑھائی؟

امی زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھیں۔ وہ صرف لوگوں کے کپڑے سی سکتی تھیں یا پھر گھروں میں کام کرسکتی تھیں۔ انہوں نے کپڑے سینے کی کوشش کی بھی لیکن آج کے فیشن ایبل دور میں لوگ اچھے درزیوں سے کپڑے سلوانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یوں ان کا سلائی کا کام بھی نہ چل سکا۔

اس دن میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میری طرح امی بھی بھوکی تھیں۔ میں یہ سوچ کر گھر سے نکلا کہ کہیں سے کچھ روٹیاں اور سالن لے آؤں۔ مگر کہاں سے لاؤں۔ میں نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

میں گھر سے نکل کر بلا مقصد ہی ایک طرف چل دیا۔ گھر سے خاصے فاصلے پر بڑا سا ایک ہوٹل تھا۔ وہاں انواع اقسام کے کھانے تھے۔ پراٹھے اور کباب کی اشتہا انگیز مہک سے میری بھوک مزید چمک اٹھی اور پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگی۔

میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، پھر ہمت کر کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے موٹے سے شخص نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا، پھر پوچھا۔ "ہاں بیٹا! تمہیں کیا چاہیے؟"

میرے بدن پر معقول لباس تھا اور اپنے حلیے سے بھی میں کسی اچھے خاندان کا نظر آتا تھا۔ اسی لیے ہوٹل والے نے اس لہجے میں بات کی تھی۔

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "انکل...... مجھے...... چار...... روٹیاں اور...... نہاری دے دیں۔"

اس نے ایک پرچی پر روٹیاں اور نہاری لکھی اور میری طرف بڑھادی کہ روٹی والے سے لے لوں۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "ایک سو دس روپے دے دو۔"

"ایک سو...... دس۔ روپے؟" میں تھوک نگل کر بولا۔ "میرے پاس...... پیسے نہیں ہیں انکل...... میں...... اور...... میں آپ کے پیسے لوٹا...... دوں گا۔"

ہوٹل والے کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے پرچی چھینی اور درشت لہجے میں بولا۔ "چل بھاگ یہاں سے۔ شکل و صورت سے تو اچھے خاندان کا لگتا ہے۔ تجھے بھیک مانگتے شرم نہیں آتی؟"

"میں بھیک نہیں مانگ رہا ہوں۔ میں تو......"

"اچھا دفع ہو یہاں سے ورنہ ایک جھانپڑ دوں گا۔

میرے دشمنے کا نام ہے۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں آنسو صاف کرتا ہوا وہاں سے باہر آ گیا۔ اس سے پہلے زندگی میں میری اتنی توہین نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اپنی توہین کا زیادہ افسوس تھا۔ میں بوجھل قدموں سے گھر آ گیا۔

امی سوکھی روٹیاں جمع کر کے انہیں پانی میں بھگو کر نہ جانے کیا پکا رہی تھیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ امی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا، پھر مجھ سے بولیں۔ "امجد بیٹا، دیکھو کون ہے دروازے پر؟"

مجھے شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ میں بھوکا رہنے کا عادی ہی کب تھا۔ میں مرتا پڑتا دروازے تک پہنچا۔

دروازے پر رشید چاچا کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ انہوں نے بہت شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ "امجد بیٹا! میں نے آج نیاز دلائی تھی۔ یہ تمہارا اور تمہاری امی کا حصہ ہے۔" انہوں نے شاپر میرے حوالے کر دیا۔ شاپر میں گرما گرم روٹیاں تھیں اور ایک تھیلی میں نہاری تھی۔

مجھے ایسا لگا جیسے رشید چاچا نے مجھے گالی دی ہو۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں رشید چاچا! ہمیں......"

"کون ہے امجد؟" امی کی آواز کی وجہ سے میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ پھر امی خود ہی دروازے پر آ گئیں اور میرے لاکھ انکار کے باوجود رشید چاچا نے وہ کھانا ہمیں دے ہی دیا۔ پھر وہ جاتے جاتے بولے۔ "بہن جی! اگر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟"

امی نے کہا۔ "بھائی برا کیا ماننا۔ آپ تو جو کچھ کہیں ہمارے بھلے ہی کے لیے کہیں گے۔"

"اگر برا نہ مانو تو کل سے امجد کو میری دکان پر بھیج دو۔ مجھے ایک ایماندار لڑکے کی ضرورت ہے۔"

"رشید بھائی، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ امجد کوئی ہنر سیکھ لے جو مستقبل میں بھی اس کے کام آئے۔ یہ محنتی بچہ ہے، کام کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھ لے گا۔"

رشید چاچا سوچ میں پڑ گئے اور پھر بولے۔ "میرے ایک دوست کریم کا بہت بڑا موٹر گیراج ہے۔ اس کے پاس بہت سے لڑکے کام کرتے ہیں۔ اگر تم کہو تو میں امجد کو اس کی ورکشاپ میں لگا دوں۔ یہ وہاں کام بھی سیکھے گا اور روز کے روز کچھ پیسے بھی مل جایا کریں گے۔"

"اگر ایسا ہے رشید بھائی تو آپ کریم بھائی سے ضرور

بات کریں۔"

میں نے ورک شاپ باہر سے تو دیکھی تھی۔ ان میں کام کرتے ہوئے غلیظ کپڑوں میں لڑکے بھی دیکھے تھے۔ مجھے اس پر حیرت ضرور تھی کہ انہوں نے رشید چاچا کی آفر ٹھکرا کر مجھے ورک شاپ میں بھیجنا پسند کیا تھا۔

دوسرے دن رشید چاچا صبح ہی صبح گھر آ گئے۔ وہ مجھے لینے آئے تھے۔ میں نے رات کی بچی ہوئی روٹی چائے کے ساتھ حلق سے اتاری اور تیار ہو کر ان کے ساتھ چل دیا۔

رشید چاچا مجھے اپنی سائیکل پر بٹھا کر وہاں لے گئے۔ ورک شاپ ہمارے گھر سے کافی دور تھی۔

وہ خاصا بڑا اور وسیع و عریض ورک شاپ تھا۔ اس کے احاطے میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں نئی بھی تھیں، پرانی بھی اور بالکل کھٹارا بھی۔ وہاں میری عمر کے کئی لڑکے گریس اور تیل میں چکٹ کپڑے پہنے کام کر رہے تھے۔ ورک شاپ کے ایک حصے میں ڈینٹنگ پینٹنگ بھی ہو رہی تھی۔

وہاں موجود لڑکوں نے حیرت اور تجسس سے مجھے دیکھا۔ ورک شاپ کے اندرونی سرے پر چھوٹا سا شیشے کا ایک کیبن تھا۔ اس میں ادھیڑ عمر کا ایک شخص بیٹھا کسی سے ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا "ہاں، کل تک آپ کی گاڑی ٹھیک ہو جائے گی۔ اصل میں ان کے انجن میں کام بہت تھا ورنہ آپ جانتے ہیں، میں اتنے دن کبھی نہیں لگاتا۔"

فون سے فارغ ہو کر وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اور شاید اس نے رشید چاچا کو پہلی دفعہ دیکھا۔ وہ ایک دم اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا اور اتنے تپاک سے رشید چاچا سے ملا، پھر بولا "یار تم بھی اچانک آ کر کھڑے ہو گئے۔ ٹیلی فون کے چکر میں مجھے بھی دھیان نہیں رہا۔ بیٹھو اس دفعہ بہت دن بعد چکر لگایا۔ کیا کسی گاڑی کی ضرورت ہے؟"

"یار، مجھے ایک کیری کی ضرورت تو ہے لیکن اس وقت تو میں کسی اور کام سے آیا ہوں۔"

"ارے تو بولو نا یار، کیا مجھ سے بھی بات کرتے ہوئے جھجک رہے ہو۔" پھر اس نے آواز لگائی۔ "نارزن۔"

فوراً ہی دبلا پتلا مریل سا ایک لڑکا وہاں آ گیا۔ "جی استاد!"

"یار بھاگ کے جا اور سامنے والی دکان سے تین ٹھنڈی بوتلیں لے آ۔ اور ہاں ساتھ میں کچھ بسکٹ اور پیٹیز وغیرہ بھی لیتے آنا۔"

"ارے یار، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔" رشید چاچا نے کہا۔

"ارے چھوڑو یار!" کریم نے کہا۔ "تم کام کی بات کرو۔"

رشید چاچا نے مختصراً اسے میرے بارے میں بتایا اور کہا کہ آج سے امجد کو میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ یہ بہت محنتی بچہ ہے۔ بہت جلد کام سیکھ لے گا۔ ہاں، یہ اچھے خاندان کا لڑکا ہے اس لیے اس پر زیادہ سختی مت کرنا۔ ویسے بھی یہ تمہیں اس کی مہلت ہی نہیں دے گا۔"

"تم فکر مت کرو رشید! اگر اس نے محنت سے کام کیا تو میں اسے وہ سب کچھ سکھا دوں گا جو مجھے آتا ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "امجد بیٹا! یہاں صاف ستھرے کپڑے نہیں چلیں گے۔ تم کل سے اپنے ساتھ اپنا کوئی پرانا جوڑا لے کر آنا اور کپڑے یہیں تبدیل کر کے کام کرنا۔ میں فی الحال تمہیں بیس روپے روز، دوپہر کا کھانا اور چائے دوں گا۔ ہاں، چائے یہاں بہت پی جاتی ہے۔ اس کا کوئی حساب نہیں ہوتا۔ چائے تو جتنی مرضی پیو۔"

"کریم انکل! میرا مطلب ہے استاد! میں چائے کا اتنا شوقین نہیں ہوں۔ مجھے تو بس کام سیکھنے سے دلچسپی ہے۔"

"مجاہد!" استاد نے کسی کو آواز دی۔

جواب میں سولہ سترہ سال کا ایک لڑکا وہاں آ گیا۔ اس کے چہرے پر ذہانت کی چمک اور چہرے پر بلا کا اعتماد تھا۔ "جی استاد!" اس نے میرا اور رشید چاچا کا جائزہ لے کر کہا۔ اس کے ہاتھ گریس اور تیل میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس کی جینز بھی میلی اور آئل کے داغوں سے اٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر بھی کالک لگی ہوئی تھی۔

"مجاہد! یہ امجد ہے۔" استاد نے تعارف کرایا۔ "یہ آج سے یہیں کام کرے گا۔ یہ آج سے تمہاری ذمے داری ہے۔ اسے بہت پیار سے کام سکھانا۔"

"آؤ بھئی امجد!" مجاہد نے کہا۔ "پہلے تو میں تمہیں مختلف قسم کے اوزاروں اور پارٹس کی شناخت کرا دوں۔ اس میں تمہارے کپڑے بھی خراب نہیں ہوں گے، ہاں کل سے اپنی کوئی پرانی جینز اور ٹی شرٹ ساتھ لے آنا۔"

رشید چاچا مجھے وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ مجاہد مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ ان کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ ہنرمند تھا اور اس کم عمری میں بھی وہ گاڑیوں کی بڑی سے بڑی خرابی دور کر لیتا تھا۔ استاد تو اس وقت انجن کو ہاتھ لگاتا تھا جب خرابی مجاہد کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو اور ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

مجاہد کو سب لڑکے مجو استاد کہتے تھے۔ اس نے نازران کو بلایا اور کہا۔ ''آج تیرا کام صرف یہ ہے کہ تو اس کو تمام اوزاروں کے نام بتا دے۔''

میں نے استاد کے کمرے میں ایک رائٹنگ پیڈ اور پنسل دیکھی تھی۔ میں استاد کی اجازت سے اس پیڈ میں سے ایک صفحہ لے آیا اور نازران کے بتائے ہوئے اوزاروں کے نام اس پر لکھنے لگا۔

نازران نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمہیں لکھنا پڑھنا آتا ہے؟''

''ہاں، میں دوسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔ میں تو ان اوزاروں کے نام انگلش میں بھی لکھ سکتا ہوں۔''

شام تک مجھے ان تمام اوزاروں کے نام ازبر ہو گئے۔

استاد اور مجو بھائی کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے وہاں کا ماحول پسند نہیں آیا۔ وہاں لڑکے ایک دوسرے سے فحش مذاق کرتے تھے۔ بات بات پر غلیظ گالیاں دیتے تھے۔ یہ سمجھو کہ گالیاں تو ان کی روز مرہ کی بول چال میں شامل تھیں۔

شام تک جب استاد نے مجھے بیس روپے کا نوٹ دیا تو خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ یہ میری پہلی کمائی تھی۔ مجھے یہ جان کر بھی حیرت ہوئی کہ سوائے مجو کے وہاں لڑکے کی دہاڑی پندرہ روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ اس دور میں اتنی مہنگائی نہیں تھی۔ بیس روپے میرے اور امی کے لیے کافی تھے۔

پھر میری زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔ میں علی الصباح بیدار ہوتا۔ ناشتا کرتا اور تیار ہو کر گیراج کے لیے پیدل ہی روانہ ہو جاتا۔ کام کے کپڑے میں نے گیراج میں رکھ دیے تھے۔

مجھے وہاں کام کرتے ہوئے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ میں اب گاڑیوں کی چھوٹی موٹی خرابیاں درست کر لیتا تھا۔ میرے ساتھ کے لڑکے ابھی تک استاد مجو کو دس نمبر اور بارہ نمبر کے پانے ہی پکڑا رہے تھے۔ استاد اور مجو دونوں میرے کام سے بہت خوش تھے۔

ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے استاد سے کہا۔ ''اگر مجھے ایک گھنٹا پہلے چھٹی مل جائے تو میں نائٹ اسکول میں داخلہ لے کر اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کر دوں؟''

''ارے یار یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''امجد بیٹا! تو میرا واحد شاگرد ہے جس نے اس چھ مہینے میں ایک دفعہ بھی چھٹی نہیں کی، کبھی دیر سے نہیں آیا۔ فضول وقت ضائع نہیں کرتا اور دل لگا کر کام کرتا ہے۔ میری طرف سے تجھے اجازت ہے۔ تو پڑھنا چاہے تو خوب پڑھ، ہنر کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی انسان کے بہت کام آتی ہے۔''

مجو بھی میرے اس فیصلے پر بہت خوش تھا۔ اس نے تنہائی میں مجھ سے کہا۔ ''امجد! تیری پڑھائی کا جتنا خرچہ ہوگا، وہ میں دوں گا۔ دیکھ انکار مت کرنا۔ تو بالکل میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہے۔'' وہ بہت جذباتی ہو گیا۔

مجو گیراج کے دوسرے کام چور لڑکوں کو انتہائی غلیظ گالیاں دیتا تھا۔ بعض اوقات تو وہ ان کی اچھی خاصی مرمت بھی کر دیتا تھا۔ مجھے آج تک اس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ میں نے اسے موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ مجھے کچھ کہہ سکے۔

میں نے نائٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد میں ورکشاپ ہی کے باتھ روم میں نہاتا، اجلے کپڑے پہن کر اور کتابیں لے کر یہاں سے نکلتا تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہاں کام کرتا ہے جو تیل اور گریس میں لتھڑا ہوا گاڑیوں میں جتا رہتا ہے۔ اب استاد نے میری تنخواہ میں بھی اچھا خاصا اضافہ کر دیا تھا اور مجھے پچاس روپے روز دینے لگا تھا۔ اب ہمارے گھر میں خوش حالی آ گئی تھی۔ اس قلیل آمدنی کے باوجود امی کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دو تین کمیٹیاں ڈال رکھی تھیں۔

پھر وقت کا پہیا اتنی تیزی سے گھوما کہ مجھے احساس ہی نہ ہوا۔ میں ان دنوں نویں کے امتحانات کی تیاری کر رہا تھا۔ تیاری کے لیے استاد نے مجھے ایک مہینے کی چھٹی دے دی تھی۔ گیراج میں ایک مہینے کی کیا ایک ہفتے کی چھٹی کا بھی تصور نہیں تھا۔

میں نویں کا امتحان دے کر آیا تو گیراج میں کام کرنے والے لڑکوں نے مجھے رشک اور حسد سے دیکھا۔ ایک مہینے کی چھٹی سے میری صحت بھی اچھی ہو گئی تھی اور میرے جسم پر بہترین لباس تھا۔ استاد اور مجو مجھ پر اتنے مہربان تھے کہ انہوں نے بغیر کسی کام کے مجھے ایک مہینے کی تنخواہ دے دی تھی۔

میں اب اپنے کام میں ماہر ہو گیا تھا اور مجو بھائی کو کم ہی تکلیف دیتا تھا... وہ صرف کام کرنے والے لڑکوں کی نگرانی کرتے تھے اور جو کام نہ کرتا اس کو گالیاں اور کسی کو طمانچے رسید کرتے تھے۔

اس دن گیراج میں جدید ماڈل کی ایک ٹویوٹا کرولا

آئی تھی۔ اس کے انجن میں نہ جانے کیا خرابی تھی کہ کچھ دور چلنے کے بعد ہی اس کا انجن شدید گرم ہو جاتا تھا اور گاڑی بند ہو جاتی تھی۔ گاڑی کا مالک اسے ٹو کر کے گیراج تک لایا تھا۔

میں نے کپڑے بدلے اور اس گاڑی کی طرف بڑھ گیا جس کا بونٹ بجو بھائی کھولے کھڑے تھے۔

"کیا ہوا بجو بھائی!" میں نے پوچھا۔ "فالٹ سمجھ میں آیا؟" دوسرے لڑکوں کے برعکس میں انہیں بجو بھائی کہتا تھا ورنہ وہ دوسروں کے لیے بجو استاد تھے۔

"یار امجد! گاڑی کا ریڈی ایٹر بھی ٹھیک ہے، آئل بھی پورا ہے، چاروں پلگ بھی ٹھیک کام کر رہے ہیں اور کرنٹ بھی آرہا ہے۔" بجو بھائی کے لیے یہ پریشانی تھی۔

میں چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "بجو بھائی! آپ ذرا گاڑی اسٹارٹ کریں۔"

"میں ابھی کر کے دیکھ چکا ہوں۔"

بجو بھائی نے کہا۔ "چلو، ایک مرتبہ پھر اسٹارٹ کر لیتا ہوں۔ ممکن ہے تمہاری سمجھ میں آجائے۔"

انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔ گاڑی فوراً ہی اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے ان سے ریس دینے کو کہا اور ریڈی ایٹر میں ایک انگلی ڈال دی۔ پانی ابھی اتنا گرم نہیں تھا۔

پانی میں انگلی ڈالتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ریس کے باوجود پانی میں خفیف سی حرکت ہو رہی تھی۔ میرے کہنے پر بجو بھائی انجن بند کر کے نیچے اتر آئے۔

میں مسکرا کر بولا۔ "بجو بھائی میں نے فالٹ پکڑ لیا ہے۔ ریڈی ایٹر کا پانی سرکولیٹ نہیں ہو رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی رکاوٹ ہے۔ پانی سرکولیٹ ہو گا تو گاڑی ٹھنڈی رہے گی۔"

بجو بھائی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انہوں نے میری پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "یار امجد! یہ سامنے کی بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟"

"ارے بجو بھائی، کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ چلو اب اس گاڑی کا ریڈی ایٹر کھلوائیں۔"

کھولنے اور نٹ بولٹ ٹائٹ کرنے کا کام گیراج کے دوسرے لڑکے ہی کرتے تھے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر میں نے وہ خرابی دور کر دی اور درست کرنے کے بعد گاڑی کی ٹرائل لی۔ گاڑی بالکل پانی کی طرح چل رہی تھی۔ بجو بھائی نے نہ صرف مجھے شاباش دی بلکہ اپنی جیب سے پانچ سو روپے انعام بھی دیے۔

ایک دفعہ میں ایک گاڑی کا انجن درست کر کے فارغ ہوا تھا کہ ہمارے ورکشاپ کا ایک لڑکا فرید میرے پاس آیا اور بولا۔ "امجد بھائی! آپ سے کچھ کام ہے۔"

"ہاں بولو۔" میں نے کہا۔

"یہاں نہیں، میرے ساتھ ذرا باہر چلیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ ہمارے گیراج کا وسیع و عریض احاطہ تھا جہاں پرانی گاڑیاں اور ان کے ڈھانچے پڑے رہتے تھے۔

میں تجسس میں اس کے ساتھ باہر آگیا کہ نہ جانے اسے مجھ سے کیا کام پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا کینوس کا تھیلا تھا۔ اس تھیلے پر میں نے پہلے دھیان نہیں دیا تھا۔

"کیا بات ہے فرید؟" میں نے باہر آکر پوچھا۔

"امجد بھائی! میرے پاس گاڑیوں کا کچھ سامان ہے، بالکل نیا اور پیک!" اس نے تھیلا کھول کر مجھے دکھایا۔

اس تھیلے میں جدید ماڈل کی گاڑیوں کے انتہائی مہنگے اسپیئر پارٹس تھے۔

"یہ تم کہاں سے لائے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میرا ایک دوست ہے احسن!" فرید نے کہا۔ "وہ پلازہ کی ایک بہت بڑی اسپیئر پارٹس کی دکان پر کام کرتا ہے، وہی یہ سامان سستے داموں لے کر آتا ہے۔"

"دیکھو فرید! جھوٹ مت بولو۔" میں ایک دم معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ "یہ تمام مال چوری کا ہے نا؟"

"نن..... نہیں..... امجد بھائی!..... وہ۔"

"زیادہ بکواس کرو گے تو ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا، پھر پولیس خود ہی تم سے احسن کا پتا بھی معلوم کر لے گی اور اس اسپیئر پارٹس کی دکان کا۔ تم جانتے ہو اس سامان کی مالیت کیا ہو گی؟ میرے اندازے کے مطابق یہ تمام سامان کم سے کم پندرہ ہزار روپے کا ہو گا۔ مجھے سچ سچ بتاؤ گے یا تمہیں پولیس کے حوالے کروں؟"

"مم..... میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں امجد بھائی!"

"اچھا!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "پولیس تو پھر بھی آئے گی، میں ابھی تو تمہیں بجو بھائی کے حوالے کر رہا ہوں۔"

یہ سن کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "بجو بھائی کو کچھ مت بولنا۔ وہ تو میرے جسم کی کھال کھنچوا دیں گے۔"

"تو پھر سچ بتاؤ۔"

فرید نے طویل سانس لیا اور بولا "ہاں...... سامان چوری کا ہے۔ احسن ایک ایک کر کے وہاں سے مختلف اسپیئر پارٹس چھپا کر لے آتا ہے۔ پھر ہم دونوں انہیں چھوٹی دکانوں یا ورک شاپ میں ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔"

"کسی چور کا ساتھ دینا بھی چوری ہے۔ میں اس دفعہ تو نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ آئندہ مجھے ایسی کوئی خبر ملی تو میں خود تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

فرید اپنا تھیلا اٹھا کر تیزی سے چلا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ فرید نے آخر مجھ ہی سے بات کیوں کی؟ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں اس کی باتوں میں نہیں آؤں گا۔ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔

شام کو جب میں جانے لگا تو میں نے بجو بھائی کو سب بتانا مناسب سمجھا۔

میری بات سن کر وہ ایک دم مشتعل ہو گئے اور بولے۔ "اس فرید کے تو میں ابھی ہاتھ پاؤں توڑتا ہوں۔"

"نہیں بجو بھائی! میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں یہ بات آپ کو اور استاد کو نہیں بتاؤں گا۔ میں نے اپنے طور پر اسے بہت سخت الفاظ میں تنبیہ کر دی ہے۔"

"اچھا! تم نہیں سمجھے۔" بجو نے کہا۔ "یہ ہمارے گیراج کے خلاف سازش ہے۔ استاد گلو اس قسم کی گھٹیا حرکتیں کرتا رہتا ہے۔"

استاد گلو کا ورک شاپ ہمارے ورک شاپ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ علاقے کے زیادہ تر گاہک ہمارے پاس آتے تھے۔ ہمارا کام معیاری تھا اور استاد اپنے کسی بھی گاہک کو دھوکا نہیں دیتا تھا۔ گاہک ان پر بھروسا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دور دور سے لوگ اپنی گاڑیاں لے کر ہمارے گیراج میں آتے تھے۔

"استاد گلو نے اس سے پہلے بھی اسی قسم کی حرکت کی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا، ایک لڑکا یہاں کام کرتا تھا اکرام!" بجو بھائی نے کہا۔ "وہ بھی چوری کی بہت سی چیزیں یہاں لایا تھا۔ وہ تو بروقت مجھے اس واقعے کی اطلاع مل گئی اور میں نے کھڑے کھڑے اسے ورک شاپ سے نکال دیا۔"

"لیکن بجو بھائی! اس سے استاد گلو کا مقصد کیا ہے؟"

"مقصد" بجو نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ "استاد گلو کا کوئی رشتے دار پولیس میں افسر ہے۔ اس کے ذریعے وہ چوری کی اشیا یہاں سے برآمد کرائے گا اور ہمارے ورک شاپ کی ساکھ مٹی میں مل جائے گی۔ اس لیے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے ولاور خان سے کہہ دیا ہے کہ جب کوئی لڑکا گیراج میں داخل ہو تو اس کی اچھی طرح تلاشی لو۔ اس کے بعد ہی انہیں ورک شاپ میں داخل ہونے دو۔ اب ولاور خان سے معلوم کرنا پڑے گا کہ فرید وہ سامان اندر لانے میں کیسے کامیاب ہوا؟"

میں تیار ہو کر نائٹ اسکول چلا گیا۔

دوسرے دن میں ورک شاپ پہنچا تو وہاں عجیب طرح کا سناٹا تھا۔ لڑکے اپنا کام تو کر رہے تھے لیکن بہت خاموشی سے۔ نہ کوئی ہنسی مذاق، نہ گالی گلوچ!

بجو نے مجھے بتایا کہ استاد نے فرید کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ فرید نے دو تھپڑوں میں قبول کر لیا ہے کہ اسے یہ تمام اسپیئر پارٹس استاد گلو نے دیے تھے۔ استاد گلو صاف مکر گیا کہ میں ایسا کیوں کرنے لگا۔ میں تو اس لڑکے کو جانتا بھی نہیں ہوں۔

میرے اور بجو بھائی کے کہنے پر استاد شام تک فرید کو تھانے سے چھڑا لایا۔ ہمارے ورک شاپ میں بڑے بڑے گاہک آیا کرتے تھے ان میں پولیس کے ایک ایس ایس پی تھے، ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج تھے اور علاقے کے ایس ڈی ایم صاحب تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے سرکاری افسران ہماری ورکشاپ میں آیا کرتے تھے۔

فرید کی گرفتاری اور رہائی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دوسرے تمام لڑکوں کو عبرت ہو گئی۔

پھر وقت مزید آگے سرک گیا۔ میں نے میٹرک کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ میں مزید نہیں پڑھنا چاہتا تھا لیکن استاد، بجو بھائی اور اماں کے کہنے پر میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔

اب میں مکمل مکینک بن چکا تھا اور ہر ماڈل کی گاڑی کو درست کر سکتا تھا۔ میں صرف آواز سن کر بتا دیتا تھا کہ گاڑی میں کیا خرابی ہے؟

اس دوران دبئی سے بجو بھائی کا ویزا آ گیا۔ وہ جانا تو نہیں چاہتے تھے لیکن استاد نے انہیں مجبور کیا کہ اگر تمہیں اچھا موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہاں کے مقابلے میں تمہاری تنخواہ بھی کئی گنا زیادہ ہوگی اور دیگر مراعات اس کے علاوہ۔ ویسے بھی اب تم نے امجد کو اتنا کچھ سکھا دیا ہے کہ یہاں کا کام متاثر نہیں ہوگا۔"

استاد کے سمجھانے بجھانے پر مجاہد بھائی دبئی روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد استاد نے پورا ورک شاپ

میرے حوالے کر دیا۔ مجھے مرمت کے لیے آنے والی گاڑیوں کا ریکارڈ رکھنا پڑتا تھا، پھر مرمت ہو کر جانے والی گاڑیوں کا ریکارڈ اور کیش کا حساب بھی رکھنا پڑتا تھا۔ وہاں کام کرنے والوں کی تنخواہیں بھی میں ہی بانٹتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا کالج بھی چل رہا تھا۔ میں بہت محنت سے دوسرے لڑکوں وسیم اور ارشد کو ٹرینڈ کر رہا تھا۔ وہ دونوں ہی انتہائی محنتی تھے اور ہر بات خود ہی سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

میں اب میل میں اٹے ہوئے کپڑوں کی جگہ صاف ستھری جینز، ٹی شرٹ اور جوگرز میں رہتا تھا۔ مجھے دیکھ کر کوئی یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ میں اس ورک شاپ میں "چھوٹا استاد" ہوں۔ بگو بھائی کے جانے کے بعد ورک شاپ کے لڑکوں نے مجھے خود ہی چھوٹا استاد کہنا شروع کر دیا تھا۔

میں اس دن چھٹی کے بعد واپس جا رہا تھا کہ ایک لڑکے نے اشارے سے مجھے آنے کو کہا۔ اس کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسے ورک شاپ میں کام کرنے والے لڑکوں کا ہوتا ہے۔ میں نے گاڑی روک دی۔ اب میں خود اور ورک شاپ کی کوئی نہ کوئی گاڑی لے جاتا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے گاڑی کی کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

لڑکے نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ استاد امجد ہیں؟"

"ہاں، میں ہی امجد ہوں تو۔" میں نے الجھ کر کہا۔

"آپ کو استاد نے بلایا ہے۔" لڑکے نے کہا۔

"استاد نے بلایا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "استاد تو ابھی ابھی مجھ سے مل کر گھر گیا ہے۔" میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور بولا۔ "میں استاد سے پوچھ لیتا ہوں۔"

"میں استاد رشید کی نہیں بلکہ استاد گلو کی بات کر رہا ہوں۔" لڑکے نے کہا۔

میں بری طرح چونک اٹھا۔ "استاد گلو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"شاید اسے آپ سے کوئی ضروری کام ہے۔" لڑکے نے کہا اور ایک طرف چلا گیا۔

میں چند لمحے سوچتا رہا، پھر میں نے استاد گلو سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔

میں نے اپنی گاڑی کا رخ استاد گلو کے ورکشاپ کی طرف کر دیا۔ اس کا ورکشاپ اتنا بڑا تو نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں اور تین چار لڑکے کام بھی کر رہے تھے۔

میں گاڑی سے اترا تو استاد گلو خود اپنے کیبن سے باہر آ گیا اور بہت تپاک سے ملا۔ وہ مجھے اپنے کیبن میں لے گیا۔ ہمارے ورک شاپ کے مقابلے میں اس کا کیبن چھوٹا تھا۔ اس نے صوفہ سیٹ اور کرسیوں کی جگہ بلاک رکھ کر گاڑیوں کی سیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ بلکہ چھپانے کے لیے اس نے سیٹوں پر اوپر سے میگزین ڈال رکھا تھا۔ اس نے بہت اپنایت سے کہا۔ "بیٹھو امجد! کھڑے کیوں ہو؟" پھر اس نے ہانک لگائی۔ "چھوٹو! دو چائے ملائی والی اور کچھ بسکٹ اور پیسٹری لے آ۔ استاد امجد ہمارے مہمان ہیں۔"

"آپ نے کیسے یاد فرمایا استاد؟" میں نے پوچھا۔ "کیا مجھ سے کوئی ضروری کام ہے؟"

"یار! کام تو ہے لیکن تم شاید کرنا پسند نہ کرو۔" گلو نے کہا۔

"ارے استاد! جب میں یہاں تک آ گیا ہوں تو کام بھی کر دوں گا۔ شرط بس یہ ہے کہ وہ کام میرے بس کا کام ہو۔"

"یار امجد! میں نے سنا ہے کہ تم ہر گاڑی ٹھیک کر لیتے ہو۔ میرے پاس ایک اسپورٹس اور آٹو میٹک جیگوار مرمت کے لیے آئی ہے۔ اس کا سارا سسٹم الیکٹرونک ہے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ وہ سسٹم میری سمجھ میں تو آیا نہیں۔ میں نے شہر کے مکینک بھی بلائے جو اپنے کام میں ماہر ہیں۔ وہ بھی اسے درست نہ کر سکے۔ میں نے سنا ہے کہ تم الیکٹرانک گاڑیوں کو بھی درست کر لیتے ہو۔"

"میں کوشش کروں گا استاد!" میں نے کہا۔ "میں کوئی بہت ماہر مکینک تو نہیں ہوں، بس کام چلا لیتا ہوں۔ مجھے دکھائیں، وہ گاڑی کہاں ہے؟"

"تمہارے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ اگر تم کپڑے بدلنا چاہو تو میرے پاس اوور آل (ڈانگری) بھی موجود ہے۔"

"ارے نہیں استاد!" میں نے ہنس کر کہا۔ "وہ مکینک ہی کیا جو کام کے وقت اپنے کپڑوں کی پروا کرے۔ تم مجھے گاڑی دکھاؤ۔"

اس وقت چھوٹو چائے اور دیگر لوازمات لے آیا۔

چائے پینے کے بعد استاد مجھے ورکشاپ کے ایک

الگ تھلگ حصے میں لے گیا۔ وہ ورک شاپ کا حصہ لگ ہی نہیں رہا تھا۔ دیواریں صاف ستھری تھیں۔ ایک دیوار پر ایک معروف کولڈ ڈرنک کا بڑا سا پوسٹر تھا۔ اور اس کے نیچے مختلف ماڈل کی گاڑیوں کے پوسٹر تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گاڑیاں سڑک پر رواں دواں ہوں۔

وہ جدید ماڈل کی انتہائی قیمتی، دو دروازوں والی کار تھی۔ میں نے استاد سے چابی مانگی تو اس نے چابیاں جیب سے نکال کر مجھے دے دیں۔ میں نے دروازے میں چابی لگا کر گھمائی تو اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے فلیش چمکی ہو۔ میں سمجھا کہ یہ ویلڈنگ کی چمک ہے۔ وہاں بھی ڈینٹنگ پینٹنگ کا کام ہوتا تھا۔

میں نے دروازہ کھول کر اس کا بونٹ کھولا تو پھر چمک سی ہوئی۔ میں نے گاڑی کا بونٹ کھولا اور اس کے انجن اور فیول سسٹم کا جائزہ لینے لگا۔ انجن کو کرنٹ سپلائی کرنے والا مین وائر نکلا ہوا تھا لیکن بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہوتا تھا کہ وائر نکلا ہوا ہے۔

میں نے اس ساکٹ کا جائزہ لیا۔ وائر کو ٹائٹ رکھنے کے لیے اس میں ایک اسکرو بھی موجود تھا۔ میں نے چھوٹا اسکرو ڈرائیور لے کر وہ اسکرو کھولا تو عجیب انکشاف ہوا۔ وائر کو اسکرو کھول کر نکالا گیا تھا کیونکہ اسکرو خاصا ٹائٹ تھا۔ وائر اگر ٹوٹا تو اس کا کچھ حصہ ساکٹ میں ہی رہ جاتا لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

اس وقت تک روشنی کے کئی جھماکے ہو چکے تھے لیکن میں اپنے کام میں اتنا محو تھا کہ میں نے اس پر دھیان ہی نہ دیا۔

میں نے وہ وائر دوبارہ اچھی طرح ساکٹ میں فٹ کیا اور اسکرو ٹائٹ کر کے ان سے کہا۔ ”استاد، ذرا سیلف لگاؤ۔“

استاد اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور اس نے سیلف لگایا۔ پہلے ہی سیلف میں گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔

استاد گلو گاڑی سے نیچے اتر آیا اور میرا شانہ تھپک کر بولا۔ ”یار امجد! اکرم نے تو تمہیں بہترین مکینک بنا دیا ہے۔ جو خرابی کئی دن سے میری اور دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی وہ تم نے دس منٹ میں دور کر دی۔ اب ذرا اس گاڑی کی ٹرائی بھی لے لو۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ خرابی وقتی طور پر دور ہوگئی ہو اور گاڑی چلتے ہی پھر گڑبڑ ہو جائے۔“

میں اس کی تسلی کے لیے اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے مین روڈ پر لے آیا۔ بہت زبردست گاڑی تھی۔ اسے چلانے میں بہت مزہ آ رہا تھا۔ میں نے ایک راؤنڈ لیا اور واپس آ گیا۔

”گاڑی ہر طرح پرفیکٹ ہے استاد!“ میں نے ہنس کر کہا۔

استاد گلو نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کئی بڑے بڑے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے اور بولا۔ ”یہ تمہاری مزدوری تو نہیں، میری طرف سے انعام ہے۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے استاد!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”رقم تم گیراج کے سب لڑکوں میں میری طرف سے تقسیم کر دو۔“

گاڑی کا وائر لگانے میں میرے صرف ہاتھ کالے ہوئے تھے۔ میں نے ہاتھ صاف کیے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر نائٹ کالج روانہ ہو گیا۔

رات کا ایک بج رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ امی بھی اٹھ گئی تھیں۔ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”اس وقت کون آ گیا؟“

دستک دوسری مرتبہ زیادہ زوردار انداز میں ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دستک دینے والا ہتھوڑے سے دروازے پر ضربیں لگا رہا ہو اور دروازہ توڑنا چاہتا ہو۔

”کون ہے؟“ میں نے چیخ کر درشت لہجے میں پوچھا۔

”دروازہ کھول۔“ باہر سے کوئی کرخت لہجے میں بولا۔ ”کیا بھنگ پی کر سو رہا تھا؟“

”تو ہے کون؟“ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ ”اور دستک دینے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟“

”پولیس!“ باہر سے کرخت آواز آئی۔ ”دروازہ کھول ورنہ میں توڑ دوں گا۔“

امی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ”امجد بیٹا، یہ پولیس کیوں آئی ہے؟“ انہوں نے ہول کر کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا ہی تھا کہ پولیس کے دو سپاہی مجھے دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔

”یہ کیا طریقہ ہے؟“ میں جھلا کر بولا۔ ”تم لوگ کسی کے بھی گھر میں یوں داخل ہو جاؤ گے۔“

”ہم چوروں سے یہی سلوک کرتے ہیں۔“ ان کے پیچھے داخل ہونے والا سب انسپکٹر غرا کر بولا۔ ”امجد تیرا ہی نام ہے؟“ اس نے تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

”ہاں، میرا ہی نام امجد ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تجھے ہمارے ساتھ تھانے چلنا پڑے گا۔“ سب

انسپکٹر نے میری گدی پر ایک ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔

''میرا قصور تو بتاؤ؟'' میں نے پوچھا۔

''تھانے چل کر سب معلوم ہو جائے گا۔'' ایک سپاہی نے مجھے ڈبر کی طرف دھکا دیا۔

''مجھے دھکے مت دو۔'' میں نے کہا۔ ''میں چل رہا ہوں۔'' پھر میں اسی سے مخاطب ہوا۔ ''اتی! آپ استاد اکرم کو اور ایس ایس پی افتخار صاحب کو ٹیلی فون کر کے بتا دیں کہ پولیس والے مجھے تھانے لے گئے ہیں۔ ایس ایس پی افتخار نہ ملیں تو ڈی آئی جی سرفراز کو بتا دیں۔'' یہ کہہ کر میں پولیس وین کی طرف بڑھ گیا۔

ایس ایس پی اور ڈی آئی جی کا نام سن کر سب انسپکٹر کے رویے میں وہ جارحانہ پن نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ اضطراب نے لے لی تھی۔ میں ایس ایس پی افتخار اور ڈی آئی جی سرفراز صاحب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ان کی گاڑیاں میں ہی مرمت کرتا تھا اور وہ لوگ بھی میری قدر کرتے تھے کہ ورک شاپ میں کام کرنے کے باوجود میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور نمایاں نمبروں سے پاس بھی ہو رہا تھا۔ ورک شاپ کے دوسرے ان پڑھ لڑکوں کے برعکس میں اپنے ہر گاہک سے انتہائی مہذب انداز میں بات کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ امی ان لوگوں کو کال نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ سیل فون کا استعمال صرف اس حد تک جانتی تھیں کہ آنے والی کال سن لیں یا مجھے کال کر لیں۔ میں نے ریپڈ ڈائل پر اپنا نمبر فیڈ کر رکھا تھا۔

سب انسپکٹر نے اس مرتبہ بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تم ایس ایس پی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کو کیسے جانتے ہو؟''

''میں برسوں سے ان کی گاڑیاں ٹھیک کر رہا ہوں۔ بعض اوقات تو وہ ایمرجنسی کی صورت میں مجھے اپنے بنگلوں پر بھی بلا لیتے ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب کی فیملی کو تو اکثر میں ہی مختلف جگہ لے کر جاتا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ میں ڈی آئی جی صاحب کی فیملی کو صرف ایک دفعہ شاپنگ کے لیے لے گیا تھا۔ اس دن ان کا ڈرائیور چھٹی پر تھا۔

سب انسپکٹر کے چہرے پر اب پریشانی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

اس دوران میں ہم پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ ایک کانسٹیبل نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال کر مجھے باہر کھینچنا چاہا تو سب انسپکٹر چیخ کر بولا۔ ''اوئے آرام سے اوئے!

امجد ابھی صرف ملزم ہے۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''امجد صاحب! آپ خود ہی باہر آ جائیں۔''

میں سب انسپکٹر کے ساتھ ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ایس ایچ او کے علاوہ باوقار سا ایک اور شخص بھی بیٹھا تھا۔

ایس ایچ او نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔ ''اوئے کیا ہوا، ملزم فرار ہو گیا؟''

''نہیں سر!'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''ہم ملزم کو لے آئے ہیں۔''

ایس ایچ او شاید مجھے پہچانتا نہیں تھا۔ میں اس وقت ٹراؤزر اور اسپورٹس شرٹ میں ملبوس تھا۔ میرے پیروں میں بھی اسپورٹس چپل تھی اسے شاید یقین ہی نہ آیا ہو کہ یہی مکینک امجد ہے۔ وہ تو سمجھ رہا ہوگا کہ میلے کچیلے کپڑوں یا ملگجی سے شلوار قمیص میں ملبوس کوئی لڑکا ہوگا۔ جس کے ہاتھوں پہ گریس کے داغ بھی ہوں گے۔ جیسے کہ اکثر مکینکس کے ہاتھوں پر صاف کرنے کے باوجود رہ جاتے ہیں۔ میرے بال بھی سلیقے سے کٹے ہوئے تھے اور سونے سے پہلے میں نہا کر اور شیمپو کر کے سونے کا عادی تھا۔

''یہ امجد ہے؟'' ایس ایچ او نے پوچھا پھر تحقیر آمیز انداز میں مجھ سے کہا۔ ''لگتا ہے تیرا چوری کی گاڑیوں کا دھندا خوب زوروں پر چل رہا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے پوچھا اور بیٹھنے کی کوشش کی۔

''کھڑا رہ!'' ایس ایچ او ڈپٹ کر بولا۔ ''ملک صاحب کی جیگو کہاں ہے؟''

''جیگوار؟'' میں نے پوچھا۔ ''کون سی جیگوار؟''

''اوئے ایک کروڑ روپے کی گاڑی ہے۔'' باوقار سادہ آدمی بولا تو اس کی شخصیت کا سارا تاثر ایک دم زمین بوس ہو گیا۔ ''تم نے تو کبھی اس گاڑی کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔ بس ایک چمکتی ہوئی گاڑی دیکھی اور اٹھا لی۔''

''میں نے ہر گاڑی دیکھی ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''جیگوار کیا، میں نے تو دو ریسنگ گاڑیاں بھی ٹھیک کی ہیں جو تین تین کروڑ روپے کی ہوتی ہیں۔''

''اچھا زیادہ بکواس نہ کر۔'' ایس ایچ او جھنجلا گیا۔ ''سیدھی طرح بتا کہ تو نے ملک صاحب کی جیگوار کہاں رکھی ہے یا اگر بیچ دی ہے تو کسے بیچا ہے؟''

''میں نے ملک صاحب کی جیگوار نہیں رکھی۔''

اس وقت پولیس اسٹیشن میں ایک ایس پی داخل ہوا۔

اس نے ملک صاحب سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ''بھائی، گاڑی کا کچھ پتا چلا؟''

''یہ لوگ ملزم تو پکڑ لائے ہیں لیکن یہ مان نہیں رہا ہے۔'' ملک نے میری طرف اشارہ کیا۔

''اس کے تو فرشتے بھی مانیں گے۔'' ایس پی نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اللہ داد!'' اس نے کسی کو آواز دی۔ ''اسے انٹرویو روم میں لے جاؤ۔ میں وہیں آرہا ہوں۔''

اللہ داد مجھے دھکیلتا ہوا اس کمرے میں لے گیا جسے ایس پی انٹرویو روم کہہ رہا تھا۔ اس کمرے میں عجیب و غریب چیزیں تھیں۔ چھوٹی بڑی دو تین چھتیں تھیں، پانی کی بھری ہوئی اور خالی بالٹیاں تھیں، ہر قسم کی رسیاں تھیں، ریت کی بوریاں تھیں، چھوٹے بڑے ڈنڈے تھے اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

''دیکھ بھئی۔'' اللہ داد نے مجھ سے کہا۔ ''تو ابھی جوان ہے، پوری زندگی تیرے سامنے پڑی ہے۔ تو ایس پی صاحب کو نہیں جانتا۔ وہ بہت ظالم افسر ہیں۔ سچ بولے گا تو ان کے ٹارچر سے بچ جائے گا ورنہ انہوں نے بہت سے نوجوانوں کو زندگی بھر کے لیے معذور کر دیا ہے۔ انہیں زیادہ غصہ آ گیا تو وہ تیرا ان کاؤنٹر بھی کر سکتے ہیں۔ زندگی رہی تو گاڑیاں بہت۔ تو پھر کوئی گاڑی اٹھا لینا۔''

''تم اپنی بکواس کر چکے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اب میری بات بھی سن لو، ایسے ایسے ایس پی بھی ہوں تو وہ مجھ سے کوئی جھوٹا اعتراف نہیں کرا سکتے۔''

اسی وقت ایس پی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے میرا جملہ سن لیا تھا۔ وہ اس وقت پینٹ اور سینڈو کٹ بنیان میں تھا۔ اسے بغیر وردی کے دیکھا تو میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے ایک دو دفعہ اسے استاد گلو کے ورک شاپ سے نکلتے دیکھا تھا۔

چشم زدن میں ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ مجھے وہ جگو ور بھی یاد آ گئی جو استاد گلو نے مجھ سے درست کرائی تھی۔ مجھے اس وقت خیال آیا کہ گاڑی میں کوئی خرابی نہیں تھی بلکہ جان بوجھ کر اس کا وائر نکالا گیا تھا۔ یہ تمام خیالات ایک سیکنڈ میں آ کر گزر گئے۔

''ہاں بھئی۔'' ایس پی نے کمرے میں رکھی ہوئی واحد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ جیسے دس ایس پی بھی ہوں تو تو اپنی زبان نہیں کھولے گا؟'' وہ ترحم آمیز لہجے میں بولا۔ ''دیکھو امجد خود پر اور اپنی بوڑھی ماں پہ رحم کھاؤ۔ تو جانتا ہے، پولیس... ڈپارٹمنٹ کے لوگ مجھے کرنل کرشر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں پولیس میں براہ راست ایس پی بھرتی نہیں ہوا ہوں جو تو مجھے کل کا لونڈا سمجھ رہا ہے۔ میں اے ایس آئی سے ترقی کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب جلدی سے بتا دے کہ ملک صاحب کی گاڑی کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اس نے کرسی سے اٹھ کر میرے منہ پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ میں لڑکھڑا کر سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی اور کمرے کی ہر چیز مجھے دھندلی نظر آنے لگی۔

''اللہ داد!'' اس نے آواز دی۔

اللہ داد فوراً ہی چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دروازے سے لگا بیٹھا ہو۔ ''جی سر!'' اس نے ایک نظر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس سورما کو الٹا لٹکا دو۔'' اس نے حکم دیا۔ ''ہاں، لٹکانے سے پہلے اس کے سب کپڑے اتار لینا۔''

اللہ داد نے میرے کپڑے اتارنے کی بجائے پھاڑ دیے۔ اس نے میرے جسم پہ کپڑے کا ایک تار بھی نہیں چھوڑا۔ اس وقت گویا میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ اللہ داد اور ایس پی کے خلاف میرے ذہن میں شدید نفرت کی لہر ابھری۔ نفرت کی اس لہر نے مجھے سر سے پاؤں تک جھلسا دیا۔ میں نے اسی وقت دل ہی دل میں عہد کیا کہ اگر موقع ملا تو ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے مجھے پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اللہ داد نے جھک کر رسی سے میرے پیر باندھے اور رسی ایک دم کھینچ دی۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے زمین پر گر پڑا۔ میری کمر اور شانوں میں اچھی خاصی چوٹ آئی لیکن مجھے چوٹ سے زیادہ بے لباس ہونے کی توہین کا احساس تھا۔

وہ رسی چھت پر لگے ہوئے کنڈے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کنڈے میں ایک چرخی بھی لگی تھی۔ اللہ داد نے مجھے ایک دم اوپر کھینچ لیا۔ اسی کی بندش سے میری پنڈلیاں کٹی جا رہی تھیں۔ پورے جسم کا دوران خون چہرے پہ سمٹ آیا تھا اور میں فرش سے تقریباً پانچ، ساڑھے پانچ فٹ کی بلندی پہ معلق تھا۔

''اوئے تو نے جان تو خوب بنا رکھی ہے۔'' ایس پی نے کہا۔ ''لیکن سچ نہیں بولے گا تو زندگی بھر یہ جان لے کر

وکیل چیمبر کا محتاج ہو جائے گا۔ مجھے یاد آیا کہ ملک صاحب کی گاڑی کہاں ہے؟" ایس پی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"ہاں مجھے یاد آیا۔" میں نے کہا۔ "میں نے وہ گاڑی استاد گلو کے ورکشاپ میں دیکھی تھی۔"

ایس پی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے میرے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میں پنڈولم کی طرح جھولتا ہوا کمرے کے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ "استاد گلو کا اس معاملے سے کیا تعلق؟ سیدھی طرح بتا گاڑی کہاں ہے؟"

"میں نے آج تک کسی ایس پی کو اس طرح تفتیش کرتے نہیں دیکھا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم استاد گلو کے رشتے دار ہو اور شاید رشتے داری کا فرض نبھا رہے ہو۔"

ایس پی ایک دم مشتعل ہو گیا اور اس نے چمڑا سا ایک چمک دار بید اٹھا کر مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

"بتا گاڑی کہاں ہے؟" ایس پی گرج کر بولا۔

"میں بتا چکا ہوں کہ وہ استاد گلو کے ورکشاپ میں ہے۔" میں نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا۔

اس مرتبہ اس نے موٹا سا ایک ڈنڈا اٹھا کے تابڑ توڑ مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں اب تک تو برداشت کر رہا تھا لیکن ڈنڈے کی ضربوں سے میری چیخیں نکل گئیں۔ پھر میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ اللہ داد نے مجھے فرش پر اٹھا لیا تھا اور میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کے مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔

"اللہ داد!" اس نے گرج کر کہا۔ "چیرا لگاؤ اس حرامی کو۔ یہ تو بہت سخت جان ہے۔"

ایک دفعہ پھر میری نظر اپنے برہنہ جسم پر پڑی اور نفرت کی شدید لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے ایس پی سے کہا۔ "ایس پی صاحب! کوشش کرنا کہ میں زندہ نہ بچوں۔ اگر میں زندہ بچ گیا تمہارے لیے موت کا فرشتہ بن جاؤں گا۔"

ایس پی نے پھر مجھے تھپڑ مارنے کی کوشش کی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی باہر سے بولا۔ "ایس پی صاحب دروازہ کھولیں، جلدی کریں۔"

ایس پی نے دروازہ کھول دیا اور ناگواری سے بولا۔ "کیا آفت آ گئی؟"

"ایس ایس پی افتخار اور ڈی آئی جی سرفراز صاحب،

صاحب کے کمرے میں بیٹھے ہیں اور ملزم امجد کو وہاں بلا رہے ہیں۔"

ایس پی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے مری مری سی آواز میں کہا۔ "اسے کپڑے پہناؤ اور ہاتھ منہ دھلا کر صاحب کے کمرے میں لاؤ۔"

اللہ داد نے مجھے کپڑے دیے لیکن میں نے ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

"جلدی کپڑے پہن!" ایس پی گرج کر بولا۔ "ڈی آئی جی صاحب انتظار کر رہے ہیں۔"

"میں کپڑے نہیں پہنوں گا، اسی طرح ڈی آئی جی صاحب سے ملوں گا۔ وہ بھی تو میرا لہولہان جسم دیکھیں اور تجھ سے ایک غلطی ہوئی ایس پی!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تو نے مجھے زندہ چھوڑ دیا۔" پھر میں اللہ داد سے مخاطب ہوا۔ "چلو کہاں ہیں ایس ایس پی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب؟"

اللہ داد کے ساتھ ساتھ ایس پی کے چہرے پر بھی بوکھلاہٹ کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا۔ "تو بغیر کپڑوں کے اسی حالت میں ڈی آئی جی صاحب کے سامنے جائے گا؟"

"میں دو گھنٹوں سے اسی حالت میں تمہارے سامنے ہوں تو وہاں جانے میں کیا فرق پڑتا ہے؟"

اچانک دروازے پر ایس ایچ او نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ اس نے درشت لہجے میں اللہ داد سے کہا۔ "اوئے تو اس کو لے کر کیوں نہیں آتا۔ افسران اعلیٰ کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ دیر بیٹھتے ہیں تو دوسرے معاملات کریدنا شروع کر دیتے ہیں۔"

"مجھ سے چلا نہیں جا رہا ہے سر!" میں نے دیوار کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ایس ایس پی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کو یہیں بھیج دیں۔"

"اوئے تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اعلیٰ افسران خود چل کر یہاں آئیں گے؟"

اسی وقت باہر برآمدے میں قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پہلے مجھے اس ایس آئی کا چہرہ نظر آیا جو مجھے گرفتار کر کے یہاں لایا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور مؤدب انداز میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے ڈی آئی جی سرفراز صاحب اور ایس ایس پی افتخار صاحب آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔

میں گزشتہ دو گھنٹے سے برہنہ تھا لیکن مجھے اس حالت

مجھے ان کے سامنے شرم آ گئی۔ میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔

''امجد!'' ڈی آئی جی صاحب نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا بیٹا! تمہاری یہ حالت کس نے کی ہے؟''

''ان دونوں ''فرض شناس'' اہلکاروں نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔'' میں نے نفرت بھرے انداز میں ایس پی اور اللہ داد کی طرف اشارہ کیا۔

''تم کپڑے پہنو، میں تمہیں اسپتال بھجواتا ہوں۔'' ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔

ان کی کوششوں سے نہ صرف مجھے فوری طور پر طبی امداد ملی بلکہ پولیس نے استاد گلو سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد جیکو ار بھی برآمد کر لی۔ یہ سارا چکر استاد گلو نے ایس پی سے مل کر چلایا تھا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہمارا ورکشاپ بند ہو جائے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اسی نے بنگلے کی ایک لڑکی کے ذریعے میرے سیل فون سے ایس ایس پی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کا نمبر نکلوایا تھا اور انہیں میرے بارے میں بتایا تھا۔

استاد ان دنوں اپنے کسی عزیز کی شادی میں لاہور گیا ہوا تھا اس لیے ورک شاپ کی ساری ذمہ داری مجھ پہ تھی۔ کئی دن تک میرا جسم پھوڑے کی طرح دکھتا رہا اور ہر ٹیس پہ میں عہد کرتا کہ اللہ داد اور ایس پی سے جب تک انتقام نہیں لوں گا، اس وقت تک میرے دل میں ٹھنڈک نہیں پڑے گی۔

اس واقعے کو ایک مہینا گزر چکا تھا۔ استاد بھی واپس آ چکا تھا۔ اسے بھی اس واقعے کا شدید افسوس تھا اور خوشی بھی تھی کہ گاڑی چرانے اور مجھ پر جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں استاد گلو کو نہ صرف سزا ہو گئی تھی بلکہ اس کا ورک شاپ بھی بالکل اجڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کے پاس ایسا کوئی مکینک نہیں تھا جو اس کے بعد ورک شاپ کو پوری ذمے داری سے سنبھال سکتا۔

اس دن میرا چھٹی کا ارادہ تھا۔ مجھے ایک دو ضروری کام تھے اور شاپنگ بھی کرنا تھی۔ میں گھر ہی سے بن ٹھن کر آیا تھا۔ میرے جسم پہ بہترین برانڈڈ جینز تھی کراچی کی ایک معروف جوتوں کی دکان کے مہنگے جوتے تھے، امپورٹڈ شرٹ تھی اور چہرے پر دے بن کا بیش قیمت چشمہ تھا۔ میں نے پرفیوم بھی دل کھول کر استعمال کیا تھا۔

استاد نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''اوہو، نواب صاحب! کہاں کی تیاری ہے؟''

''استاد، مجھے ایک دو ضروری کام ہیں، پھر اپنے لیے اور امی کے لیے شاپنگ کرنا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں چھٹی کر لوں؟''

''ارے یار تمہاری سج دھج دیکھ کر کون تمہیں چھٹی کرنے سے روک سکتا ہے؟'' استاد ہنس کر بولا۔

''مجھے ایک گاڑی بھی چاہیے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''وہ آف وہائٹ کرولا لے جاؤ۔ اس کا مالک دو دن بعد اسلام آباد سے آئے گا لیکن ذرا احتیاط سے چلانا، اسی سال کا ماڈل ہے۔''

''استاد! اتنی احتیاط سے تو اس کا مالک خود بھی نہیں چلاتا ہوگا۔''

''اچھا ایک کام کرو، مجھے ذرا گھر جانا ہے۔ میں آدھے پونے گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ اس کے بعد تم چلے جانا۔'' استاد نے کہا۔

''ہاں، استاد! اتنا ٹائم تو ہے میرے پاس۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

استاد نے اب اپنے کیبن کو ڈیکوریٹ کر لیا تھا۔ پرانی گاڑیوں کی سیٹوں کی جگہ صوفے آ گئے تھے۔ اس نے فرش پہ بھی پزل لگوا لیے تھے اور کیبن کا شیشہ بھی اعلیٰ معیار کا تھا۔ استاد کی کرسی بھی کافی قیمتی تھی اور اس کے ساتھ رکھی ہوئی گلاس ٹاپ کی ٹیبل پہ اگرچہ کہیں کہیں تیل اور گریس کے خفیف سے دھبے تھے، اس کے باوجود وہ کسی ورکشاپ کا کیبن نہیں لگتا تھا۔ وہاں ایک اسپلٹ بھی تھا اور استاد نے یہ سب کچھ میری فرمائش پر کیا تھا۔

میں کیبن میں بیٹھنے کی بجائے باہر نکل آیا اور لڑکوں کو کام کرتا ہوا دیکھتا رہا۔

اچانک ورکشاپ میں ایک سوزوکی آلٹو آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی اور اگر ڈرائیور بروقت فل بریک نہ لگاتا تو وہ ورکشاپ میں کھڑی ہوئی لینڈ کروزر سے ٹکرا جاتی۔

میں نے جھنجلا کر ڈرائیور کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسے خوبصورت سی نازک اندام ایک لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس نے ٹائٹ جینز پہ ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن رکھی تھی، لمبے براؤن بال کھلے ہوئے تھے اور اس کا خوبصورت چشمہ آنکھوں کی بجائے سر پہ ٹکا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ تو میں نے اس کے گاڑی سے اترنے کے بعد غور کیا تھا۔

''اے لڑکے!'' اس نے نازران کو مخاطب کیا۔ ''میری گاڑی چلتے چلتے گرم ہو رہی ہے اور ایک دم بند

بھی ہو جاتی ہے۔ ذرا چیک کرو خرابی کیا ہے؟"

نازنین بے چارہ کیا چیک کرتا؟ وہ تو ان لڑکوں میں سے تھا جو دس دس سال ورکشاپ میں کام کرنے کے باوجود صرف استادوں کی ہیلپ کرتے ہیں اور انہیں پانے اور پانا پکڑاتے رہتے ہیں یا پھر گاڑیوں کے انجن ڈاؤن کر لیتے ہیں لیکن انہیں دوبارہ لگانے کی اہلیت نہیں ہوتی۔

میں نے اسلم کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی کو دیکھے۔ اسلم خاصا ذہین لڑکا تھا اور بہت توجہ سے کام سیکھ رہا تھا۔

اسلم نے گاڑی کا بونٹ کھولا اور لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "میڈم! جب تک آپ کی گاڑی ٹھیک ہو، آپ آفس میں چل کر بیٹھیں۔ یہاں گرمی اور شور بہت ہے۔"

"نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تم لوگ گاڑی کا ایک نقص دور کرتے ہو اور دو خرابیاں پیدا کر دیتے ہو۔ بہت سے مکینک لڑکے گاڑی کے پرزے بھی بدل دیتے ہیں۔"

"میڈم، یہ کام اگر کوئی مکینک کرنا چاہے گا تو آپ کی آنکھوں کے سامنے بھی کر دے گا اور آپ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اس لیے اطمینان سے آفس میں بیٹھیں۔"

"آپ تو خود کنفرم ہیں!" لڑکی نے کہا۔ "آپ ان لڑکوں کے ہتھکنڈے نہیں جانتے۔"

میں اس کی بات پر مسکرا دیا۔ "ٹھیک ہے، اگر یہاں کھڑے رہ کر آپ کی تسلی ہو رہی ہے تو شوق سے یہاں کھڑی رہیں۔"

اسلم نے اس کا ریڈی ایٹر چیک کیا، آئل چیک کیا، سب کچھ درست تھا۔ گاڑی میں کرنٹ بھی آ رہا تھا اور اس کے تمام پلگ بھی ٹھیک تھے۔

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ خرابی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

میں نے آگے بڑھ کر انجن کا جائزہ لیا تو لڑکی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ پھر بولی۔ "اے مسٹر! میری گاڑی پہ کوئی تجربہ نہ کریں اور ورکشاپ کے مالک کو بلائیں۔"

"ورکشاپ کے مالک یہی ہیں۔" اسلم نے کہا۔

میں نے اسلم سے کہا۔ "تم ذرا سیلف لگاؤ۔" اس نے سیلف لگایا تو گاڑی نے پہلے تو تھوڑا بہت سیلف اٹھایا، پھر سیلف فری ہو گئی۔ اب سیلف میں چابی لگانے کے بعد تک ہلکی سی آواز آ رہی تھی۔

میں فوراً سمجھ گیا۔ اگنیشن کے روشن یا تمام فیوز اڑ گئے تھے۔

میں نے لڑکی سے پوچھا۔ "جب آپ گاڑی ڈرائیو کر رہی تھیں تو کیا گاڑی بند ہونے پر سیلف کی چابی گھما کر چلا رہی تھیں؟"

"ہاں، ایسا کرنے سے گاڑی بند نہیں ہو رہی تھی۔" لڑکی نے کہا۔

"نازنین!" میں نے آواز دی۔ "فیوز پلگ کا ڈبا لے کر آؤ۔"

پھر میں نے باری باری گاڑی کے تمام فیوز چیک کیے۔ اس میں سے زیادہ تر ناکارہ ہو چکے تھے۔ میں نے چند منٹ کے اندر اندر تمام فیوز تبدیل کر دیے۔

پھر لڑکی سے کہا۔ "اب ذرا آپ اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر سیلف لگائیں۔"

پہلی ہی دفعہ میں گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے نازنین سے ریڈی ایٹر کا پانی اور آئل چینج کرنے کو کہا اور خود ہاتھ صاف کرتا ہوا کیبن میں چلا گیا۔ لڑکی کی گاڑی درست کرنے میں مجھے پسینا آ گیا۔

لڑکی میرے پیچھے پیچھے آفس میں آئی اور بولی۔ "آپ تو بہت ایکسپرٹ ہیں۔ لمحوں میں خرابی پکڑ لی۔"

"آپ احتیاطاً گاڑی کی ٹرائی لے لیں۔ ممکن ہے ابھی کوئی خرابی رہ گئی ہو یا میں نے ہی کوئی نئی خرابی کر دی ہو؟"

"اب آپ مجھے شرمندہ تو نہ کریں۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

مجھے وہ لڑکی پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھی۔ بھولی بھالی، معصوم اور صاف گو، اس پُرکشش شخصیت اور اس کی آنکھوں میں بھی میرے لیے قربت تھی۔

"آپ بل تو بتا دیں۔"

اس نے پرس کھولتے ہوئے کہا۔

میں نے صرف فیوز اور آئل کا بل بنا کر اسے دے دیا۔"

اس نے بل دیکھ کر کہا۔ "اس میں ورکشاپ سروس تو آپ نے شامل ہی نہیں کیں۔"

"ہم پہلی دفعہ آنے والے گاہک کو سروس فری دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ پھر بولا۔ "سوری، میں بل پر نام لکھنا بھول گیا۔"

"میرا نام فرح ہے۔" اس نے کہا اور جلدی سے

آفس سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی مجھے کیبن ایک دم خالی خالی سا لگنے لگا۔ فرح ان لڑکیوں میں سے تھی جو پہلی ہی نظر میں دل میں اتر جاتی ہیں۔

اس وقت استاد وہاں آگیا اور بولا۔ ”یار امجد! مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں استاد!“ میں نے ہنس کر کہا اور نادر زمان سے کہا۔ ”وہ آف وہائٹ کرولا اچھی طرح چمکا دے اور اندر سے بھی اس کی صفائی کر دینا۔“

☆☆☆

میں گاڑی لے کر ورک شاپ سے نکلا تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے پہلے تو مجھے یونیورسٹی جا کر اپنا بی اے پارٹ ٹو کا فارم جمع کرانا تھا۔ کالج والوں نے غلط مضامین کا اندراج کر دیا تھا۔ وہاں سے میں پاسپورٹ آفس گیا۔ مجھے اپنا اور امی کا پاسپورٹ بنوانا تھا۔ میں انہیں اس سال حج پر لے جانا چاہتا تھا۔

اور پھر میں شاپنگ کرنے شہر کے ایک معروف مال میں چلا گیا۔ اچھا پرفیوم، اچھی ٹائیاں، کف لنکس، شرٹس، جرابیں اور بوٹ میری کمزوری ہیں۔ میں ایک شاپ پہ کھڑا ہوا پرفیوم دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک شناسا سی نسوانی آواز آئی۔

”بیسٹ بھیڑ بنا پرفیوم ہے۔“

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو فرح کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”آپ...... یہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا میں یہاں نہیں آسکتی؟“ اس نے شوخی سے پوچھا۔

میں نے شاپ کیپر سے پوچھا۔ ”ابھی تمہارا نیول ان شرٹس اینڈ ٹی شرٹس؟ (شرٹس اور ٹی شرٹ میں کوئی نئی ورائٹی آئی ہے؟)

”سر اگلے ہفتے تک آنے والی ہے۔“ اس نے جواب دے دیا۔

فرح نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”آ...... آپ...... تو پڑھے لکھے ہیں ورنہ ورکشاپ میں کام کرنے والے تو......“

”عموماً جاہل ہوتے ہیں۔“ میں نے ہنس کر اس کا جملہ پورا کر دیا۔ ”مجھے پڑھنے کا شوق ہے۔ اور میں گریجویشن کرلوں گا۔ پھر میرا ارادہ ایم بی اے کرنے کا ہے۔“ کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”مس فرح! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں ایک بات کہوں؟“

”کہیے۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ کیا ہم سکون سے بیٹھ کر کہیں آئس کریم یا کولڈ ڈرنک پئیں تو کیسا رہے؟“

”شیور! مسٹر...... دیکھیے میں بھی کتنی بد اخلاق ہوں۔ اب تک آپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔“

”میرا نام امجد ہے۔“

پھر ہم ایک آئس کریم پارلر میں جا بیٹھے۔ فرح بہت معصوم لڑکی تھی۔ وہ سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد پولیس میں ایس پی ہیں۔

”ارے بھئی پھر تو آپ سے ڈرنا پڑے گا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ پولیس والوں سے تو سلام دعا ورکی اچھی۔ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی!“

وہ اس بات پر کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔ ”پہلی بات تو یہ کہ میں پولیس والی نہیں ہوں اور دوسری بات یہ کہ میرے پاپا بہت اچھے اور نفیس انسان ہیں۔ وہ روایتی پولیس افسروں کی طرح نہیں ہیں۔“

اس دن فرح سے بہت باتیں ہوئیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں فرح کو برسوں سے جانتا ہوں۔

پھر تو اکثر ہی ملاقاتیں ہونے لگیں۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ ”فرح، میں آپ سے ایک بات پوچھوں؟“

”امجد، اب یہ آپ جناب کا تکلف ختم کر دیں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”تم بھی تو اس تکلف میں پڑی ہوئی ہو۔“ میں نے کہا۔

”چلو میں بھی ختم کیے دیتی ہوں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”اب پوچھو کیا پوچھ رہے تھے؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ اب تمہیں اپنی امی سے ملوا دوں۔“

”کیوں؟“ وہ شوخی سے بولی۔

”بھئی، وہ بھی تو دیکھیں کہ ان کی ہونے والی بہو کیسی ہے؟“

میری بات پر فرح ایک دم شرما گئی۔ پھر میں نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ ”فرح کیا تمہارے پاپا اس شادی پر راضی ہو جائیں گے؟“

”پاپا کی تم فکر مت کرو، وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔“ فرح نے کہا۔

اس وقت ہم ساحل سمندر پر بیٹھے تھے اور فرح کے بال ہوا سے اڑ رہے تھے۔ اس حالت میں وہ مزید حسین لگ رہی تھی۔

دو دن بعد میں فرح کو اپنے گھر لے گیا۔ امی اس سے یوں ملیں جیسے وہ ان کی بچھڑی ہوئی بیٹی ہو۔ فرح بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوئی۔

اس رات امی نے مجھ سے پوچھا۔ ”امجد! تو نے بتائے بغیر اپنے لیے لڑکی بھی پسند کر لی؟“

”امی! ایسی بات نہیں ہے۔ شادی تو آپ کی اجازت ہی سے ہوگی۔“

”ویسے لڑکی بہت پیاری ہے، بس ایک بات کا خطرہ ہے مجھے۔ اس کا اعلیٰ عہدے دار باپ اس شادی پر راضی ہوگا بھی یا نہیں؟“

”امی، آپ اس کی فکر مت کریں۔ میں پڑھا لکھا ہوں، اچھا کماتا ہوں، پھر یہ کہ فرح اپنے باپ کی بہت لاڈلی ہے۔ وہ انہیں منا لے گی۔ آپ فکر مت کریں۔“

پھر کئی ہفتے یوں ہی گزر گئے۔ فرح اپنے تایا کے پاس اسلام آباد چلی گئی تھی۔ ان دنوں کالج کی چھٹیاں تھیں۔ ہاں، وہ سیل فون پر روزانہ رات کو گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتی تھی۔

وہ دن بہت منحوس تھا۔ میں نے ورکشاپ آ کر ڈانگری پہنی ہی تھی کہ ایک ہنڈا سوک ورکشاپ میں داخل ہوئی۔ استاد اس وقت بھی موجود نہیں تھا۔ میں ایک گاڑی کے بونٹ پر جھکا کام کر رہا تھا۔ کیونکہ اس دن اسلم بھی نہیں آیا تھا۔

میں نے ہنڈا سوک پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اچانک کوئی چیخ کر بولا۔ ”یہاں کام کرنے والا کوئی ہے یا میں واپس چلا جاؤں؟“

میں نے بونٹ کی آڑ سے بولنے والے کو دیکھا تو خون میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ ایس پی اکرم تھا۔ وہی ایس پی جس نے مجھے پولیس لاک اپ میں برہنہ کر کے میری ا... کو ... کر رکھ دیا تھا۔

”کیا بات ہے جناب!“ میں نے کہا۔ ”شور کیوں کر رہے ہیں۔ دیکھ نہیں رہے، سب لڑکے مصروف ہیں۔ آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔“

وہ بھی ایک دم مجھے پہچان گیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ”سب کام چھوڑ دے پہلے میرا کام کر!“

”سوری!“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”انتظار تو آپ کو کرنا پڑے گا۔“

”تو مجھے جانتا نہیں میں کون ہوں؟“

”مجھ سے زیادہ آپ کو کون جان سکتا ہے؟“ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”بہتر ہے کہ آپ اپنی گاڑی کسی اور ورکشاپ میں لے جائیں۔ ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے۔“

میری بات سن کر وہ آگ بگولہ ہوگیا اور بری طرح میری طرف لپکا۔ ”دو ٹکے کا چھوکرا مجھ سے زبان درازی کرے گا؟“ اس نے اچانک میرے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

اس نے دوسرا تھپڑ مارنے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ اب اگر تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں اس پانے سے تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔“ میں نے بھاری بھرکم پانا اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اور لاک اپ اور پولیس میرے لیے اب کوئی نئی چیز نہیں رہی۔ بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

اس وقت استاد آ گیا۔ اور درشت لہجے میں بولا۔ ”امجد ایس پی صاحب ہمارے کسٹمر ہیں اور کسی بھی کسٹمر کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔“

”کسٹمر ہوں گے آپ کے۔“ میں نے استاد سے بھی پہلی دفعہ تلخ لہجے میں بات کی۔ ”آپ ان کی خوشامد کریں، ان کے پاؤں پکڑیں اور ان کی گاڑی ٹھیک کریں۔“

”لگتا ہے یہ پرانی مار بھول گیا ہے۔“ ایس پی بپھر کر بولا۔ ”میں ابھی تیرا علاج کرتا ہوں۔“ اس نے جیب سے سیل فون نکالا۔

”جانے دیں سر!“ استاد نے کہا۔ ”بچہ ہے۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔“ پھر استاد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”امجد! تم اندر جاؤ۔“

استاد نے خوشامد کر کے اسے ٹھنڈا کیا اور اس کی گاڑی خود ٹھیک کر دی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے استاد سے کہا۔ ”استاد! اب مجھے بھی اجازت دو۔ میں نے یہاں بہت اچھا وقت گزارا ہے، ہاں، اگر مجھ سے نادانستگی میں کوئی بھول ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔“

میں نے کپڑے بدلے اور جانے کو تیار ہو گیا۔

”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے امجد!“ استاد نے کہا۔ ”تو..... تو مجھے چھوڑ کر جائے گا..... میں نے ہمیشہ تجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھا۔ مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔“ استاد کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''اکرم بھائی! میں......''

''بس آگے کچھ مت بولنا۔'' انہوں نے یہ کہہ کر مجھے سینے سے لگالیا۔ ان کے سینے سے لگ کر میں بھی باری طرح رونے لگا۔

ورکشاپ کا ہر لڑکا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''اکرم بھائی! آپ تصور کرسکتے ہیں کہ میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ ورنہ تو میں نے رفیق تو ہین کے احساس سے کہہ دیا تھا۔''

یوں استاد نے مجھے اپنے ورکشاپ میں روک لیا۔

پھر دن یوں ہی بے رنگ گزرنے رہے کیونکہ فرح اسلام آباد میں تھی۔ میں روز رات کو اس سے کہتا تھا کہ بس اب تم واپس آجاؤ۔ تمہارے بغیر کسی کام میں میرا دل نہیں لگتا۔ وہ ہمیشہ وعدہ کرلی تھی کہ میں دو تین دن میں کراچی آجاؤں گی۔

پھر ایک دن وہ واقعی کراچی آگئی۔ اسلام آباد میں رہ کر اس کا چہرہ مزید نکھر گیا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی۔ اس کا جسم بھر گیا تھا اور انتہائی متناسب ہوگیا تھا۔

ہم نے اسی دن ہی ریو کا پروگرام بنالیا کیونکہ فرح کو سمندر سے عشق تھا۔ پھر ہمارے شب و روز یوں ہی گزرنے لگے۔

میں نے دن رات محنت کرکے کراچی یونیورسٹی میں ایم بی اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ اب میں دن میں کم ہی ورکشاپ میں ہوتا تھا۔ میں سہ پہر تین بجے تک ورکشاپ جاتا تھا تو استاد چھٹی کرکے گھر چلا جاتا تھا۔ میں رات گیارہ بجے تک ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔

اس دن میں یونیورسٹی سے گھر آیا تو استاد گھر جانے کو تیار بیٹھا تھا۔ وہ فوراً ہی گھر چلا گیا۔

میں نے گھوم پھر کے ورکشاپ کا جائزہ لیا۔ اس دن کوئی بھی نئی گاڑی ورکشاپ میں نہیں آئی تھی۔ باقی گاڑیوں پرانے کے کام کررہے تھے۔

اچانک ورکشاپ میں ایس پی کی ہنڈا سوک داخل ہوئی۔

اسلم فوراً اس کی طرف لپکا لیکن اس نے انتہائی ہتک آمیز انداز میں مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

اسے دیکھ کر میرا دبا ہوا جو نفرت کی خوفناک آگ میں جلنے لگا تھا۔

مجھے استاد کا خیال تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا تھا کہ اس

سے الجھو مت۔ پھر بھی مگر ہمارے ورکشاپ میں وہ ہمارا کسٹمر ہے۔

''دیکھو میری گاڑی میں کیا خرابی ہے؟'' اس نے انتہائی حقارت سے کہا۔

''یہ تو آپ بتائیں گے کہ اس میں پرابلم کیا ہے؟'' میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''میں گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوں، گیئر میں ڈال کر آگے بڑھاتا ہوں تو ایک دم بند ہوجاتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ پرابلم کب سے ہے؟''

''کل رات کو میں نے اس کی سروس کرائی تھی۔ اس کے بعد سے یہ حال ہے۔'' اس نے کہا۔ ''نئی گاڑیاں بھی ایک دم بے کار ہوتی ہیں۔ اس سے بہتر تو میری کرولا تھی۔''

میں نے گاڑی کا بونٹ کھولا۔ اس کے پلگ اور کرنٹ چیک کیا، پھر بولا۔ ''سر، آپ کو گاڑی ایک گھنٹے کے لیے یہاں چھوڑنا پڑے گی۔''

''اور ایک گھنٹے تک میں کیا پیدل مارا مارا پھروں گا؟'' اس نے یوں کہا جیسے اس کے پیدل پھرنے کا ذمے دار ورکشاپ ہے۔

''آپ اس وقت تک میری گاڑی سے کام چلالیں۔'' میں نے ایک لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مالک گاڑی کی ٹیوننگ اور سروس کے لیے گاڑی چھوڑ کر دو تین دن کے لیے اسلام آباد چلا گیا تھا۔

''یہ تو چلنے میں پریشان نہیں کرے گی۔'' اس نے پوچھا۔

''یہ گاڑی پرفیکٹ ہے بس آپ کو فیول ڈلوانا پڑے گا۔ اس میں اتنا فیول ہے کہ پیٹرول پمپ تک پہنچ جائے گی۔''

وہ گاڑی لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد فرید نے پوچھا۔ ''استاد! اس کی گاڑی میں فالٹ کیا ہے؟''

''فالٹ کچھ بھی نہیں ہے سروس کرنے والوں نے آئل ضرورت سے زیادہ بھر دیا ہے۔ میں ابھی پانچ منٹ میں اسے سیٹ کردوں گا۔''

میں نے اپنے کپڑے اتار کے اوورآل پہنا اور خود گاڑی کے نیچے لیٹ گیا۔ پہلے تو میں نے اس کا اضافی آئل نکالا، پھر ایک دم میں انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔ میں نے گاڑی کے بریک آئل کے پائپ میں بہت معمولی سا سوراخ کردیا مگر اس وقت غور نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ میں ایس پی کا کام دل سے کرنا نہیں چاہتا تھا جبکہ اس سے خطرہ تھا کہ بریک آئل لیک ہوتا رہتا اور ایک وقت تک اس

کے بریک فیل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر میں گاڑی کے نیچے سے باہر نکلا۔ گاڑی کی بریک آئل چیک کیا۔ وہ آدھے سے بھی کم تھا۔ میں نے احتیاطاً آئل فل کر دیا تا کہ یہاں سے نکلتے ہی فوراً حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔

پھر میں گاڑی کے اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے ورک شاپ سے باہر لے گیا۔ اب وہ گاڑی بالکل بہترین انداز میں چل رہی تھی۔

میں.... لمبی ڈرائیو لے کر آیا تو فرید نے کہا۔ ''امجد بھائی! آپ تو گاڑی کی نبض پر ہاتھ لگا کر اس کی خرابی پہچان لیتے ہیں۔''

''اس ایس پی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گاڑی میں کیا فالٹ تھا۔ اس کا بل میں خود بناؤں گا۔''

ایس پی ایک گھنٹے کی بجائے دو گھنٹے میں آیا۔ میں نے اس کا بل پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ وہ تقریباً ساڑھے پانچ ہزار کا بل تھا۔ میں نے ایس پی کو اتنی خرابیاں بتائی تھیں کہ ایس پی کے لیے نہیں پڑی تھی۔

اس نے گاڑی کی ڈرائیو لی اور خوشی خوشی واپس آ کر بولا۔ ''آدمی تم کمینے ہو لیکن اپنے فن میں ماہر ہو۔''

اسے کیا معلوم کہ میں کتنا کمینہ آدمی ہوں۔ اس کے جانے کے بعد میرے ضمیر نے مجھے بہت ملامت کی لیکن ہر بار مجھے وہ منظر یاد آ گیا جو اس نے لاک اپ میں مجھے بے لباس کر کے تشدد کیا تھا۔

پھر کئی دن یوں ہی گزر گئے۔ فرح سے ملاقاتیں بھی جاری تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے پاپا کو اپنی شادی کے بارے میں بتا دیا ہے اور گھر میں آج کل بہت تناؤ ہے۔ وہ تمہارا تو نام بھی سننا نہیں چاہتے۔ ان کی بس ایک ہی رٹ ہے کہ لڑکا کتنا بھی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو لیکن ہے تو وہ ٹکے کا مکینک!''

میں نے ان سے کہا۔ ''پاپا آپ ایک دفعہ اس سے مل تو لیں لیکن انہوں نے سختی سے انکار کر دیا۔''

میرا دل ڈوبنے لگا۔ ''پھر.... پھر تم کیا کرو گی؟''

''مجھے تو قانون نے اتنا حق دیا ہے کہ میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر سکوں۔ پاپا اگر راضی نہیں تو میں تو ہوں۔ میں ہر قیمت پر تم ہی سے شادی کروں گی۔'' اس نے حوصلہ مند لہجے میں کہا۔

وہ بظاہر تو ایک صبح تھی مگر میرا دل نہ جانے کیوں بجھا جا رہا ہے۔ کسی چیز میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں ورک شاپ میں جا کر کیبن میں بیٹھ گیا اور اسلم سے کہہ دیا کہ آج ورک شاپ کے معاملات تم سنبھال لینا۔

تھوڑی دیر بعد استاد بھی آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''کیا بات ہے امجد! کوئی پریشانی ہے؟''

''کچھ نہیں استاد بس صبح سے میرا دل نہ جانے کیوں گھبرا رہا ہے۔''

اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ استاد نے ریسیور اٹھایا اور بولا۔ ''ہیلو..... ارے، کب، کیسے..... یہ تو بہت برا ہوا۔'' پھر استاد نے مجھے بتایا کہ ایس پی صاحب کا بہت خوفناک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے وہ اپنی فیملی کے ساتھ حیدر آباد جا رہے تھے۔ کہ اچانک بریک فیل ہو گئے۔ حادثے میں ان کی بیگم اور وہ دونوں ہی ہلاک ہو گئے ان کی بیٹی فرح شدید زخمی ہے اور کراچی کے آغا خان اسپتال میں ہے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے استاد نے میرے سر پر دس کلو کا ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔

''استاد..... فرح ... ان کی بیٹی تھی؟'' استاد کا جواب سنے بغیر میں بے ہوش ہو گیا۔

مجھے ہوش آیا تو میں خود اسپتال میں تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ فرح اس حادثے میں بچ تو گئی ہے لیکن وہ زندگی بھر کے لیے معذور ہو گئی ہے۔

میں فرح سے ملا تو وہ بہت اداس اور دل گرفتہ تھی۔ میری معمولی سی خطا نے فرح کو نہ صرف ماں باپ کے سائے سے محروم کر دیا تھا بلکہ وہ زندگی بھر کے لیے معذور بھی ہو گئی تھی۔

استاد کے لاکھ سمجھانے کے باوجود میں نے فرح سے شادی کر لی۔ میں بھلا انہیں کیسے بتاتا کہ میرا ضمیر دن رات مجھے کچوکے دیتا ہے۔ ضمیر کی یہ چبھن اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب فرح میرے اس احسان کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

یہ سب میرا کیا دھرا ہی تو ہے۔ اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔

میں نے اپنے ضمیر کی جلن دور کرنے کو فرح سے شادی کر لی ہے لیکن کیا میں ان دو جیتے جاگتے انسانوں کی زندگی کا بھی قرض اتار سکوں گا۔ ایک مکینک ہوتے ہوئے بھی دل سے کام نہ کر کے اس حادثے کو جنم دیا۔ اگر میں اس وقت لیکیج لیک کو نظر انداز نہ کرتا تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔ فرح کے ماں باپ جان سے نہ جاتے۔ اپنی اسی خطا کی پردہ پوشی کر رہا ہوں۔

میں بیروں روتا ہوں، اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ کاش مجھے سکون مل جائے۔ کاش!